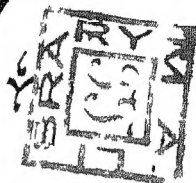




میں

۱۵۷

# مضامین



مولانا مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شریک رضوی

میں

مطلبہ اعلیٰ

میں

کہ تمام شاعرانہ و عاشقانہ، ممتاز فلسفیانہ، تاریخی و حب الوطنی، علمی و ادبی مضامین، دنیا کے مشہور اکابر اور نامور خاتونوں کے سوانح عمری، اور کل متفرق تحریریں جن کی فائصل و محقق موصوف نے اسے

میں

نظر ثانی فرمائی ہے

میں

جنھیں

میں ایک عاشق کیلانی مولوی ضامن گنگا بہت چھپوا

٢٩١٥٢٥٠

م ٢١٥

١٢٢-٤

١٢٢

M. A. LIBRARY, A. M. U.



113377

١٢٢

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ یعنی گزشتہ لکھنؤ

(۱)

اے بھائی! میں شاید کسی کو عذر نہ ہوگا کہ ہندوستان میں مشرقی تہذیب کی ترقی نہ ہو سکی۔ اگلے دور کی یادگار جو وہ ہیں مگر جس دربار پر پُرانی تہذیب اور مغل معاشرت کا اثر رہا تھا۔ جو بہت ہی آخرین قائم ہوا اور عجیب و غریب تہذیبی جملہ بنا ہو گیا۔ لہذا مندرجہ بالا عنوان کے تحت میں ہم رسالہ فقر حالات اور اس کی خصوصیتوں کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان میں شاید کسی کو عذر نہ ہوگا کہ جس خطہ زمین پر یہ پھیلا اور بار بار رفت اور اہمیت ہندوستان کے تمام صوبوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ یہ خاندان خصوصاً راجہ راجندر جی کے اعلیٰ کارنامے اور عظیم نظریات کمال کو پہنچی ہوئی ہیں کہ تاریخ کے غرور کو تائب اور محدود دیکھ کر ہی تقدس کا جامہ پہن لیا ہے۔ اور آج ہندوستان کا شاید ناوہری ہوگا توں ہوگا جہاں اگلی یاد ہر سال رام لیلا کے مذہبی تائب کے منور ہو جاتی ہو۔ لیکن اودھ کے اس قدیم ترین دیوتا کی دربار کے سامنے اس کا اس ہند کا جاہ و جلال و مالکی نے ایسی عجیب و غریب فصاحت اور عظیم کیش کی لوح دل پر لکھ گیا۔ لہذا میں اسے اعادے میں لوگوں نے آج وہ لکھنے پر شکوہ زمانے کی تصویر کشی کی ہے۔

اور اسی مبارک نقشہ پر آج و گداز میں فیض آباد کا

اور اس کی اس وقت سے شروع کرتے ہیں جب

اور پچاس سال سے زیادہ زمانہ



کی طرف سے صوبہ دار اودھ مقرر ہوئے آئے تو شیخ زادگان لکھنؤ کو منظر  
قدیم مستقر اودھ یعنی محترم و مقدس شہر اچھو دھیا میں ہو گئے۔ اور اُن  
خامسے پر یعنی دریائے گھاگر کے کنارے ایک لمبے ٹیلے پر اپنا خیمہ نصب  
انتظام صوبہ کی محویت میں اُنھیں عالیشان عمارت بنانے کی فرصت  
نہ اپنی سادہ مزاجی کی وجہ سے ایسے خاموشی کر فرما اُنھیں شوق  
ایک زمانے تک خیموں میں بسر کی۔ اور جب چند روز کے بعد اُنھیں  
تکلیف ہوئی تو تھوڑی دُور مٹ کے ایک مناسب مقام پر اپنے لیے ایک  
پھر اس کے بعد اُس چھپر کے گرد کچھ دیوار کا ایک بہت وسیع مربع حصہ بنا  
چاروں طرف کو فون پر قلعہ بندی کی شان سے چار کچے برج بنوا دیے تاکہ اگر  
بگرائی کی جاسکے۔ یہ احاطہ اس قدر وسیع تھا کہ اس کے اندر متعدد ماسا  
توپ خانے۔ اسٹبل۔ اور دیگر ضروری کارخانے آسانی سے رکھے گئے تھے۔  
کوچہ کہ عمارت کا شوق رہا تھا اس لیے اُن کے زمانے اور بگیاات کے قیام  
بھی کچھ ہی مکانات بنائے گئے۔ غرض اُس کچے بنگے میں اُن وقت کا  
جب اُسے اصلاح کے دورے اور سفر باہر۔ مگر اُن سے فراغت ہوتی آد  
کے ساتھ رہتا تھا اور کسی بات کی شکایت نہ تھی۔ اور اُس کا یہ دار  
روز میں ”جگلا“ کے نام سے مشہور ہو گیا۔

برج بان الملک کے انتقال کے بعد جب نواب مندرجہ جگ کا زمانہ  
تو یہ بستی فیض آباد مشہور ہوئی۔ یہ بے بنیاد شہر فیض آباد کی جس نے  
ورنہ بڑے کی سرعت میں لکھنؤ کو بھی مات کر دیا۔ اب اُن دنوں اُپر  
ہواری کے گرد اکثر غل سرداران فوج نے اپنی دلچسپی کے لیے اُپر  
غش تربیت گاہیں بنائیں۔ اور شہر کی رونق ترقی کرتے گئے۔ اس کے  
”دلی دروازہ“ کہلاتا تھا جو مغرب کی طرف تھا۔ اس کے باج

پشاور بازار بنوایا اور اسی کے سلسلے میں راجے کے

ملائے نشی پرنسپل جن کی ”مابج“ قرض غل ہے۔

نہ روز وقت ہے۔ اگر بٹ برہا

برکرائے۔ اسی طرح جنس خاں رسالدار نے بھی ایک بازار بنوایا۔ اور چار دیواری  
 اندر خواجہ سراؤں اور غلاموں کی بہت سے مکانات بھی تیار ہو گئے۔  
 قوآب صغیر جنگ کی وفات کے بعد اس نئی بستی پر چند روز کے لیے بنا ہی  
 اس گئی۔ جس کی وجہ سے اتنے دفون میں چوکھ بنا تھا زمانے نے بگاڑ کے دکھایا  
 اس لیے کہ اُن کے فرزند قوآب شجاع الدولہ نے اپنی سکونت کے لیے لکھنؤ کو پسند کیا  
 تھا اور وہیں رہتے تھے۔ گویا سال میں دو ایک برائیں اپنے باپ دادا کے اس  
 مذہم سکونت میں ضرور بسر کر لیا کرتے۔ یہاں تک کہ ۱۷۶۳ء میں انھیں کبیر کی لڑائی  
 میں انگریزوں سے شکست ہوئی۔ اُس وقت وہ کمال پے سرو سامانی سے بھاگ گئے  
 ہوئے فیض آباد میں آئے اور وہاں کے قلعے میں جو کچھ ساز و سامان موجود پایا ان کے  
 راتوں رات چل کھڑے ہوئے۔ اور لکھنؤ پہنچے۔ یہاں بھی ایک ہی رات قیام کر کے  
 جو کچھ ہاتھ آیا لیا اور چربی کی راہ لی۔ تاکہ افغانہ روہیلکھنڈ کے پاس جا کے پناہ  
 لیں۔ لڑائی کے فوہینے بعد انگریزوں سے اُن سے صلح ہو گئی۔ جس کی رُو سے  
 شجاع الدولہ کے ذمے واجب تھا کہ محاصل ملک میں سے پنج آتی انگریزوں کو  
 ادا کیا کریں۔

صلح ہونے سے پہلے اس سفر میں اتفاقاً شجاع الدولہ کا گذر شہر فرخ آباد  
 میں بھی ہوا تھا جہاں احمد خان بکس سے ملاقات ہوئی جو اُس زمانے کے پرانے تجربہ کار  
 شجاعون میں خیال کیے جاتے تھے۔ انھوں نے شجاع الدولہ کو مستورہ دیا کہ اب کی  
 جو تم جا کے عمارت حکومت ہاتھ میں لینا تو میری ان دو باتوں کو نہ بھولنا۔ ایک تو  
 یہ کہ سنوں کا کبھی اعتبار نہ کرنا بلکہ اپنے دیگر ملازموں اور خواجہ سراؤں سے کام لو۔  
 دوسرے یہ کہ لکھنؤ کا رہنا چھوڑو اور فیض آباد ہی کو اپنا دار الحکومت بناؤ۔  
 یہ باتیں شجاع الدولہ کے دل پر بیٹھ گئیں۔ اور انگریزوں سے معاہدہ ہونے کے  
 بعد ۱۷۶۹ء میں جو انھوں نے اپنی فکر و کی راہ لی تو سیدھے فیض آباد آئے اور  
 اسی کو اپنا دار الحکومت قرار دے دیا۔ اب یہاں انھوں نے نئی فوج بھرتی کرنا  
 شروع کی۔ نئے رستے مرتب کرنے لگے اور نئی عمارتوں کی بنیاد ڈالی۔ پڑائے  
 دار کو ایک مضبوط شہر بنانے کی شان سے از سر نو تعمیر کرایا۔ جو اب قلعہ کہلاتا تھا۔

مخلون کے چمکانات اندر واقع تھے ڈھادیے۔ اور اپنے اکثر خاکی مازوں کو حکم دیا کہ شہر پانڈے کے باہر مکان بنوائیں۔ اُس حصار کے گرد اگر دہرمت دودھیل کا میدان چھوڑ دیا گیا جس کے گرد گہری خندق کھود کے قلعہ بندی کی منع سے درست کی گئی۔ اور ملازمین سرکار اور افسران فوج کو اجازت ہوئی کہ اپنی حیثیت اور حالت کے مناسب تعلقات زمین کے اُسی میدان میں مکان بنائیں۔ جیسے ہی خبر مشہور ہوئی کہ شجاع اللہ دے فیض آباد کو اپنا مستقر قرار دیا ہے ایک دنیا کا رخ ادھر پھر گیا۔ ہزار ہا خلعت آتے آتے آباد ہوتا شروع ہوئی۔ شاہجہان آباد میں یہ حالت تھی کہ جسے دیکھے فیض آباد جانے کے لیے تیار ہے۔ چنانچہ دہلی کے امیر الہ آبادیوں نے وطن کو خیر باد نہی اور پورب کا رخ کیا۔ شب و روز لوگوں کے آنے کا آنا بندھا رہتا تھا۔ اور قافلے پر قافلے چلے آتے تھے جو آتے ہی ان کے پاس بیٹے اور بیٹیاں آباد کی سود میں کھپتے جاتے تھے۔ چند ہی روز کے اندر ہر قوم و ملت کے خوش باش۔ اہل قلم۔ اہل سیب۔ تاجر۔ ستاع۔ اور ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگ یہاں جمع ہو گئے۔ اور جو آتے آتے ہی اس فکر میں پڑ جاتا کہ کوئی قلعہ زمین حاصل کر کے مکان بنائے۔

چند ہی سال کے اندر اس پہلے حصار کے علاوہ دواور فیصلین تعمیر ہو گئیں۔ ایک جو پہلے مربع کے جنوبی چلو سے ملی ہوئی تھی اُس کے رقبے کا فوٹ و عرض دودھیل کا تھا۔ اور دوسرا حصار ایک میل کے پھیلاؤ میں تھا جو قلعہ اور بیرونی فیصل کے درمیان تھا۔ اسی زمانے میں ترقی پزیر اور چوک بازار تعمیر ہوئے۔ جن کی شرک قلعے کے جنوبی پھاٹک سے شروع ہو کر شرک آباد کے ٹکڑے تک چلی گئی تھی۔ اور اتنی کشادہ تھی کہ برابر برابر دس پھاٹک سامانی سے گزر سکتے تھے۔ فیصل شہر کا آثار زمین کے پاس چاہے جتنا ہو درمیان میں اس گز سے کم نہ تھا جو اوپر پونچ کے پانچ گز ہو گیا تھا۔ اس فیصل پر قاعدہ اور بے قاعدہ دونوں طرح کی فوج کے رہنے والے تھے۔ اور بھر روئے پھر اکرتے۔ اور جا بجا پرو دیتے۔ باقاعدہ سپاہیوں کی وردی لال تھی۔ اور بے قاعدہ سپاہیوں کی وردی سیاہ۔ انھیں سپاہیوں کی عزت سے برسات میں جا بجا پھیر ڈال دیے جاتے۔ مگر برسات کے فخر ہوئے ہی آگ لگنے سے مزید

سے وہ لازمی طور پر آثار ڈالے جاتے۔ چنانچہ صرف فیصل کی دیواروں کے لیے ہر سال تقریباً ایک لاکھ چھپر چھپائے اور چار مہینے بعد فوج کے پھینک دیے جاتے۔

حوالی شہر میں دومر غزار شکار گاہ قرار دیے گئے تھے۔ جن میں سے ایک مغرب کی جانب گرجی بیگ خان کی مسجد سے گپٹا رکھاٹ تک چلا گیا تھا جو ایک مستند سنت ہے۔ اُس کے دونوں طرف کچی دیواریں تھیں اور تیسری طرف گھاگرا واقع ہوئی تھی۔ اس میں ہرن۔ چیتل۔ بارہ شگے۔ نیل گائیں وغیرہ شکار کے جانور کثرت سے چھوڑے گئے تھے جو نہایت آزادی سے چھوٹے چھوٹے پھرتے اور بھڑکے ہی جو کھانا بھرتے لگتے۔ دوسری شکار گاہ شہر سے مشرق کی طرف موضع جنورا اور چھاؤنی گوشتا میں سے دریا کنارے تک تھی جس کا پھیلاؤ چھ میل کا تھا۔ اس کے رقبے میں گیارہ موضع اور اُنکی ارہنی آگئی تھی۔ مگر یہ شکار گاہ نامکمل ہی رہی اور اسکی نوبت نہ آنے پائی کہ اس میں وحشی جانور چھوڑے جائیں۔

خاص شہر کے ملنے کے اندر تین ایسے نہایت بخش باغ تھے جو اس قابل تھے کہ امرا اور شاہزادے آکے اُن میں سیر کریں اور اُنکی بہار اور شاہابی سے لطفت اُٹھائیں۔ ایک انگوری باغ جو قلعے کے اندر واقع تھا۔ اور اُسکے رقبے کے چوتھائی حصے پر حاوی تھا۔ دوسرا موٹی باغ جو مین چوک کے اندر واقع تھا۔ تیسرا لال باغ جو سب باغوں سے زیادہ وسیع تھا۔ اس میں نہایت ہی نفاست سے چمن بندی کی گئی تھی اور ہر طرح کے نازک و نظر فریب پھول قرینے سے لگائے گئے تھے۔ سارے صوبے میں اس کی شہرت تھی اور دور دور کے لوگوں کو تمنا تھی کہ کوئی خوش نصیبی کی شام اس روح افزا باغ میں بسر کریں۔ شہر کے نوجوان شرفاء کے غول و زربہر کو اُس میں گشت لگاتے اور دل بہلاتے نظر آتے۔ اس باغ کی جان فراخی کی شہرت یہاں تک تھی کہ شہنشاہِ ہندی شاہ عالم بادشاہِ حبيب الدہ آباد سے پٹے تو اسی باغ کی سیر کے شوق میں فیض آباد ہوتے ہوئے دہلی گئے۔ اور کچھ زمانے تک اسی کے اندر اُن کا قیام رہا۔ ان تین باغوں کے علاوہ آصفی باغ اور بلند باغ بھی فواح شہر میں لکھنؤ کے راستے پر واقع تھے۔

نواب شجاع الدولہ بہادر کو شہر کی درستی کا اس قدر شوق تھا کہ ہر صبح و شام

سوار ہو کے سڑکوں اور مکانات کو معائنہ کرتے۔ مزدور پھڑوسے اور گدہاں لیے ہوئے ساتھ ہوتے۔ جہاں کہیں کسی مکان کو ٹیڑھا اور اپنی حد سے بڑھا ہوا پاتے یا کسی دوکاندار کو دیکھتے کہ اُس نے سڑک کی زمین بالشت بھر بھی دالی ہے فوراً اُسے کھدوائے برابر اور سیدھا کر دیتے۔

فوج کی اصلاح کی طرف بھی شجاع الدولہ کو خاص توجہ تھی۔ رسلے کے علی سردار نواب ترغی خان بریج اور بہت بہادر اور امراؤ گیر نام دو گوسائین تھے۔ ان کے ماتحت اتنے سوار تھے کہ ان تین کے علاوہ او۔ جتنے چھوٹے چھوٹے عہدار تھے سب کی فوج کی مجموعی تعداد سے ان میں سے ہر ایک کی جمعیت زیادہ تھی۔ دیگر سرداران فوج احسان کبیری۔ گرجی بیگ خان۔ گوپالی راؤ مرہٹہ۔ بیرجلیہ کے کے درانا نواب جمال الدین خان۔ مظفر الدولہ نور جنگ بخشی بوالبرکات خان ساکن کاکوری۔ اور محمد معز الدین خان لکھنؤ کے ایک شیخ زادے تھے۔ ان میں سے کوئی نہ تھا جسکے ماتحت ہزار پانسو سپاہیوں کا گروہ نہ ہو۔ ماسوا ان کے خواجہ سرا اور وہ نو عمر خواجہ سرا جو اُنکے زیر نگرانی تربیت پاتے۔ چیلے۔ اور شاگرد پیشہ تھے۔ بہت سے علی خان خواجہ سرا کے ماتحت دو ڈویژن فوج یعنی چودہ ہزار باقاعدہ سپاہ تھی۔ جس کی دردی سرخ تھی۔ ایک دوسرا بہت خواجہ سرا تھا جس کے زیر کمان ایک ہزار بے قاعدہ نیزد باز سوار اور ایک پلٹن تھی۔ قنبر علی خان خواجہ سرا کی افسری میں پانسو سوار اور ایک پلٹن تھی۔ جن کی وردیاں سیاہ تھیں۔ محبوب علیخان خواجہ سرا کے زیر علم پانسو سوار تھے اور چار پلٹین تھیں۔ اتنی ہی فوج تھاقت علی خان کے ماتحت تھی۔ رگھوناتھ سنگھ اور پرشاد سنگھ میں سے ہر ایک کے زیر کمان تین تین سو سوار اور چار۔ چار پلٹین تھیں۔ اسی طرح مقبول علی خان اول و دوم پانچ سو علی خان کے ہمراہ پان پان سو سوار دن اور پہن لوں کی جمعیت تھی۔ اور توپخانے بے حدود بے حساب تھا۔

لہذا کل فوج جو شجاع الدولہ کے قبضے میں تھی اور قبضہ آدھین موجود رہا کرنی تھی اُس کی مجموعی تعداد یہ تھی۔ سرخ دردی والے تیس ہزار۔ باقاعدہ سپاہ دردی والے پالیس ہزار بے قاعدہ پیادے۔ ان نے افسر علی یعنی سپہ سالار شکر

سید احمد تھے جو "بانسی والا" کے لقب سے مشہور تھے۔ جلد ہی بھرتے اور فر کرنے کے اعتبار سے ان کی توڑے دار بند و فون کے مقابلے میں انگریزی فوج کی بندھن کوئی وقعت نہ رکھتی تھیں۔

اس جمعیت کے علاوہ شجاع الدولہ کے پاس بابیس ہزار ہر کارے اور مخیر تھے جو ہر ساتویں روز چوتھ سے اور ہر پندرہویں دن کابل سے خبریں لاتے۔ دربار میں ہمیشہ بلا دور و راز کے حکمرانوں کے نائب موجود رہا کرتے۔ ایک نائب مرہٹوں کا تھا۔ ایک نظام علی خان فرما زولے وکن کا۔ ایک ضابطہ خان کا۔ اور ایک نواب ذوالفقار الدولہ نجف خان کا۔ جن کے ساتھ ان کے دفتر اور سپاہی بھی تھے۔ ان لوگوں کے علاوہ اور بھی بہت سے فوجی انسر اپنی جمعیاتوں کے ساتھ یہاں موجود رہتے۔ جیسے میر نسیم خان جن کے بھندے کے بچے ثابت خانی، بند لیکنڈی، چندیلہ اور میواتی سپاہیوں کا ہجوم تھا۔ محمد بشیر خان قلعہ دار تھے۔ شہر کی فضیلون اور بھیاٹکون پر انھیں کے سوا اور سپاہی بھیلے رہتے۔ اور قلعے کے اندر ہی ان کے رہنے اور دفتر کے لیے عمدہ مکانات اور ان کے سپاہیوں کی بارکین بنی ہوئی تھیں۔ جب بیرونی دیواروں میں بھی جگہ نہ باقی رہی تو سید جمال الدین خان اور گوبال راؤ مرہٹہ نے باہر نکل کے موضع نور اہی کے پاس سکونت اختیار کی اور اپنے مکانات اور کمیٹیاں بنائے۔ اور اسی جگہ کی تنگی کی وجہ سے نواب مرتضیٰ خان بریج۔ میر احمد بانسی والا۔ میر ابوالبرکات اور شیخ احسان اجدھیا اور فیض آباد کے دریاں نیچوں میں رہتے تھے۔

آدمیوں کی کثرت اور سپاہیوں کے ہجوم سے شہر کے اندر خصوصاً چوک میں اس قدر بھیڑ مگی رہتی کہ گز نہا دشوار تھا۔ اور غیر ملکن تھا کہ کوئی شخص بغیر اٹکے ہوئے سیدھا چلا جائے۔ فیض آباد نہ تھا انسانوں کا جھل تھا۔ بازار میں دیکھتے تو ملکوں ملکوں کا مال ڈھیر تھا۔ اور یہ خبر سن کے کہ فیض آباد میں نفیس مزاج رمیوں اور شو قین امیروں کا انتخاب مجمع ہے۔ ہر طرف سے تاجروں کے قافلے لہے پھندے چلے آتے تھے۔ اور چونکہ چاہے کیسا ہی قیمتی مال ہوا تھا تو

ہاتھ پک جاتا۔ اچھی سے اچھی چیزوں کے آنے کا سلسلہ بندھ گیا تھا۔ جب دیکھیے  
ایران کا کاجی۔ چینی۔ اور فرنگی سوداگر نہایت گران قیمت اور بیماری ال پیے  
ہوئے موجود رہتے۔ اور جو نفع اٹھاتے ہوس بڑھتی اور زیادہ جستجو جان  
فشاری سے نیا مال لے آتے۔ سیوٹران تیل۔ سیوٹون سون۔ اور سیو پید روز  
وغیرہ کے ایسے دو سو فرانسسی جو بیان اقامت گزین ہوئے تھے سرکار مین  
ملازم تھے۔ اور شجاع الدولہ کی سلطنت سے روابط اتحاد رکھتے تھے جو سپاہیوں  
کو فوجی تعلیم دیتے۔ اور توپین بند دتین اور دیگر اسلحہ جنگ اپنے اہتمام میں تیار  
کراتے۔

نشی فیض بخش مصنف تاریخ فرخ بخش جن کی عنایت سے ہیں : واقعات  
معلوم ہوئے ہیں خود اس زمانے میں موجود تھے اور انھوں نے جو کچھ لکھا ہے  
اپنے شاہدے سے لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں جب چلے پہل گھر چھوڑ کے تھیں آباد  
میں گیا ہوں ممتاز گاہی تک پہنچا تھا جو شہر کے مغربی چھانک سے چار میل کے فاصلے  
پر ہے۔ میں نے دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے انواع و اقسام کی مٹھائیاں۔ گرا گرام  
لکھا۔ کباب۔ سالن۔ روٹیاں۔ اور پرانے وغیرہ پک رہے ہیں۔ سیلین  
رکھی ہوئی ہیں۔ ان مٹھائیوں مختلف قسم کے شربت اور خالودہ بھی پک رہا  
ہے۔ اور صد ہا آدمی خریداری کے لیے ان دکانوں پر گئے پڑتے ہیں۔ مجھے  
خیال گذرا کہ میں شہر کے اندر داخل ہو گیا اور خاص چوک میں ہوں۔ مگر تھیر تھا کہ  
ابھی تک شہر کا چھانک تو آیا ہی نہیں میں اندر کیسے پہنچ گیا؟ لوگوں سے  
پوچھا تو ایک راگیر نے کہا "جناب شہر کا چھانک یہاں سے چار میل ہے۔ آپ کس  
خیال میں ہیں؟"

اس جواب پر حیرت کرتا ہوا میں شہر میں داخل ہوا تو عجیب چل پہل نظر آئی۔  
زمینیاں ٹھنڈی اور دھنپیاں۔ ہر طرف دیکھا ہوں ناچ ہو رہا ہے۔ داری تاشا کر رہے  
ہیں۔ اور لوگ طرح طرح کے سیرکاتھون میں مصروف ہیں۔ میں : رونق اور شور  
دھنگامہ دیکھ کے مبہوت رہ گیا۔ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک کوئی وقت  
نہ ہوتا جب فوج اور پلٹھون کے نقاروں کی آواز نہ سُنی جاتی جو۔ ہارون اور

گھڑیوں کے بتاتے کے لیے بار بار نوبت بھی اور گھڑیا لاون پر سو گریاں پڑتیں جن کے شور و غل سے کان اڑے جاتے۔ شرکون پر دیکھیے تو ہر دم گھوڑوں، ہاتھیوں، اونٹوں، چغروں، شکاری کتوں، گائے بھینسوں، بیلوں، چھکروں، اور توپوں کے گزرنے کا سلسلہ جاری رہتا۔ جن کا شمار حساب اور اندازے سے باہر تھا۔ راستہ چلنا دشوار تھا۔

ایک عجیب و غریب و شکست کا شہر نظر آیا جس میں صنعتداران دہلی میں سے خوش پوشاک اور صنعتدار شریف زادے، حاذق الماسے یونانی، اعلیٰ درجے کے مردانے اور زنانے طائفے، ہر شہر اور ہر مقام کے مشہور اور باکمال گوشتے سرکار میں ملازم تھے۔ اور بڑی بڑی تنخواہیں پا کے عیش و فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے۔ ادنیٰ و اعلیٰ سب کی جیبیں روپوں، اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اور ایسا نظر آتا کہ جیسے یہاں کبھی کسی نے انلاںس و امتیاج کو خواب میں بھی نہیں دیکھا ہو۔ نواب وزیرد شجاع الدولہ بہادر شہر کی سرسبز درونق اور رعایا کی مرفہ الحالی میں ہمہ تن مصروف ہیں اور معلوم ہوتا تھا کہ چند ہی روز میں فیض آباد دہلی کی ہمہری کا دعویٰ کرے گا۔

چونکہ کسی ملک اور کسی شہر کا رئیس اس نفاست اور شان و شکوہ سے نہیں رہتا تھا جس طرح کہ نواب شجاع الدولہ رہتے تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ نظر آتا تھا کہ کہیں کے لوگ اس بے جگری سے ہر کام میں اور ہر موقع و محل پر دولت صرف کرنے کو نہیں تیار ہو جاتے تھے۔ اس لیے ہر قسم کے اور ہر جگہ کے اعلیٰ دستکاروں، صناعوں اور عاملوں نے وطنوں کو خیر باد کہنے کے فیض آباد ہی کو اپنا مسکن بنا لیا۔ اور یہاں ہر زمانے میں وہاں کے، بنگالے، گجرات، مائوہ، حیدر آباد، شاہجہان آباد، لاہور، پٹنہ اور کابل، کشمیر اور ملتان وغیرہ کے طالب علموں کا ایک بڑا بھاری گروہ موجود رہتا جو علم کی درس گاہوں میں تعلیم پاتے۔ اور اس چشمہ علم سے جو فیض آباد میں جاری تھا سیراب ہو ہو کے اپنے گھروں کو واپس جاتے۔ کاش نواب وزیر اور دس بارہ برس بھی جاتے تو گھاگرا کٹا رے ایک نیا شاہجہان آباد آباد ہو جاتا۔ اور دنیا ایک نئی زندہ دہلی کی صورت دیکھ لیتی۔



یہ نواب شجاع الدولہ کے صرف نو سال کے قیام کا نتیجہ تھا جس سے فیض آباد کو ایسا بنا دیا۔ اور ان نو سال میں بھی صرف برسات کے چار مہینے وہ شہر میں اپنی فروز رہتے۔ باقی زمانہ اپنی فکر و کے دورے اور سیر و شکار میں صرف ہوتا تھا شجاع الدولہ کا طبیعی سیلان مدجین عورتوں اور قص و سرود کی طرف تھا جس کی وجہ سے بازاری عورتوں اور تاپچے والے ملائقوں کی شہر میں اس قدر کثرت ہو گئی تھی کہ کوئی گلی کوچہ اُن سے خالی نہ تھا۔ اور نواب کے اٹھام و اکرام سے وہ اس قدر خوشحال اور دولت مند تھیں کہ اکثر زندیاں ڈیرہ دار تھیں جن کے ساتھ دو دو تین تین مالیشان خیمے لہا کرتے۔ اور نواب صاحب جب اضلاع کا دورہ کرتے اور سفر میں ہوتے تو زوای خیموں کے ساتھ ساتھ اُنکے خیمے بھی شاہانہ شکوہ سے چھلکڑوں پر لہلہ کے روا ہوتے اور اُنکے گرد دس دس بارہ بارہ تنگنوں کا پرہ رہتا۔ اور جب حکمران کی یہ وضع تھی تو تمام امرا اور سرداروں نے بھی بے تکلف ہی وضع اختیار کر لی۔ اور سفر میں سب کے ساتھ زندیاں رہنے لگیں۔ اگرچہ اس سے بد اخلاقی اور بے شرمی کو ترقی ہو گئی لیکن اس میں شک نہیں کہ ان شاہانہ بازاری کی کثرت اور امرا کی شوقیت سے شہر کی رونق پر جہاں زیادہ بڑھ گئی تھی اور فیض آباد و ملن بنگیا تھا۔

سنة ۱۱۷۴ میں شجاع الدولہ نے مغرب کا سفر کیا۔ اس سفر میں شاہی کمپ کی رونق اور پہل پہل بیان سے باہر تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ فوای علم اقبال کے ساتھ ساتھ ایک بڑا بھاری شہر سفر کر رہا ہے۔ لکھنؤ ہوتے ہوئے اٹاوے چوتھے جس پر مرے قاض تھے۔ ایک ہی محلے میں اُسے اُن سے چھین کے اپنے قبضے میں کیا۔ اور آٹھ خانہ نگلش کی قلمرو میں داخل ہو کے کوڑیا گنج اور کاس گنج میں خیمہ زن ہوئے۔ یہاں سے اُنھوں نے حافظ رحمت خان فران رو اسے بریلی کو لکھا "گذشتہ سال میں نے ایک کروڑ روپے مہاجی سفید صیامرے کو بھیجے تھے جس نے آپ کا وہ تمام علاقہ جو درمیان دو آب ہے آپ سے چھین لیا تھا۔ وہ رقم ادا کر کے میں نے آپ کا وہ علاقہ اُنکے قبضے سے چھڑایا اور آپ کے حوالے کر دیا۔ لہذا اب پچاس لاکھ کی رقم جو آپ کی طرف سے میں نے ادا کی تھی فوراً ادا کیجیے۔" حافظ رحمت خان نے اپنے تمام افغان سرداروں اور بھائی بندوں کو جمع کر کے کہا "شجاع الدولہ لڑائی کے لیے

چاہتے تھے تو یہ سب یہ ہے کہ یہ مطلوبہ رقم ادا کر دی جائے۔ میں  
لاکھ میں اپنے پاس سے دیتا ہوں اور باقی تیس لاکھ تم جمع کر دو۔" نا عاقبت اندیش  
پٹھان سرداروں نے جواب دیا: "شجاع الدولہ کے آدمی دیکھنے ہی کے ہیں وہ بلا  
ہم سے کیا مقابلہ کریں گے؟ باقی رہی انگریزی فوج جو ان کے ساتھ ہے تو انکی  
توپوں پر جس وقت ہم تلواریں موت موت کے جا پڑیں گے سب کے جو اس جاتے  
رہیں گے۔ دینے لینے کی کچھ ضرورت نہیں۔" حافظ رحمت خان نے یہ سن کے کہا  
"نہیں اختیار ہے۔ مگر میں ابھی سے کہے رکھتا ہوں کہ اگر لڑائی کا رنگ بدلا تو  
میں میدان سے زندہ نہ آؤں گا۔ اور اس کا جو کچھ انجام ہوگا وہ تمہیں کوٹھکنا  
پڑے گا۔"

ہر تقدیر شجاع الدولہ کو اپنی خواہش کے موافق جواب نہ ملا۔ فوج نے کے  
چڑھ گئے۔ لڑائی ہوئی۔ اور لڑائی کا انجام وہی ہوا جسے تقدیر نے حافظ رحمت  
خان کی زبان سے پہلے ہی سنوایا تھا۔ حافظ رحمت خان شہید ہوئے اور  
ان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر یہ فتح شجاع الدولہ کو بھی سزاوار نہ ہوئی۔  
۱۳۔ ستمبر ۱۸۵۷ء (۱۲۷۷ھ) کو لڑائی ہوئی تھی۔ ۱۱ شبان کو شجاع الدولہ بریلی  
سے کوچ کر کے لکھنؤ آئے۔ ماہ مبارک رمضان لکھنؤ میں بسر کیا۔ ۸۔ سوال کو لکھنؤ  
سے کوچ کر کے ۱۴۔ کو فیض آباد میں داخل ہوئے۔ اور فتح کو ۹۔ عینے دس ہی  
دن ہوئے تھے۔ اور گھر میں پورے ڈیڑھ عینے بھی آرام کرنے کا موقع نہیں ملا  
تھا کہ ۲۳۔ ذیقعدہ ۱۲۷۷ھ (۱۸۵۷ء) کو رگڑے عالم جاودان ہوئے۔ اور  
افسوس اُن کی وفات ہی کے ساتھ فیض آباد کی ترقی کا دور بھی ختم ہو گیا۔

اس وقت حکومت اودھ میں سب سے بڑا اثر نواب شجاع الدولہ بہادر کی  
بی بی جو بکیم صاحبہ کا تھا۔ جو نہایت ہی دولتمند بھی سمجھی جاتی تھیں۔ انکی منظوری  
سے نواب آصف الدولہ مسند نشین حکومت ہوئے۔ مگر اُن کی اخلاقی حالت  
نہایت خراب تھی۔ اور مصائبوں کو مناسب معلوم ہوا کہ مان بیٹوں کو الگ رکھیں۔  
چند روز تک سیر و شکار میں مصروف رہنے کے بعد نواب آصف الدولہ بہادر نے  
لکھنؤ میں قیام اختیار کر لیا جو عین بیٹھے بیٹھے مان کو ستایا کرتے۔ اور بار بار اُن سے

روپیہ طلب کرتے۔

ہو بیگم صاحبہ کے موجد رہنے سے فیض آباد کو اُن کی زندگی تک تھوڑی بہت رونق حاصل رہی۔ اگرچہ اُن کی زندگی میں بھی خواب آصف الدولہ کی اٹالیاہین نے ہو بیگم صاحبہ کے اطمینان میں اور اسکی وجہ سے فیض آباد کے امن و امان میں خلل ڈالا۔ مگر اُس محترم خاتون کی زندگی تک وہ جھگڑے اور جھگڑے بھی ایک گونہ باعث رونق ہو جایا کرتے تھے۔ اُن کی وفات پر فیض آباد کی تاریخ ختم ہو گئی۔ اور لکھنؤ کا دور شروع ہوا جس کا حال ہم آئندہ لکھیں گے۔

(۳)

ٹھیک کسی کو نہیں معلوم کہ لکھنؤ کی آبادی کی بنیاد کب پڑی؟ اس کا پانی کون تھا؟ اور وجہ تسمیہ کیا ہے؟ لیکن مختلف قائمہ افواج کی قومی روایتوں اور قیاسات سے کام لے کے جو کچھ بتایا جاسکتا ہے یہ ہے۔

کتے مین راجہ راجندر جی لشکا کو فتح کر کے اور اپنے بن باس کا زمانہ پورا کر کے جب سرسری جہان پناہی پر جلوہ افروز ہوئے تو یہ سرزمین اُنھوں نے جاگیر کے طور پر اپنے ہمسفر و ہمدرہ بھائی بھین جی کو عطا کر دی۔ چنانچہ اُنھیں کے قیام یا اردو سے یہاں دریا کنارے ایک اونچے ٹیکرے پر ایک سببی آباد ہو گئی جس کا نام اُسوقت سے ”بھین پور“ قرار پایا۔ اور ”ٹیکر“ بھین ٹیلا مشہور ہوا۔ اُس ٹیلے میں ایک بہت بڑا گہرا غار یا کنواں تھا جس کی کسی کو تھاہ نہ ملتی تھی۔ اور لوگوں میں مشہور تھا کہ وہ سیس آگ تک چلا گیا ہے۔ اس خیال نے جذبات عقیدت کو حرکت دی۔ اور ہندو لوگ خوش اعتمادی سے جا چکے اُس میں بھول پائی ڈالنے لگے۔

یہ بھی کہنا جاتا ہے کہ ہمارا راجہ جو دھستہ کے پوتے راجہ تھم جے نے یہ علاقہ مراٹھ بزرگوں۔ رشیوں اور مہنوں کو جاگیر میں دیدیا تھا۔ جنھوں نے چنانچہ پتے پر اپنے آشرم بنائے اور ہر کے دھیان میں مصروف ہو گئے۔ ایک مدت کے بعد انکو کمزور دیکھ کے دونی تو مین ہمالیہ کی ترائی سے آئے، اس ٹیکر پر قابض ہو گئے جو باہم ملی ہوئی عہ بند و دیو ملا مین سیس ناگ اُس ہزار سرداروں کے ساتھ کا نام ہے جو دھرتی زمین کو اپنے چمن پر اُٹھائے ہوئے ہے۔ اور قدرت و عظمت اسی کا ایک درجہ ان محترم مغرب۔

اور ایک ہی نسل کی دو شاخیں معلوم ہوتی تھیں۔ ایک "بھڑ" اور دوسری "پانسی"۔ انھیں لوگوں سے سید سالار مسعود غازی سے ۵۹۰ھ (۱۱۹۳ء) میں مقابلہ ہوا۔ اور غالباً انھیں پرتھوی راج نے ۶۳۱ھ (۱۲۲۸ء) میں چڑھائی کی تھی۔ لہذا اس سرزمین پر جو مسلمان خاندان پہلے پہل آئے آباد ہوئے وہ انھیں دونوں حملہ آوروں خصوصاً سید سالار مسعود غازی کے ساتھ آئے والوں میں سے تھے۔

بھڑ اور پانسیوں کے علاوہ برہمن اور کاسیہ بھی یہاں پہلے سے موجود تھے۔ ان سب لوگوں نے مل کے یہاں ایک چھوٹا سا شہر بسالیا اور امن و امان سے رہنے لگے۔ لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس بستی کا نام "لکھنؤ پور" سے بدل کے "لکھنؤ" کب ہو گیا۔ اس آخری مروجہ نام کا پتہ شہنشاہ اکبر سے پہلے نہیں چلتا۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندو مسلمانوں کی کافی آبادی پہلے سے موجود تھی جس کا ثبوت اس واقعے سے ہو سکتا ہے جو شیوخ لکھنؤ کی خاندانی روایتوں میں بہت پہلے سے موجود ہے کہ ۹۶۶ھ (۱۵۵۹ء) میں جب ہمایوں بادشاہ کو شیر شاہ کے مقابل چوہدری میں شکست ہوئی تو وہ میدان چھوڑ کے سلطان پور لکھنؤ پہنچ گئے۔ ہوتا ہوا بھاگا تھا۔ لکھنؤ میں اُس نے صرف چار گھنٹے دم لیا تھا۔ اور گو کہ شکست کھانے کے آیا تھا اور کوئی قوت و حکومت نہ لکھتا تھا مگر لکھنؤ کے لوگوں نے محض انسانی ہمدردی اور ہمان دہی کے خیال سے اُن چند لکھنؤیوں ہی میں دس ہزار روپیہ اور پچاس گھوڑے اُس کی نذر کیے تھے۔ اتنے تھوڑے زمانے میں اس سامان کے فراہم ہو جانے سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اُن دنوں یہاں متحدہ آبادی موجود تھی۔ اور اُن دنوں کا لکھنؤ آج کل کے اکثر قصبات سے زیادہ بارونق اور خوشحال تھا۔

اُسی قدیم زمانے کے آنے والوں میں شاہینا کا خاندان بھی ہے جن کا مزار پراگڑا آج تک فریض اتام ہے۔ اور غالباً اُسی عہد کے آنے والوں میں شاہ پیر محمد بھی تھے جنھوں نے خاص لکھنؤ ٹیلے پر سکونت اختیار کی۔ اور وہیں چوہدری زمین جوئے اُن کے قیام کی وجہ سے وہ پُرانا ٹیکرا لکھنؤ ٹیلے سے "شاہ پیر محمد کا ٹیلا" ہو گیا۔ اور مرور

ایام سے وہ گہرا غار بھی پٹ گیا۔ اُس پر بعد کے زمانے میں شہنشاہ آورنگ زیب نے جو پانچ نفیس یہاں آیا تھا ایک عمدہ - مضبوط - خوبصورت - اور شاندار مسجد بنا کے کھڑی کر دی جو آج تک عالمگیر کی طرف سے مدللے "امداد گاہ" کہلا رہی ہے۔

۱۹ ستمبر ۱۶۵۷ء میں شہنشاہ اکبر نے جب سارس ہندوستان کو بارہ صوبوں میں تقسیم کیا تو صوبہ آودھ کے صوبہ دار یا والی کا مستقر باوی النظر میں لکھنؤ ہی قرار پایا تھا۔ اُن دنوں اتفاق سے شیخ عبدالرحیم نام ضلع جھڑ کے ایک فستہ حال دہریشان روزگار بزرگ یہ تلاش معاش دہلی پہنچے۔ وہاں امر لے رہا۔ مین رسوخ پیدا کر کے بارگاہ شہنشاہی میں باریاب ہوئے۔ آخر منصب اداں شاہی میں شامل ہوئے لکھنؤ میں جاگیر پائی۔ اور چند روز بعد پٹے ترک و اقسام اور کمر دفرے اپنی جاگیر میں آئے مقیم ہوئے۔ یہاں فاضل ٹھیلے یا شاہ پیر کچھ کے ٹھیلے پر مقیم ہوئے اُنھوں نے اپنا بیج نکلا بنوایا۔ شیخ دروازہ تعمیر کرایا۔ اور لکھنؤ ہی میں بیہ مذہب میں ہوئے۔ اُن کا مقبرہ "دادن غل" کے نام سے آج تک مشہور ہے جس کی عمارت کو ابھی چند روز ہوئے گورنمنٹ آف انڈیا نے پس کر کے اپنی زیر نیت لے لیا ہے۔

اسی زمانے میں یہاں شیخ عبدالرحیم نے ٹھیلے کے پاس ایک دوسری جگہ پر ایک چھوٹا قلعہ تعمیر کرایا جو قرب و جوار کی گڑھیوں سے زیادہ مضبوط تھا۔ اور گڑھ و دوزخ کے لوگوں پر اُس کا بڑا اثر پڑتا تھا۔ یا تو اس لیے کہ شیخ عبدالرحیم کو دربار شاہی سے علم ماہی مراتب عطا ہوا تھا۔ یا اس لیے کہ اس قلعے کے ایک مکان میں پچیس بھرا میں تھیں اور ہر طرح اس پر ہمارے دو دو بھیلیاں بنا کے باؤن بھیلیاں بنا دی تھیں۔ اس قلعے کا نام "بھٹی بھون" مشہور ہو گیا۔ "بھون" کا لفظ یا تو قلعہ کے معنوں میں ہے۔ یا "باؤن" سے کر کے بن گیا ہے۔ جس ہمارے اس قلعہ کو تعمیر کیا وہ "لکھنا" نام ایک امیر تھا۔ اور لکھنؤ بن گیا ہے۔ ان میں سے جو بات ہو کر اس آبادی نے یہ نام شیخ عبدالرحیم کے آنے کے بعد پایا۔

چند روز بعد شیخ عبدالرحیم کے خاندان والوں یعنی شیخ اودن کے علاوہ یہاں

پٹھانوں کا ایک گروہ آگیا۔ جو جنوب کی طرف بے اور ڈامنگر کے پٹھان مشہور ہوئے۔  
 اُنھوں نے اپنی زمینداری کی حد اُس مقام تک قرار دی تھی جہاں اب گول دروازہ واقع ہے۔ کیونکہ وہاں سے دریا کی طرف بڑھے تو شیخ زادوں کی زمین شروع ہوئی تھی۔ ان پٹھانوں کے بعد شیوخ کا ایک نیا گروہ آ کے مشرق کی طرف بس گیا جو "شیوخ نہرہ" کہلاتے ہیں۔ اُن لوگوں کی زمین وہاں پر تھی جہاں اب رزینہ کی کے کھنڈر پڑے ہیں۔

یہ تینوں گروہ اپنے ملاؤں پر متصرف اور اپنے معلقوں کے حاکم تھے لیکن شیخ زادوں کا اثر سب پر غالب تھا اور قرب و چار پر اُن کا دباؤ پڑتا تھا جس کا قوی سبب یہ تھا کہ یہ لوگ دربار دہلی میں رسوخ رکھتے تھے۔ ان میں سے کئی شخص پورے ملک اودھ کے صوبہ دار مقرر ہو گئے تھے۔ اور اُن کے قلمہ بھی بھون کی مضبوطی کی اس قدر شہرت تھی کہ عوام کی زبان پر تھا جس کا بھی بھون اُس کا لکھنؤ۔  
 آکبر ہی کے زمانے میں لکھنؤ ترقی کرنے لگا تھا۔ اور اُسکی آبادی بڑھتی اور بڑھتی جاتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ صوبہ دار اودھ اُنھیں شیخ زادوں میں سے منتخب ہوئے لیکن عام معمول یہ تھا کہ اس خدمت پر معززین دہلی مقرر ہوتے۔ جو سالوں سال اپنے گھر بیٹھے رہتے۔ فقط تحصیل و وصول کے زمانے میں ایک دورہ سا کرتے اور اُن کے نائب یہاں رہا کرتے۔ لہذا اُن سے شہر کی ترقی کی کوئی امید نہ کی جاسکتی تھی۔  
 ہاں یہاں کے دو ایک شیخ زادے جو صوبہ دار مقرر ہو گئے تو اُن کے تقرر سے بہت لکھنؤ کو فائدہ پہونچا۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آکبر کو لکھنؤ کی طرف خاص توجہ تھی۔ چنانچہ اُس نے یہاں کے برہمنوں کو باجی چڑھا دے کے لیے ایک لاکھ روپے مرحمت فرمائے تھے۔ اور اُسی وقت سے لکھنؤ کے باجی برہمن مشہور ہوئے۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ لکھنؤ کے قدیم ترین ہندو محلے جو آکبر کے وقت میں موجود تھے۔ باجی ٹولہ۔ کٹاری ٹولہ۔ سوڈھی ٹولہ۔ پنجاری ٹولہ اور اچیری ٹولہ ہیں۔ اور یہ سب چوک ہی کے اطراف میں ہیں۔

مرزا سلیم نے جو تخت پر بیٹھ کے نور الدین جہانگیر کے لقب سے مشہور ہوئے باپ

کی زندگی اور اپنے ایام و عہد میں مرزا سندھی کی بنیاد ڈالی جو بھی بھون سے مغرب طرف واقع ہے۔ اکبر کے آخر عہد میں یہاں کے صوبہ دار جو اہر خان تھے۔ ۹۱۔  
تو دہلی میں رہتے مگر اُن کے نائب قاضی محمود بلگرامی نے چوک کے جنوب میں اُس  
سے ہوئے داہنی طرف محمود نگر اور بائیں طرف شاہ گنج آباد کیے۔ اور اُن کے اور  
چوک کے درمیان میں بادشاہ کے نام سے اکبری دروازہ تعمیر کرایا۔

عہد اکبری میں جبکہ یہ عمارتیں بن رہی تھیں اور یہ مکمل آباد ہو رہے تھے لکھنؤ  
ایک اچھی تجارت گاہ بن گیا تھا۔ اور ترقی کے اس درجے کو پہنچا ہوا تھا کہ ایک  
فرانسیسی تاجروں نے جو گھوڑوں کی تجارت کرتا تھا یہاں قیام کر کے نفع حاصل کرنے  
کی کوشش کی۔ اور دوبارہ شہنشاہی سے لکھنؤ کے قیام کے لیے سندھستانی حاصل  
کرنے کے بیان اپنا مصلحت نامہ کیا۔ درجہ ہی۔ ال میں اس قدر پہلچ ہوا کہ چوک کے  
مستقل چارہ ایشیائے اقصیٰ کے لیے۔ سال ختم ہوئی پر جب اُس نے پورہ نہایت  
کی تجدید چاہی تو اُسے زیادہ قیام کی اجازت نہ ملی۔ اور اسپر بھی اُس نے نہیں  
ٹھہرنے کا ارادہ کیا تو حسب حکم شہنشاہی حکام شہ نے اُس کے مکانات ضبط کر کے  
نزدول سرکار کر لیے اور اُسے یہاں سے نکال دیا۔ وہ چاروں مکان دت تک  
سرکار کے قبضے میں رہے یہاں تک کہ شہنشاہ آؤدگ زیب عالمگیر کے عہد میں  
حبیب اللہ نظام الدین سہاوی نے اپنے قبضے کے فسادوں سے عاجز آئے لکھنؤ میں  
سکونت اختیار کرنے کا قصد کیا تو عطیہ سرکار کے طور پر وہ چاروں مکان اُنھیں دیے  
گئے۔ اور اُنھوں نے اپنے پورے خاندان کے ساتھ آئے اُن مکانوں میں سکونت  
افتداری کی جو اپنے گرد و پیش کے بہت سے مکانات کے ساتھ آج تک "فرنگی محل"  
کہلاتے ہیں۔ ان صاحب کے قدم کی برکت سے لکھنؤ علم و فضل کا مرکز اور طلبہ علوم  
کا مریض و مددگار بن گیا۔ اور اس علمی برجستہ کو اس قدر ترقی ہوئی کہ لکھنؤ راہ الدین  
عہد ستاسن کے معنی غالب اس میں یورپ و ان کوچ نگر مسلمانوں، و رہنماؤں میں اپنے لیے  
خطرہ فیر آیا کرتا تھا اس لیے جہاں قیام کرنا چاہتے وہاں کے لیے دربار ولی سے مستاسنی  
حاصل کر لیا کرتے تاکہ مال و حکام اور نیز و نمایاں اُنھیں نہ سنائے۔ اس سلسلے سے چکر سلطنت پر  
ذمہ داریاں عائد ہو جاتی تھیں اس لیے ایک سال سے زیادہ کی سند کم دی جاتی تھی۔

کا مرتب کیا ہوا انصاف تعلیم جو سلسلہ نظامیہ کہلاتا ہے مدت دراز سے ہندوستان ہی کا نہیں سارے ایشیا کا انصاف تعلیم ہے اور علمی کمالات کے ساتھ اس میں ولایت نہ برکتیں بھی مقرر تصور کی جاتی ہیں۔ اور اس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس قدیم زمانے میں کہاں کہاں اور کتنی کتنی دُور کے طلبہ علوم لکھنؤ میں جمع رہتے ہوں گے۔

یوہن سیاح لیکٹ جو سنہ ۱۶۳۷ء (۱۰۴۵ھ) یعنی شاہجہان بادشاہ کی سلطنت کے اوائل میں ہندوستان کی سیر کر رہا تھا۔ لکھنؤ کی نسبت لکھتا ہے کہ ”عظیم الشان منڈی ہے۔“ عہد شاہجہانی میں یہاں کے صوبہ دار سلطان علی شاہ قلی خان تھے۔ اُنکے دو بیٹے تھے۔ مرزا قاضی اور مرزا منصور۔ اُنھیں دونوں کے نام سے اُنھوں نے محمود نگر سے جنوب کی طرف آگے بڑھ کے دوئے محلے قاضی نگر اور منصور نگر آباد کیے۔

اس زمانے میں یہاں اشرف علی خان نام ایک رسالہ لکھتے اُنھوں نے اسی سلسلے میں اشرف آباد بنایا۔ اور اُن کے بھائی مشرف علی خان نے نام کے دوسری طرف اپنا گھر بنائے مشرف آباد نام ایک اور محلہ قائم کیا جس کا نام مردور ایام سے اب تو بستر ہو گیا ہے۔ اُنھیں دونوں پیر خان نام ایک اور فوجی فہر تھے جنھوں نے ان سب محلوں سے مغرب کی طرف دُور جا کے اپنی گڑھی بنائی جو مقام آج تک پیر خان کی گڑھی کہلاتا ہے۔

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے کسی ضرورت سے وجود ہیا کا سفر کیا تھا۔ وہی کے وقت لکھنؤ میں ٹھہرتا ہوا دہلی گیا۔ اس موقع پر اُس نے شاہ پیر محمد کے ٹیلے والی مسجد تعمیر کرائی۔ جو خاص چھین ٹیلے پر ہونے کی وجہ سے اسی بلند پر واقع ہے جس سے زیادہ مناسب جگہ مسجد کے لیے لکھنؤ میں نہیں ہو سکتی۔ اور غالباً اسی موقع پر اُس نے فرنگی محل کے مکانات علامہ زمان نظام الدین کی تخریک کیے ہوئے۔ محمد شاہ رنجیلے کے زمانے میں لکھنؤ کا صوبہ دار گر دھانا لگا نام ایک بہادر ہندو رسالہ لکھتا تھا۔ اُس کا چچا چھیلے رام دربار دہلی کی طرف سے آکر آباد کی حکومت پر مامور تھا۔ چھیلے رام کے مرنے پر گر دھانا لگا نے سرکشی اختیار کی اور ارادہ کیا کہ



چچا کی جگہ زبردستی آباؤ کا حاکم ہو جائے۔ مگر پھر خود ہی کچھ سوچ کے اُس نے انہماک رکھا  
و فرمان برداری کیا۔ اور دریا سے اُسے اودھ کی صوبہ داری کا خلعت عطا کیا گیا۔  
اُس نے یہاں کی سکونت اختیار کی۔ اور اُس کی بی بی نے جو راتی کھاتی تھی راتی کھاتا  
آیا دیا۔

مگر یہاں کا حاکم اور صوبہ دار چاہے کوئی پو شیخزادوں کا اس قدر زور تھا کہ کسی  
والی کو چاہے کیسا ہی زبردست ہو اور کیسی ہی سبکداری لے کے آیا ہو یہ جرات  
نہ ہو سکتی تھی کہ اُس کے حلقے میں قدم رکھے۔ بھیجے بھون کو اگرچہ نصراوت کی حیثیت  
حاصل تھی لیکن شیخزادوں نے اُسے اپنی موروثی جائیداد بنا لیا تھا۔ اور دہلی سے جو  
والی آتا اُس کے پاس بچھلنے نہ پاتا۔ اُنھوں نے بھی بھون کے پاس دروازہ تین  
تعمیر کر لی تھیں جن میں سے ایک کا نام "مبارک کلا" تھا اور دوسری کا نام "پنچ عمارت"  
پنچ محلے کی نسبت کوئی کہتا ہے کہ پنچ منزلی عمارت تھی اور کوئی کہتا ہے کہ ایک دوسرے  
کے پاس پنچ محلے بنے ہوئے تھے۔ اور اُن کے جنوب طرف ایک بڑا محراب دار چھانک  
تھا جو "شیخن دروازہ" کہلاتا۔ شہر سے جو لوگ شیخزادوں کی مذکورہ عمارتوں میں جانا  
چاہتے اسی چھانک میں سے ہو کے گذرتے۔

اس چھانک کی محراب میں بائیں شیخزادوں نے ایک نکلی تلوار لٹکا رکھی تھی اور  
حکم تھا کہ جو کوئی یہاں آنا چاہے کوئی ہو اور کتنا ہی بڑا شخص ہو پہلے اس تلوار کو  
ٹھیک کے سلام کرے پھر آگے قدم بڑھائے۔ کس کی مجال تھی کہ اس حکم کی تعمیل میں  
غور کرے؟ یہاں تک کہ دہلی سے جو والی اور حاکم مقرر ہو کے آتے تھے اور جنھوں  
سے ملنے جاتے تو انھیں بھی جبراً و قہراً اُس تلوار کے آگے سرور سر جھکا دینا پڑتا۔

لکھنؤ کی یہ حالت تھی کہ سالانہ مہری (سالانہ ۶۰) میں نواب ستادت حسان  
مرہاں الملک دربار دہلی سے اودھ کے صوبہ دار مقرر ہو کے آتے۔ جن سے ہندوستان  
کے اُس آخری مشرقی دربار کی بنیاد پڑی جس کے عروج کو ہم مشرقی تمدن کا آخری  
نمونہ قرار دے کے بیان کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے نمبر میں ہم نے فیض آباد کی حالت  
دکھائی جو اسی تمدن کا نقش اولین اور اسی مشرقی دربار لکھنؤ کا ایک منہمک تھا۔ اس  
نمبر میں اس دربار کے قائم ہونے سے پیشتر کے لکھنؤ کی تصویر دکھا دی۔ اور اُس

بساط کو اپنے ناظرین کے پیش نظر کر دیا جس پر اس دربار نے اپنی شطرنج بچھائی۔ آئندہ چند نہروں میں ہم اس نیشاپوری خاندان کی تاریخ حکومت بیان کریں گے۔ اور اس کے بعد دکھائیں گے کہ یہ تمدن کیا اور کیا تھا۔

(۳)

نواب سعادت خان برہان الملک کے خاندان کے متعلق اسی قدر بتا دینا کافی ہے کہ میر محمد نصیر نام نیشاپور کے ایک سید زادے جن کا سلسلہ نسب امام موسیٰ کاظم سے ملتا ہے۔ (مسئلہ ۴) عہد بہادر شاہ مین داد ہندوستان ہوئے۔ ان کے بیٹے بیٹے میر محمد باقر ساتھ آئے تھے جنھوں نے یہاں شادی کر لی۔ اور باپ بیٹوں نے ناظم جنگل کے زیرِ حمایت عظیم آباد پٹنہ میں سکونت اختیار کی۔ محمد باقر کو ہندوستان کی بی بی سے خدا نے ایک بیٹا دیا جو بعد کو شیر جنگ کے معزز لقب سے مشہور ہوا۔ میر محمد نصیر کے آنے کے دو سال بعد ان کے چھوٹے بیٹے میر محمد امین بھی نیشاپور سے ہندوستان میں آ گئے۔ عظیم آباد پہنچے تو سنا کہ والد نے سفر آخرت کیا۔ اور اب دونوں بھائی میر محمد باقر اور میر محمد امین دہلی کو روانہ ہوئے۔ جہاں پہنچنے کے بعد میر محمد امین کو شاہزادوں کی جاگیر کا ٹھیکہ مل گیا۔ اس میں انھوں نے اسی لیاقت۔ مستعدی۔ اور کارگزاری دکھائی کہ تمام لوگوں میں شہرت ہو گئی۔ اقبال پسراری تھا۔ چند ہی روز بعد دربار شاہی کے معزز امیروں اور منصبداروں میں شامل ہو گیا۔ پھر صوبہ دار اکبر آباد کی بیٹی سے نکاح ہو گیا۔ اور اُس اعلیٰ طبقہ امرامین شمار کیے جانے لگے جس پر سلطنت کی ذمہ داری کی خدمتوں کے لیے انتخاب کی نظر پڑتی تھیں۔ ان دنوں دہلی میں ساداتِ بارہہ کا زور تھا جن سے رعیت و رعیت خود بادشاہ سلامت ڈرتے تھے۔ محمد امین نے انکو قتل کر کے سیدوں کا زور ہمیشہ کے لیے توڑ دیا۔ اور لڑائی میں ایسی شجاعت دکھائی کہ دربار شاہی سے منصبِ ہفت ہزاری اور سات ہزار سواروں کی سرداری کے ساتھ ”برہان الملک بہادر جنگ“ کا خطاب عطا ہوا۔ اور اُسی وقت اکبر آباد کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ اس کے بعد بادشاہی خواہوں کی داروغگی عطا ہوئی جو بڑا معزز عہدہ تھا۔ اس کے چھوٹے دونوں بعد وہ صوبہ آوڈھ کے صوبہ دار اور اس کے ساتھ ہی بادشاہی توپ خانے کے

داروغہ مقرر ہوئے۔ آدمی ہوشیار اور نجات ہی میدان مقرر اور اس کے ساتھ بڑے بہادر اور شجاع تھے۔ شاہی توپخانے کو اپنے ہاتھ میں لے کے انھوں نے ایسی زبردست قوت پیدا کر لی جیسی ان دنوں سارے ہندوستان میں کسی کو نصیب نہ تھی۔ اس زمانے میں کوڑہ کے زمیندار بھگونت سنگھ نے سلطنت سے سربانی کر کے بڑا زور باندھ رکھا تھا۔ اور کئی افسر جو اس کی سرکوبی کو گئے اُس کے ہاتھ سے مارے جاسکے تھے۔ آخر بُرائان الملک اس ہم پر مامور ہوئے اور لیٹا دگرتے ہوئے پونچے۔ بھگونت سنگھ نے چالاکئی سے اُن کو گھیر لیا اور لڑائی کا رنگ ایسا بگڑا نظر آیا کہ بڑے بڑے بہادروں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مگر بُرائان الملک نے ایسی جو اندری سے مقابلہ کیا کہ دیر تک دشمنین کے زرخے میں اُن کی لمبی سفید زورانی ڈاڑھی جھکتی اور مڑب ڈالنی رہی۔ ٹھوڑی دیر میں بھگونت سنگھ اُن کے تیر کا نشانہ ہوا۔ اور دشمن بھاگ کھڑا ہوا۔

بُرائان الملک کی دوسری ہم اس سے بھی زبردست تھی۔ اُن دنوں مرہٹوں کا ہندوستان میں بڑا زور تھا۔ انھوں نے تاجدار دہلی سے جو نقد مقرر کرالی تھی۔ اور بڑے بڑے سوار اُن کے نام سے کانپتے تھے۔ بُرائان الملک نے مرہٹوں کو زبردست فوج کے ساتھ جاکے ایسی سخت شکست دی کہ اُن کے حواس جاتے رہے۔ نوک و دم بھاگے۔ اور بُرائان الملک نے تعاقب شروع کیا۔ دقات تا۔ پیچ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس موقع پر بُرائان الملک زبردستی روک دیے جاتے تو وہ بڑے بڑے مرہٹوں کا استبدال کر دیتے۔ اور سلطنت مغلیہ اپنے اگلے عہد شباب کی طرح سارے ہندوستان کے سیاہ و سفید کی مالک ہو جاتی۔ مگر اُس پر نصیب زوال پذیر سلطنت کو ملنا ہی تھا۔ دربار یوں کی سازش اور مقررین دربار کے حسد نے بُرائان الملک کی راتار کوڑا دیا۔

اس بات نے بُرائان الملک کو یقین دلایا کہ بادشاہ میں اپنے نیک و بد کے سوچنے کی صلاحیت نہیں اور اہل دربار بدایانت و خرد غرض ہیں۔ فوراً مرہٹوں سے صلح کر لی۔ پھر ارادہ کیا کہ اپنے نبوت میں جا کے قیام آئین اور رب سے الگ ہو کے اپنے علاقے کو مضبوط اور منظم بنادیں۔ غرض بُرائان الملک نے دل میں

سمجھ لیا کہ اب سلطنت ثلثیہ پہنچنے والی نہیں ہے۔ اپنا صوبہ لے کے الگ ہو جانا ہی مناسب ہے۔ اور دربار دہلی کو اس کی سمت پر چھوڑ دینا چاہیے۔

لکھنؤ میں جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں شیخزادوں کا زور تھا۔ انھوں نے اپنی عادت کے موافق انھیں بھی روکا۔ مگر برہان الملک حکمت عملی سے داخل ہو گئے اور تکسیر بھی نہ بھوٹے پائی۔ برہان الملک کے لکھنؤ میں داخل ہونے کے متعلق دو روایتیں مشہور ہیں۔ ایک یہ کہ وہ برابر بڑھتے چلے آئے۔ یہاں تک کہ اکبری دروازے پر روکے گئے۔ چونکہ وہ سابق کے تمام صوبہ داروں کے خلاف بظریہ کار۔ متین اور سنجیدہ شخص تھے۔ ٹھہر گئے۔ اور محمود نگر میں پڑاؤ ڈال دیا۔ دو ایک دن کے بعد شیخزادوں کی دعوت کی۔ ان سے بڑی خاطر تواضع سے پیش آئے۔ لیکن جس وقت غافل شیخزادے الوان نعمت کا مزہ لوٹنے میں مصروف تھے شاہی فوج خاموشی کے ساتھ چوک میں داخل ہو رہی تھی۔ جو برابر بڑھتی ہی چلی گئی۔ یہاں تک کہ چھٹی بھون کے پاس جا پہنچی۔

دوسری روایت یہ ہے کہ محمد خان بلش نے برہان الملک کو بتا دیا تھا کہ لکھنؤ کے شیخزادے بڑے شورہ ٹپست ہیں ان سے پیش پا نا آسان نہیں۔ مگر قرب و جوار کے دوسرے شیوخ ان کے خلاف ہیں۔ آپ ان لوگوں سے مدد لیجیے۔ اور انھیں کی مدد سے لکھنؤ والوں کو زیر کیجیے۔ چنانچہ برہان الملک نے کاکوری میں قیام کو کے شیوخ کاکوری کو اپنے موافق بنا لیا۔ انھیں کی مدد اور رہبری سے آگے بڑھے۔ اور یہ سن کے کہ محمود نگر اور اکبری دروازے میں مقابلے کا سامان کیا گیا ہے اسلی راستے سے کترائے مغرب کی طرف کٹ گئے۔ گتو گھاٹ کے پاس دریا کے پار اترے اور پار کی طرف سے آہستہ آہستہ آئے اچانک چھٹی بھون پر آپڑے۔ غرض جو صورت ہو۔ انھوں نے بغیر اس کے کہ کوئی مزاحم ہو قلعے پر قبضہ کر لیا۔

جب چھٹی بھون پر قبضہ ہو گیا تو پھر کون دم مار سکتا تھا؟ شیخزادوں کے تمام معزز لوگوں نے حاضر ہو کے عاجزی سے سر ہٹکا دیا۔ برہان الملک باقی پر سوار ہو کے شیخزادوں کے دروازے میں داخل ہوئے اور اس تلوار کو جو بڑے بڑے بہادروں سے سلام لے چکی تھی اپنی تلوار سے کاٹ کے گرا دیا۔ پھر شیخزادوں سے کہا ہمارے قیام

کے لیے چھٹی بھون خالی کر دو۔ اس میں انھوں نے لیت و لعل کرنا چاہی مگر نہ پہلی۔ آخر ایک ہفتے کی ہمت دی گئی۔ اور اس عبت کے اندر شیون جو کچھ اسباب نے جاسکے اٹھائے گئے۔ اور چورہ گیا اسپر برہان الملک کے سپاہیوں نے تعینہ کیا۔ قلعے میں جا کے رہنے سے پہلے اسکے پاس ہی جان شیخے ڈال کے وہ رہے تھے۔ ایک نوبت خانہ تعمیر کرادیا جس میں دربار اودھ کے آخری تک روزانہ چھ دست نوبت پہنچتی تھی۔

اسکے بعد برہان الملک آجودھیا میں گئے اور دریا کنارے وہ جگہ بنوایا جسے حال ہم بیان کر چکے ہیں۔ لیکن وقتاً فوقتاً لکھنؤ میں آتے اور قیام کرتے تھے کیونکہ صوبے کا مستقر ہی شہر تھا۔ انکے زمانے میں یہاں کئی نئے محلے آباد ہوئے۔ گریس محلے ان کے محل سرداران فوج کے بڑاؤ کے مقامات تھے جہاں قتل سکونت کے لیے لوگوں نے مکان بنا شروع کر دیے۔ سید حسین خان کا کٹرہ۔ ابو تراب خان کا کٹرہ۔ خدا یار خان کا کٹرہ۔ بزن بیگ خان کا کٹرہ۔ دتیا بیگ خان کا کٹرہ۔ محمد علی خان کا کٹرہ۔ یاغ ہانزائے۔ سرک معالی خان اور اسماعیل گنج (جو بھی بھون کے مشرق) طیف تھا اب لکھنؤ گیا۔ سب اسی زمانے کے محلے یا برہان الملک کے سرداران فوج کی لشکر کا ہیں ہیں۔

نواب برہان الملک چھ ہی برس اودھ اور لکھنؤ میں رہنے پائے تھے کہ سال ۱۱۷۲ھ (۱۷۵۸ء) میں نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ اور وہ نہایت ہی تاحیر کے ساتھ دہلی میں لپٹے گئے۔ اس پر فتنے زمانے میں جو کچھ واقعات گذرے ان کو لکھنؤ سے نقل نہیں۔ لکھنؤ میں اپنا نائب اور قائم مقام بنا کے وہ اپنے بھائی اور داماد مسعود جنگ کو چھوڑ گئے تھے۔ نادر دہلی کو لوٹ چکا تھا اور قتل عام کر دیا تھا مگر ابھی وہیں تھا کہ نواب برہان الملک نے دہلی میں وفات پائی۔ انکے بھتیجے شیر جنگ نے نادر شاہ سے سفارش اٹھوائی کہ نواب مرحوم کے بعد اودھ کی صوبہ داری انھیں دی جائے۔ لیکن راجہ کچھوی نرائن نے جو برہان الملک کے متحدہ وار دن میں تھا نادر کی خدمت میں اس معنوں کی ایک عرضداشت پیش کر دی کہ نواب برہان الملک شیر جنگ سے خوش نہ تھے۔ اور اسی لیے انھوں نے اپنی بیٹی انکو چھوڑ کے مسعود جنگ

دی جو ان کی نیابت کرتے تھے اور اس وقت بھی ان کی طرف سے وہاں موجود ہیں۔  
برہان الملک کے مال و اسباب کی مالک سرکار ہے۔ جسے چاہے عطا کرے۔ اور  
لیے کہ کوئی ورثہ نہیں ہے۔ یہ بھی عرض ہے کہ صفدر جنگ برہان - خدا ترس - لائق -  
اور وعدے کے سچے ہیں۔ اور سپاہ ان سے خوش ہے۔ قطع نظر اسکے حضور کے  
لیے برہان الملک نے دو کروڑ روپے کی رقم کا وعدہ کیا تھا اس کے ادا کرنے کا نظام  
نواب صفدر جنگ نے کر لیا ہے۔ جس وقت حکم ہو حاضر کیے جائیں۔ ان وجہ سے  
امید ہے کہ حضور انھیں کی سفارش فرمائیں گے۔ یہ عرضداشت دیکھتے ہی نادر شاہ  
نے صفدر جنگ کے لیے محمد شاہ سے خود ہی خلعت صوبہ دلائی لے لیا۔ اور اپنے  
ایک صاحب اور دو سوواروں کے ساتھ اودھ میں صفدر جنگ کے پاس بھیجا۔  
یہ خلعت صوبہ داری پن کے صفدر جنگ نے وہ دو کروڑ کا تذرانہ نادر کے پاس  
بھیجا دیا۔ اور اپنے علاقے پر حکومت کرنے لگے۔

صفدر جنگ کا پورا نام مرزا متیم ابوالمنصور خان صفدر جنگ تھا۔ گو ان میں  
برہان الملک کی سی سچی بہادری - سادگی - راست بازی - اور جفا کشی نہ تھی مگر نہایت  
قیامت - بلند حوصلہ - رحمدل - رعایا پرور - اور منتظم تھے۔ شہر سے تین میل کی فاصلہ  
پر انھوں نے قلعہ جلال آباد تعمیر کرایا۔ اور چھ بھون کے اندر پنچ محلے کی جو قدیم عمارت  
تھی اسے بھی شیخ زادوں سے لے لیا۔ اور اس کے عوض میں دو گنا زمین ۶۰۰۰ ایکڑ  
زمین شیخ زادوں کو رہنے اور رہنے کے لیے عطا کی۔ جس سے اگرچہ شیخ زادوں پر ظلم ہوا  
مگر لکھنؤ کی آبادی کو وسعت اور ترقی حاصل ہوئی۔ چھٹی بھون کو صفدر جنگ نے  
از سر نو تعمیر کرایا اور اسے بہت درست کیا۔

لیکن صفدر جنگ پانچ ہی برس اپنے صوبے میں رہنے پائے تھے کہ دہلی میں انکی  
طلبی ہوئی۔ اور راجہ تول رے کو اپنی نیابت پر لکھنؤ میں چھوڑ کے وہ دہلی چلے گئے۔  
تول رے علم دوست - وقت کا پابند - جفا کش - بہادر اور بہت بڑا منتظم تھا۔ اور  
اس کے ساتھ اسے خدا نے اپنے آقا کی سی اولوالعزمی اور قیامت بھی دی تھی۔ اس نے  
ارادہ کیا کہ چھٹی بھون کے ساتھ دس یا ایک پل تعمیر کرے۔ یا یوں کی بنیاد ڈالنے  
کے لیے گھرے کوئٹن کھدوائے۔ لیکن پائے بنا شروع نہیں ہو سکے تھے کہ اپنے

آقا کی طلب پر اُسے احمد خان بگلش کے مقابلے کے لیے جان بٹاڑا۔ اس ہم پردہ بڑی زبردست فوج لے کے گیا۔ گرا راکیا۔ اور پل کا کام جو چھڑا تھا تمام پڑا گیا۔ احمد خان بگلش اُس زالے کا بہادر ترین شخص تھا۔ اُسکے مقابلے کے لیے برہان الملک کی ضرورت تھی۔ صفدر جنگ اُسکے حریف مقابل نہ ہو سکے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ احمد خان کی اور اُسکے ساتھ افغانہ کی قوت ترقی کرتی گئی۔ صفدر جنگ نے لاکھ ہاتھ پاؤں مارے۔ خود شہنشاہ دہلی تک کو اُسکے مقابلے پر لا کے کھڑا کر دیا۔ مگر اُس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ اور اُسکے انار سے سے حافظ رحمت خان نے اودھ کے شہروں اور قصبوں میں لوٹ مار شروع کر دی۔ خیر آباد پر قبضہ کر لیا۔ اور خود احمد خان بگلش کا بیٹا محمود خان فوج لے کے چلا کہ لکھنؤ پر قبضہ کر لے۔ (۱۷۸۴ء) مہدی (۱۷۸۴ء) میں چٹانوں نے علی آباد میں اپنا تھا نہ قائم کیا۔ اور (۱۷۸۵ء) میں محمود خان کا کوئی عزیز بیس ہزار فوج لے کے لکھنؤ کی طرف چلا۔ شہر کے باہر پڑاؤ ڈالا۔ اور اپنا ایک کو قوال مقرر کر کے شہر میں بھیجا۔ صفدر جنگ کے آدمیوں سے شہر خالی تھا جو چند تھے بھی چٹانوں کے آنے کی خبر سن کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور چٹانوں کے کو قوال نے شہر میں آکے بے اعتدالیان شروع کر دیں۔ ان دنوں شیخ زادگان لکھنؤ میں سب سے زیادہ سربر آوردہ شیخ معزالدین تھے وہ افغانہ کے سردار سے شہر کے باہر جا کے لے۔ اُسی وقت کسی نے اُس سے جاکے شکایت کی کہ شہر والے آپ کے کو قوال کی تحقیر و توہین کرتے ہیں۔ اور کوئی اُس کا حکم نہیں مانتا۔ شیخ معزالدین بولے "کیا خیال ہے کہ کوئی ایسی گستاخی کرے۔ میں جانتا ہوں صفدون کو سزا دیں گا"۔ یہ کہہ کے واپس آئے اور تمام بھائی بندوں کو بلانے کے کہا "پٹھانوں کے قول و فعل کا اعتبار نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ہم خواب صفدر جنگ کا ساتھ دیں۔ اور مقابلہ کر کے پٹھانوں کو بیان سے نکال دیں"۔ اُسکے بعد شیخ معزالدین نے گھر کا زیور بیچ کے فوج جمع کی اور سارے شیخ زادوں کو لے کے کو قوال پر حملہ کیا۔ وہ اپنی جان لے کے بھاگا۔ اور شیخ صاحب نے کسی مثل کو درباری لباس پہنا کے اپنے مکان میں ٹھہرایا۔ اور سادی کرادی کہ صفدر جنگ نے اپنی طرف سے اس مثل کو کو قوال ہانکے بھیجا ہے۔ اُسکے ساتھ

ملی کا ایک ہر جھنڈا کھڑا کیا اور لوگ اس کی نیچے آ آ کے جمع ہونے لگے۔ یہ حالات سن کے پٹھانوں نے حملہ کر دیا۔ شیخزادوں نے جان قویہ کے مقابلہ کیا۔ اور اپنی پرانی شجاعت دکھا دی۔ پٹھان مقابلے کی تاب نہ لاسکے۔ پندرہ ہزاروں کے ساتھ بھاگے۔ اور موقع پائے شیخزادوں نے پٹھانوں کو سارے ٹک اور دھڑے نکال باہر کیا۔

دو سال بعد جب احمد خان نیکش سے صلح ہو گئی تو سلسلہ محمدی (۱۲۵۳ھ) میں نواب مسعود جنگ پھر لکھنؤ میں آئے اور ہندی گھاٹ پر آ کے ٹھہرے۔ ایک خاص مکان اپنے رہنے کے لیے بنوایا اور سچا۔ اور سپاہ کی درستی میں مصروف ہوئے لیکن اسکی ہمت نہ ملی۔ اسی سال سلطان پور کے قریب پانچ گھاٹ میں پڑاؤ تھا۔ انتقال کیا۔ لاش پہلے فیض آباد کی گلاب باڑی میں لے جا کے زمین کے سپرد کی گئی۔ پھر تھوڑے دنوں کے بعد ہریانہ میں یمنی محلہ کے دفن کی گئیں جن پر نہایت ہی عالیشان مقبرہ موجود ہے۔ اور سیاحان ارض اُسے آج تک مہرت و عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

(۴)

مسعود جنگ مسعود علی خان کے انتقال کے بعد سلسلہ محمدی (۱۲۵۳ھ) میں اُنکے بیٹے نواب شجاع الدولہ مسند نشین ہوئے۔ جن کے کچھ حالات اس مضمون کے پہلے حصے میں بیان ہو چکے ہیں۔ وہ ایک مضطرب اور بے قرار طبیعت کے انوکھے فرماں روا تھے۔ لیکن بد قسمتی سے اُن کا عہد بڑے بڑے فتنوں اور یادگار زمانہ انقلابوں سے بھرا ہوا تھا۔ دنیا کی دو زبردست تاریخی قوموں اور قوتوں کی قسمت کا فیصلہ انہیں کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ پہلے پانی پت کی محشر انگیز لڑائی ہوئی۔ جس میں احمد شاہ درانی۔ شجاع الدولہ اور نجیب الدولہ کے ساتھ خواتین روہیلکھنڈ کی تمام زبردست فوجیں ایک طرف تھیں اور مرہٹوں کا ٹیری دل دوسری طرف۔ اس لڑائی نے سلسلہ محمدی (۱۲۵۳ھ) میں ایک ہی دن کے اندر فیصلہ کر دیا کہ ہندوستان چاہے مسلمانوں کا رہے یا نہ رہے مگر مرہٹوں کا نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد کسرت کا قیامت خیز میدان گرم ہوا جس میں انگریزوں کی باقاعدہ فوج ایک طرف تھی اور شجاع الدولہ کا لشکر کثیر ایک طرف۔ اس لڑائی نے جنگ پانی پت کے چار سال بعد ۱۲۹۳ھ میں



(۱۸۶۳ء) میں چوبیس گھنٹے کے اندر اس بات کا تصفیہ کر دیا کہ ہندوستان اب مسلمانوں کا نہیں انگریزوں کا ہے۔

ان ٹرائیوں سے پہلے شجاع الدولہ اگرچہ لکھنؤ ہی میں رہ کر بڑی بڑی بیوی بیوی لیکھنؤ لکھنؤ سے اصلاحوں سے اُنھیں اتنی اہمیت ہی نہ ملی کہ شہر کی ترقی و آسائش کی طرف توجہ کریں۔ اُنھوں نے قلعے جوائے۔ گڑھیاں قائم کیں۔ فوجی سامان اور آلات جنگ کو فراہم کیا۔ اسکی فرست نہ ملی کہ اپنے گھر و دست اور اپنے شہر کو آراستہ کریں۔ بسکری ٹرائی کے بعد مہیا کہ ہم بیان کر چکے ہیں وہ فیض آباد میں جا کے اقامت کریں ہو گئے۔ اس لیے لکھنؤ آگئی برکتوں سے محروم رہ گئی۔ (۱۸۶۵ء) میں اُنھوں نے سفر آخرت کیا اور نواب آصف الدولہ اُسکے جانشین ہوئے۔

آصف الدولہ نے سند حکومت پر قدم رکھتے ہی ان سے گوارا نہ ہوئے لکھنؤ کی راہ لی۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب سے دربار اودھ کی قوت فرمان برداری گھٹنے اور لکھنؤ کی ظاہری رونق بڑھنے لگی۔ جس کا میدان جیتنے کے بعد انگریزوں نے دربار اودھ میں داخل دہی کے بہت سے حقوق حاصل کر لیے تھے۔ جن کی بنا پر بیان فوجی ترقیوں کی روک ٹوک کی جاتی اور ہمیشہ غائر نظر سے اس بات کی نگرانی کی جاتی کہ حکومت اودھ کو پھر اسی قوت نہ حاصل ہونے پائے کہ اسکی فوجیں دوبارہ انگریزی لشکر کے ساتھ صحت آرا ہو سکیں۔ تاہم شجاع الدولہ جب تک فیض آباد میں زندہ رہے فوجی اصلاح ہی میں مصروف رہے۔ اور رات دن اسی بات کی دُھن تھی کہ جس طرح بنے اپنی قوت کو بڑھائیں۔ چنانچہ نشی قیض بخش اپنی تاریخ قریح بخش میں اسی زمانے کا چشم دید حال بیان کرتے ہیں کہ ”میلہ ی بھرے اور فیر کرنے کے اعتبار سے شجاع الدولہ کی فوج کی ہندوؤں نے مقابلے میں انگریزی فوج کی ہندوؤں کوئی وقت نہ رکھتی تھیں۔“

لیکن آصف الدولہ کا عہد شروع ہوتے ہی یہ سب باقین تشریف لے گئیں۔ انگریزوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنے داخل دہی کے حقوق کو بڑھا کر شروع کیا۔ اور نہایت ہی دانائی سے آصف الدولہ کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ فوجی اصلاح

کی طرف سے بے پروا ہو کے دوسرے شافل میں جی ہلاکین - آصف الدولہ کو خود بھی  
فوج کا زیادہ شوق نہ تھا - انہیں لٹائے اور مڑے اڑانے کے لیے روپے کی ضرورت  
تھی جو بغیر فوج کے موقوف کیے پوری نہ ہو سکتی تھی - اس لیے انہوں نے تھوڑی سی  
فوج رکھ لی - باقی سب کو معزول کر دیا - اور عیش و عشرت میں مصروف ہو گئے -  
وہ اپنے مغربی دوستوں کے اطاعت کیش دوست تھے - جو ان کے اشاروں پر  
چلتے اور ان کے مشوروں کے آگے کسی کی نہ سنتے -

اس خلوص عقیدت کے صلے میں انگریزوں نے دو ایک لاکھ روپے ان کا قبضہ کر دیا  
اپنی ماں ہو گیا مہاجد کے ستانے اور ٹوٹنے کے لیے جب انہوں نے انگریزوں سے  
مدد مانگی تو نہایت فیاضی کے ساتھ انہیں اخلاقی مدد دی گئی - اور انکی طرفداری  
کی گئی - لیکن اسپر بھی ان کے زمانے تک انہیں یا لکھنؤ کی رعایا کو بہت ہی کم محسوس  
ہو سکا کہ ہمارے نظم و نسق میں کسی بیرونی قوت کو دخل ہے - جس کی زیادہ تر وجہ یہ  
تھی کہ آصف الدولہ کی عام فیاضی اور عیش پرستی نے ساری رعایا کو بھی عیش پرست  
و عشرت طلب بنا دیا تھا - اور کسی کو موجودہ راحت و آرام کے آگے انجام پر غور کرنے  
کی ضرورت ہی نہ محسوس ہوتی تھی -

اس عیش پرستی کا نتیجہ یہ تھا کہ ظاہری صورت میں ان دنوں لکھنؤ کے دربار میں  
ایسی شان و شوکت پیدا ہو گئی جو کہیں اور کسی دربار میں نہ تھی - اور ایسا سامان پیش  
کش ہو گیا تھا جو کسی جگہ نہ نظر آتا - ان دنوں شہر لکھنؤ ایسی رونق پر تھا کہ ہندوستان  
میں نہیں نمایاں دیکھا کوئی شہر لکھنؤ کے اوج و عروج کا مقابلہ نہ کر سکتا ہو گا شہنشاہ  
الدولہ جو روپیہ فوج اور جنگی تیاریوں میں صرف کرتے تھے اُسے آصف الدولہ  
نے اپنی عیش طلبی کے ذوق اور شر کی آہش و خوشحالی میں صرف کرنا شروع کر دیا  
اور اپنے ہی روز کے راز ساری دنیا کی دعوم و دعاء اپنے بیان جمع کر لی - ان کا  
موصوفہ یہ تھا کہ نظامِ مہاراجا و بیوان یا تہذیب سلطان کسی دربار کا کردار کسی  
کی شوکت و شہرت میرے دربار سے زیادہ نہ ہو سکے -

بچے بیٹے و قند علی عثمان کی شادی میں انہوں نے ایسا حوصلہ دکھایا کہ برات  
کا بڑا بڑا و قند علی علی عثمان کے نام تحفہ کے نام تحفہ سے بڑھ گیا - برات کے جلوس میں

بارہ سو باہلی تھے۔ دو لکھا چوہا شاہی خلعت پہنے تھا اُس میں میں لاکھ کے جواہرات  
ٹپکنے ہوئے تھے۔ محفل طرب کے لیے دو عظیم الشان ادب کی خلعت تھے بنوائے گئے مبین  
ہر ایک ۶۰ فٹ چوڑا۔ ۱۲ فٹ لمبا اور ۶۰ فٹ لمبا تھا۔ اور ایسا عمدہ نفیس اور  
قیمتی کپڑا لگایا گیا تھا کہ اُن دو وزن کی تیاری میں خلعت کے دس لاکھ روپے خرچ  
ہو گئے۔

اُنھوں نے دریا کنارے چھٹی جھون کے مغرب طرف دولت خانہ رومی دروازہ  
اور اپنا کیا ہے۔ روزگار آٹھ تعمیر کرایا۔ (۱۲۰۰۰۰) میں اور دھین  
قسط پڑ گیا تھا۔ اور شرفاے شہر تک فاقہ کشی میں مبتلا تھے۔ اس اذک موقع پر رعایا  
کی دشگیری کے لیے امام باڑے کی عمارت چھیر دی گئی۔ چونکہ شریف لوگ دن کو مزدوری  
کرتے میں اپنی سیرتی خیال کرتے تھے اس لیے تعمیر کا کام دن کی طرح رات کو بھی جاری  
رہتا۔ اور غریب و فاقہ کش شرفاے شہر رات کے اندھیرے میں آگے مزبورون میں  
شریک ہو جاتے اور مشلون کی روشنی میں کام کرتے۔ اس عمارت کو قراب سے  
بھے خلوس عقیدت اور جوش دینداری سے بنوایا تھا ویسے ہی خالص اور سچے دلی  
جوش سے لوگوں نے تعمیر بھی کیا نتیجہ ہوا کہ ایسی نفیس اور شاندار عمارت بن گئی  
ہو گئی جو اپنی نوعیت میں بے مثل اور نامور روزگار ہے۔ اُس کا نقشہ بنانے کے لیے  
بڑے بڑے مشہور ہندس اور مہار بلائے گئے۔ اور سب نے کوشش کی کہ ہمارا نقشہ  
دوسروں کے مجوزہ نقشے سے بڑھ جائے۔ مگر کفایت اللہ امام ایک بے مثل زمانہ علماء  
کا نقشہ پسند کیا گیا۔ اور اُسی کے مطابق عمارت بنا شروع ہو گئی۔ جو ۱۶ فٹ لمبی  
۵۲ فٹ چوڑی ہے۔ اینٹ اور نہایت اعلیٰ درجے کے چرنے سے یہ عمارت بنائی گئی۔  
جس میں فرش سے چھت تک لکڑی کا کام نہیں ہے۔ اس عمارت کو شاہان مظلیہ  
کی سنگین ۱۲ دنوں سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔ کھنڈ میں اُس کثرت سے سنگ مرمر  
دستیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن امام باڑے اور آصف الدولہ کی دوسری عمارتوں  
کو دیکھے تو آپ کی خوشنوائی اور جزائی خلعت و شان دکھتی ہیں۔ امام باڑے کے لداؤ  
کی چھت جو کراڑے کے بنائی گئی ہے اتنی بڑی ہے کہ اتنی بڑی لداؤ کی چھت ساری  
دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ بھی دنیا کی عجیب و روزگار گیرین

مین شمار کی جاتی ہے۔

آصف الدولہ کی عمارتوں پر یورپ کی عمارتوں کا ذرا بھی اثر نہ تھا۔ وہ اپنی رعیت میں خالص ایشیائی مین بن مین نمائشی بنین اصلی و حقیقی شان و شوکت پائی جاتی ہے۔ نواب آصف الدولہ کے بعد یہ عمارتیں کس مہر سی مین پڑی۔ مین۔ قدر کے بعد انگریزوں نے اُن پر قبضہ کر کے گرد و پیش کے مکانات کو منہدم کر دیا۔ اور سوا اُس جانب کے جدھر وہ رہا ہے باقی تینوں طرف میدان کر کے امام باڑے کو قلعہ اور رومی دروازے کو اُس کا پھاٹک بنا لیا۔ اُس زمانے میں اس امام باڑے میں گورے رہتے تھے۔ اسکے بڑے ہال میں سلج خانہ تھا۔ اور اُسکے فرش پر بڑی بڑی توپیں دوڑتی پھرتی تھیں۔ مگر نہ کبھی زمین کھدی نہ درودیاہ کی کوئی پیپ اُٹھڑی۔ اب سرکار انگریزی نے امام باڑے کو چھوڑ کے پھر مسلمانوں کے حوالے کر دیا ہے۔ ابھی مسجد میں ایک مجتہد صاحب نماز پڑھاتے ہیں اور امام باڑے میں تعزیہ داری ہوتی ہے۔

نواب آصف الدولہ کی عمارتوں کی مضبوطی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُنھیں تعمیر ہوئے اگرچہ سوا سو برس سے زیادہ کی مدت گزر گئی مگر آج تک اُسی عظمت و شکوہ اور اُسی مضبوطی و پائیداری سے اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ نہ کوئی انیٹ اپنے مقام سے ہٹتی ہے اور نہ کسی جگہ چوڑے نے اینٹوں کو چھوڑا ہے۔ یہ غلات اُن کے دیگر شاہان اور دھڑے کر دھڑے کر کے جو عمارتیں بعد کو بنائیں وہ قوی و ملکی و مہنداری کے مفقود ہو جانے کے علاوہ نہایت کمزور ہیں۔ اور اگر وقتاً فوقتاً مرمت نہ ہوتی رہتی تو آج تک کب کی منہدم ہو چکی ہوتیں۔

آصف الدولہ امام باڑے اور بھی بھون کے متصل اپنے محل "دولت خانے" میں رہتے تھے۔ شہر کے باہر اور دریا پار جو م خلافت سے دُور اور دنیوی جھگڑوں سے الگ رہنے کے معروف عیش ہونے کے لیے بنایا پورا محل بنوایا۔ اکثر جب وہ سیر شکار کے لیے جاتے تو اسی مکان میں قیام کرتے۔ اسی طرح چنٹ مین ایک پُر نضا و تزئینت بخش مکان۔ اور چار ماغ اور تیش باغ مین کوشکین بنوائیں۔ اور اسی زمانے میں سچائی گنج مین اور اُسکے متصل اُسیطیل بنے۔ پھر محلہ و تیر گنج قائم ہوا جو آصف الدولہ کے بیٹے وزیر علی خان کی قیام گاہ ہونے کے باعث اُنھیں کی طرف منسوب اور

انھیں کی یادگار ہے۔

اب لکھنؤ میں حاکم اور فرمان روا کے مستقل طور پر سلطنت پذیر ہو جانے کی وجہ سے عام خلعت کا رخ لکھنؤ کی طرف پھیر گیا۔ جو لوگ شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد میں بس گئے تھے انھوں نے فیض آباد کو چھوڑ چھوڑ کے لکھنؤ میں آنے کے بعد شروع کیا۔ دوسری طرف دہلی کے لوگ اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر کے سیدھے لکھنؤ میں آئے تھے اور پھر واپس جانا نہ نصیب ہوا تھا۔ خلعت کے اس ہجوم نے نئے نئے محلے آباد کرنا شروع کر دیے۔ اس لیے کہ باہر کے آنے والوں میں سے جسے جہان آباد مل جاتی آباد ہو جاتا۔ اور سیکڑوں نے محلے آباد ہوتے چلے جاتے۔

چنانچہ آمانی گنج۔ قلعہ گنج۔ ککاب گنج۔ تناس۔ دولت گنج۔ حکیم گنج۔ قواب گنج۔ قاسمان کا محلہ۔ ایسے نواب آصف الدولہ کے ایک خانی دار و خانے آباد کیا۔ اور تناس کی تقریب میں خود انھیں بلایا۔ ملکیت گنج۔ ملکیت رے کا بازار۔ جو وزیر اعظم ہمارا اب ملکیت رے کی جانب منسوب ہیں (ترجمی گنج۔ مگرانی یا نکلی حسین الدین خان کی چھانوئی۔ حسن گنج۔ باؤلی۔ بھوانی گنج۔ بالاک گنج۔ کشمیری محلہ۔ صورت شاہ کا محلہ۔ نواز گنج۔ تحسین گنج۔ قدا گنج۔ مگرانی (جس کی نواب آصف الدولہ کی ان جو بیگم صاحبہ نے اسی دن بنیاد ڈالی جس دن دیپا راجہ انھوں نے علی گنج کی بنیاد رکھی تھی) غیر گنج۔ محبوب گنج۔ توپ۔ دروازہ۔ خیالی گنج۔ جھاؤ لال کا پل۔ ان دونوں محلوں کے باقی راجہ جھاؤ لال سلطنت اودھ کے وزیر خزانہ تھے۔ یہ سب وہ محلے ہیں جو عہد آصفی میں بسے اور تعمیر ہوئے۔ اور انھیں دونوں دیا کے پار حسن رضا خان نے حسن گنج بسایا۔

نواب آصف الدولہ کی فیاضیوں کی خاص و عام میں شہرت تھی۔ اور دور دور کے شہروں میں ان کی داود و بیش کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ لوگ اٹھتے بیٹھتے عزت و محبت کے ساتھ ان کا نام لیتے۔ اور ان کے تمام ذاتی عیوب فیاضی کے دامن میں چھپ کے نظر اس سے غائب ہو گئے تھے۔ اور عوام کو نواب کی صورت میں ایک سلیش پرست فرمان روا نہیں بلکہ ایک بے نفس اور درویش صفت ولی نظر آتا۔ ہندو دکاندار آج تک صبح کو آگے کھلتے ہی جوش عقیدت سے کہتے ہیں یا آصف الدولہ ولی!

اُسی زمانے میں جنرل کلاؤ مارٹن نام ایک بہت بڑا دو لختہ فرانسسی تاجر لکھنؤ میں آکے رہ پڑا تھا۔ اُس نے ایک نہایت ہی مالیشان کوٹھی کا نقشہ بنا کے ذواب آصف الدولہ کے ملاحظے میں پیش کیا۔ ذواب نے اُسے اس قدر پسند کیا کہ اسکی قیمت میں دس لاکھ اشرفیان دینے کو تیار ہو گئے۔ بیچ کا معاہدہ مکمل کو نہیں ہو سچے پایا تھا کہ ذواب آصف الدولہ نے سفر آخرت کیا۔ اور عمارت ہنوز مکمل کو نہیں پہنچی تھی کہ خود مسیو مارٹن دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اُنھوں نے چونکہ دولت بے پایاں چھوڑی تھی اور وارث کوئی نہ تھا اس لیے مرتے وقت وصیت کر دی کہ میری لاش اسی کوٹھی کے اندر دفن کی جائے تاکہ میرے بعد اُسے حکمرانانِ اودھ مضبوط نہ کر سکیں۔ اس عمارت کا نام اُنھوں نے کاشٹن شیا (قسططنیہ) قرار دیا تھا۔ مگر عوام میں وہ آج کل "مارکین صاحب کی کوٹھی" مشہور ہے۔ اور دیکھنے کے قابل ہے۔ مرثیہ کے بعد وہ اسی کوٹھی میں دفن ہوئے۔ وہ مدرسہ آج تک جاری ہے جس سے بہت سے طلبہ کو کھانا اور کپڑا ملتا ہے۔ مگر سنئے ہیں کہ مارٹن صاحب نے اس اسکول اور اسکے وظائف کو کسی مذہب اور قوم کے ساتھ مخصوص نہیں کیا تھا۔ بلکہ وصیت کی تھی کہ عیسائی، ہندو مسلمان سب ہی کیساں طور پر اس سے فیض یاب ہو سکتے ہیں لیکن اب یہ مدرسہ صرف یورپین بچوں کے لیے مخصوص ہے۔ کسی ہندوستانی کو وخصیفہ لہاؤر کنار اُس کی تعلیم میں بھی شریک نہیں کیا جاتا۔ شاید یہ اس وجہ سے ہو کہ غدر کے زمانے میں جاہل و پُرہوش بلوایوں نے قبر کھود کے سٹراٹن کی ہڈیاں نکال لیں اور اُنھیں ادھر ادھر پھینک دیا۔ انگریزوں کو بعد تسلط اتفاقاً ایک ہڈی مل گئی جو پھر اُسی خاک میں دبا دی گئی۔ لیکن اُن بلوایوں کے فعل کے ذمہ دار عام ہندوستانی نہیں ہو سکتے۔

۱۲۶۷ھ (۱۸۵۹ء) میں ذواب آصف الدولہ نے سفر آخرت کیا۔ اور اُنکی

جگہ ذواب وزیر علی خان مرند نشین ہوئے۔ جن کی شادی کی دھوم دھام کا حال ہم بنا سکتے ہیں۔ مگر چار ہی بیٹے میں اُن سے ایسے ہیوودہ اور قابل نفرت حرکات ظاہر ہوئے کہ اکثر لوگ اُن سے ناراض تھے۔ خود بہو بیگم صاحبہ اُنکے مقابل اپنے سوتیلے بیٹے میں الدولہ ذواب سلوٹ علی خان کو زیادہ پسند کرتی تھیں۔ ادھر اس خبر

کی شہرت ہوئی کہ وزیر علی خان آصف الدولہ کے بیٹے ہی نہیں ہیں۔ کیونکہ آصف الدولہ کی نسبت بیٹوں کا خیال تھا کہ پیدا ہونے لگے۔  
نواب سعادت علی خان آصف الدولہ کی مخالفت کے باعث ان کے زمانے میں  
مردوں قتل سے باہر اور دور رہتے تھے۔ مردوں کھلتے میں رہے اور ایک زمانہ دراز  
تک بنارس میں قیام رہا۔ وزیر علی خان کی نسبت یہ خیال قائم ہوتے کے بعد قریب  
انتخاب نواب سعادت علی خان پر پڑا۔ وہ بنارس سے لائے گئے اور بنارس کی کوٹھی  
میں خود گورنر جنرل ہمارے دربار فرما کے وزیر علی خان کی مزدوری اور نواب سعادت  
علی خان کی مسند نشینی کا فیصلہ کیا۔ وزیر علی خان فوراً گرفتار کر کے بنارس بھیجے  
گئے۔ جو ان اٹھواں نے پیش میں آئے مسٹر جی کو مار ڈالا۔ اور اسکی سزا میں  
گرفتار کر کے چنایہ کڑھ بھیجے گئے اور دین مرے۔ ان کی مصیبتوں اور سرگردانیوں  
کا ایک بڑا بھاری قصہ مشہور ہے۔ جس کا یہ مختصر معرّفہ نقل نہیں ہو سکا۔

(۵)

نواب سعادت علی خان نے سال ۱۷۹۹ء میں تخت پر بیٹھے ہی آدھا  
ملک انگریزوں کی نذر کر دیا۔ مشہور ہے کہ وہ سلطنت سے ایس وٹا اسید بنارس میں  
پرے ہوئے تھے کہ خبر پہنچی نواب آصف الدولہ ہمارے سفر آخرت کیا اور سندھ  
پر وزیر علی خان بھیجے گئے۔ یہ سنتے ہی سلطنت کی رہی سہی اسید بن بھی خاک بن گئیں  
اس قطعی اس کے عالم میں تھے کہ بنارس کے کسی پورویہ حکم نے آئے پوچھا۔  
”نواب صاحب! اگر آپ کو اودھ کی حکومت مل جائے تو انگریزی حکومت کو کیا  
دیکھے گا؟“ جو چیز ہاتھ سے جا چکی ہو انسان کے دل میں اسکی قدر ہی کیا ہو سکتی ہے  
بے اختیار زبان سے نکلا ”آدھا ملک انگریزوں کی نذر کر دوں گا۔“ یہ وعدہ سن کے  
اُس انگریز حکم نے کہا ”تو آپ خوش ہوں۔ اور میں آپ کو خوشخبری سنا تا ہوں کہ  
آپ ہی فرمانروا سے کھٹو منتخب ہوئے ہیں۔“ سعادت علی خان یہ مشورہ غیر متبرک  
کے خوش تو ضرور ہوئے مگر اپنے وعدے کا خیال آیا تو ایک سائے میں آئے۔ اور آخر  
تخت نشینی کے بعد اس وعدے کے ایفا میں انھیں اپنی آدمی قلمرو بانٹ دینا پڑی  
جس کا کتنا زندگی بھر ان کے دل میں کھلے رہا۔

انگریزی آرمی میں ان سے وعدہ لے جانے کا تو ذکر نہیں ہے مگر اس کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ نواب سعادت علی خان کو چونکہ انگریزوں نے تخت پر بٹھایا تھا اس لیے انھوں نے اپنا آدھا ملک شکر بے کے طور پر انگریزوں کی نذر کر دیا۔ ہر تقدیر جو کچھ ہو سعادت علی خان کی تخت نشینی کے وقت اودھ کی حکومت آدمی رہ گئی لکھنؤ کے پرانے لوگوں میں مشہور ہے کہ اسی کو فتح میں سعادت علی خان نے نہایت ہی کفایت شکاری سے کام لے کے اور تحصیل و موصول میں بے انتہا مستعدی و میدانگری ظاہر کر کے باغی ٹپس کر ڈر روپیہ جمع کیا۔ اور انگلستان میں برٹش گورنمنٹ سے مراسلت کر کے یہ طے کر لیا تھا کہ ہندوستان کی حکومت کا ٹھیکہ بیومن ایسٹ انڈیا کمپنی کے اُنکو دے دیا جائے۔ اور معاہدے کی ٹپس ہونے ہی کو بھی کہ اُنکے سالے نے کسی سازش میں شریک ہونے کے زہر دے دیا۔ اور وہی مثل پوری ہوئی کہ سب آج قریح بطلست و آن ساتی نہ ماند۔

اور اسی قسم کے بیسیوں واقعات مشہور ہیں جن کا ثبوت سوا اسی ہوا ہے اور پورے کے اور کچھ نہیں مل سکتا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ سعادت علی خان اس قدر مجرور اور مستغرق واقع ہوئے تھے کہ ان کے سے حاکم نے قلمرو کا کوئی جُڑا سا فیصلہ نہ دیا ہو گا۔ دوسرے اُنکے طرز عمل اور انکی پالیسی میں ایک ایسی مغفلانہ ہوشیاری اور بے اسرار بیقراری نظر آتی ہے کہ چاہے پتہ نہ چلے مگر صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی بڑا کام کرنے والے تھے۔ اور اُنکے تیور بہت ہی عجیب تھے۔

لک کو بائٹ دینے کی وجہ سے انھیں سب سے بڑی مشکل یہ پیش آئی کہ سلطنت کی نصف آمدنی گھٹ گئی۔ اور آئندہ مروجہ درجہ مصارف حد سے زیادہ بڑھا رکھے تھے۔ چنانچہ انھیں دربار کے مصارف گھٹانا پڑے جو نہایت ہی مشکل چیز تھی اس کوشش میں انھوں نے حسابات کی جانچ کی۔ ادنیٰ ادنیٰ رقموں پر نظر ڈالی۔ مافیوں اور جاگیروں کی نہایت سختی کے ساتھ چھان بین کی۔ دربار کے مصارف میں جہاں تک بنا کی کی۔ غرض جس طرح ہو سکا بدنامیاں اٹھا کے اور لوگوں پر سخت بے رحمان کر کے انھوں نے سلطنت کی آمدنی بڑھائی اور خرچ گھٹایا۔

یہ کارروایاں دیکھ کے ذہنی ہوش اور صفت مزاج لوگ تو سعادت علی خان



کی لیاقت اور خوش تدبیری کے قائل ہو گئے۔ مگر عوام میں بے انتہاء ۱۲۰۱ ہنسی پھیلی۔ ایک طرف اُن معافی داروں اور جاگیر داروں کا گروہ شاکی تھا جن کی جائیدادیں ضبط ہوئی تھیں۔ دوسری طرف وہ فتنوں اور اراکِ رافضیہ ملازمین روٹے پھرتے تھے جن کی جگہیں تحفیت میں آگئی تھیں۔ اسی قدر نہیں۔ ملک میں ایک بڑا بھاری گردہ اُن لوگوں کا بھی تھا جو دہریلی خان کے طرفدار تھے۔ اُن کو جائز اور سچا حقدار سلطنت خیال کر کے سادات علی خان کو فاضل بناتے تھے۔ غرض ملک میں ہزاروں دشمن تھے جن سے خطرہ تھا کہ نواب کی جان پر حملہ نہ کر بیٹھیں۔ رعایا کے علاوہ فوج بھی نئے نواب سے نہایت ہی ناراض تھی۔ بیشمار فوج کاٹیری دل جو نواب شجاع الدولہ کے عہد میں جمع تھا اُس میں آصف الدولہ ہی کے زمانے سے سرکارِ انگریزِ مہار کے مشورے سے تخفیف شروع ہو گئی تھی۔ مگر آصف الدولہ کی فیاضیوں اور غنفل خرمیوں نے پہلائے رکھا۔ اور شکایت کی آواز زیادہ نہیں بلند ہونے پائی۔ سادات علی خان نے جب زیادہ تخفیف کی اور اُس کے ساتھ جو سی بھی اختیار کی تو برطانیہ ہاے ہاے پڑ گئی۔ اور جو تھا اُن کی جان کو روکا تھا۔

نتیجہ ہوا کہ اُن کی جان کی حفاظت کے لیے سرکار انگریزی کو ضرورت معلوم ہوئی کہ انگریزی اہلابلہ فوجی گاڑی خاص شہر کے اندر رکھا جائے۔ کیونکہ شہر کے مفسدین اور سرکشوں کی سرکوبی کے لیے اور تیراسن و امان قائم رکھنے کی غرض سے ایک سرباز زبردست قوت کا ہر وقت شہر میں موجود رہنا بہت ہی ضروری تھا۔ جسکی نسبت سنا جاتا ہے کہ نواب سعادت علی خان نے اُسکو نہایت ہی ناگواری کے ساتھ منظور کیا۔

فرمانِ روا یاں اودھ نے اس سے پیشتر اپنے رہنے سہنے کے متعلق نہایت ہی سادگی  
ظاہر کی تھی پہلے تین حکمرانوں یعنی نواب جبرہاں الملک، نواب صفدر جنگ اور  
نواب شجاع الدولہ نے جن سادے مکاؤں میں زندگی بسر کی وہ بھی انکی ذاتِ ملکیت  
نہیں بلکہ کرایے پر تھے۔ انھوں نے اپنا اصلی مکان یا تو میدانِ جنگ کو خیال کیا یا  
سازِی ملکیت کو جس میں دورہ کرتے رہتے اور ساری ملکوں کے زمین کے ہر حصے کو اپنا  
مسکن و مکان تصور کرتے۔ نواب آصف الدولہ اگرچہ نہایت ہی سُرست تھے عیاشی  
و فضول خرچی میں بدنام تھے مگر انکے لیے بھی صرف ایک سادہ پرانی قلع کا مکان

یعنی پنج محلا کافی تھا۔ حالانکہ اٹھین عمارت کا بڑا شوق تھا۔ اس سے زیادہ کیا ہو گا کہ میں لاکھ روپے ایک امام باڑے اور مسجد کی تعمیر میں صرف کر دیے۔ اور اس سے زیادہ ہی رقم جو کہ مختلف بازاروں - سنڈیوں - بکوں - اور سرواؤں وغیرہ کی تعمیر میں خرچ کی - غرض پہلے تین فرمان رواؤں کا شوق تعمیر اگر قلموں گرہ بیوں کی تعمیر اور فوجی سامان کے فراہم کرنے میں پورا ہوتا تھا تو آصف الدولہ کا شوق دینداری کی عمارتوں یا نفع رسانی خلق اللہ کے کاموں میں - اسکے ساتھ کار کا قدیم مذاق بھی اب تک بھٹا چلا جاتا تھا - آصف الدولہ کے امام باڑے تک کی قدیم مذاق تعمیر کا مکمل ترین نمونہ ہیں - دہلی و آگرے میں شاہجہان بادشاہ کو اعلیٰ درجے کا سنگ رخام اور سنگ سرخ قریب کی کاؤن میں لگایا تھا جس نے وہاں کی عمارتوں میں خاص قسم کی نفاست اور اعلیٰ درجے کی شان پیدا کرادی لکھنؤ میں پتھر کا مانا غیر ملکی تھا - اور آگرے اور بڑے پورے لانا اس قدر دشوار تھا کہ کسی کو مشورے کی جرات نہ ہو سکتی تھی - آصف الدولہ نے اینٹ اور چوٹے سے وہی کام لیا اور ویسی ہی شان داری دکھا دی -

نواب سعادت علی خان کو باوجود کفایت شکاری - جزرسی - اور روپیہ جمع کرنے کی ہوس کے مکانوں اور عمارتوں کا شوق تھا - مگر افسوس اُن کا یہ شوق کلکتے وغیرہ میں رہنے اور مختلف مقامات کی عمارتوں کے دیکھنے کی وجہ سے ایسا غارت ہو گیا تھا کہ اُن کے عہد کی عمارتوں سے وہ پرانی خصوصیتیں جدا ہو گئیں - اور اُس وقت سے گویا عمارت کا مذاق ہی بدل گیا -

لکھنؤ میں اس انقلاب تعمیر کا اصلی باعث کچھ تو تخت نشینی سے پہلے نواب سعادت علی خان کی غریب الوطنی - خاندان بدوشی اور اقوام یورپ سے لانا جانا تھا اور زیادہ تر یہ چیز تھی کہ جنرل مارٹن نے اپنے مذاق کی دو ایک کوٹھیاں بیان ہوا کے ایک سی و منع عمارت فرمان رواؤں کے سامنے پیش کر دی جو بلحاظ مصنوعی کے ناقص اور باعتبار ضروریات زندگی کے نہایت ہی دلفریب تھی - جن عمارتوں کی حالت بالخصوص اُن کھلونوں کی سی تھی جو بچوں کے ہاتھ میں دے دیے جاتے ہیں - اور روز بڑھتے اور نئے خریدے جاتے ہیں - ناقدین یورپ تنقید کرتے وقت بڑے زور شور سے

اعراض کرتے ہیں کہ آصف الدولہ کے بعد والے فرمان روباہان لکھنؤ کا مذاق عمارت  
بائکل بگڑ گیا تھا۔ اور اُن کی تمام عمارتیں لڑکوں کے کھلونے یا لڑکیوں کے گھر وندے ہیں  
مگر ادھر توجہ نہیں کرتے کہ یہ مذاق بگڑا کس نے؟ کہا جاتا ہے کہ یہاں کا قومی مذاق  
اس لیے بگڑ گیا کہ یہاں دراصل کوئی قوم ہی نہیں تھی۔ اور اس کا خیال نہیں کیا جاتا کہ  
یہاں کی قومیت کو کس نے بگڑا۔ اور کس کی کوشش سازپوں نے لوگوں سے اُن کی  
پُرانی وضع پھرا دی۔ یہ ہے کہ ۱۷۱۷ء یا دہلی میں جبہ آور دہلی سے۔

سعادت علی خان نے پہلے کوٹھی فرحت بخش پچاس ہزار روپے پر جہیز نامہ  
سے مولیٰ لی۔ اُسی میں رہنا شروع کیا اور اُس کے متصل اور کئی مکان جو ملے پھر وہاں  
سے قریب ہی صاحب رز پٹنہ کی سکونت کے لیے ٹیڑھی کوٹھی تعمیر کی جس کے کچھ  
ریڈنسی کے ۱۷۱۷ء پڑے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد اپنے دربار کے لیے اُنھوں نے لال آباد  
تعمیر کرائی جس میں اب کتب خانہ ہے۔ اور اُن دنوں نصر السلطان کے نام سے مشہور  
تھی۔ اس کے علاوہ دیپاڑ اُنھوں نے دل آرام نام ایک نئی کوٹھی تعمیر کی۔ اور اسی  
سلسلے میں ایک بلند ٹیکرے پر جو اب صدر مین لٹاری کا لکھنؤ کے ملازمین واقع ہوا ہے  
اور جہان سارے شہر گرد کے میدانوں۔ اور روایا کا دلکش منظر نظر کے سامنے جو مابقی  
ایک خوبصورت کوٹھی تعمیر کی۔ اور دلکش اُس کا نام رکھا۔ اسی طرح ایک اور کوٹھی  
تعمیر کی جس کا نام حیات بخش قرار دیا۔ مگر وہ کوٹھی نواب سعادت علی خان کے بعد  
کے فرمان روباہان اودھ کے استمال میں نہیں رہی۔ اُس میں مدرسے پہلے پتھر بنائے  
رہتے تھے۔ اور مدرسے کے بعد یہ معمول تھا کہ انگریزی گورنمنٹ کی طرف سے جو مسٹر  
یورپین اودھ کے چیف کمشنر مقرر ہوئے اُنہیں اُسی کوٹھی میں قیام کرتے۔

مذکورہ بالا کوٹھیوں کے علاوہ نواب مدوح نے مشہور عمارتیں سور بخش اور  
خورشید منزل بھی تعمیر کرائیں۔ اور چوڑے کا سبیل بھی اُنھیں کی یادگار ہے۔ مگر ان  
سب عمارتوں کی تعمیر میں پُرانی وطنی عمارت کی وضع ترک کر دی گئی۔ اور یورپ سے  
آئی ہوئی نئی جدتیں اختیار کی گئیں۔ اور غاہ ہے کہ اس بارہا خاص میں لکھنؤ کا  
کوئی قدیم مکان اُن نئی عالیشان عمارتوں کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا جو خود دولت  
برطانیہ کے اثر اور اہتمام سے ہندوستان کے مختلف شہروں میں تعمیر ہو چکی ہیں ہر روز

روز تعمیر ہوتی جاتی ہیں۔ غرض یہی ڈانہ ہے جب سے لکھنؤ میں اُن قدیم مذاق کی عمارتوں کا خاتمہ ہو گیا جو تاریخی وقت رکھتی ہوں اور کسی خاص خوبی کے لحاظ سے سیاحوں کو اپنی طرف بلاتی ہوں۔

نواب سادات علی خان نے لکھنؤ کے مغربی حصے میں ایک بڑا گنج بنوایا۔ اور اُس کی آبادی و رونق کے لیے اس قدر اہتمام کیا کہ اُس کے واسطے خاص قوانین وضع کیے گئے۔ اور تاجروں اور دوکانداروں کو خاص قسم کے حقوق عطا کیے گئے۔ اُس نے بڑی رونق پائی۔ اور آج تک باوجودیکہ شہر کی آبادی سے فاصلے پر اور بالکل الگ واقع ہوا ہے مختلف چیزوں کی سب سے بڑی منڈی ہے۔ اور عالم نگر کا ایٹشن صرف اُسی کی وجہ سے روز بروز ترقی پاتا جاتا ہے۔

سادات گنج کے علاوہ دوسرے بڑے بازار جو نواب ممدوح کے عہد میں قائم اور آباد ہوئے حسب ذیل ہیں۔ رکاب گنج (جو آج لوہے کی سب سے بڑی اور غلے وغیرہ کی ایک ممتاز منڈی ہے) جنگلی گنج۔ مقبول گنج۔ موٹوی گنج۔ گولا گنج۔ اور رستوگی محلہ۔ موتی محل میں جو اصلی اور بُرائی عمارت ہے وہ بھی نواب سادات علی خان ہی کی بنوائی ہوئی ہے۔ یہ عمارت موجودہ احاطہ موتی محل میں شامل کی طرف واقع ہے۔ اُس میں نہایت ہی نفیس سفید گنبد تھا جس میں کارگر نے موتی کی سی آپ و تاب پیدا کر دی تھی۔

سادات علی خان ادوہ کے تمام فرلن رواؤں سے زیادہ بیدار مغزو و مدبر اور اُس کے ساتھ نہایت ہی کفایت شعار۔ جُزدس۔ بلکہ عمل خیال کیے جاتے ہیں۔ ملک کا اہتمام اُنھوں نے غیر معمولی ہوشیاری اور خوبی و شائستگی سے کیا۔ اور اس میں ذرا شک نہیں کہ اگر اُن کو آخر عہد ملک پورا اطمینان نصیب ہو جاتا تو تمام گزشتہ پانچ سو سالوں اور خرابیاں دور ہو جاتیں۔ اور وہ ملک کی پوری پوری اصلاح کر لے جاتے۔ لیکن خرابی یہ ہوئی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ اُن کے تعلقات اچھے نہیں رہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اُن کا دل تاج و تخت اور خزانوں کی وجہان بانی سے کھٹا ہو گیا تھا۔ انھیں باتوں سے عاجز آئے اُنھوں نے آدھے سے زیادہ ملک سرکارِ عظمت دار برطانیہ کے سپرد کر دیا۔ اور سمجھے کہ اب میں اپنے مقبوضہ

علائے میں بے خرشتہ دیے تردد حکومت کی سکوان کا گرافس کہ اب بھی انگو اطمینان اور چین نہ نصیب ہوا۔ جو ملک اُنکے قبضے میں چھوڑا گیا تھا اُس میں بھی جا بجا انگریزی فوج کے گیمپ قائم کیے گئے۔ اور بڑی مقدار خاص لکھنؤ اور اُسکے حوالی میں مقیم ہوئی۔ جس کی سنبھال دشوار تھی۔ اور اُسکی تعداد کے زیادہ ہونے سے سلطنت پر سخت بار پڑ گیا تھا۔ اس کے مقابل انھیں اپنی بہت سی فوج بٹھادی تھی۔ مگر باوجود ان افکار و ترددات کے اُنھوں نے جو جو اصلاحیں کیں بہت کچھ قابلِ تعریف ہیں۔ مگر سب سے عجیب یہ بات ہے کہ ان اردن کی ترقی اور تجارت کے فروغ کے ساتھ اُنکے دربار میں بالکالوں اور قابلِ قدر لوگوں کا اتنا بڑا مجمع ہو گیا تھا کہ اُسوقت ہندوستان کے اور کسی دربار میں ایسے صاحبانِ کمال نہ نظر آ سکتے تھے۔ ایسے لوگ اکثر اُسی جگہ جمع ہوا کرتے ہیں جو سان کے رئیس مول سے زیادہ دنیا ضعی ظاہر کرتے ہوں سعادت علی خان جیسا کہ بحر بیان کر چکے ہیں جزیس اور بھیل تھے۔ مگر اس بھل و کفایت شاری کے ساتھ یہ صفت تھی کہ اُن کی ذاتی قابلیت دوسرے بالکالوں کی لیاقت کا اعتراف کرتے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ اور اسی بات نے اُن کے ہاتھوں سے لائق لوگوں کی بڑی بڑی قدریں کرائیں۔ اور لکھنؤ چلنے سے زیادہ اہل کمال کا مرجع بن گیا۔ جو قابلِ آدمی جہاں ہوتا سعادت علی خان کی قدردانی کی شہرت سُنتے ہی اپنے وطن کو خیر آباد کہہ کے لکھنؤ کا رخ کرتا اور یہاں آکے ہیا آرام پاتا کہ پھر کبھی وطن کا نام نہ لیتا۔

۱۲۶۳ھ ہجری (۱۸۴۷ء) میں نواب سعادت علی خان نے سفر آخرت کیا۔ اُنکے بیٹے غازی الدین حیدر سند حکومت پر رونق افروز ہوئے۔ تعمیر باغ کی مہرب عمارت کے اندر نواب سعادت علی خان اور اُن کی بی بی مرشد زادہ کے مقبرے ہیں۔ ان دونوں مقبروں کی جگہ ایک مکان تھا جس میں نواب غازی الدین حیدر ایام و لیہ۔ ہی میں رہا کرتے تھے۔ باپ کی آنکھیں بند ہوتے ہی جب وہ ایوان شہر یاری میں گئے تو کہا "میں نے والد کا گھر لیا ہے تو ضرور ہے کہ اپنا مکان انھیں رہنے کو دے دوں"۔ اس خیال کے مطابق مرحوم کو اپنے گھر میں دفن کرایا۔ اور پُرانا مکان مہدم کر کے یہ مقبرہ تعمیر کرا دیا۔

اب غازی الدین حیدر کے عہد میں نہ پاپ کی سی بیدار مغزی اور دولت کی قدر تھی۔ اور نہ اگلے فرمان رواؤں کی سی فوجی سرگرمی۔ ہاں آصف الدولہ کے عہد کی سی آرام طلبی اور عیش پرستی ضرور تھی مگر اس میں بھی یہ فرق آگیا تھا کہ آصف الدولہ کا اسراف بھی ملک و ملت کی نفع رسانی کے لیے ہوتا تھا اور اب خالص نفس پروری تھی۔

غازی الدین حیدر کو پاپ کا جع کیا ہوا کروڑوں روپیہ کا نقد خزانہ مل گیا تھا جو شاہی شوق کے پورا ہونے میں نہایت ہی دریا دلی سے اڑنے لگا۔ موتی محل میں ہم کہہ آئے ہیں کہ شمالی جانب سعادت علی خان نے ایک کوٹھی تعمیر کرائی تھی۔ غازی الدین حیدر نے اس احاطے میں دو اور کوٹھیاں تعمیر کرائیں۔ جن کے نام مبارک منزل اور شاہ منزل قرار دیے گئے۔ شاہ منزل کے پاس ہی کشتیوں کا ایک پل تھا۔ اور مبارک منزل اس سے مشرق کی طرف بیٹھ ہوئی تھی۔ شاہ منزل کے محاذی دریا پار رمنہ تھا جو ہزاری باغ کے نام سے موسوم تھا اور اس میں میلوں تک نہایت بخش سبزہ دار چلا گیا تھا۔ اس میں اکثر مسٹ ہاتھی۔ گنڈے۔ اور وحشی درندے لڑائے جاتے اور بادشاہ اس پار شاہ منزل کے کوٹھے پر جلوہ فرما ہوا کہ ان کی لڑائی کا تماشا لحاظ فرماتے۔ شیروں کی لڑائی بھی وہیں ہوتی۔ جس کے لیے مضبوط کٹرے اور ایک عمدہ سرکس بنا ہوا تھا۔ مگر جو چھوٹے شیر آزار سان جانور لڑائے جاتے ان کی لڑائی خاص شاہ منزل کے احاطے میں اسی پار ہوتی۔

یہ درندوں اور وحشی جانوروں کے لڑانے کا شوق ہندوستان میں یہاں سے پہلے اور کہیں نہیں سنا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رزیدنٹوں اور دربار رس اہل یورپ سے رومیوں کے ایسی تھپڑ کے حالات سن کے کہان پناہ کے دل میں شوق پیدا ہوا مگر مولانا حبیب الرحمن خان صاحب شروانی کے توجہ دلانے سے یہاں معلوم ہوا کہ درندوں کی لڑائی کا رواج دولت مندی کے عہد سے

غازی الدین حیدر نے اپنی ایک یورپین بی بی کے لیے ولایتی محل بنوایا۔ اور اس کا نام ولایتی باغ قرار دیا۔ وہاں سے قریب ہی قدم رسول کی عمارت تیار کرائی غازی الدین حیدر کی آرزو کے موافق دربار انگریزی سے انھیں "بادشاہی کا لقب عطا کیا گیا۔ اس سے پیشتر فرمان روا یاں اودھ وزیر کے رتبے کے سمجھے جاتے

اور سوا نواب کے اور کسی اعزازی لقب سے نہیں یاد کیے جاتے تھے۔ اس زمانے تک ہندوستان میں شہنشاہی منلیہ کی اتنی آن باقی تھی کہ اگرچہ ملک خود مختار و خود سر مکرانوں میں بنٹ گیا تھا اور شہنشاہ دہلی کے قبضے میں صرف دہلی کے گرد و پیش کی زمین باقی رہ گئی تھی۔ لیکن اس بے پناہ یعنی پرہیز شہنشاہ و جہان پناہ دہلی تھے۔ نہ سربراہ ایران دہلی کے سوا ہندوستان میں کسی کو "بادشاہ" کہلاتے کا حق تھا اور نہ خطاب و عزت دینے کا۔ ان کے اس غرور کے ٹوٹنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی نے غازی الدین حیدر کو جھونکے ناپ کے اندوختہ میں سے بہت سا روپیہ انگریزوں کو قرض دے دیا تھا۔ شاہی بکا خطاب دیا۔ اور بارہا اودھ سے اس عزت و سرفرازی کو نہایت ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ چنانچہ اس وقت سے حکمران اودھ جو رزٹینٹوں کے ہاتھوں کے کھلونے تھے بادشاہ بن گئے۔ اور آخری فرمان روا و آبد علی شاہ کے مرنے تک انکا سرمایہ ناز رہے۔

غازی الدین حیدر نے اسی خطاب شاہی کی یادگار میں دریا پار بھی بھونکے سنے ایک نیا بازار بسایا اور اس کا نام بادشاہ گنج رکھا۔ اسی زمانے میں حکیم احمدی نے ہندی گنج آباد کیا۔ اور نائب السلطنت آغا میر کی شاہانہ عمارت کے ڈوڑھک پھیل جاتے کی وجہ سے عین وسط شہر میں محلہ آغا میر کی ڈیوڑھی قائم ہوا۔ اور اسی عہد میں آغا میر کی سرے تعمیر ہوئی۔

بادشاہ کو اور ان سے زیادہ بادشاہ ملیم کو مذہبی معاملات میں بہت زیادہ اہمک تھا۔ مثنویہ خاندان کے زمانے سے ایران کا مذہب شیعہ اثنا عشری تھا۔ مگر ہندوستان کے عام مسلمان سنی تھے۔ نواب برہان الملک چونکہ ولایت کے آئے تھے اس لیے ان کا اور ان کے سارے خاندان کا مذہب شیعہ تھا۔ باوجود اسکے زمانے تک لکھنؤ میں حکومت کا وہی قدیم طریقہ چلا آتا تھا جو آغا ز سلطنت اسلام سے دیگر بلاد ہند اور سارے ملک کا تھا۔ مگر اس وقت سے بادشاہ اور ان کے خاص محل کے اہمک مذہبی کی وجہ سے شیعیت حکومت لکھنؤ کا ایک نمایاں عنصر بن گئی۔ قرنی محل کے علی کی طرف سے حکمرانوں کی توجہ ہٹ گئی اور خاندان اجتہاد و عروج پاکستان سلطنت کا اصلی مقصد قرار پایا۔

لیکن شیعہ مذہب اپنی اصلی حالت پر قائم رہتا تو چند ان مضائقہ نہ تھا۔ خرابی یہ ہوئی کہ بادشاہ سلیم کی جاہلانہ اور امیرانہ مذہبی سرگرمی نے مذہب شیعہ میں نئی بدعتیں ایجاد کیں۔ جن کی وجہ سے اسی قدر نہیں ہوا کہ بادشاہوں اور امیروں میں طرح طرح کی طفلانہ مزاجیان پیدا ہوئیں بلکہ لکھنؤ کی شیعیت ساری دنیا کی شیعیت سے نئی۔ نرالی۔ اور عجیب ہو گئی۔

سب سے پہلے سلیم صاحبہ نے امام صاحب العصر کی چھٹی کی رسم قرار دی جس میں اگر یہ ہوتا کہ کسی شخص میں امام مدوح کے حالات بیان کر کے ثواب حاصل کر لیا جاتا تو مضائقہ نہ تھا۔ مگر نہیں۔ یہاں ہندوؤں کے جنم سٹھی کے رسوم کے موافق پورا زچا خانہ مرتب کیا جاتا۔ اسکے بعد یہ ترقی ہوئی کہ صحیح النسب سیدوں کی خودصورت لڑکیاں لے کے ائمہ اثنا عشر کی بیبیاں قرار دی گئیں جن کا نام ”اجھوتیاں“ رکھا گیا۔ اور جب وہ اماموں کی بیبیاں بنیں تو پھر ان کے وہاں اماموں کی ولادت بھی ہوتی۔ اور بارہوں اماموں کی ولادت کی تقریبیں بڑے کرد و فر کے ساتھ منائی جانے لگیں۔

غازی الدین حیدر نہایت ہی غضبناک اور آشفتمزاج بادشاہ تھے۔ اور جب وہ اب اس بلا کا تھا کہ ان کے زمانے میں انگریزوں سے تعلقات تو اچھے رہے مگر آغا میر جو وزیر السلطنت تھا دربار پر اس قدر حاوی تھا کہ خود بادشاہ سلیم اور ولیم سلطنت تک اس کے آزار سے محفوظ نہ رہ سکے۔ غازی الدین حیدر اسے ٹھونکنے اور لاٹوں سے مارنے۔ جس مار کو وہ خوشی سے کھا لیتا۔ مگر اس کا بدلہ دیکر معزین دربار اور اعراسی تک سے لے لیا کرتا۔

اس پہلے بادشاہ اودھ نے مذہبی ارادت و عقیدت سے دریا کنارے اور موتی محل کے متصل تخت اشرف یعنی روضۂ مطہرہ حضرت علیؑ کی نقل لکھنؤ میں بنوائی اور اس کی روشنی و خدمت کے لیے بہت سارے پیرسکار انگریزی کے حوالے کیا۔ جس کی بدولت آج تک وہ بارونق اور خوب آباد ہے۔ اور ۱۲۵۶ھ بمطابق ۱۸۴۱ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو اسی میں دفن ہوئے۔



۱۲۵۶ء محمدی (۱۸۴۲ء) میں غازی الدین حیدر کے بیٹے نصیر الدین حیدر تخت پر بیٹھے۔ غازی الدین حیدر کے زمانے سے جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں فرمان روائی کا اودھ نواب نہیں بادشاہ تھے۔ اس دولت کا آغاز وزارت دہلی کے درجے سے ہوا تھا۔ اور اگلے زبردست و فوری وقت فرمان رواسب نواب وزیر کھلاتے تھے۔ لیکن اب جبکہ اصلی حکومت و سطوت حضرت ہو چکی تھی اور ہندوستان کے پائلکس میں ان لوگوں کا بالکل اثر نہیں باقی رہا تھا یہ بادشاہ بن گئے۔

خیال کیا جاسکتا ہے کہ انگریزوں نے حکمرانان اودھ کو بادشاہی عزت دی تو اپنی پشت پناہی سے انکی سلطنت بھی بڑھادی ہوگی۔ اور انھیں نام ہی کا بادشاہ نہیں بلکہ حقیقتہً بادشاہ بنائے دکھا دیا ہوگا۔ لیکن نہیں۔ ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ اس عہد میں اودھ کے باہر ان لوگوں کا اثر تو بالکل تھا ہی نہیں۔ خود اپنی ظلم و ستم بھی یہ اتنے آزاد نہ تھے جتنے کہ انکے مابین بزرگ ہوتے آئے تھے۔ اب کسی کی تخت نشینی بغیر انگریزوں کی منظوری کے ہو ہی نہ سکتی تھی۔ انگریزی فوج ساری ظلم و ستم میں جا بجا پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی اہم معاملہ بغیر صاحب رزیدنٹ کی دخل دہی کے طے نہ ہو سکتا تھا۔ سربراہ شہریاری ایک ایجنٹ تھا۔ جس پر جو کچھ ہوتا یہ ظاہر نظر آتا کہ ایکٹر کر رہے ہیں مگر اس میں وہ انحال کسی اور شخص کے قبضہ قدرت میں تھے جو پورے کی آٹھ میں تھا اور جو چاہتا تھا کرتا تھا۔

مگر خدا کی اتنی مہربانی تھی کہ ان پچھلے حکمرانان اودھ کی اور انکے ساتھ قریب قریب سارے وہ ہنگامان دولت کی جس حقوق و ہوئی تھی جسکی بدولت وہ اپنی کمزوری دے دست و پائی کو بالکل محسوس نہ کر سکتے تھے۔ غازی الدین حیدر بادشاہ بننے ہی پیش و عشرت میں مشغول ہو گئے۔ اور نصیر الدین حیدر کو تخت شاہی ورثے میں ملا تھا۔ نواب سعادت علی خان کا جمع کیا ہوا روپیہ عیش پرستی میں دونوں کا حمد و معاون ہوا۔ کچھ انگریزوں کو قرض دیا گیا۔ کچھ ان مبتدع مذہبی رسموں کی پجاری میں صرف ہو جنہیں بادشاہ اور ان کی ملکاؤں نے اپنے مذاق کے موافق ذوق و شوق سے ایجاد کیا۔ اور باقی فتنہ فخر چیون اور عیاشیوں کی نذر ہونے لگا۔ غازی الدین حیدر نے تو اتنا بھی کیا تھا کہ نجف اشرف کی نقل ہوا کے اپنی قبر کا ٹھکانا کر لیا۔ اور بغیر اسکے کہ

اپنے ورٹے پر بھروسہ کر کے روپیہ اگر بڑوں کے حوالے کیا کہ اُسکے سود سے پورے دینی آداب کے ساتھ محنت کی داشت کیا کریں۔ چنانچہ آج تک اُنکی قبر پر چراغ روشن ہوتا ہے۔ مجلسین ہوتی ہیں۔ قرآن خوانی ہوتی ہے۔ اور محرم میں خوب روشنی ہوتی ہے۔ جسکے طفیل تھوڑے سے غریبوں کی پرورش ہو جایا کرتی ہے۔ مگر نصیر الدین حیدر کو باجم عیش میں اتنی بھی توفیق نہ ہوئی۔ دریا پار محلہ آبادت نگر میں اُنھوں نے ایک کمر بلا ہوائی جو خود اُن کا مرقد قرار پائے والی تھی مگر اس کی خدمت و داشت کی ذرا بھی فکر نہیں کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج وہ ڈالنی گنج کے ایشین کے پاس اُجاڑ اور خاموش پڑی ہے اور شاہ کوئی چراغ جلانے والا بھی نہیں۔ اُنکے زمانے میں نئے نئے گنج اور چاند گنج وہیں دریا پار آباد ہوئے۔

نصیر الدین حیدر کو نجوم سے عقیدت تھی جس نے علم ہیأت کی طرف توجہ دلائی۔ اور ادا وہ کیا کہ اپنے شہر میں ایک اعلیٰ درجے کی رصد گاہ قائم کریں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے ایک کوٹھی ذاب سعادت علی خان کے مقبرے اور موتی محل کے درمیان میں تعمیر کرائی جو رصد گاہ ہونے کے باعث لکھنؤ میں تارے والی کوٹھی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اُس میں بڑی بڑی دو مینیں اور اعلیٰ درجے کے آلات و مہر جمع کیے گئے۔ اُنکے مناسب طور پر قائم کرنے کا کام اور اُن کا انتظام و اہتمام کرنل ونگٹس کے سپرد ہوا جو ایک اچھے ہیأت دان تھے۔ مگر لکھنؤ کی یہ رصد گاہ کرنل صاحب موصوف ہی کی زندگی کا ایک بھول الحال واقعہ تھی۔ کیونکہ ۱۲۵۶ھ میں نصیر الدین حیدر کی سلطنت کا آغاز ہوا۔ جسکے چار پانچ سال بعد غالباً یہ رصد گاہ قائم ہوئی ہوگی۔ اور اس وقت سے ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) تک جبکہ آخری تاجدار اودھ و اجد علی شاہ کا زمانہ تھا یہ رصد گاہ اُنھیں کے اہتمام میں رہی۔ سنہ مذکور میں کرنل صاحب کا انتقال ہوا اور اُنکی جگہ کوئی ہیأت دان اس خدمت پر مقرر نہیں کیا گیا۔ و اجد علی شاہ نے اُس کی طرف سے بے پروائی کی۔ لکھنؤ کے بعض مستند اشخاص کی زبانی سنا گیا کہ اس کی سب سے بڑی دو مین کو و اجد علی شاہ نے ایک کھلم تا خیال کر کے حیدری طواغیت کے حوالے کر دیا تھا۔ لیکن گزشتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رصد گاہ انتراع سلطنت کے زمانے تک قائم تھی۔ قدرین غالباً جوائیوں نے اسے تباہ کر دیا کیونکہ

احمد شاہ نے (جو ڈنگا شاہ بھی کہلاتے تھے) اور انگریزی فوج سے بڑی مسدیدی و گرجوشی کے ساتھ لڑے تھے) تارے والی کوٹھی ہی میں سکونت اختیار کی تھی اسی میں اپنا دربار قائم کیا تھا۔ اور باغی فوجوں کے افسرین جمع ہو کے مشورے کیا کرتے تھے۔

اسی زمانے میں روشن الدولہ نے جو وزیر سلطنت تھے اپنی خوبصورت اور شاذار کوٹھی تعمیر کرائی جس میں فی الحال ڈپٹی کمشنر ہاراجلاس کرتے ہیں۔ اس لیے کہ واجد علی شاہ نے اس کوٹھی کو قیصر باغ بنواتے وقت ضبط کر لیا تھا۔ اور جب ملک انگریزوں کے قبضے میں آیا ہے یہ کوٹھی ایک سرکاری جائیداد تھی۔

نصیر الدین حیدر کا زمانہ سچ یہ ہے کہ نہایت ہی خطرناک زمانہ تھا۔ ایک طرف تو انتظام مملکت کی خرابی تھی بادشاہ کو عیش و عشرت اور اپنی ایجاد کردہ ویداری کی رسوم سے فرصت نہ ملتی تھی۔ سارا نظام سلطنت وزیر پر چھوڑا جاتا تھا۔ اور وزیروں کی یہ حالت تھی کہ کوئی ایسا شخص ملتا ہی نہ تھا جو نیکیتی اور خوش تدبیری سے کام چلا سکے۔ حکیم ہمدی بلائے گئے۔ وہ منتظم قوائی درجے کے تھے مگر چاہتے تھے کہ سلطنت کو اپنی ہی میراث بنالین۔ روشن الدولہ وزیر ہوئے۔ ان میں نہ مادہ تھا نہ طبیعت داری۔ ان سے کچھ کرتے دھرتے نہ تھے۔ بادشاہ کی فصولہ جیون کی حالت تھی کہ سادات علی خان کابج کیا ہوا سارا روپیہ پانی کی طرح اڑ گیا۔ اور ملک کی آمدنی محل کے مصارف کے لیے کفایت ہی نہ کرتی تھی۔ اسپر طرہ یہ کہ بادشاہ اور ان کی مان فازی الدین حیدر کی خاص محل میں جھگڑے پیدا ہوئے۔ وہ متا جان کو بادشاہ کا بیٹا جاتی تھیں اور بادشاہ اُسکو اپنا بیٹا تسلیم نہ کرتے تھے۔ ان باتوں نے ملک کی ایسی حالت کر دی تھی کہ معلوم ہوتا حکمرانوں میں حکومت کرنا اور ملک کے نبھانے کی مطلق صلاحیت نہیں ہے۔

ماحب ریڈیٹس اور گورنر جنرل ہند نے بار بار کھایا۔ ڈرایا۔ دھکایا۔ انجام یہ سے مطلع کیا۔ اور برابر کان کھوتے رہے مگر یہاں کسی کے کان پر جون نہ رہی۔ نصیر الدین حیدر میں عورتوں میں رہتے رہتے اس درجہ زمانہ مزاجی پیدا ہو گئی تھی کہ عورتوں کی سی باتیں کرتے۔ اور عورتوں ہی کا سالیاس پہنتے۔ زمانہ مزاجی کے ساتھ مذہبی

۱۔ یہ  
۲۔ یہ  
۳۔ یہ  
۴۔ یہ  
۵۔ یہ  
۶۔ یہ  
۷۔ یہ  
۸۔ یہ  
۹۔ یہ  
۱۰۔ یہ

عقیدت نے یہ شان پیدا کر دی کہ ائمہ اثنا عشر کی فرضی بیبیان (چھوٹیاں) اور انکی ولادت کی تقریبیں جو ان کی ان کے قائم کی تھیں ان کو اور زیادہ ترقی دی۔ یہاں تک کہ ولادت ائمہ کی تقریبوں میں خود حاملہ عورت بن کے زچہ خانے میں بیٹھتے۔ چہرے اور حرکات سے وضع محل کی تکلیف ظاہر کرتے۔ اور پھر خود ایک فرضی بچہ جنتے۔ جس کے لیے ولادت۔ چھٹی۔ اور نہان کے سامان بالکل اصل کے مطابق کیے جاتے۔ یہ تقریبیں اس قدر زیادہ تھیں کہ سال بھر بادشاہ کو انھیں سے فرصت نہ ملتی سلطنت کی طرف کون توجہ کرتا۔

دربار اودھ اور سرکار انگریزی کے تعلقات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر گورنر جنرل اور ریزڈنٹوں کی نظرنایت نہ ہوتی اور انگلستان کا جو پورٹو سیٹ انڈیا کمپنی کا ٹکران تھا کمپنی کو روکے تھامے نہ رہتا تو انتراع سلطنت کی کارروائی اسی زمانے میں ہو گئی ہوتی۔ مگر اس طفلانہ مزاجی کے دربار کی زندگی ابھی باقی تھی۔ انگریز ملک کے لینے کا ارادہ کر کے رہ گئے۔

نصیر الدین حیدر کی نسبت لکھنؤ کے معبر پرانے لوگوں کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں اور ان طفلانہ حرکتوں کے ساتھ نہایت ہی ظالم بھی تھے۔ لیکن چونکہ ساری زندگی عورتوں میں بسر ہوتی تھی اس لیے ان کے مظالم کا شکار بھی زیادہ تر عورتیں ہی ہوتیں بیبیوں عورتوں کو ادنیٰ قصور اور معمولی بگانی پر دیواروں میں چڑا دیا۔ کہتے ہیں کہ راہ چلتے کسی مرد کو کسی عورت کے سینے پر ہاتھ رکھے دیکھ لیا تھا۔ فوراً عورت کی چھاتیان اڈا کر کے ہاتھ کٹوا ڈالے۔

آخر دس برس کی بے اعتدالیوں کے بعد جبکہ اندر باہر کے تمام اہل دربار زندگی سے عاجز آ گئے تھے بادشاہ خود اپنے دوستوں اور عزیزوں کے ہاتھ کا شکار رہے۔ اور کسی نے زہر دے کے ۱۶۶۶ء محمدی (۱۸۴۳ء) میں قصہ تمام کر دیا۔ نصیر الدین حیدر لا ولد مرے تھے۔ ستا جان کو غازی الدین حیدر کی بیگم نے ہمیشہ اپنا پوتا اور سچا وارث سلطنت بنا کے پیش کیا مگر غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر دونوں نے اپنے نسل شاہی ہونے سے انکار کیا تھا۔ اسی بنا پر گورنمنٹ انگریزی نے نواب سعادت علی خان مرحوم کے بیٹے نصیر الدولہ محمد علی خان کی تخت نشینی

کا پہلے سے بندوبست کر لیا تھا۔ مگر بیگم صاحبہ نے نہ مانا۔ مٹا جان کو لے کے لال بارہ دری یعنی تخت گاہ میں آگئیں۔ رزیڈنٹ نے ہزار روکا اور سمجھایا مگر ایک نہ سنی اور زبردستی مٹا جان کو تخت پر بٹھا دیا۔ جنھوں نے تخت پر قدم رکھتے ہی زہرین لہن اور اپنے دشمنوں سے فوراً بدلہ لینا بھی شروع کر دیا۔ بہتوں کے گھر لٹوئے۔ بعض کو گرفتار کر لیا۔ بعض قتل ہوئے۔ اور شہر میں ایک ہڑو بگ مچ گیا۔ صاحب رزیڈنٹ اور اُنکے اسٹنٹ فوراً دربار میں پہنچے۔ بادشاہ بیگم کو سمجھایا کہ مٹا جان وارث سلطنت نہیں ہو سکتے۔ اور اس میں آپ کو ہرگز کامیابی نہ ہوگی۔ پھر لاٹ صاحب کا تحریری فرمان دکھایا اور کہا بہتر یہی ہے کہ مٹا جان تخت کو خالی کر دیں اور نصیر الدولہ کی تخت نشینی عمل میں آجائے۔ مگر کسی نے سماعت نہ کی۔ بلکہ کسی نے اسٹنٹ رزیڈنٹ پر حملہ کیا جس سے اُن کا چہرہ خون آلود ہو گیا۔ رزیڈنٹ نے منڈیاؤں سے انگریزی فوج پہلے ہی سے بلوالی تھی اور اس نے تختگاہ کے سامنے توپیں لگا دی تھیں اور سپاہی معین باندھ کھڑے تھے۔ مجبوراً صاحب عالی شان نے گھڑی ہاتھ میں لی اور کہا دس منٹ کی ہمت دی جاتی ہے اس زمانے کے اندر اگر مٹا جان تخت سے نہ اتر گئے تو جبریہ کا ردائی کی جائے گی۔ اس کا بھی کسی نے خیال نہ کیا۔ حالانکہ رزیڈنٹ بار بار کہتے جاتے تھے کہ اب پانچ منٹ باقی ہیں۔ اب دو ہی منٹ رہ گئے۔ اور اب دیکھیے پورا ایک منٹ بھی نہیں۔

ان تینہیوں کا کسی نے خیال نہ کیا۔ اور یکایک توپوں نے گراہیں مارنا شروع کیں۔ آٹا فائنا میں تیس چالیس آدمی گر گئے۔ ورباری بدحواسی کے ساتھ گرتے پڑتے بھاگے۔ جو طائفہ مجرّا کر رہا تھا اُس میں سے بھی کئی آدمی زخمی ہوئے۔ شیشہ آلات جھٹا جھٹ ٹوٹ ٹوٹ کے گرے لگے۔ جب کئی وفادار ہبادر جو سینہ سپر تھے مارے جا چکے تو مٹا جان نے بھی تخت سے گر کے بھاگے کا قصد کیا مگر پکڑ لیے گئے غرض بیگم صاحب اور انھیں دونوں کو انگریزوں نے گرفتار کر لیا۔ ساتھ ہی نصیر الدولہ کی تخت نشینی عمل میں آئی جو محمد علی شاہ کے لقب سے بادشاہ وادھ قرار پائے۔ اور مٹا جان اور اُنکی دادی سخت حراست میں لکھنؤ سے کانپور اور کانپور سے قلعہ چنار گڑھ

مین بھیج دیے گئے۔ اور دو ہزار چار سو روپیہ ماہوار اُن کی تنخواہ لکھنؤ کے خزانے سے مقرر کر دی گئی۔

محمد علی شاہ کی عمر تخت نشینی کے وقت ترسٹھ برس کی تھی۔ بوڑھے تجربہ کار تھے زمانے کے سروگرم اور دیار کی طفلانہ مزاجیان دیکھتے رہے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ فواب سعادت علی خان کے بیٹے تھے اور اُن کی آنکھیں دیکھنے سے تھیں۔ انھوں نے بہت سنبھل کے کام کیا۔ کفایت شکاری کے اصول جاری کیے اور جہان تک بنا انتظام کے سنبھالنے کی کوشش کی۔ مگر عمر زیادہ آچکی تھی اور تو لے جواب دیتے جاتے تھے۔ تخت پر بیٹھے ہی انھوں نے حکیم ہمدی کو فرخ آباد سے یلو کے غلٹ وزارت دیا۔ مگر چند ہی روز بعد وہ مر گئے۔ تب ظہیر الدولہ کو غلٹ وزارت ہوا۔ دو تین مہینے بعد وہ بھی دنیا سے رخصت ہوئے۔ اور منور الدولہ وزیر قرار پائے۔ جنھوں نے دو چار مہینے کے بعد ہی استعفا دے دیا اور کربلا سے سٹے چلے گئے۔ پھر اشرف الدولہ محمد ابراہیم خان وزیر قرار پائے جو اوروں کے دیکھتے ڈی ہوش اور متین تھے۔

محمد علی شاہ کی تخت نشینی پر گورنمنٹ انگریزی اور سلطنت اودھ میں ایک نیا معاہدہ ہوا۔ جس کی رو سے سرکار انگریزی نے جو فوج اودھ کی نگرانی کے لیے بھیجی تھی اُس میں مستبدہ اضافہ ہوا۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی گورنمنٹ کو یہ اختیار حاصل ہوا کہ ساری قلمرو اودھ یا اُس کے جس علاقے میں بدظلمی دیکھے اُسے جب تک چاہے اپنے زیر انتظام رکھے۔ بادشاہ نے ناگواری کے ساتھ اس عہد نامے پر دستخط کیے اور جہان تک بنا ملک کی اصلاح کرنے لگے۔

تخت نشینی کے دوسرے ہی برس اُنھوں نے اپنا مشہور امام باڑہ حسین آباد اور اور اُس کے قریب ایک عالیشان مسجد تعمیر کرانا شروع کی۔ جس کی بابت اہتمام کیا گیا کہ دہلی کی جامع مسجد سے رونق اور وسعت میں بڑھ جائے۔

اُن دنوں لکھنؤ کی آبادی و رونق اس قدر ترقی کر گئی تھی اور اس کثرت سے آدمی اُس کی سوا دین آباد تھے کہ اُسے ہندوستان کا بابل کہنا بیجا نہ تھا۔ واقعی شہر ہر حیثیت سے اُس عہد کا زندہ بابل تھا۔

اس مشابہت کو شاید انگریزوں یا کبھی اور باری سے سن کے محمد علی شاہ نے ارادہ کیا کہ  
لکھنؤ کو پورا پورا بابل بنا دین۔ اور اپنی ایک ایسی یادگار قائم کر دین جو ان کے نام  
کو تمام شاہانِ اودھ سے زیادہ بلند پرکھائے۔ انھوں نے بابل کے مینار یا دیوار  
کے ہوئی بارغ کی طرح کی ایک عمارت حسین آباد سے قریب اور موجودہ گھنٹہ گھر کے  
باس تعمیر کرنا شروع کی۔ جس میں محرابوں کے دو دروازے پر دوسرا حلقہ اور دوسرا  
حلقہ پر تیسرا حلقہ۔ غرض یوں ہی تھے اوپر قائم ہوتے چلے جاتے تھے۔ ارادہ تھا کہ  
یونین سات منزلوں تک اسے بلند کر کے ایک اتار بڑا اور اونچا برج بنادیا جائے  
جو دنیا بھر میں لا جواب ہو۔ اور اس کے اوپسے ہمارے لکھنؤ اور اس کے گرد کی فضا  
نظر آئے۔ یہ عمارت اگر پوری بن جاتی تو یقیناً لا جواب اور عجیب و غریب ہوتی۔ اس کا  
نام ست کھنڈا " قرار دیا گیا تھا۔ اور بڑے اہتمام سے بن رہی تھی۔ مگر باغ ہی  
منزل بننے پائی تھیں کہ محمد علی شاہ نے سلسلہ محمدی (سلسلہ ۶) میں سفر آخرت کیا۔  
محمد علی شاہ نے اپنے مختصر زمانے میں بغیر اس کے کہ اندرونی جھگڑے پیدا ہوں  
یا ملک میں بد نظمی کی فریاد بلند ہو لکھنؤ کو نہایت ہی خوبصورت شہر بنادیا۔ حسین آباد  
کے بھاٹک سے رومی دروازے تک دریا کنارے کنارے ایک سڑک نکالی جو چوک  
کھلائی تھی۔ اس سڑک پر باوجود دو طرفہ عالیشان مکانات کے ایک طرف رومی  
دروازہ آصف الدولہ کا امام باڑہ اور اس کی مسجد تھی۔ دوسری طرف تلکھنڈا  
اور حسین آباد کا بھاٹک تھا۔ اس نے امام باڑے کی مختلف سرنگاہ عمارتیں بنائیں۔  
اور ان کے پہلو میں جامع مسجد واقع تھی۔ ان سب عمارتوں نے مل کے دوؤں جانب  
ایک ایسا خوشنما اور نظریں منظر پیدا کر دیا تھا جو دنیا کے تمام مشہور و خوش سواد  
منظر پر چشم کشی کرتا تھا۔ اور اب بھی گو کہ درمیان میں باشندگان شہر کے جتنے  
مکانات واقع تھے سب گھر گئے مگر دنیا کا ایک بہترین منظر تصور کیا جاتا ہے۔

(۷)

محمد علی شاہ کے بعد امجد علی شاہ اریکھ آئے سریر شہر باری ہوئے۔ محمد علی شاہ نے  
کوشش کی تھی کہ ولیمہ سلطنت کی تعلیم اعلیٰ درجے کی ہو۔ چنانچہ انھیں علماء و فضلا  
کی صحبت میں رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امجد علی شاہ بجائے اسکے کہ تعلیم میں کوئی نمایاں ترقی

کرین اخلاق و عادات کے لحاظ سے ایک ثقہ مولوی بن گئے۔ عثمان حکومت  
ہاتھ میں لینے کے بعد اُن کا جو کچھ حوصلہ عقاب تھا کہ وہ اُن کے ساتھ ساری  
رعایا جناب قبلہ و کعبہ کی حلقہ گوش ارادت بن جائے۔ لیکن ظاہر ہو کہ علماء  
دین و مقتدایان ملت کو بالکل سے کسی قسم کا واسطہ نہیں ہو سکتا۔ وہ نہ مبرا  
سلطنت ہو سکتے ہیں نہ سلیکسین۔ اُن سے جو کچھ ہدایت مل سکتی تھی یہ تھی کہ سید و  
کی خدمتگداری کی جائے۔ اور سلطنت کا روپیہ مومنین کی اعانت و دستگیری میں صرف  
ہو۔ اور یہ کام بھی ارادت کش اور محتاط فرمانروا سے اودھ احمد علی شاہ کی نظر میں  
اُسی وقت قابل اطمینان ہو سکتا تھا جب خود محمد العصر کے مبارک ہاتھوں سے  
انجام پائے۔ چنانچہ ملک کی آمدنی میں سے لاکھوں روپیہ زکوٰۃ کے نام سے اُنکی  
نذر کیا جاتا۔ اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سی خیرات کی رقمیں انھیں کے  
ہاتھ میں جاتیں۔

احمد علی شاہ کے لیے تعویذ طہارت کا خیال مرض بن گیا تھا۔ انھیں اپنے  
خیال کی پابندی شرع سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ نظم و نسق مملکت کی طرف  
توجہ کریں۔ جس کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ محمد علی شاہ نے اپنی تجربہ کاری و بیدار مغزی  
سے جو کچھ انتظامات کیے تھے سب درہم و برہم ہو گئے۔ اور یہ حالت ہو گئی کہ  
(قائمی محمد صادق خان اختر کے بیان کے مطابق) تمام محال بدکار و بد باطن اور  
خود غرض تھے۔ رعایا تباہ تھی۔ زبردست کاٹھنگا سر پہ تھا۔ ظالم و مجرم کو سزا  
نہ ملتی۔ خزانہ خالی تھا۔ رشوت ستانی کی گرم بازاری تھی۔ اور جو فتنے پیدا  
ہوتے کسی کے مٹانے یا مٹ سکتے یہ

لیکن اس اتھاکی خاموشی اور تہمتی غفلت و بے پروائی پر بھی انھوں نے  
محلہ حضرت گنج آباد کیا جو آج لکھنؤ میں تمام محلوں سے زیادہ صاف ستھرا خوب  
آباد۔ نہایت خوبصورت۔ دو بلند تاجروں کا اعلیٰ ترین بازار ہے۔ اور رسول لائن  
کا سب سے زیادہ بارونق حصہ ہے۔ انھوں نے لکھنؤ سے کا پور تک براہ راست  
ایک پختہ سڑک بنوائی۔ اُن کے عہد میں سب سے بڑا کام یہ ہوا کہ نوہے کے پل کی  
عمارت بن کے تیار ہو گئی۔ اس پل کی تعمیر کا واقعہ یہ ہے کہ اسکے اجراء اور پورے علاقے میں



حیدر نے انگلستان سے منگوائے تھے۔ مگر وہ پُرزے جب تک لکھنؤ میں ہوئیں نہیں  
بادشاہ رہے۔ عالم جاوید ہو چکے تھے۔ نصیر الدین حیدر کے عہد میں جب  
وہ پُرزے ولایت سے آئے تو انھوں نے اپنے دربار کے انجینئر مسٹر نیگل کو ان  
پُرزوں کے جوڑنے اور پُل کو بنا کے کھڑا کر دینے کا ٹھیکہ دیا۔ اور حکم دیا کہ وہ  
پُرزے رزیڈنسی کے سامنے پار دریا کے کنارے ڈال دیے جائیں۔ جس مقام  
پر پُل کے یہ آہنی پُرزے ڈالے گئے تھے اُس جگہ کا پتہ دینے کے لیے آج وہیں  
ایک گھاٹ اور شوالہ قائم ہے۔ مسٹر نیگل نے دریا کے اندر ستون قائم کرنے کے  
لیے گہرے کنوئین کھدوائے۔ اور ستون کی جڑائی بھی کر لائی۔ مگر اسکے بعد  
اُن سے کچھ کرتے دھرتے نہ بنی اور پُل کی ٹکئیں میں ناکامی ہوئی۔ محمد علی شاہ کے  
زمانے میں یہ کام ناتمام پڑا۔ مگر امجد علی شاہ نے اپنے عہد میں اسکی جانب توجہ  
کی اور پُل بن کے تیار ہو گیا۔ لیکن جو پُل آج کل قائم ہے یہ وہ امجد علی شاہ  
کے زمانے کا پُل نہیں ہے۔ وہ ایک ہینٹنگ برج بننے لگنے والا پُل تھا جس کا سارا  
بار چار بلند اور زبردست آہنی کھمبون پر ٹک رہا تھا۔ انگریزی زمانے میں جب  
اُسکے پُرزے زنگ آلود ہو کے کمزور ہوئے اور اُس پر عام آمد و رفت میں خطرہ  
نظر آیا تو اُسے منہدم کر اسکے اُس کی جگہ دوسرا آہنی پُل قائم کیا گیا۔ اور وہی پُل  
اسوقت موجود ہے۔

امجد علی شاہ ہی کے زمانے میں اُسکے وزیر امین الدولہ نے امین آباد آباد  
کیا۔ جس کی آبادی و رونق آج کل روز افزون ترقی کر رہی ہے۔ امجد علی شاہ  
نے اپنے زمانے میں اگرچہ کچھ نہیں کیا اور نہ اپنے شوق سے کوئی ایسی عمارت  
بوائی جو آج کل اُنکی یادگار ہو۔ مگر شاید اپنے اتقا و پرہیزگاری کے صلے میں  
انھیں یہ قدرتی ناموری حاصل ہو گئی کہ لکھنؤ کے آج کل کے وٹو سب سے زیادہ  
مشہور۔ سب سے زیادہ آباد۔ سب سے زیادہ بارونق۔ اور سب سے زیادہ  
دولتمند محلے۔ امین آباد اور حضرت گنج اٹھین کے عہد کی یادگار ہیں۔

آخر زمانے نے اُنکے دور کا درق بھی اُلٹا۔ اور شکستہ محوری (۱۸۵۷ء)  
میں جبکہ عمر اٹھالیس برس سے کچھ ہی دن زیادہ تھی مرزا سلطان میں مبتلا ہو

دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اور اپنے آباد کیے ہوئے محلے حضرت گنج مین منڈو خان رسالدار کی چھاؤنی کے اندر دفن ہوئے۔ اُن کا امام باڑہ جس میں وہ مدفون ہیں حضرت گنج کے مغربی حصے میں لب شرک موجود ہے جس کی عمارت اُن کی وفات کے بعد واجد علی شاہ نے دس لاکھ روپیہ صرف کر کے بنوائی تھی۔ یہ امام باڑہ حسین آباد کی ایک ناقص نقل ہے۔ اور اگر حسین آباد کی طرح اس میں بھی روشنی ہوتی تو محرم میں لکھنؤ کا مشرقی حصہ بھی عالم نور بنایا کرتا۔ اگرچہ اُس کے لیے کوئی وثیقہ نہیں ملتا ہے لیکن اس کی آمدنی بھی کم نہیں۔ احاطے کی عمارت کے بیرونی رخ کی دو کاون میں بہت سے اچھے اچھے تاجروں کی دکانیں ہیں۔ اور اندرونی عمارتوں میں بہت سے پورشین وغیرہ رہتے ہیں جن سے کرایے کی مستند رقم وصول ہوتی ہے۔ مگر کرایہ وصول کرنے والوں کا یہ بھی احسان ہے جو محرم میں خاص قبر اور امام باڑے میں چند چراغ روشن کر دیا کرتے ہیں۔

اب امجد علی شاہ کے بڑے بیٹے واجد علی شاہ تحت سلطنت پر جلوہ افروز ہوئے اُن کا زمانہ اس مشرقی دربار کی تاریخ کا آخری ورق اور اسی مرثیہ پستان کا آخری بند ہے۔ چونکہ انتراع سلطنت انھیں کے عہد میں ہوا اس لیے تمام اہل المرے کے ہفت سہام اور نشانہ ملاست وہی بن گئے۔ اور قریب قریب تسلیم کر لیا گیا کہ زوال سلطنت کا باعث وہ تھے۔ لیکن جس زمانے میں انکی سلطنت کا خاتمہ ہوا ہے اُن دنوں ہندوستان کی تمام وطنی قوتیں ٹوٹ رہی تھیں۔ اور برہمنی بھلی سب طرح کی قدیم حکومتیں دنیا سے مٹتی جاتی ہیں پنجاب میں سکھوں کا اور روکن میں مرہٹوں کا دفتر کیوں اُلٹا جو بہادر اور زبردست اور ہوشیار مانے جاتے ہیں؟ دہلی میں مثل شہنشاہی کا اور بنگالے میں نواب ناظم بنگالہ کا استیصال کیوں ہوا؟ حالانکہ اُن میں اتنی طفلانہ مزاحمت تھی جتنی کہ لکھنؤ کے ارکیہ آراء سلطنت میں بتائی جاتی ہے۔ مذکورہ چاروں درباروں میں کوئی واجد علی شاہ نہ تھا۔ حالانکہ انکی تباہی لکھنؤ کی تباہی سے کم نہ تھی۔ اصل یہ ہے کہ اس عہد میں اور اہل ہند کی غفلت و ہمالیت کا پیکار نہ چھلکنے

کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اور اُدھر دولت برطانیہ کی قوت اور برٹش قوم کی طاقت اندیشی۔ قابلیت۔ جفاکشی۔ اپنی کوششوں اور اپنی اعلیٰ تہذیب و شائستگی کا ثمرہ پانے کی روز بروز مستحق ثابت ہوتی جاتی تھی۔ غیر ملکن تھا کہ دانیان فرنگ کی ذہانت و طباعی۔ خوش تدبیری و باضابطگی ہندوستان کی جمالت و خود غراہی پر فتح نہ پاتی۔ زمانے نے ساری دنیا میں تمدن کا نیا رنگ اختیار کیا تھا اور پکار پکار کے ہر ایک قوم سے کہہ رہا تھا کہ جو اس مذاق میں میرا ساتھ دے گا مرٹ جائے گا۔ زمانے کے اس ڈھنڈورے کی آواز ہندوستان میں کسی نے نہ سنی۔ اور سب مرٹ گئے۔ انھیں نئے دالوں میں اودھ کی سلطنت بھی تھی جسکے زوال کا بار غریب و آبد علی شاہ پر ڈال دینا محققانہ مذاق کے خلاف ہے۔

پابند شرع باپ نے واجد علی شاہ کو بھی ملال کی محبت میں رکھ کے اپنا سناٹا چاہا تھا۔ اور یہ رنگ ایک حد تک واجد علی شاہ پر چڑھا بھی جو انقضاے عمر کے ساتھ زیادہ کھلتا گیا۔ مگر آج علی شاہ کا اس میں کچھ زور نہ چلا کہ دارش سلطنت فرزند کا فطری رُحان عیاشی اور فنون طرب و نشاط کی طرف تھا۔ اگرچہ باپ کی تاکید سے پرٹھنے لکھنے کی تعلیم بھی اچھی تھی لیکن موسیقی کا شوق غالب تھا۔ ولیم ہدی ہی میں اپنے ذاتی شوق سے اُنھوں نے باپ کے نشاط کے خلاف گویوں اور ڈھارڈیوں کو اپنی محبت میں رکھا۔ گانا بجانا سیکھا۔ آوارہ عورتوں اور ڈوم ڈھارڈیوں سے ربط و منبط بڑھایا۔ اور انجام یہ ہوا کہ جو تلف اُنھیں حسین عورتوں اور گویوں کی محبت میں آتا علی مذاق کی ہندب محبتوں میں نہ آتا۔

باپ کے خلاف انھیں عمارت کا بڑا شوق تھا۔ اور ولیم ہدی ہی میں اُنھوں نے خاص اپنی محفل طرب اور عیش کے لیے ایک پُر فصاحت باغ اور اُس میں دو ایک مختصر۔ خوبصورت اور پُر تلف مکان بنوائے۔ علی نقی خان جھپین تخت پر بیٹھے ہی خلعت و وزارت عطا کیا اُن سے نہ مانہ ولیم ہدی میں ایک رنڈی کے گھر ملا تھا ہوئی۔ اُنکی جو امانہ شوخ مزاجی نے مزاج میں درخو پیدا کیا۔ اور جب مذکورہ بالا باغ اور عمارت اُن کے اہتمام میں تعمیر ہوئے کہ امید آئے تو سمجھ لیا گیا کہ وزارت اور انتظام مملکت کے لیے اُن سے زیادہ موزون نہ کی شخص نہیں ہے۔

واجد علی شاہ کی سلطنت کا آغاز تو اس عنوان سے ہوا کہ نوجوان ہائے بادشاہ کو عدالت گستری اور اصلاح فوج کی طرف غیر معمولی توجہ تھی۔ سواری میں آگے آگے دو نفری صندوق چلتے۔ جس کسی کو کچھ شکایت ہوتی عرضی لکھ کے اُن میں ڈال دیتا۔ کبھی خود بادشاہ کے پاس رہتی۔ محل میں پہنچ کے حضور اُن عرضیوں کو نکالتے اور اپنے ہاتھ سے احکام تحریر فرماتے۔ اس طرح کئی نئے رسالے اور کئی پلٹین پھرتی ہوئیں۔ رسالوں کے نام بادشاہ نے اپنی نشانیہ طہا سے بانگا۔ ترچھا۔ گنگوڑ رکھے۔ اور پلٹوں کے نام اختر۔ تادری رکھے گئے۔ خود بدولت پرنس نفیس گھوڑے پر سوار ہو کے جاتے اور گھنٹوں دھوپ میں کھڑے ہو کے اُن کی قواعد اور فنون جنگ میں اُن کی مشافی دیکھتے۔ اور خوش ہو ہو کے باکمال سپاہیوں کو انعام و اکرام سے سرفراز فرماتے۔ فوجی قواعد کے لیے خود ہی فارسی اصطلاحات اور کلمات مقرر کیے۔ ”راست رو“ ”پس بیا“ ”دست چپ بگرو“ چند بانگی جو ان حسین عورتوں کی ایک چھوٹی زنانی فوج مرتب کی گئی۔ اور اُن کو بھی انھیں اصطلاحوں میں قواعد سکھائی گئی۔

مگر جدید عہد کا نقش اولین چند روزہ تھا۔ پورا ایک سال بھی نہ گزرا ہوگا کہ طبیعت ان چیزوں سے اُگتا گئی۔ زمانہ ولید ہی کا وہی پرانا مذاق پھر عود کر آیا حسین اور ادارہ عورتوں سے محبت بڑھی۔ ارباب نشاط کا بازار گرم ہوا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں دوم ڈھاڑی سی ارکان دولت اور معززین سلطنت تھے بادشاہ کے دل میں اب اگر کوئی ظلمی اور شریفانہ مذاق باقی تھا تو وہ شاعری تھی۔ کیونکہ خود شعر کہتے اور شعرا کی قدر کرتے تھے۔

لکھنؤ میں اُن دنوں شاعری کا چرچا حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ اکیلے لکھنؤ میں اتنے شاعر موجود تھے کہ اگر سارے ہندوستان کے شعرا جمع کیے جاتے تو انکی تعداد لکھنؤ کے شاعروں سے نہ بڑھ سکتی۔ تیسرا درتووا کی پُرانی شاعری تقویم پارنہ ہو چکی تھی۔ اب تاسع کی زبان اور آتش کے خیالات و ماغون میں بے ہوس تھے جن میں رند و قہار کے زندانہ کلام اور نواب مرزا شوق کی مثنویوں نے شہوت پرستیوں کی روح بھونک دی تھی۔ اور اسی مذاق کو بادشاہ کی طبیعت کا اصلی

رنگ چاہتا اور پسند کرتا تھا۔

اسلامی شاعری کا رنگ خلافت اسلامیہ کی پہلی صدی تک تو یہ تھا کہ شاعر ایک خاص عورت پر عاشق ہوتے۔ اُس کا نام لے لے کے اُس کے حسن کی خوبیاں اور اُس کی اداؤں کی دلفریبیوں کو بیان کرتے۔ اور اُس کی طرٹ خطاب کر کر کے اپنی بیٹیوں اور بیٹاریوں کو ظاہر کرتے۔ اکثر چھپ چھپ کے اُس سے ملتے مگر تذبذب و عفت کے دائرے سے کبھی قدم باہر نہ نکالتے۔ چند روز بعد عرب ہی میں معشوق گناہ ہو گیا۔ اور عموماً شعرا کا معشوق اُس کے خیال کا ایک پتلا بن گیا۔ جسے رند مشرب تو کوئی حسین عورت یا کوئی خود دلہن کا بتاتے۔ مگر کوئی تھوڑی سی معنوی تاویل کر کے اُسے اپنا حسین مطلق یعنی خلاق عالم بتا دیتے یہی سمویا ہوا چھپا ڈھکا مذاق رندی فارسی شاعری میں رہا اور یہی مذاق اس وقت تک اُردو شاعری کا بھی تھا۔ مگر ذاب مرزا شوق نے اپنی شاعری کو حسین پردہ دار عورتوں پر عاشق ہونے کے اُن کے خواب کرنے کا آلہ بنایا۔ اور قیامت یہ تھی کہ اُن کی ثنویوں کی زبان اسی خوبصورت۔ بے لکھت اور شستہ و رفته تھی اور اُن میں عاشقانہ جذبات اس کثرت سے بھر دیے گئے تھے کہ مہذب و شایستہ لوگوں سے بھی بے دیکھے اور مزہ لیے نہ رہا جاتا۔

واجد علی شاہ نے بھی ان ثنویوں کو دیکھا اور چونکہ ماٹا، اللہ سے خود شاعر تھے اس رنگ کو اختیار کر کے اپنے بہت سے عشقوں اور اپنی عنفوان شباب کی صدہا رندانہ بے اعتدالیوں کو خود ہی موزوں کر کے ناک میں پھیلا دیا۔ اور خلاقی دنیا میں اقرار ہی مجرم بن گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بادشاہ تو بادشاہ و زرا و امرا میں بھی شاڈ و نا درہی ایسے گزرے ہوں گے جنھوں نے عنفوان شباب میں اپنی شہوت پرستی کی ہوسوں کو جی بھر کے نہ نکال لیا ہو۔ مگر وواجد علی شاہ کی طرح کسی نے اپنے ان بے شرمی کے جرائم کو خود ہی پبلک کے سامنے پیش نہیں کیا تھا۔ وواجد علی شاہ دور میں آئے تو چاہے شاعری میں نہ بڑھ سکیں مگر اپنے جذبات و خیالات اور اپنے کارناموں کے عالم آشکارا کرنے میں نواب مرزا سے بھی دو قدم آگے نکل گئے۔ اور یہاں تک ترقی کی کہ بعض موقعوں پر انھیں مبتذل بازاری مذاق

اور فٹش الفاظ کے استعمل میں بھی تامل نہیں ہوتا۔ وہ کہاریون - رنڈیون - خواہون - محل میں آنے جانے والی عورتوں - غرض صد ہا عورتوں پر عاشق ہوئے۔ اور چونکہ ولیعہد سلطنت تھے اپنے عشق میں خوب کامیاب ہوئے۔ جن کی شرمناک داستانیں انکی نظریوں - تحریروں - اور تصنیفوں میں خود ان کی زبان سے سن لی جاسکتی ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ تاریخ میں انکا کیریکٹر سب سے زیادہ نمایاں اور تاریک نظر آتا ہے۔ چونکہ عمارت کا بید شوق تھا۔ اس لیے تخت نشین ہوتے ہی قیصر باغ کی عمارت بنوانا شروع کر دی۔ جو چاہے آصف الدولہ کی عمارتوں کی طرح مضبوط نہ ہو مگر خوبصورتی اور شاندار سی میں لا جواب ہے۔ اس میں بہت سی خوشنما اور باشاں شوکت دو منزلی عمارتوں کا ایک مربع مستطیل رقبہ دور تک چلا گیا تھا۔ جس کا ایک رخ جو دریائے گانگہ کے کنارے تھا عذر کے بعد کھود ڈالا گیا۔ اور تین منزلیں اب تک قائم ہیں۔ جن کو مختلف قطعات پر بانٹ کے گورنمنٹ نے تعلقہ داران اودھ کے حوالے کر دیا ہے۔ اور حکم دیا ہے کہ ان میں رہیں اور انکو اسی وضع میں قائم و برقرار رکھیں۔

قیصر باغ کا اندرونی صحن جس میں جن بندے تھے جلو خانہ کھاتا تھا۔ درمیان میں پتھر والی بارہ دری تھی جو آج کل لکھنؤ کا ٹاؤن ہال ہے۔ اس میں اور کئی عمارتیں بھی تھیں جو اب نہیں باقی ہیں۔ اسکے باہر میان سے متصل ہی بہت سی شاہی عمارتیں تھیں جنہوں نے اس قلعہ زمین کو انجوپڑ روزگار بنا دیا تھا۔ یہ عمارتیں قیصر باغ کے مشرقی پھاٹک کے باہر تھیں۔ لوگوں کو اس پھاٹک سے نکلنے ہی دونوں جانب چوبی اسکرینیں ملتی تھیں۔ جن میں سے گزر کے وہ چنبی باغ میں پہنچتے۔ وہاں سے بائیں ہاتھ کی طرف ٹرکڑیپ جل پریوں کے ایک عالیشان پھاٹک پر پہنچتے۔ جسپر مدارالہمام سلطنت نواب علی نقی خان کا قیام رہتا تھا۔ تاکہ ہر وقت جہان پناہ سے قریب رہیں اور بوقت ضرورت فوراً بلائے جاسکیں۔ اس پھاٹک کے اُس طرف حضرت باغ تھا۔ اور اندر ہی دائیں طرف چاندی والی بارہ دری تھی۔ یہ ایک معمولی اینٹ چوڑے کی عمارت تھی مگر چھت میں چاندی کے پتھر چڑے ہوئے کی وجہ سے

چاندی والی بارہ درمی کھلاتی۔ اسی سے ملحق کوٹھی خاص مقام تھی جس میں خود جہان پناہ سلامت رہتے۔ اور وہیں نواب سادات علی خان کی بنائی ہوئی پڑائی کوٹھی بادشاہ منزل تھی۔

پھر ان چوبی اسکرینوں کے گھلارے سے نکل کے دوسری طرف مڑیے تو یہ عیدہ عمارتوں کا ایک سلسلہ درمک ہلا گیا تھا جو چوٹھی کے نام سے مشہور تھیں۔ ان عمارتوں کا بانی حضور علی عظیم اللہ تھا۔ جنہیں بادشاہ نے چار لاکھ روپے دیکے سول لیا تھا۔ نواب خاص محل اور معزز محلات عالیات اس میں رہتی تھیں۔ اسی کے اندر غدر کے زمانے میں حضرت محل کا قیام رہا اور یہیں ان کا دربار ہوا کرتا تھا۔

یہاں سے ایک سرک فقیر باغ کی طرف آئی تھی جسکے کنارے ایک بڑا بھاری سایہ دار درخت تھا اُسکے نیچے گردا گرد سنگ مرمر کا ایک نفیس گول چوترا بنایا گیا تھا جسپر فقیر باغ کے میلوں کے زمانے میں جہا پناہ جوئی بنکے اور گہرے کپڑے پہنکے آتے اور دھوئی رما کے بیٹھتے۔ اس چوترا سے آگے بڑھکے ایک عالیشان پھاٹک تھا جو کھلی پھاٹک کہلاتا۔ اس لیے کہ اسکی تعمیر میں ایک لاکھ روپے صرف ہوئے تھے۔ اور اس سے بڑھکے آپ پھر فقیر باغ میں آجاتے۔ فقیر باغ کی عمارت میں سلطنت کے اسی لاکھ روپے مرن ہوئے تھے۔ اور اُسکے چاروں طرف کی عمارتوں میں جہا پناہ کی سبیلین اور برکال و ماہ طلعت خاتونیں رہتیں۔ جن کی حیراب عجیب و غریب عورتوں کو دیکھ کے نفس پراسنے زمانے والے کہ اُٹھا کرتے ہیں۔

”پوری ہفتہ رخ دیو در کشمہ و تاز بسوخت عقل ز جہت کہ این چہ بولیم ہیست“  
فقیر باغ کے مغربی پھاٹک کے باہر روشن الدولہ کی کوٹھی تھی۔ اسے واجد علی شاہ نے ضبط کر کے اس کا نام فقیر پسند رکھ دیا تھا۔ اور اُعلیٰ ایک مجموعہ نواب مشن محل اس میں رہتی تھیں۔ اب اُس میں صاحب ڈپٹی کسٹربادری کی عدالت ہے۔ اُس کے سامنے اور فقیر باغ کے اس مغربی پہلو پر بھی ایک دوسرا جلو خانہ تھا۔

سال میں ایک مرتبہ فقیر باغ میں ایک عظیم الشان میلہ ہوتا تھا جس میں پہاڑ کے بھی فقیر باغ میں آتے اور جہا پناہ کی عشرت پرستیوں کا رنگ دیکھنے کا موقع مل جاتا۔ بادشاہ نے سری کرشن جی کا رہس جو ہندوؤں میں عروج ہے دیکھا تھا۔ اور سری

کرشن جی کی مشفقانہ و شہ عا شقی اس قدر پسند آگئی تھی کہ اُس رہس سے ڈرا اسکے طور پر ایک کھیل ایجاد کیا تھا جس میں خود کھینچتے۔ مجذرات عصمت آیات کو بیان۔ نمین۔ اور ناچ رنگ کی مٹیلین گرم ہوتی۔ کبھی جوش جوانی کے جذبات سے جوگی بن جاتے۔ موتیوں کو جلا کے بھیجوت بنائی جاتی۔ جس کی بدولت فقیری بن بھی شاہی کے کمرشے نظر آتے۔ میلے کے زمانے میں ان صحبتوں میں شریک ہونے کی عام اہل شہر کو اجازت ہو جاتی مگر اس شرط کے ساتھ کہ گروس کپڑے پہن کے آئیں جبکہ نتیجہ یہ تھا کہ اسی اسی برس کے بڑھے بھی تنگرفی کپڑے پہن کے پھیلا بن جاتے اور بادشاہ کی جوانی کے بادہ طرب سے اپنے بڑھاپے کا جام بھر لیتے۔

یہی رنگ چلا جاتا تھا اور لکھنؤ میں کمال بے فکری کے ساتھ رنگ رلیاں منائی جا رہی تھیں کہ گورنمنٹ برطانیہ کو ریزیڈنٹوں نے یہاں کے حالات سے آگاہ کیا اور وہاں کے بورڈ نے یہ فیصلہ کر دیا کہ ملک اودھ قلمبرطانیہ میں شامل کر لیا جائے۔ اس حکم کی تعمیل کے لیے انگریزی فوج لکھنؤ میں آئی۔ اور یکایک خلاف توقع بادشاہ کو حکم سنایا گیا کہ ”آپ کا ملک انگریزی مالک محروسہ میں شامل کر لیا گیا۔ آپ کے لیے بارہ لاکھ روپیہ سالانہ اور آپ کے جلوسی لشکر کے لیے تین لاکھ روپیہ سالانہ ماہوار جو آپ کی اور وابستگان دامن کی ضرورتوں کے لیے بخوبی کافی ہے مقرر کی گئی۔ اور آپ کو اجازت ہے کہ شہر کے اندر آرام سے بیٹھ کر بن کے بیٹھے اور رعایا کی فکروں سے آزاد ہو کے بے غل و غش رنگ رلیاں سنائیے۔“ یہ احکام سننے ہی شہر میں شام ہو گیا۔ خود بادشاہ نے رودھو کے بہت کچھ عذر خواہی کی۔ بادشاہ کی مان اور خاص محل نے حق و کائنات ادا کیا مگر گورنر جنرل جادو کے حکم میں رد و بدل کرنا صاحب ریزیڈنٹ کے اقتدار سے باہر تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی گورنمنٹ نے بغیر کسی زحمت و مزاحمت کے ملک اودھ پر قبضہ کر لیا۔ اور بادشاہ مع اپنی والدہ۔ بیوی۔ خاص خاص محلات اور جان نثار رفقا کے کلکتہ روانہ ہوئے کہ انگلستان جا کے اپنی کرین اور اپنی بگیا ہی ثابت کر کے انزع سلطنت کے حکم کو منسوخ کرائیں۔

(۸)

واجہ علی شاہ کی یہ بڑی خوش نصیبی تھی کہ تاج و تخت سے جدا ہوتے ہی آخر



۱۲۵۵ھ بمطابق ۱۸۴۰ء میں لکھنؤ چھوڑ کے کلکتے کی طرف روانہ ہو گئے۔ تاکہ اپنے منشا میں یا منشا بطور ہی کرین۔ اور گورنر جنرل ہند کے دربار سے کامیابی نہ ہو تو لندن پہنچ کے مقدسے کو پارلیمنٹ اور ملکہ انگلستان کے سامنے پیش کر دیں۔ چنانچہ جب کلکتے میں کام نہ نکلا تو انگلستان کا قصد کیا۔ گراہانے بحری سفر کو بادشاہ کے لیے سفر تصور کیا۔ اور مشیرون نے روکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود بادشاہ تو کلکتے ہی میں ٹھہر گئے مگر اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ وئی عہد کو انگلستان روانہ کیا۔ اس سفر میں میرے ناٹاشی فریڈرک صاحب مرحوم بھی اس خاندان پر بادشاہی قافلے کے ہمراہ تھے۔ بادشاہ کو سرکار انگریزی کی مجوزہ خواہ لینے سے انکار تھا اور اڑے ہوئے تھے کہ ہم تو اپنا تاج و تخت ہی لین گے جو بے قصور جینا گیا ہے۔

بادشاہ کلکتے میں تھے۔ اُن کا خاندان لندن میں تھا۔ اور معاملہ زیر غور تھا کہ ایک ایک کار تو سون کے جھگڑوں اور گورنمنٹ کی صندے ۱۲۵۵ھ بمطابق ۱۸۴۰ء میں قدر پیدا کر دیا۔ اور میرٹھ سے بیگالے تک ایسی آگ لگی کہ اپنے پر ائے سب کے گھر جل اٹھے۔ اور ایسا فتنہ عظیم پیدا ہوا کہ ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کی بنیاد ہی متزلزل نظر آتی تھی۔ جس طرح میرٹھ وغیرہ کے باغی ہر طرف سے سمٹ کے دہلی میں جمع ہوئے تھے اور ظفر شاہ کو ہندوستان کا شہنشاہ بنایا تھا ویسے ہی الہ آباد و فیض آباد کے باغی مئی ۱۸۵۷ء میں جوش و خروش کے ساتھ لکھنؤ پہنچے۔ اُسے آتے ہی یہاں کے بھی جنت سے بیگڑے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور شاہی خاندان اودھ کا اور کوئی رکن نہ ملا تو واجد علی شاہ کے ایک دس برس کے نابالغ بچے مرزا بہار حسین قدر کو تخت پر بٹھا دیا۔ اور اُن کی ماں نواب حفصہ محل سلطنت کی مختار کل بنیں۔ تھوڑی سی انگریزی فوج جو یہاں موجود تھی اور اُسے ساتھ یہاں کے تمام یوزدین عہدہ داران مملکت جو باغیوں کے ہاتھ سے جان برباد کے بنی گاردین قلعہ بند ہو گئے۔ جس کے گرد باغیوں کے پہنچنے سے پہلے ہی دھس بنالے گئے تھے۔ اور حفاظت و برسر کار فی بندوبست کر لیا گیا تھا۔ غنیمت ہوا یا یہ کہیے کہ قسمت ابھی تھی کہ واجد علی شاہ لکھنؤ سے جا چکے تھے۔ ورنہ وہی خواہ خواہ بادشاہ بنائے جاتے۔ ان کا حشر ظفر شاہ سے بھی بدتر ہوتا۔ اور اودھ کے پریشان سختوں کو ذرا

پہننے کے لیے ٹیا بروج کے دربار کا جو ایک عاریتی سہارا مل گیا تھا یہ بھی نہ نصیب ہوتا۔ اب لکھنؤ میں انگریزوں کی باغی فوج کے علاوہ اودھ کے اکثر زمیندار و تعلقدار اور عہد شاہی کے برطرف شدہ سپاہی کثرت سے جمع تھے۔ اور ان میں شہر کے بہت سے اوباشوں اور ہر طبقے کے لوگوں کا طوفان بے تمیزی بھی شریک ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ قنوطے سے انگریزوں پر ایک ہڈائی کا زعم ہے۔ مگر فرق یہ تھا کہ محاصرہ کرنے والوں میں سوا اوباش اہل شہر اور بے اصول و خود سر دیان شجاعت کے ایک بھی ایسا شخص نہ تھا جو اصول جنگ سے واقف ہو۔ اور تمام منتشر قوتوں کو یکجا کر کے ایک با منابطہ فوج بنا سکے۔ بخلاف اسکے انگریز اپنی جان پر کھیل کے اپنی حفاظت کرتے سمہ پھیلی پرلے کے حملہ آوروں کو روکتے تھے۔ اور جدید اصول جنگ سے بخوبی واقف تھے۔

اب لکھنؤ میں برجیس قدر کا زمانہ اور حضرت محل کی حکومت تھی۔ برجیس قدر کے نام کا سکہ جاری ہوا۔ عہدہ داران سلطنت مقرر ہوئے۔ ملک سے تحصیل وصول ہونے لگی۔ اور صرف تفتن طبع کے طور پر محاصرے کی کارروائی بھی جاری تھی۔ لوگ حضرت محل کی مستعدی و نیک نفسی کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ سپاہیوں کی نہایت قدر کرتی اور ان کے کام اور حوصلے سے زیادہ انعام دیتی تھیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ خود پردے سے نکل کے فوج کی سپہ سالاری کریں۔ مشیر اچھے نہ تھے اور سپاہی کام کے نہ تھے۔ ہر شخص غرض کا بندہ تھا۔ اور کوئی کسی کا کہنا نہ مانتا تھا۔ انگریزی فوج کے باغی اس غرور میں تھے کہ یہ فقط ہمارے دم کا ظہور ہے۔ اصلی حاکم ہم ہی ہیں۔ اور جسکے سر پر جو تار رکھ دیں وہی بادشاہ ہو جائی۔ احمد اللہ نام ایک شاہ صاحب جو فیض آباد کے باغیوں کے ساتھ آئے تھے اور کئی معرکوں میں لڑ چکے تھے وہ الگ اپنا عیب بجا رہے تھے بلکہ خود اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ برجیس قدر کے مقابل لکھنؤ ہی میں ان کا دربار الگ قائم تھا اور دونوں درباروں میں پولیسٹل اختلاف کے ساتھ شیعہ سنی کا جھگڑا اور تقصیب بھی نمایاں ہونے لگا۔ غرض بادشاہ اور شاہ صاحب میں رقابت بڑھتی جاتی تھی۔ آخر اسی سال نومبر کے مہینے میں برجیس قدر کی تخت نشینی کو چھ ہی سات مہینے ہوئے تھے کہ انگریزی

فوج لکھنؤ پر تسلط حاصل کرنے کے لیے آگئی۔ جسکے ساتھ پنجاب کے سکھ اور بھوٹان کے پہاڑی بھی تھے۔ اور کہا جاتا ہے کہ انھیں لوگوں نے زیادہ مظالم کیے۔ وہی تین دن کی گونہ باری مین نئی سلطنت کا جو نقش قائم ہوا تھا مگر ٹی کے جلنے کی طرح ٹوٹ کے رہ گیا۔ ہزار ہا افرادین کے ساتھ حضرت محل اور جیس قدر نیال کی طرف بھاگے۔ شاہ صاحب نے دو تین دن لڑ لڑ کے اگرچہ جیس قدر کے لیے آزادی سے بھاگنے کا موقع پیدا کر دیا مگر خود اپنی جان نہ بچا سکے۔ شکست کھا کے بھاگے باڑی اور محمدی ہوتے ہوئے پوائین مین پہنچے۔ وہاں کسی نے گولی مار دی۔ پوائین کے راجہ نے سرکاٹ کے انگریزوں کے پاس بھیجا اور صلے مین انجام دیا گیا۔

آبادی کو باغیوں سے مداف کرنے کے لیے انگریزوں نے شہر مین سخت گورنار کی۔ ساری رعایا گھبرا اٹھی۔ زن و مرد گھر چھوڑ چھوڑ کے بھاگے۔ اور ایک سی تیاست بپا ہو گئی کہ جن لوگوں نے دیکھا ہے آج تک یاد کر کے کانپ جاتے ہیں۔ محلوں کی بیٹھنے والیاں جن کی صورت کبھی آفتاب تک نے نہ دیکھی تھی برہمن پانچگون کی خاک چھانتی پھرتی تھیں۔ بکسی مین ایک ایک کا دامن کپڑتی تھیں۔ اور جو لٹا تھا دشمن ہی لٹا تھا۔ اور سدی کا یہ مصرعہ پوری طرح صادق آ رہا تھا کہ "یاران فراموش کردند عشق"۔ اسی حالت مین فتحیاب فوج نے شہر کو لٹا۔ اور بعد خرابی بعد خدا خدا کر کے لوگوں کو پھر اپنے گھروں مین آنے کی اجازت ملی۔ اب ایک تھلکہ کے بعد جو امن قائم ہوا تھا وہ بفضلہ تعالیٰ آج تک قائم اور روز بروز ترقی کر رہا ہے۔ لیکن پرانی دولت کے وابستگان دامن اور اعز کے شاہی جو انقلاب سلطنت کے بعد بالکل بیکار ہو گئے اور نئی سلطنت سے فائدہ اٹھانے کی لیاقت نہ رکھتے تھے اٹھے ہی چلے گئے۔ چنانچہ بڑے بڑے دولتمند اور معزز گھرانوں کے پامال و تباہ ہونے کا سلسلہ مدت تک برابر جاری رہا۔ محلے کے محلے اُچڑتے چلے جاتے تھے۔ اور خاندان کے بعد خاندان مٹ رہا تھا۔ اور اکثر لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ چند روز کے بعد لکھنؤ کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ لیکن انجام مین سرکار انگریزی کی وہ تیرین جھینون نے ساری دنیا مین انگریزوں کی نوآبادیان قائم کرادی مین غالب

آئین اور لکھنؤ حادث زمانہ کی دست برد سے حج کے پٹیا۔ جن کو ٹٹا تھا سٹ گئے اور جو باقی رہے سنبھلنے کے قابل ہو گئے۔ اور اگر سٹر ٹیلر کے ایسے چند اور حاکم لکھنؤ کو مل گئے تو اُمید ہے کہ آئندہ بہت ترقی کرے گا۔

ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ اسی سلسلہ واقعات میں ہم واجد علی شاہ کی باقیہ زندگی اور اُنکے قیام کلکتہ کے حالات بھی اپنے ناظرین کے سامنے پیش کر دیں۔ کیونکہ بغیر اس کے اس تاریخ کا مکملہ نہیں ہو سکتا۔ کلکتہ میں خود ہمارا بچپن بادشاہ کے محل حمایت میں بسر ہوا ہے۔ اور گزشتہ واقعات کے حالات اگر ہم نے لوگوں سے سُن کے اور اوراقِ تاریخ میں پڑھ کے بیان کیے ہیں تو آئندہ اکثر چشم دید حالات بیان کریں گے۔

کلکتہ سے تین چار میل کی مسافت پر جنوب کی طرف دریائے بھاگا رتی (بھگلی) کے کنارے گاؤں "پچ" نام ایک خاموش محلہ ہے۔ اور چونکہ وہاں ایک سٹی کا تودہ سا تھا اس لیے عام لوگ اُسے ٹیا برج کہتے تھے۔ یہاں کئی عالیشان کوٹھیاں تھیں جن کی زمین دریا کے کنارے تقریباً دو ڈھائی میل تک چلی گئی ہے جب واجد علی شاہ کلکتہ میں پہنچے تو گورنمنٹ آف انڈیا نے یہ کوٹھیاں انھیں دیدین دو خاص بادشاہ کے لیے۔ ایک نواب خاص محل کے واسطے اور ایک علی نقی خان کی سکونت کے لیے جو بادشاہ کے ساتھ تھے۔ اور ان کے گرد زمین کا ایک بڑا قطعہ جو عرض میں دریا کنارے سے تقریباً میل ڈیڑھ میل تک چلا گیا تھا اور اُس کا حلقہ چھ سات میل سے کم نہ ہو گا بادشاہ کو اپنے اور اپنے ملازمین کے قیام کے لیے دیا گیا۔ میونسپلٹی کی شرک اس رقبے کو طویل قطع کرتی تھی۔ وہ دو کوٹھیاں جو بادشاہ کو دی گئی تھیں اُنکے نام بادشاہ نے سلطان خانہ اور آسم منزل قرار دیے۔ اور نواب خاص محل کی کوٹھی پر بھی جب بادشاہ نے قبضہ کر لیا تو اُس کا نام برج ستر رکھا۔ اور علی نقی خان کی کوٹھی آخر تک انھیں کے قبضے میں اور اُن کے بعد اُن کی اولاد خصوصاً نواب اختر محل کے قبضے میں رہی جو علی نقی خان کی بیٹی اور بادشاہ کی ممتاز بی بی بلکہ اُن کے دوسرے ولی عہد مرزا خوش سجت بہادر کی ان تھیں۔

عذر کے زمانے میں انگریزی فوج کے باغی افسروں نے ارادہ کیا کہ اگر بادشاہ اُنکے حکمران بنیں تو وہ کلکتے میں بھی عذر کر دیں۔ مگر بادشاہ نے گورنمنٹ آف انڈیا کے معاملے میں یہ روش نہ تخت و تاج سے جدا ہوتے وقت اختیار کی تھی اور نہ اب پسند کی۔ بلکہ لاٹ صاحب کو اُن لوگوں کے ارادے کی اطلاع کر دی۔ جس پر اُن کا شکر یہ ادا کیا گیا۔ مگر دہری چار روز بعد مناسبت سمجھا گیا کہ بادشاہ کو تعلقہ فورٹ ولیم میں رکھا جائے تاکہ پھر کبھی باغیوں کی اُن تک رسائی نہ ہو سکے۔ لندن میں اُنکی جانب سے جو مقدمہ پیش تھا وہ اس بنا پر ملتوی کر دیا گیا کہ جس ملک کے لیے یہ دعویٰ ہے وہ اب ہمارے قبضے ہی میں نہیں جب اُسپر پھر دولت برطانیہ کا قبضہ ہوئے گا تب دیکھا جائے گا۔

بادشاہ اس حراست ہی میں تھے کہ لکھنؤ کا عذر ضرور ہو گیا۔ اور مسیح الدین خان نے جو لندن میں بادشاہ کے مختار غلام تھے پھر اپنا دعویٰ پیش کیا۔ اُنھیں بادی النظر میں کامیابی اور استرداد سلطنت کی پوری امید تھی۔ مگر ہمتی سے اُن لوگوں میں جو قلعے میں بادشاہ کے میسر اور مصاحب تھے خواہ کسی بیرونی تحریک سے یا خود اپنے نفع کے خیال سے ایک سازش ہوئی۔ ان لوگوں نے خیال کیا کہ اگر مسیح الدین خان مقدمہ حبس گئے تو ہمارا بازار سرد پڑ جائے گا اور وہی وہ رہ جائیگا لہذا سب نے بادشاہ کو سمجھانا شروع کیا کہ ”جہان پناہ بھلا کبھی کسی نے ملک لے کے دیا ہے؟ مسیح الدین خان نے حضور کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ ہونا ہونا کچھ نہیں ہے۔ اور جہان پناہ مفت میں تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ ڈیڑھ دو سال سے تنخواہ نہیں لی ہے۔ ہریات کی تنگی ہے۔ اور ہم ملازمان دولت بھی پیسے پیسے کو محتاج ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ حضور گورنمنٹ انگریزی کی تجویز دن کو قبول کر لیں۔ اور تنخواہ وصول کر کے اطمینان و قانع البالی سے اپنے محلات عالیات اور استان بوسان دولت کے ساتھ بسر فرمائیں۔“ بادشاہ کو خرچ کی تنگی تھی۔ اور بادشاہ سے زیادہ اُن کے رفقا پریشان تھے۔ معاحبوں نے جب بار بار یہ تجویز پیش کی تو بلا تکلف حضور و سیرلے کی خدمت میں لکھ بھیجا ”مجھے سرکار انگریزی کی مجوزہ مایہوار لینا منظور ہے۔ لہذا میری اس وقت تک کی تنخواہ دی جائے۔ اور مقدمہ جو لندن

میں دائر ہے خارج کیا جائے۔ " جواب ملا " اب آپ کو اوّل تو گزشتہ ایام کی  
 یاد دہانی دی جائے گی۔ صرف اسی وقت سے مابہوار جاری ہوگی۔ دوسرے فقط  
 بارہ لاکھ روپیہ سالانہ دیے جائیں گے۔ اور جو تین لاکھ روپیہ سالانہ آپ کے  
 ملازمین کے لیے تجویز کیے گئے تھے اب ان کے دینے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔"  
 بظن غالب بادشاہ اس نقصان کو گوارا نہ کرتے۔ مگر مصاحبوں نے اس پر  
 بھی راضی کر دیا۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا نے انگلستان میں اطلاع دی کہ  
 واجد علی شاہ نے گورنمنٹ کی تجویز کو منظور کر لیا۔ لہذا ان کا مقدمہ خارج کیا  
 جائے۔ یہ واقعات میں نے خود اپنے نانا منشی قمر الدین صاحب کی زبان سے سنے  
 ہیں۔ جو جناب عالیہ کے ہمراہی دفتر کے میر منشی اور مولوی مسیح الدین خان کے  
 نائب خاص تھے۔ اور کل کارروائیاں انھیں کے ہاتھ سے عمل میں آتی تھیں  
 بادشاہ کے مابہوار پر راضی ہو جانے کی خبر جیسے ہی لندن میں پہنچی مسیح الدین خان  
 کے حواس جاتے رہے۔ بادشاہ کی مان۔ اُنکے بھائی۔ اور ولیعهد نے سرپیٹ  
 لیا۔ اور حیران تھے کہ یہ کیا غضب ہو گیا۔ افسوس اس وقت تک کاسب کیا  
 دھوا خاک میں ملا جاتا ہے۔ آخر مسیح الدین خان نے سوچتے سوچتے ایک بات  
 پیدا کی۔ اور پارلیمنٹ میں یہ قانونی عذر پیش کیا کہ "بادشاہ فی الحال گورنمنٹ  
 آف انڈیا کی حراست میں ہیں اور اسی حالت میں اُنکی کوئی تحریر یا یہ اعتبار کو  
 نہیں پونج سکتی" عذر معقول تھا۔ تسلیم کیا گیا۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا کو  
 بادشاہ کے مختار کی عذرداری سے مطلع کیا گیا۔ ساتھ میں مسیح الدین خان  
 اور تمام ارکان خاندان شاہی نے بادشاہ کو لکھا کہ "یہ آپ کیا غضب کر رہے ہیں  
 ہمیں ملک اودھ کے واپس ملنے کی پوری امید ہے" اب عذر فرو ہو چکا تھا۔  
 گورنمنٹ نے بادشاہ کو چھوڑ دیا۔ اور وہ خوشی خوشی قلعے سے نکل کے مٹیابرج  
 میں آئے۔ اور آزادی حاصل ہوئی ہی تھی کہ مصاحبوں نے عرض کیا "حضور!  
 مسیح الدین خان لندن میں یہ کہہ رہے ہیں کہ جہاں پناہ نے تنخواہ لینے کو صرف  
 قید ہونے کی وجہ سے منظور کر لیا ہے" یہ سنتے ہی بادشاہ نے برا فروختہ ہو کے  
 اُسی وقت لکھ بیٹھا کہ "ہم نے آزادی سے بہ رضا و رغبت گورنمنٹ کی تجویز کو منظور

کیا ہے۔ اور مسیح الدین خان کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہم نے قید میں ہوتے یا کسی حیرت  
اکراہ کی وجہ سے منظور دی ہے۔ لہذا ہم آئندہ کے لیے اُس مختار نامے ہی کو فرسوخ  
کے دیتے ہیں جس کی رُو سے وہ ہمارے مختار عام بنائے گئے ہیں۔

اب کیا تھا؟ ساری کارروائی ختم ہو گئی۔ بادشاہ ٹیپو برج میں رنگ رلیاں  
منانے لگے۔ مصاحبوں کے گھروں میں ہن برسنے لگا۔ اور شاہی خاندان کا شکستہ  
حال قافلہ جو انگلستان میں پڑا ہوا تھا۔ قریب قریب وہیں تباہ ہو گیا۔ اکثر ہمایوں  
نے ساتھ چھوڑ دیا۔ بادشاہ کی مان جناب عالیہ اس صدمے سے بچار ہو گئیں۔ اور  
اُسی بیمار میں چلین کے ملک فرانس سے ہوتی ہوئی مقامات متبرکہ میں جائیں۔ او  
انکی زیارت سے شرفیاب ہو کے نکلتے پوینچین۔ مگر موت نے پیرس سے آگے قدم نہ  
بڑھنے دیا۔ وہیں انتقال کیا۔ اور عثمانی سفارت خانہ فرانس کی مسجد کے متصل مسلمانوں  
کا ایک قبرستان ہے اُسی میں دفن ہوئیں۔ مرزا سکند جہت کو مان کے مرنے کا  
اس قدر صدمہ ہوا کہ مان کے مرنے ہی خود بھی بیمار پڑ گئے۔ اور مان کے چودہ پندہ  
روز بعد وہ بھی مان کے برابر یوم جزا کا انتظار کرنے کے لیے لٹا دیے گئے۔ اکیلے مرزا  
ولی عہد بہادر ملکہ واپس آ کے مان باپ سے ملے۔

کہتے ہیں کہ ابتدا ٹیپو برج میں بھی بادشاہ کی زندگی نہایت ہی سید اور مغزی  
اور ہوشیار رہی کی تھی۔ یہ حالت دیکھ کے گرد و پیش کے لوگوں نے چند آلات موسیقی  
فراہم کر دیے۔ نوٹس و دبستان یاد دہانیں کا پورا پورا مصنفون صادق آگیا۔ اور  
ارباب نشاط کا گروہ وہاں بھی جمع ہونے لگا۔ ہندوستان کے اچھے اچھے گویے  
آ کے ملازم ہوئے اور ٹیپو برج میں موسیقی دانوں کا ایسا مجمع ہو گیا تھا کہ اور کسی  
جگہ نہ تھا۔

خوبصورت عورتوں کے جمع کرنے اور حسن و عشق کے کرشموں میں پھنسے رہنے کا  
وہاں بھی دیباہی شوق تھا جیسا کہ لکھنؤ میں سنا جاتا ہے۔ مگر ٹیپو برج میں اس شوق  
میں مذہبی احتیاط کا پورا لحاظ رہتا۔ بادشاہ شیعہ تھے۔ اور شیعوں کی شرع میں  
مشہور بغیر کسی تحدید اور روک کے جائز ہے۔ اس مذہبی آزادی سے فائدہ اُٹھا کے  
بادشاہ جی بھر کے اپنا شوق پورا کر لیتے۔ اور قاعدہ تھا کہ غیر متوہ عورت کی صورت

تک دیکھنا گوارا نہ کرتے۔ یہ احتیاط اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ ایک جوان  
 بیشتن جو بادشاہ کے سامنے زمانے میں پانی لاتی اُن سے بھی متہ کر کے اُسے  
 نواب آف رسالیم کا خطاب دے دیا۔ ایک جوان خاک روہن جس کی حضور  
 میں آمد و رفت رہتی وہ بھی ممتوعات میں داخل ہو کے نواب مصفا بیگم کے خطاب  
 سے سرفراز ہوئی۔ اسی طرح موسیقی کا شوق بھی ممتوعات ہی تک محدود رہتا۔ شاید  
 شاذ و نادر ہی اس کا اتفاق ہوا ہوگا کہ بادشاہ نے کبھی کسی بازاری طوائف کا  
 مجرا دیکھا ہو۔ خود ممتوعات کی مختلف پارٹیاں بنا دی گئی تھیں جن کو مختلف طرز پر  
 رقص و سرود کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ایک آدھ منزل والیاں۔ ایک چھوٹا  
 والیاں۔ ایک ٹلن والیاں۔ ایک سارو منزل والیاں۔ ایک تھو والیاں۔  
 ایک گھونٹ والیاں۔ ایک دھس والیاں۔ ایک نقل والیاں۔ اور اسی طرح  
 کے بیسیوں گروہ تھے جن کو رقص و سرود کی اعلیٰ تعلیم دی گئی تھی۔ اور انھیں کے  
 تاج گانے میں اُن کا دل بہلتا۔ ان سب سے متہ ہو گیا تھا۔ بیچین کہلاتی تھیں۔  
 اور دو ایک گروہوں میں اگر چند کسوں و نابالغ لڑکیاں غیر متوہ تھیں تو اس لیے  
 تھیں کہ بعد بلوغ داخل ممتوعات کر لی جاتی تھیں۔ ان میں سے اکثر خود بادشاہ  
 کے قریب خاص سلطان خانے میں رہتیں۔ اور بعض کو دوسری کو بیویوں میں جدا  
 محسراتین ملی تھیں۔ ان ممتوعات میں سے جو صاحب اولاد ہو جاتیں اُن کو  
 محل کا خطاب دیا جاتا۔ رہنے کو جداگانہ محسراتین۔ اور اُن کی تنخواہ اور عزت  
 بڑھ جاتی۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ موسیقی کے سوا اور تمام حقیقتوں سے بادشاہ بڑے  
 متقی و پرہیزگار اور پابند شرع تھے۔ نماز کبھی قصائد ہوتی تھی۔ بیسوں روزے  
 رکھتے تھے۔ افیون۔ شراب۔ فلک میر۔ یا اور کسی قسم کے نشے سے زندگی بھر احتراز  
 رہا۔ اور محرم کی عزاداری نہایت ہی خلوص عقیدت سے بجا لاتے تھے۔

تیسرا شوق اُنھیں غارت کا تھا۔ سلطان خانے کے گرد بیسیوں محسراتین تعمیر  
 ہو گئیں۔ اور بہت سی نئی کوٹھیاں اور اُن میں محسراتین بنیں۔ گورنمنٹ سے  
 صرف سلطان خانہ۔ اسد منزل۔ اور مرصع منزل ملی تھیں۔ مگر بادشاہ کے شوق



نے چند ہی روز میں بیویوں کو ٹھیکان تعمیر کرا دیں جن کے گرد نہایت ہی پرفضا باغ اور فرحت بخش چمن تھے۔ جس وقت میں نے دیکھا ہے بادشاہ کے قبضے میں مندرجہ ذیل مالیشان کو ٹھیکان یقین جو جنوب سے شمال تک ترتیب وار چلی گئی یقین۔ سلطان خانہ۔ قیصر لیلیا۔ گوشہ سلطانی۔ شہنشاہ منزل۔ مرغی منزل۔ اسد منزل۔ شاہ منزل۔ وزیر منزل۔ تفریح بخش۔ بادشاہی۔ آستانہ۔ تہمت منزل۔ حد سلطانی۔ سد سلطانی۔ مذاکات منزل۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی کو ٹھیکان یقین جن کے نام مجھے یاد نہیں رہے۔

ان کے مابوا باغوں کے اندر تالابوں کے کنارے بہت سے کمرے بنائے اور چھوٹی چھوٹی کوشکیں یقین۔ ان تمام کو ٹھیوں۔ متفرق کمروں۔ بنگلون اور کوشکوں میں صاف ستھرا۔ پر تکلف فرش بچھا رہتا۔ چاندی کے چٹا بکچھوڑوں اور ٹکیوں سے مکمل لگے رہتے۔ تصویریں اور طرح طرح کا فرنیچر آراستہ ہوتا تھا اور محض پردہ و رش کے خیال سے ضرورت سے زیادہ مکاندار مقرر تھے جو روز بھار اور ہر چیز کو صفائی اور قرینے سے آراستہ رکھتے۔ غرض ہر کوٹھی بجائے خود اس قدر آراستہ و پیراستہ نظر آتی کہ انسان عیش عیش کر جاتا۔ کو ٹھیوں کے گرد کے باغ اور چمن ایسی ہندسی ترتیبوں اور اقلیدس کی شکلوں کے مطابق بنائے گئے تھے کہ دیکھنے والوں کو بادشاہ کی مناسبت طبعی پر تعجب ہوتا۔

لکھنؤ میں تو بادشاہ نے صرف قیصر باغ اور اُس کے پاس کی چند عمارتیں یا اپنے والد مرحوم کا امام باڑہ اور مقبرہ ہی تعمیر کیا تھا مگر ٹیپا بروج میں نفیس اور اعلیٰ عمارتوں کا ایک خوبصورت شہر بسا دیا تھا۔ دریا کے اُس پار ٹیپا بروج کے عین مقابل کلکتے کا مشہور بوٹیکل گارڈن ہے۔ مگر وہ ٹیپا بروج کی دنیوی جنت اور اُس کے دلکش عجائبات کے سامنے مٹ گیا تھا۔ ان تمام عمارتوں۔ چمنوں۔ کنجوں۔ اور وسیع و نہایت بخش مرغزاروں کے گرد لمبہ دیواروں کا احاطہ تھا مگر میونسپلٹی کی شاہراہ عام کے کنارے کنارے تقریباً ایک میل تک شان دار دکانیں یقین اور ان میں وہی ادنیٰ درجے کے ملازمین رہنے پاتے تھے جن کو اپنے فرائض کے لحاظ سے وہاں رہنے کی ضرورت تھی۔ مگر اندر جانے کا راستہ

سوا پھاٹگون کے جن پر پرہ رہتا کسی دکان میں سے نہیں رکھا گیا تھا۔ خاص سلطان خانے کے پھاٹک پر نہایت عالیشان ٹوبت خانہ تھا۔ تقارچی ٹوبت بجاتے۔ اور پُراتے ہر دن اور گھڑیوں ہی کے حساب سے شب و روز گھڑیاں بجا کرتا۔ دنیا میں عمارت کے شوقین ہزاروں بادشاہ گذرے ہیں۔ مگر غالباً اپنی ذات سے کسی تاجدار نے اتنی عمارتیں اور اتنے باغ نہ بنوائے ہونگے جتنے کہ واجد علی شاہ نے اپنی ناکام زندگی اور برے نام شاہی کے مختصر زمانے میں بنائے۔ شاہجہان کے بعد اس بارہ خاص میں اگر کسی کا نام لیا جاسکتا ہے تو وہ اسی ستم زدہ شاہ اودھ کا نام ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی خاص عمارت سیکڑوں ہزاروں سال تک باقی رہی اور کسی کی مدد یا عمارتیں زمانے نے چند ہی روز میں مٹا کے رکھ دیں۔ عمارت کے علاوہ بادشاہ کو جانوروں کا شوق تھا۔ اور اس شوق کو بھی اُنھوں نے اس درجے تک پہنچا دیا کہ دنیا اُس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز رہے۔ اور شاہ کوئی شخصی کوشش آج تک اُس کے نصف درجے کو بھی نہ پہنچ سکی ہوگی۔ نور تنزل کے سلسلے خوشنما آہنی کھڑے سے گھیر کے ایک دیس رسنہ بنایا گیا تھا۔ جس میں صمد ہا چیتل۔ ہرن۔ اور وحشی چوپائے چھوٹے پھرتے تھے۔ اسی کے درمیان سنگ مرمر کا ایک پختہ تالاب تھا جو ہر وقت ملبہ رہتا۔ اور اُس میں شتر مرغ۔ کتوری۔ فیل مرغ۔ سارس۔ قازین۔ بگلے۔ قرقے۔ ہنس۔ مور۔ چکورا اور صد ہا قسم کے پورا اور کچھوٹے چھوڑ دیے گئے تھے۔ صفائی کا اس قدر اہتمام تھا کہ بجال کیا جو کہیں بیٹ یا کسی جانور کا بد بھی نظر آ جائے۔ ایک طرف تالاب کے کنارے کھڑوں میں بیٹھتے۔ اور اس رسنہ کے پاس ہی سے لکڑی کے سلاخوں دار بڑے بڑے ٹافوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا جس میں میوین طرح کے اور خدا جانے کہاں کہاں کے بندر لاکے جمع کیے گئے تھے جو عجیب عجیب برکتیں کرتے۔ اور انسان کو بغیر اپنا تماشا دکھائے گئے نہ بڑھنے دیتے۔ مختلف جگہ حوضوں میں پھیلیاں پالی گئی تھیں جو اشارے پر جمع ہو جاتیں۔ اور کوئی کھانے کی چیز ڈالیے تو اپنی اچھل کود سے خوب بہار دکھاتیں۔ سب پر طرہ یہ کہ شہنشاہ منزل کے سامنے ایک بڑا سا لمبا اور گہرا حوض قائم کر کے اور اس

کے کناروں کو چاروں طرف سے خوب چکنا کر کے اور آگے کی طرف بھٹک کے اُس کے  
بیچ میں ایک مصنوعی پہاڑ بنایا گیا تھا جس کے اندر سیکڑوں نالیوں کو ڈرائی گئی تھیں۔  
اور اوپر سے دو ایک جگہ کاٹ کے پانی کا چشمہ بھی بہا دیا گیا تھا۔ اس پہاڑ میں  
ہزاروں بڑے بڑے دو دو تین تین گز کے لمبے سانپ چھوڑ دیے گئے تھے جو برابر دوڑتے  
اور رینگتے پھرتے۔ پہاڑ کی چوٹی تک چڑھ جاتے اور پھر نیچے اتر آتے۔ مینڈکین  
چھوڑی جاتیں۔ انھیں دوڑ دوڑ کے پکڑتے۔ پہاڑ کے گرد اگر دھنر کی شان سے  
ایک نالی تھی۔ اُس میں سانپ لہرا لہرا کے دوڑتے اور مینڈکوں کا تقابب کرتے۔  
اور لوگ بلا کسی خوف کے پاس کھڑے سیر دکھا کرتے۔ اس پہاڑ کے نیچے بھی دو  
کھڑے تھے جن میں دو بڑی بڑی جیتین رکھی گئی تھیں۔ یوں تو خاموش پڑی  
رہتیں لیکن جس وقت مرغ لاکے چھوڑا جاتا اُسے جھپٹ کے پکڑتیں اور مسلم  
نگل جاتیں۔ سانپوں کے رکھنے کا انتظام اس سے پہلے شاید کہیں نہ کیا گیا ہوگا۔  
اور یہ خاص و اجد علی شاہ کی ایجا دہی جسکو یورپ کے سیاح حیرت سے دیکھتے  
اور اس کی تصویریں اور شرح کیفیت قلم بند کرے جاتے تھے۔

مذکورہ جانوروں کے علاوہ ہزار ہا طیور کے چمکتے ہوئے برنجی چمبے خاص  
سلطان خانے کے اندر تھے۔ میوے بڑے بڑے اہل تھے جو لوہے کے جال سے  
محفوظ کر دیے گئے تھے اور گنج کھلاتے تھے۔ ان میں قسم قسم کے طیور کثرت سے  
لاکے چھوڑ دیے گئے تھے۔ اور اُنکے رہنے اور نشوونما پانے کا پورا سامان فراہم  
کیا گیا تھا۔ بادشاہ کی کوشش تھی کہ چرنند پرند میں سے جتنی قسم کے جانور دستیاب  
ہو سکیں سب جمع کر لیے جائیں۔ اور واقعی ایسا مکمل زندہ عجائب خانہ شاید رو  
زمین پر کہیں موجود نہ ہوگا۔ ان جانوروں کی فراہمی میں بہت روک روپی صرف  
کیا جاتا۔ اور کوئی شخص کوئی نیا جانور لائے تو مائے دایم پاتا۔ کہتے ہیں  
کہ بادشاہ نے رستم پرے کیو تر دن کا جوڑا چوبیس ہزار روپے کو اور عقیدہ مور کا جوڑا  
گیارہ ہزار روپے کو لیا تھا۔ اور آدھو افریقہ کا بہت بڑا اور نہایت عجیب جانور  
سے اُس کا بھی ایک جوڑا موجود تھا۔ دو کو ان کے بندادی اونٹ ہندوستان  
میں کہیں نہیں نظر آتے اور بادشاہ کے وہاں تھے۔ کلکتہ میں اُنہی مطلق نہیں ہیں

مگر بادشاہ کے اس زندہ بچل ہسٹری یوزیم میں ایک ہاتھی بھی تھا۔ محض اس خیال سے کہ کوئی جا فورہ نہ جائے دو گدھے بھی رستے میں لاکے چھوڑ دیے گئے تھے۔ درندوں میں سے شیربیر۔ دبی شیر۔ چیتے۔ تیندوے۔ بچھ۔ سیاہ گوش۔ چرخ۔ بھیڑیے۔ سب کھڑوں میں بند تھے اور بڑی خاطرہ اشت سے رکھ جاتے۔ کبوتروں کا انتظام دیگر جانوروں سے الگ تھا۔ بادشاہ کی مختلف کوٹھیوں میں سب ملا کے چوبیس بچھیں ہزار کبوتر تھے۔ جن کے اڑاتے میں کبوتر بازوں نے بڑے بڑے کمالات دکھائے تھے۔

جانوروں پر جو صرف ہو رہا تھا اس کا ناقص اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آٹھ سو سے زیادہ جانور ہزار تھے۔ تین سو کے قریب کبوتر ہزار تھے۔ اسی کے قریب ماہی پرور تھے۔ اور تیس چالیس مار پرور تھے۔ جن کو دس روپیہ ماہوار سے لے کے پھر روپیہ ماہوار تک تنخواہیں ملتی تھیں۔ افسروں کی تنخواہیں تیس سے بیس روپیہ تک تھیں۔ اور کبوتروں سانپوں اور کھلیوں کے علاوہ دیگر جانوروں کی خوراک میں کچھ کم فوہزار روپیہ ماہوار صرف ہوتے تھے۔ عمارت کا کام زیادہ تر مولس الدولہ اور ریحان الدولہ کے سپرد رہا جن کو عمارت کی مدین تقریباً پچیس ہزار ماہوار ملا کرتے تھے۔

ہزار کے قریب پرے کے سپاہی تھے جن کی تنخواہیں عموماً پھر روپیہ ماہوار تھیں۔ بعض بعض آٹھ یا دس روپے بھی پاتے۔ یہی تنخواہ مکان داروں کی تھی جن کا شمار پانچ سو سے زیادہ تھا۔ مالیوں کی بھی یہی تنخواہ تھی۔ اور ان کا شمار بھی پانچ سو سے زیادہ تھا۔ تقریباً اسی اہل قلم یعنی محرر تھے جو تیس سے دس روپیہ ماہوار تک تنخواہ پاتے تھے۔ معزز صاحبوں اور اعلیٰ عہدہ داروں کا شمار پچاس پچاس سے کم نہ ہو گا جو اٹھاسی روپیہ ماہوار پاتے تھے۔ سو سے زیادہ کہا رہے ان کے علاوہ بیسیوں چھوٹے چھوٹے تھے۔ باورچی خانہ۔ آبدار خانہ۔ بھنڈی خانہ۔ خس خانہ۔ اور خدا جانے کیا کیا تھا۔ پھر ایک مددواری بیگات سے متوعات کے رشتہ داروں اور بھائی بندوں کی بھی جینیں حسب حیثیت تنخواہیں ملتی تھیں۔

ان سب لوگوں نے کوٹھیوں کے عقبے سے باہر نیا وہ تر اسی زمین پر جو بادشاہ کو دی گئی تھی اور بہتوں نے پاس کی دوسری زمینوں پر مکان بنالے تھے۔ اور ایک شہر بس گیا تھا جس کی مردم شماری چالیس ہزار سے زیادہ تھی۔ ان سب کی زندگی بادشاہ کی خواہ کے ایک لاکھ روپہا ہوا سے وابستہ تھی۔ اور کسی کی بچپن نہ آتا تھا کہ اتنی خلقت عظیم اس قلعہ کی سی رقم میں کیونکر زندگی بسر کر لیتی ہے۔ جنگل کے عوام میں یہ مشہور تھا کہ بادشاہ کے پاس پاس پتھر ہے۔ جب ضرورت ہوتی ہے لوہے یا تانبے کو اُس میں رگڑ کے سونا بنالیا کرتے ہیں۔

حقیقت حال یہ ہے کہ بادشاہ کے قیام سے کلکتے کے پڑوس میں ایک دوسرا لکھنؤ آباد ہو گیا تھا۔ اصلی لکھنؤ مٹ گیا تھا اور اُس کی منتخب صحبت مٹا بُرج میں چلی گئی تھی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اُن دنوں لکھنؤ لکھنؤ نہیں رہا تھا مٹا بُرج لکھنؤ تھا۔ یہی چل چل تھی۔ یہی زبان تھی۔ یہی شاعری تھی۔ یہی صحبتیں اور بزمِ بختیاں تھیں۔ یہیں کے علما و اقلیت تھے۔ یہیں کے امرا و رؤساء تھے۔ اور یہیں کے عوام تھے۔ کسی کو نظری نہ آتا تھا کہ ہم جنگلے میں ہیں۔ یہی تنگ بازیاں تھیں۔ یہی مرغ بازیاں تھیں۔ یہی بٹیر بازیاں تھیں۔ یہی ایفونی تھے۔ یہی داستان گوئی تھی۔ یہی تعزیر داری تھی۔ یہی مرثیہ خوانی و نوحہ خوانی تھی۔ یہی امام باڑے تھے۔ اور یہی کربلا تھی۔ بلکہ جس جلوس اور شان و شوکت سے بادشاہ کی فریج اٹھتی تھی لکھنؤ میں عہد شاہی میں شاید اٹھ سکی ہو۔ غدر کے بعد تو کبھی کوئی تعزیر نہیں اٹھ سکا۔ کلکتے کی ہزار ہا خلقت اور انگریزہ ملک زیارت کو مٹا بُرج میں آجاتے تھے۔

بادشاہ اگرچہ شیعہ تھے مگر مزاج میں مطلق تعصب نہ تھا۔ اُن کا پُرانا مقولہ تھا کہ ”میری دو آنکھوں میں سے ایک شیعہ ہے اور ایک سُنی ہے“ ایک بار دو شخصوں میں مذہبی اختلاف پر مار پیٹ ہو گئی۔ بادشاہ نے دونوں کی عزتوں کا حکم دیا۔ بلکہ اپنے وہاں ممنوع الملازمتہ کر دیا اور فرمایا ”ایسے لوگوں کا میرے یہاں گزر نہیں ہو سکتا“ آخر آخر میں بادشاہ کی ایک کتاب میں بعض ایسے ناگور الفاظ چھپ گئے تھے جن پر کلکتے کے سنیوں میں بڑی شورش ہوئی۔ مگر

اس سے لوگ واقف نہیں ہیں کہ وہ الفاظ اصل کتاب میں نہیں بلکہ دوسروں کی تاریخ یا تقریظ میں تھے۔ اور بادشاہ کو جیسے ہی اطلاع ہوئی بغیر کسی تحریک کے معافی مانگنے کو تیار ہو گئے۔ بے نقیبی کا اس سے زیادہ ثبوت کیا ہوگا کہ سارا انتظامی کاروبار سنٹیوں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ وزیر اعظم مسٹر اللہ بہادر سنٹی تھے۔ بخشی السلطان جو ایک زمانے میں سب سے زیادہ مقرب اور سارے جاوہر خانے، کل اہل قلم، اور کئی اور محکموں کے افسر اعلیٰ تھے سنٹی تھے۔ بخشی امانت الدولہ بہادر جن کے ہاتھ سے کل ملازموں حتیٰ کہ محکموں اور شاہزادوں تک کو تنخواہ ملتی تھی سنٹی تھے۔ عطا رد الدولہ اور داروغہ متبیر علی خان جو آخر میں سب سے بڑے عہدہ دار اور کل کاروبار کے مالک تھے دونوں سنٹی تھے۔ اس سے بڑھ کے کیا ہوگا کہ امام باڑہ، بے طین آباد کا اور محل کے خاص امام باڑے بیت الیکا کا انتظام اور محکموں اور مذہبی تقریروں کے بجالانے کا انصرام بھی سنٹیوں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ وہاں کبھی کسی نے اس کو محسوس ہی نہیں کیا کہ کون سنٹی ہے اور کون شیعہ ہے۔

ٹیپا برج کے دکاندار اور ہاجن تک لکھنؤ کے تھے۔ اور لکھنؤ کی کوئی چیز تھی جو مکمل ترین صورت میں وہاں موجود نہ ہو۔ جدھر گزر جائے ایک عجیب رونق اور چہل پہل نظر آتی۔ اور اُس لطف میں لوگ اس قدر محاورست و از خود رفتہ ہو رہے تھے کہ کسی کو انجام کی خبر ہی نہ تھی۔ عمارات شاہی اور ذمہ وغیرہ کے اندر جانے کی اہل لکھنؤ جملہ ملازمین بلکہ ساکنین ٹیپا برج کو عام آزادی حاصل تھی۔ باغوں میں پھرے تو اُس سے زیادہ پُر فضا مقام کہیں نصیب نہ ہو سکتا۔ دریا کے کنارے کھڑے ہو جائے تو عجیب لطف نظر آتا۔ کلکتے کو آنے جانے والے جہاز سامنے سے ہو کے گذرتے۔ جو فورٹ ولیم کی سلامی کے لیے پھین سے اپنی جھنڈیاں اُتارنا شروع کر دیتے۔ اور لوگ سمجھتے کہ بادشاہ کی سلامی لے رہے ہیں۔ محلات کی ڈیوڑھیوں اور مجلسراؤں کے دروازوں پر کھڑے ہو جاتے تو عجیب لطف کی دھوم دھام میں کبھی کبھی ایسی صورتیں نظر آجاتیں اور ایسی فحش و دلکش زبان اور ایسی مزے مزے کی پیاری باتیں سننے میں

آجائیں کہ انسان مرقون بلکہ زندگی بھر مرہ لیا کرتا۔  
 آہ! یہ خوبصورت اور دلنریب نقش توٹنے کے قابل نہ تھا اگر ہاے زمانے  
 نے مٹا ہی دیا۔ اور ایسا مٹایا کہ گویا تھا ہی نہیں۔ سلسلہ محمدی (۱۳۸۶ء)  
 میں یکا یک بادشاہ کی آنکھ بند ہوئی اور معلوم ہوا کہ ”خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا  
 افسانہ تھا“ سب باتیں خواب و خیال تھیں۔ ایک طلسم تھا کہ یکا یک ٹوٹ گیا۔  
 اور وہ خوبصورت بقعہ جس کی زیارت کی تمنا یورپ کے سلاطین اور ہندوستان کے  
 والیان ملک کو رہا کرتی تھی آج ایک دشتان فنا اور عبرت کہہ ہے۔ جہاں  
 کچھ بھی نہیں۔ جس نے اس اگلے رنگ کو کبھی دیکھا تھا اب وہاں کے ستارے کو  
 دیکھ کے سوا اس کے کہ کمال حسرت و اندوہ کے ساتھ ایک ٹھنڈی سانس بھر کے  
 کہے ”رہے نام اللہ کا!“ اور کیا کر سکتا ہے؟

(۹)

اس دربار کے فرمان رواؤں کی تاریخ میں سے اب صرف اس قدر بتانا باقی  
 ہے کہ مرزا برجیس قدر بہادر لکھنؤ سے بھاگے تو سرحد نیپال پر دم لیا۔ ہمراہ رکاب  
 تقریباً ایک لاکھ آدمیوں کا مجمع تھا۔ ان لوگوں نے ارادہ کیا کہ ہالیہ کی گھاٹیوں  
 میں پناہ گزین ہو جائیں۔ اور جب موقع ملے نکل کے انگریزوں پر حملہ کریں۔  
 فتح ہو تو اپنے وطن پوٹھن۔ شکست ہو تو پھر بھاگ کے پہاڑوں میں ہو رہیں۔  
 مگر یہ بھنے والی صورت نہ تھی۔ ریاست نیپال نہ اتنے آدمیوں کو اپنے وہاں  
 پناہ دے سکتی تھی اور نہ اُنکے لیے انگریزوں سے لڑ سکتی تھی۔ اُس میں اتنی  
 قوت ہی نہ تھی کہ انگریزوں کا مقابلہ کرتی۔ لہذا حکومت نیپال نے صرف مرزا برجیس  
 قدر اور اُن کی مان کو تو پناہ دے دی۔ مگر اُنکے ہمراہی طوفان بے تمیزی کو  
 قطعی حکم دے دیا کہ فوراً واپس جائیں۔ اور نہ جائیں تو مار کے نکال دیے  
 جائیں۔ نیپال کی قلمرو فوراً ان سے خالی کرالی جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب کے  
 سب وہاں سے نکل نکل کے بھاگے۔ بہت سے مارے گئے۔ بہت سے بھیس بدل  
 بدل کے کسی طرف نکل گئے۔ اور مرزا برجیس قدر مع اپنی والدہ کے خاص نیپال  
 میں جا کے سکونت پذیر ہو گئے۔ دربار نیپال سے اُنکے لیے کچھ معمولی وظیفہ مقرر ہوا

اور کہتے ہیں اُن کے ساتھ جس قدر جواہرات تھا سب دولتِ نیپال کی نذر ہو۔ آخر حضرت محل دہین پوتہ زمین ہوئیں۔ اور اُن کے بعد ملک و کوٹریہ کی جو بیٹی کے موقع پر دولتِ برطانیہ نے مرزا پر قبضہ قدر کا قصور معاف کر دیا۔ اُنھیں اُس آنے کی اجازت ملی تو بغیر کسی کو اطلاع دیے نیپال سے بھاگ کے نکلتے ہوئے پہنچے یہاں و آج علی شاہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور بحیثیت اولاد اکبر مرزا آخر قدر سب سے زیادہ تنخواہ پارہے تھے۔ برہمیس قدر نے دعویٰ کیا کہ بادشاہ کے تمام بیٹوں سے زیادہ معزز و مستحق ہیں ہوں۔ اندر سے قانونِ نیشن بادشاہ کی نیشن میں سے ایک ٹلٹ گھٹا کے باقی تنخواہ مجھ پر جاری کی جائے۔ اور اُن کے تمام ورثاء اور وابستگان دامن کی خبر گیری میرے ذمے کی جائے۔ اس کی پیروی میں وہ انگلستان میں جانے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ اُن کے خاندان والوں ہی میں سے کسی نے دعوت کی۔ دعوت سے واپس آئے تو دستِ جاری ہو گئے۔ آنا نا نا حالتِ خراب ہو گئی۔ اور ایک ہی دن میں وہ۔ اُنکی بی بی۔ اور اُن کے کئی فرزند سب کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ اور دنیا اس خاندان کی اُن تمام یادگاروں سے خالی ہو گئی جنھوں نے کبھی تخت و تاج کی صورت دیکھی تھی۔

تاہم ٹیپا برج کی چل پھل اور اُس نئی بستی کی رونق و آبادی نے ایسی صورت پیدا کر لی تھی کہ اگر چشمِ زخمِ حوادث سے بچ جاتا تو مدتوں تک یاد دلانا رہتا کہ اس بختِ برگشتہ بادشاہ کے دربار اور اُس کے وابستگان دامن کی کیا وضع قطع تھی۔ اور اُن کا کیا مذاق تھا۔ مگر برٹش گورنمنٹ کی عدالت گسٹری نے و آج علی شاہ کا ترکہ تقسیم کرنے اور اُن کے ورثاء کی دادرسی میں یہ شانِ عدالت دکھائی کہ ساری جائداد اور سارا گھر باڑیچ کے حصہ رسدی سب میں تقسیم کر دیا جائے۔ اور جو کچھ ہے نقد روپے کی صورت میں کر لیا جائے۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ٹیپا برج کی اینٹ سے اینٹ بچ گئی۔ لاکھوں کاسمان کوڑیوں کو بک گیا۔ اور وہی بقیہ جو چند روز میں باغِ ارم بن گیا تھا حقیضِ ادبار کا جہنم ہو کے رہ گیا۔ اب تم وہاں جا کے خاک اڑاؤ کچھ نہ نظر آئے گا۔ اگر



اس شخص اگلی رونق اور چہل پہل کو ڈھونڈتی ہوں تو کسی امر آفتیس کو بلانے کو  
 سوہانا جائے اور تھیں بتاتا جائے کہ یہاں مرقع منزل تھی یہاں نور منزل  
 تھی یہاں سلطان خانہ تھا۔ اور یہاں اسد منزل تھی۔ وہاں مشاعرے ہوتے  
 تھے۔ وہاں علمائے بالکمال کی مجلس تھی۔ وہاں یاران باصفا کی بذلہ پنہان  
 تھیں۔ اور وہاں فصاحت جادو بیان کی سحر طرازیان تھیں۔ اس مقام پر شب  
 سیناں جہان کا بھرٹ تھا۔ اس مقام پر قص و سرود کی محفل گرم تھی۔ اس  
 مقام پر حروش و جبینوں کو گانے مانچنے کی تعلیم ہوتی تھی۔ اور اس مقام پر  
 جہان پناہ ناز آفرین مہتمات کے بیچ میں بیٹھ کے جشن مایا کرتے تھے۔ اس  
 جگہ افیونیون کے مجمع میں داستان ہوتی تھی۔ اس جگہ بیسروں کی پالیان ہوتی  
 تھیں۔ اس جگہ کبوتر اڑتے تھے۔ اور اس جگہ لکھنؤ کے میدان برسے  
 جاتے تھے۔ اس ڈیوڑھی پر ماہ و ش جادو نگاہیں پر دے سے سر نکالے جھانک  
 نظر آتی تھیں۔ اس ڈیوڑھی پر اماما سیلون کی آمد و رفت سے ہر وقت ایک عجیب  
 جوش و خروش نمایاں ہوتا تھا۔ اس ڈیوڑھی پر خاص خاص شعر ادا فرماتے ایسے  
 کہ مجلس ادا کی کو فن شعر سے دلچسپی تھی۔ اور اس ڈیوڑھی پر روز نگین عبارت لکھنے  
 والے جوان مزاج ادیبوں کی تلاش رہتی تھی۔ اس لیے کہ دوسرے تیسرے یہاں  
 سے ایک نئے رنگ کا قوس نامہ جا کے بادشاہ کے ملاخط میں پیش ہوتا۔

لیکن ڈیبا رنج کے مٹ جانے پر بھی اس مرحوم دربار کی ہزاروں یادگارین  
 باقی ہیں۔ خود شہر لکھنؤ اور اسکی سوسائٹی اس دربار کو یاد دلانے پر ہے اور  
 اودھ کی سر زمین کا چہ چہ اسکی عظمت کی یادگار ہے۔ اس لیے کہ اس پر جا بجا  
 سلطنت ماضیہ کے مار کے پتے ہوئے ہیں۔ اہل لکھنؤ کی ہر حرکت اور ادا اگلے ارکان  
 دربار کی زندہ تائید ہے۔ اور انکی چال و کیم کے پے اختیار زبان سے نکل جاتا ہے۔  
 آسے گل تو جو خرمندہ تو بوسے داری۔ لہذا ان دیر پا آثار سلطنت کی یادگازہ  
 عہ جاہلیت عرب کا ایک نہایت مشہور شاعر نے اپنے قدیم عشرت کہے کی دیرانی اور تہابی کی تصویر  
 نہایت ہی سوز و گداز کے الفاظ میں دکھائی ہے۔ عہ قود و نامہ ان خطوط کو کہتے تھے جو بیگمات و محلات  
 عالیات جہان پناہ کی خدمت میں بھیجتیں جو عموماً مانتھانہ رنگ میں ہوتے۔

کرنے کی غرض سے اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس دربار کے قائم ہونے سے لکھنؤ میں جو سوسائٹی پیدا ہو گئی تھی وہ کیا تھی؟ کیسی تھی؟ اور اُس نے کس کس عنوان سے ہندوستان کی معاشرت پر اثر ڈال رکھا تھا۔

ہندوستان میں اُن دنوں فارسی زبان کو رٹ لینکوج (درباری زبان) تھی اور اہل ہندوستان کی بہترین معاشرت ایرانی تہذیب سے ماخوذ تھی۔ دولت صفویہ کے عہد میں ایرانیوں کا عام مذہب شیعہ اثنا عشری ہو گیا تھا۔ اور ہندوستان کا حکمران خاندان مغلیہ چغتائیہ مذہب اہل سنت کا پیرو تھا۔ مگر معاشرت پر فارسیت کا سکہ جاری ہونے کا یہ اثر تھا کہ باوجود اختلاف مذہب کے چغتائی یہاں آتے ادب کے ہاتھوں سے لیے جاتے تھے۔ اسی اخلاقی رجحان نے نورجہاں بیگم کو جہانگیر کے تاج و تخت کا مالک بنا دیا۔ اسی کی بدولت دہلی کے اکثر سرسبز عہدہ دار آخر عہد میں شیعہ تھے۔ اور اسی کی وجہ سے امین الدین خان نیشاپوری یہاں پہنچتے ہی ذوالبرہمان الملک بن کے وادی گنگا کے سارے وسیع علاقے کے مالک ہو گئے۔ برہمان الملک کا اثر اور اقتدار جس قدر بڑھتا اور ترقی کرتا گیا اُسی قدر زیادہ وہ بالکل لان دہلی کے مریض و مالدی بنتے گئے۔ باوجود اس کے اُن کی اور ذوالبرہمان صفدر جنگ کی زندگی چونکہ ایک نئی سلطنت کی داغ بیل ڈالنے میں صرف ہوئی اس وجہ سے سوا بھاد سپہ گروں کی قدردانی کے اُنھیں قومی تمدن اور معاشرتی امور کی طرف متوجہ ہونے کے بہت ہی کم مہلت ملی۔ کیونکہ ان باتوں کو بمقابل فوجی و فہمدی کے امن و امان کے پریشانی زمانے سے زیادہ غفلت ہوا کرتا ہے۔

لیکن جب شجاع الدولہ نے بکسر کی لڑائی میں ہمت ہارنے کے بعد انگریزوں سے نیا معاہدہ کیا۔ اور مجبور ہو کے فیض آباد میں خاموش بیٹھ تو سرزمینِ اودھ میں ایک نئے تمدن کی بنیاد پڑ گئی۔ اس مضمون کے آغاز میں ہم بتا چکے ہیں کہ شجاع الدولہ کے زمانے میں کس کثرت سے بالکل لان دہلی وطن چھوڑ چھوڑ کے یہاں آنے لگے تھے۔ دہلی سے فیض آباد تک ہر پیشے اور ہر طبقے کے لوگوں کے آنے کا کیسا تاتا ہندہ گیا تھا۔ اور صرف نو سال کی مدت میں فیض آباد کیا

سے کیا ہو گیا تھا؟ شجاع الدولہ کے بعد نواب آصف الدولہ نے جب لکھنؤ میں قیام کیا تو فیض آباد کا بچا بچایا اکھاڑہ کیا رگی فیض آباد سے اکھڑ کے لکھنؤ میں آگیا۔ اور دہلی کے اعلیٰ خاندانوں اور بالکالوں کا جو سیلاب فیض آباد کو جا رہا تھا لکھنؤ ہی میں روک لیا گیا جو کہ عین سر راہ واقع ہوا تھا۔ اور آخر میں چند شرفاء و حضرات ہنر جو فیض آباد میں بیگنوں کی سرکاروں میں اُلجھے رہ گئے تھے رفتہ رفتہ وہ بھی لکھنؤ میں آ گئے۔ اس لیے کہ آصف الدولہ نے یہاں دولت کی ایسی گنگا نہیں بہا رکھی تھی کہ کوئی سنا اور سیراب ہونے کے شوق میں بے اختیار نہ دوڑ پڑتا۔

ان دنوں یون تو بہت سی ہندو ریاستیں موجود تھیں مگر ہند اور شالیہ دربار مسلمان حکمرانوں ہی کے سمجھے جاتے تھے۔ اور ہندو راجہ خود معروف تھے کہ تمدن اور معاشرت میں ہم مسلمان درباروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اپنی قدیم تہذیب کو زندہ کر کے اپنے لیے نیا تمدن اور نیا لٹریچر پیدا کرنے کا خیال ابھی اُن میں انگریزی تعلیم نے نہیں پیدا کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اگر کوئی بالکال عالم شاعر یا سپاہی مسلمان امرا سے برخاستہ خاطر ہو کے ہندو امرا کے علاقے میں پہنچ جاتا تو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا اور دیوتاؤں کی طرح اُس کی قدر و منزلت کی جاتی۔

مسلمان دربار ان دنوں چند گنتی کے تھے۔ سب سے پہلے تو دہلی کا دربار خلیہ تھا۔ اور اس کی قدامت اور گزشتہ شوکت کی وجہ سے ہر قسم کے بالکالوں اور ستند خاندانی شرفا کی کان دہلی بنی ہوئی تھی۔ اور اسی سرزمین کے منتشر روٹے تھے جنہوں نے دور و دراز صوبوں میں جا کے نئے نئے دربار قائم کیے تھے۔ جن میں سے دکن میں آصف جاہ کا دربار تھا۔ وہاں سے آگے بڑھ کے میو سلطان اور نواب ارکاٹ کے دربار تھے۔ شمال میں دہلی سے چلے تو پہلے روہیلکھنڈ کے بہادر خاں کی قلمرو ملتی۔ اس کے بعد یہ اودھ کا دربار تھا۔ پھر اُس سے آگے مرشد آباد میں نواب ناظم بنگالہ کا دربار تھا۔ مذکورہ اسلامی درباروں سے دکن کے دربار نہایت ہی دور تھے۔ اُن کا راستہ اول تو جنگوں اور پھاڑوں کی وجہ سے نہایت ہی دشوار گزار تھا۔ اور اس پر بھی جرأت کر کے کوئی چل کھڑا ہوتا تو ٹھٹھ اور ڈاکو

جو سارے ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ راستے ہی میں اُس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔  
 ٹیپو سلطان اور نواب کرناٹک کی قلمرو تک جانا دیکھ کر کسی کو نظام حیدر آباد کی  
 مملکت تک پہنچنا بھی مشکل سے نصیب ہوتا۔ اس لیے جب دہلی بگڑنا شروع  
 ہوئی اور تاجدارانِ مغل کی حالتِ غراب ہونے سے قدردانی کا بازار دہان  
 سر پڑا تو لوگوں نے عموماً شمالی ہندوستان کا رخ کیا۔ اس میں شک نہیں کہ  
 روہیلکھنڈ بہت قریب تھا۔ یہاں کے خوانین اگر قدردانی کرتے تو اُن سے زیادہ  
 موقع کسی کو نہیں حاصل تھا۔ مگر اُن میں دینداری تھی۔ شجاعت تھی۔ اور  
 بہت سی خوبیاں تھیں مگر علمی مذاق اور معاشرتی رنگینوں سے وہ لوگ بالکل معز  
 تھے۔ انکی حالت کا صحیح اندازہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ خالص فوجی مذاق کے  
 لوگ تھے۔ جنہیں اپنے ہموطنوں کے جمع کرنے اور اپنے جروگوں کی تعداد بڑھانے  
 اپنی جنگی قوت کو ترقی دینے کے سوا اور کسی بات کا شوق نہ تھا۔ معاشرت کے  
 پہلے پن اور تمدنی زندگی کے آداب و اخلاق کے لحاظ سے دیکھیے تو انکی حالت  
 بالکل وحشی گنواروں کی سی تھی۔ ایسے لوگ بھلا شاعروں ادیبوں اور دیگر قسم  
 کے بالکالوں کی کیا قدر کر سکتے تھے؟ لہذا اُن کی سرزمین میں جو داخل ہوا قدم  
 بڑھاتا ہوا آگے نکل گیا۔ چار پانچ منزلیں طے کر کے لکھنؤ میں پہنچا تو دیکھا کہ اُس  
 سے لے کے ادنیٰ طبقے والے تک استقبال میں آنکھیں بھجھا رہے ہیں۔ اور ہر طرح  
 خدمتگاری کو تیار ہیں۔ اسی جگہ پہنچ کے پھر بھلا کون واپس آ سکتا ہے؟ چو گیا  
 وہیں کا ہو گیا۔ اور دہلی کا ہر خانانہ برباد یہاں آتے ہی پافون توڑنے لگے۔  
 نہ وطن ہی یاد رہا اور نہ کسی اور دربار کے دلچسپی کی ہوس ہی دل میں باقی رہی چند  
 لوگ یہاں سے آگے بڑھ کر نواب ناظم بنگالہ تک بھی پہنچ گئے مگر وہ وہی تھے جنگی  
 لکھنؤ قدر نہ کر سکا۔ مگر ایسے چند گنتی ہی کے لوگ تھے ورنہ دہلی سے جتنے بالکال  
 آئے سب لکھنؤ ہی میں کھٹے چلے گئے۔ تھوڑے ہی زمانے کے اندر یہ حالت ہو گئی کہ  
 اُس دور کی مہذب ترین سوسائٹی کے جتنے مشہور اور نامور بزرگ تھے سب لکھنؤ  
 کے اندر جمع تھے۔

فقط ایک چیز لکھنؤ میں اس دربار کے قائم ہونے سے پہلے موجود تھی۔ اور وہ

عربی کا علم و فضل تھا۔ جس کی بنیاد اُس وقت پڑ گئی تھی جب شہنشاہ اورنگ زیب نے فرنگی محل کے مکانات ملا نظام الدین سہالوی کو عطا کیے تھے۔ ملا صاحب مدسج اور اُس کے خاندان کے قیام نے چند ہی روز میں فرنگی محل کو ہندوستان کی ایک ایسی اعلیٰ ترین یونیورسٹی بنادیا کہ سارے ہندوستان کے علماء و فضلاء کامرکز لکھنؤ کا یہی چھوٹا سا محلہ قرار پا گیا۔ شیخ عبدالحق دہلوی کے بعد دہلی میں بھی کوئی نوکود کا عالم نہیں پیدا ہو سکا تھا۔ آخرین شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان نے البتہ بہت بڑا عروج حاصل کیا مگر اُن کی شہرت علم حدیث تک محدود تھی۔ مگر حدیث کے علاوہ اور جتنے علوم ہیں ان سب کی یونیورسٹی لکھنؤ ہی تھا۔ اُن دنوں لکھنؤ ایک گنام شہر تھا۔ مگر ایسے ایک گنام مقام کا اتنی بڑی یونیورسٹی بنانا کہ ہندوستان درکار تجارت و خوارزم۔ اور ہرات و کابل اس کے آگے سر جھکا دین بہت ہی حیرت کے قابل ہے۔ ساری اسلامی دنیا میں کی شاگردی پر فخر کر رہی تھی اور ہمیں کے منتجب کیے ہوئے نصیب تعلیم یعنی سلسلہ نظامیہ کی پیروی تھی۔ غرض علماء فرنگی محل کی بہت اس نئے دربار کے قائم ہونے سے پہلے ہی لکھنؤ حکمت و فلسفہ۔ منطق و کلام۔ فقہ و اصول فقہ اور دیگر مختلف علوم کا معدن و مرجع بن چکا تھا۔ لہذا ایک ایس چیز میں تو لکھنؤ اس نئے دربار کا زیر بار احسان نہیں ہے باقی اور تمام ترقیان اس سلطنت کے قائم ہونے ہی سے پیدا ہوئیں۔

اب ہم جدا جدا بیان کرنا چاہتے ہیں کہ دہلی سے لکھنؤ میں کون کون سی چیزیں آئیں۔ اور یہاں آ کے اُنھوں نے کیا رنگ پکڑا؟ سب سے مقدم اُردو زبان ہے جو دہلی کے اُن شرفاء و سردارانِ فوج کی زبان تھی جو آپ برہان الملک بہادر کے ساتھ لکھنؤ میں آئے تھے۔ یہ زبان دہلی میں پیدا ہوئی۔ اور اسکی شاعری کا آغاز دکن سے ہوا۔ وہی گہرائی نے دہلی میں آ کے اپنا دیوان پیش کیا۔ اور اپنے نغمہ دلکش سے اہل زبان کو خواب غفلت سے جگایا۔ اس نغمے میں کچھ ایسا چادو تھا کہ سنتے ہی سب کی زبان پر یہی نغمہ جاری ہو گیا۔ اور دہلی میں اُردو شاعری شروع ہو گئی۔

ابتداءً چند ہی بزرگ تھے جنھوں نے استاد کی شان سے دہلی میں داد سخن

دنیا شروع کی۔ مگر اس زمانے کو اگر اردو زبان کی طفلی نہیں تو اردو شاعری کا بچپن کہنا چاہیے۔ دنیا سے اردو کے ان سابقین الاولین میں سب سے زیادہ صاحب علم و فضل اور سب سے بڑے باکمال خان آرزو تھے۔ جنھیں مولانا آزاد مرحوم نے دوسرے دور شاعری میں رکھا ہے۔ زمانہ مابعد کے بڑے بڑے باکمال جن میں سودا، میر، میرزا نادر جان جاناں اور خواجہ میر درد شامل ہیں سب ان کے شاگرد تھے۔ شاعری اور کمال زیادتی کے لکھنؤ میں آنے کی بنیاد انھیں اُستاد اول خان آرزو سے پڑی۔ نواب شجاع الدولہ کے مامون سالار جنگ نے کمال قدر دانی سے انھیں لکھنؤ بٹوایا۔ اور ایک زمانے تک وہ انھیں اقامت گزین رہے وہ شجاع الدولہ کی مسند نشینی کے دو برس بعد ۱۱۶۹ھ (۱۷۵۶ء) محمدی سلطان (۱۷۵۷ء) میں خاص لکھنؤ کے اندر مگرلے آخرت ہوئے۔ وہی پہلے اُستاد اردو شاعری کے تھے۔ اور انھیں سے اردو شعر و سخن کے لکھنؤ میں آنے کی بنیاد پڑی۔ مگر افسوس کہ انکی ہڈیاں سرزمین لکھنؤ کے دامن شوق سے چھین کے خاک دہلی کو سوچی گئیں۔

اس کے بعد اسی دور کے دوسرے نامی اُستاد سخن اشرف علی خان فغان نے جو احمد شاہ بادشاہ کے کوا تھے قدر دانی کی تلاش میں لکھنؤ کی راہ لی۔ شجاع الدولہ نے نہایت ہی تعظیم و تکریم کی۔ ہاتھوں ہاتھ لیا اور ایک زمانے تک اپنے دیار میں رکھا۔ مگر شعرا نازک خیال سے زیادہ نازک دماغ ہوا کرتے ہیں۔ کسی خفیت سی بات پر روٹھ کے عظیم آباد چلے گئے۔ اور شجاع الدولہ کی وفات سے دو برس پہلے وہیں پونہ زمین ہو گئے۔

اب مولانا آزاد کا مقرر کیا ہوا تیسرا دور شاعری شروع ہوا۔ جبکہ خان آرزو کے شاگرد نظم اردو پر حکومت کر رہے تھے۔ اس زمانے کی حالت دیکھنے سے نظر آتا ہے کہ دہلی اپنے باکالوں کو اپنے آغوش میں سنبھال نہیں سکتی۔ ہر طرح کے صاحبان کمال اُسکی سواد سے نکلنے چلے جاتے ہیں۔ اور جو جاتا ہے پھر نہیں آتا۔ اس کے مقابل لکھنؤ کی یہ حالت ہے کہ جو صاحب فن آتا ہے چاہے کہیں کا ہو یہیں کا ہو جاتا ہے۔ مرزا رفیع سودا، میر تقی میر، سید محمد میر سوز جو اس تیسرے

دور کے پیران سخن ہین سب دہلی چھوڑ چھوڑ کے لکھنؤ میں آئے اور یہیں بیوی بچے ہو گئے۔

ان کے علاوہ جو بالکالان سخن اس زمانے میں وارد لکھنؤ ہوئے اور یہیں کے ہو گئے۔ میرزا جعفر علی حسرت۔ میر حیدر علی حیران۔ خواجہ حسن حسن۔ میرزا قاسم کلین۔ میرضا ملک۔ بقاؤ اللہ خان بقا۔ میر حسن دہلوی۔ میرضا ملک کے فرزند (صاحب ثنوی) اور انھیں کے ایسے بیسیوں شعرا ہین۔ میر قمر الدین مسرت۔ میرضیاء الدین منیا۔ اشرف علی خان خان دہلی سے لکھنؤ میں آئے ایک مدت تک رہے اور یہیں چلے۔ مگر آخر میں بیرونی قدردانوں کی کشش سے کلکتہ اور عظیم آباد میں جا کے نذر اہل ہوئے۔ شیخ محمد قائم قائم کا انتقال اگرچہ اس کے وطن ٹکینے میں ہوا مگر وہ بھی ایک مدت تک اسی لکھنؤ کی سبھا کے ایک اکیڑ تھے۔ مرث میرزا منظر جان جاناں اور خواجہ میر درد کے ایسے چند بزرگ دہلی میں پڑے رہ گئے جن کو فقیرانہ قناعت اور مرصیت کی وجہ سے دہلی میں قدم جاسے کا موقع مل گیا تھا۔ اور سجادہ نشینی کی وجہ سے اپنی سند و پیشی کو نہ چھوڑ سکے تھے۔ غرض شاعری کا یہ تیسرا دور وہ زمانہ ہے جبکہ دہلی کی سبھا وہاں سے اُکھڑے لکھنؤ میں جم رہی تھی۔ اور لکھنؤ میں ایک جوش قدردانی تھا جس سے ہندوستان کی تاریخ خالی ہے۔

اب چوتھا دور شروع ہوا۔ اس کے ارکان بھی اگرچہ دہلی و اکبر آباد وغیرہ کی خاک سے پیدا ہوئے تھے مگر سب کی شاعری لکھنؤ ہی میں چلی۔ یہیں سے ان کا نام مشہور ہوا۔ یہیں کے شاعروں کے میر مجلس تھے۔ یہ لوگ علی العموم یہیں سے نکلے۔ یہیں رہے۔ یہیں عروج پایا اور یہیں مرکب کئے۔ اس دور کے رکن رکن جرأت۔ سید انشا۔ مصحفی۔ قتیل اور رنگین وغیرہ تھے۔ یہ لوگ اپنے عہد میں زبان پر حکومت کر رہے تھے۔ اور انکی شاعری کا غلغلہ اس قدر بلند تھا کہ ان کے سامنے کسی اردو شاعر کا نام چمک ہی نہ سکا۔ ان سب کی ہڈیاں کہاں ہین؟ لکھنؤ کی خاک میں۔

اس زمانے میں دہلی کے صاحبان مذاق جس کثرت سے لکھنؤ میں آ رہے تھے

اُس کا اندازہ سید انشا کی ایک روایت سے ہو سکتا ہے جس میں انھوں نے اُس عہد کے ایک شریعت و مقدار بڑھے اور فوراً نام ایک کسی کی گفتگو نقل کی ہے۔ وہ بزرگ اور کسی دونوں دہلی کے ہیں مگر دونوں لکھنؤ میں باتیں کر رہے ہیں۔ بنی فوراً کہتی ہیں: اچھی آؤ میر صاحب! تم تو عید کا چاند ہو گئے۔ دلی میں آتے تھے دود و پھر رات تک بیٹھتے تھے۔ لکھنؤ میں تھیں کیا ہو گیا کہ کبھی صورت بھی نہیں دکھاتے۔ اب کی کر بلا میں کتنا میں نے ڈھونڈھا کہ میں تمہارا اثر آثار معلوم نہ ہوا۔ ایسا نہ کیجیو کہ آٹھون میں بھی نہ چلو۔ تھیں علی کی قسم آٹھون میں مقرر چلیو! اس کا جواب جو میر صاحب نے دیا ہے وہ اگرچہ نہایت ہی دلچسپ ہے مگر ہم تطویل سے بچنے کے خیال سے اُسے چھوڑے دیتے ہیں۔ انھوں نے دہلی و لکھنؤ کے موجودہ رنگ پر اعتراضات کئے ہیں۔ اور میر صاحب پر نکتہ چینیان کی ہیں جس سے ہمیں بحث نہیں۔ ہمیں صرف یہ بتانا ہے کہ اُس زمانے میں شرفاؤ کمال درکنار زبڈیان تک لکھنؤ میں آ کے بستی جاتی تھیں۔ اور جو لوگ دلی میں پھول والوں کی سیر کے رسیا تھے اب کر بلا اور آٹھون کے سیلے میں اپنا دل بہلاتے تھے۔

شمس العلماء مولانا آزاد مرحوم نے بعد کے تمام شہرے دہلی و لکھنؤ کو بلا لحاظ اتنا دو عہد ایک جگہ جمع کر کے اور زمانے کی طاب میں لکھنے کے پانچون دو بنادیا ہے۔ لیکن یہ نا انصافی ہے۔ اہلی پانچون دور صرف تاسع و آتش کا تھا جس میں زبان نے نئی وضع اختیار کی۔ بہت سے پرانے محاورات ترک ہو گئے۔ نئی بندشیں پیدا ہوئیں۔ اور اس زبان کی بنیاد پڑی جو بعد کے شہرے دہلی و لکھنؤ میں کیساں طور پر مقبول ہوئی۔ اور قریب قریب وہ زبان بن گئی جو اب ہندوستان میں مستند ہے۔ اور یہی وہ زمانہ تھا جب شاعری کی قلم و میں پہلے پہل لکھنؤ کا سکہ جاری ہوا۔

اس کے بعد چھٹا دور وہ تھا جب لکھنؤ میں وزیر۔ صبا۔ رند۔ گویا۔ رشک نسیم دہلوی۔ اسیر۔ نواب مرزا شوق اور نپٹت دیا شکر نسیم صاحبان ثنوی کی شاعری کا غلغلہ بلند تھا۔ اور دلی میں موتس۔ ذوق۔ غالب وغیرہ شاعرانہ



سنا رہے تھے۔ اس دور نے یہ ہے کہ زبان کو لحاظ خیالات سب سے زیادہ ترقی کے درجے پر پہنچا دیا۔

اس کے بعد سا تو ان دور اسیر۔ دارغ۔ منیر۔ تسلیم۔ مجروح۔ جلال۔ لطافت۔ انضال اور حکیم وغیرہ کا تھا۔

ان آخری دوروں پر غائر نظر ڈالنے سے صاف نظر آ جاتا ہے کہ فصاحت زبان اور شاعری نے لکھنؤ میں کیسی مضبوط جگہ پکڑ لی تھی۔ چند ہی روز میں شعر کہنا لکھنؤ میں ایک وسعت داری بن گیا۔ اور شعرا کی یہاں اس قدر کثرت ہو گئی کہ شاید کہیں کسی زبان میں نہ ہوئی ہوگی۔ عورتوں میں شعر و سخن کا چرچا ہوا۔ اور جہاں کے کلام میں بھی شاعرانہ خیال آفرینیوں۔ تشبیہوں اور استعاروں کی جھلک نظر آنے لگی۔

(۱۰)

فارسی شاعری کا اصلی اٹھان ثنوی سے ہوا ہے۔ اور یہ صفت شاعری ہمیشہ سب سے زیادہ اہم اور با وقعت سمجھی گئی۔ ابتدا فردوسی کی رزمیہ ثنوی شاہنامے سے پڑی۔ پھر نظامی۔ سعدی۔ مولانا روم۔ خسرو۔ جامی۔ اور ہاتھی وغیرہ نے اس میں اعلیٰ ترین شہرت و ناموری حاصل کی۔ اردو میں میر تقی میر نے چھوٹی چھوٹی ہمت سی ثنویان دہلی و لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں لکھی تھیں مگر وہ اس قدر مختصر اور معمولی ہیں کہ ثنویوں کے تذکرے میں ان کا ذکر بھی بے محل سا معلوم ہوتا ہے۔

ثنوی لکھنے کا آغاز اردو میں میر تقی میر کے بیٹے میر غلام حسن حسن سے ہوا۔ جو بچپن ہی میں اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے تھے۔ یہیں کی صحبت میں ان کا نشو و نما ہوا تھا۔ یہیں پرورش پائی تھی۔ اور یہیں کی آب و ہوا کے آغوش میں ان کی شاعری پلجی تھی۔ کیونکہ جس تعلیم اور جس سوسائٹی نے ان کی ثنوی بے نظیر و بدرمیر لکھوائی وہ خالص لکھنؤ کی تھی۔ اسی زمانے میں مرزا محمد تقی خان جو سنے ثنوی لیلیٰ مجنون لکھی۔ اور لکھنؤ میں ثنویت کا مذاق بڑھا شروع ہوا۔ آتش و ناسخ کے زمانے میں تو ذرا خاموشی رہی۔ مگر پھر جو یہ مذاق ابھرا تو نیند نہ دیا شکر نسیم نے گلزار نسیم۔ آفتاب الدولہ قلین نے طلسم الفت۔ اور نواب مرزا شوق نے بہار عشق۔

ذہر عشق اور فریب عشق لکھیں۔ اور انھیں اس قدر عام نمود و شہرت اور عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی کہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی زبان پر ان فنویوں کے اشعار پڑھ گئے۔ اس سے پیشتر کے زمانے میں کسی صاحب نے ثنوی میر حسن کے جواب میں لذت عشق نام ایک ثنوی لکھی تھی وہ جواب مرزا شوق کی ثنویوں کے ساتھ شائع ہونے کی وجہ سے انھیں کی جانب منسوب ہو گئی۔ لیکن حقیقت میں نہ وہ اُن کی ہے اور نہ اُن کے زمانے کی ہے۔

ان سب ثنویوں کے دیکھتے ثنوی گلزار نسیم باوجود عام مقبولیت کے صد ہا غلطیوں سے ملوے۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نازک خیالی فو شوق ہے جو ہر قسم کی شاعرانہ خوبیاں اپنے کلام میں پیدا کرنا چاہتا ہے مگر قادر الکلامی کے نہ ہونے سے قدم قدم پر ٹھوکر کین کھاتا ہے اور کسی جگہ اپنے مقصد کو نہیں حاصل کر سکتا۔ اس کے جواب میں آغا علی شمس نے جو ایک بہت ہی کنہ مشق شاعر تھے اسی بحر میں ایک ثنوی لکھی تھی جس میں غلطیوں سے پاک رہ کے تشبیہات۔ استعارات۔ اور رعایت لفظی کے کمالات دکھائے تھے۔ مگر افسوس وہ ثنوی مٹ گئی۔ اور گلزار نسیم کو جو شہرت حاصل ہو چکی تھی اُس پر غالب نہ آ سکی۔ دہلی میں ان دفن مومن خان نے چند چھوٹی چھوٹی بے مثل ثنویاں لکھیں جو بہت ہی مقبول اور مشہور ہوئیں۔

مومن خان کے مذاق شاعری میں نازک خیالی بڑھی ہوئی تھی۔ خیالی تشبیہوں اور استعاروں پر وہ اپنی سخن آفرینی کی عمارت قائم کرتے تھے۔ ثنویوں میں وہ زیادہ تر خیالی جذبات و صفات کو متحضر کر کے اپنے کلام میں ایک خاص لطافت پیدا کیا کرتے تھے۔ مومن خان کے ایک شاگرد نسیم دہلوی لکھنؤ میں آئے۔ اور یہاں کے مشاعرہ میں اپنا رنگ ایسا جمایا کہ بہت سے لوگ اُن کے شاگرد ہو گئے۔ نسیم دہلوی نے لکھنؤ میں اپنے اُستاد کے دھب کو خوب چمکایا۔ اور اُن کے شاگرد تسلیم لکھنوی نے اُردو مثنویوں میں نظیری و عرفی و مصائب کی خیال آرائیاں دکھا دیں۔ اور نظم اُردو میں جیتے جاگتے فیضی و غنیمت لاکے کھڑے کر دیے۔ ادھر آخر زمانے میں مولوی میر علی حیدر طباطبائی نظم لکھنوی نے شراب کی مذمت میں ساقی نامہ شفق شبیہ کے نام سے ایک ایسی بے نظیر اخلاقی نظم اُردو پہلاک کے سانسے پیش کر دی کہ اُس کا

جواب نہیں ہو سکتا۔ غرض کہ مومن خان کی چند مختصر مثنویوں سے اگر قطع نظر کر لی جائے تو اردو مثنوی گوئی کا آغاز بھی لکھنؤ میں ہوا۔ اور ترقی بھی یہیں ہوئی۔

بعض حضرات مثنوی میر حسن اور گلزار نسیم کے ذریعے سے دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا مقابلہ و موازنہ کیا کرتے ہیں۔ جس خیال کو مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے اور زیادہ قوت دے دی۔ لیکن اول تو گلزار نسیم کو نظیر اکبر آبادی کے بخاری نامے کی طرح اگر شہرت ہو بھی گئی تو اُسے مثنوی میر حسن کے مقابلے میں رکھنا اردو شاعری کی سخت تذلیل و توہین ہے۔ صحیح مقابلہ ہو سکتا ہے تو مثنوی میر حسن اور اردو مثنوی طلسم الفت کا۔ اور اگر گلزار نسیم کی زبان زبردستی لکھنؤ کی زبان مان بھی لی جائے تو مثنوی میر حسن اور گلزار نسیم کا مقابلہ دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کا نہیں بلکہ خود لکھنؤ کی اگلی پچھلی زبانوں کا مقابلہ ہے۔ اس لیے کہ مثنوی میر حسن لکھنؤ کی پہلی زبان کا نمونہ ہے اور یہ آخری زبان کا۔

شاعری کی ایک اہم اور قدیم ترین صفت مرثیہ خوانی ہے۔ قدیم عربی شاعری میں زیادہ تر مرثیے اور جزوی شعر و سخن میں انہماک کمال کا ذریعہ تھے۔ فارسی میں مرثیہ خوانی مرکز پرکھی تھی۔ لیکن بہہد سلاطین صفویہ ایران میں مذہب شیعہ کو فروغ حاصل ہوا تو مصائب اہل بیت رسالت کی یاد تازہ کرنے کے لیے شعر کو مرثیہ خوانی کی طرف توجہ ہوئی۔ مولانا مخدوم کاشی نے چند نیدون کا ایک بے مثل مرثیہ لکھا تھا جو عموماً مقبول ہوا۔ اس کے بعد سے دواج تھا کہ شعرا کبھی کبھی ماقم حسین میں دو ایک مرثیے بھی موزون کر دیا کرتے۔ لیکن شعر و سخن کی دنیا میں مرثیہ گوئی کی دقت اس قدر کم تھی کہ مشہور تھا ”گریڈا شاعر مرثیہ گو“ پھر جب مذہبی اعتبار سے دولت صفویہ مرحومہ کی جانشین اودھ کی سلطنت قرار پائی تو لکھنؤ میں مجالس کی ترقی و عزاداری کے جوش و خروش نے مرثیہ گوئی کی ایسی قدر دانی کی کہ اس فن کو غیر معمولی عروج حاصل ہونا شروع ہوا۔ اور دراصل لکھنؤ کے عروج کا سارا راز اسی تاریخی واقعے میں مستتر ہے۔ ہندوستان میں منلوں کی سلطنت تھی جنہوں نے فارسی زبان کو درباری زبان قرار دیا۔ اور فارسی معاشرت اُن کی امیرانہ زندگی اور اُن کے تمام کمالات کا مرکز تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہر ایرانی ہندوستان میں آتے ہی

آنکھوں پر ٹھپایا جاتا۔ اور اُس کی ہر حرکت اور ہر وضع مقبولیت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی۔ دہلی کی سلطنت میں بادشاہوں کا مذہب سُنی ہونے کی وجہ سے ایرانی اپنی بہت سی باتوں کو چھپاتے۔ اور وہاں کی محفلوں میں اس قدر شگفتہ نہ ہونے پاتے جس قدر کہ وہ اصل میں تھے۔ او وہ کا دربار شیعہ تھا۔ اور یہاں کا خاندان حکمرانی خاص خراسان سے آیا تھا۔ اس لیے یہاں ایرانی بالکل کھل گئے۔ اور اپنے اصلی رنگ بہن نمایاں ہونے کی وجہ سے وہ جس قدر شگفتہ ہوئے اُسی قدر زیادہ ہم مذہبی کے باعث یہاں کے اہل دربار نے اُنکے اوصاف و اطوار کو حاصل کرنا شروع کیا۔ اور ایرانیوں جو دراصل ساسانی اور عباسی شان و شوکت کے آغوش میں پلے ہوئی تھی چند ہی روز کے اندر لکھنؤ کی معاشرت میں سرایت کر گئی۔

غرض سودا و تیر کے زمانے میں میان سکندر۔ گدا۔ سکین۔ اور افتدہ مرثیہ گو تھے جو چھوٹی چھوٹی نظمیں شہادتِ امام حسین کے بیان میں تصنیف کر کے مجلسوں میں سُنا دیا کرتے۔ اُن کے بعد میر تقی اور میر غنیمت مرثیہ گوئی کو بہت ترقی دی۔ اور مرثیوں کی موجودہ وضع انھیں کے زمانے میں ایجاد ہوئی۔ یہاں تک کہ زمانہ میر غنیمت کے شاگرد مرزا دبیر اور میر خلیق کے صاحبزادے میر انیس کو ناموری کے شہ نشین پر لایا۔ اور ان دونوں بزرگوں نے مرثیہ خوانی میں ایسے ایسے کمالات شاعری دکھائے کہ شعر و سخن کے آسمان پر آفتاب و ماہ تاب بن کے چلے۔ وہی مقابلہ جو تیر و سودا اور آتش و تاج میں رہا تھا اب میر انیس اور مرزا دبیر میں قائم ہوا۔ مرزا دبیر میں شوکت الفاظ ممتی۔ بلند خیالی تھی۔ اور علم و فضل کا زور تھا۔ میر انیس میں سادگی بے تکلف اور جذبات انسانی پر حکومت کرنے والی زبان کی وہ خوبیاں تھیں جو سوا سبب اُفیاض کی عنایت کے سیکھنے سے نہیں آسکتیں۔ ان دونوں بزرگوں نے فن مرثیہ گوئی کو شاعری کی اور تمام اصناف سے بڑھا دیا۔ اور ادبِ اردو میں وہ نئی چیزیں پیدا کر دیں جن کو انگریزی تسلیم کے اثر سے طبعیت میں ڈھونڈنے لگی تھیں۔

انیس و دبیر نے مرثیہ گوئی کو اس درجہ کمال پر پہنچا دیا تھا کہ اب مرثیہ گوئی

بجائے میوب ہونے کے سب سے بڑا شاعرانہ ہنر بن گئی تھی۔ تمام اہل لکھنؤ ان دونوں بزرگوں کے اس قدر معرفت و مدارج ہوئے کہ سارا شہر دو گروہوں میں بٹا ہوا تھا اور ہر سخن سنج یا انیسیا تھا یا دیریا۔ اور ان دونوں گروہوں میں ہمیشہ باہمی مخالفت رہتی۔

میر انیس نے مرثیہ گوئی کے ساتھ مرثیہ خوانی کو بھی ایک فن بنا دیا۔ یونانیوں کے بعض مقررون اور خطیبوں کی نسبت سنا جاتا ہے کہ اُنھوں نے اپنی تقریریں میں اثر پیدا کرنے کے لیے خاص خاص کوششیں کی تھیں اور آواز کے تشبیب و فرائز اور وضلع و اطوار کے تغیرات سے گفتگو میں اثر پیدا کرتے تھے۔ اسلام کی اس طولانی عمر میں اس نہایت ضروری فن کو اصول کے ساتھ خاص تہرئیں سے زندہ کیا۔ الفاظ کے مناسب آواز کے تغیرات اور مضامین کے موافق چہرہ بنا لینے۔ کلام کو اعضا و جوارح کے مناسب حرکات اور خط و خال کے اشارات سے قوت دینے کا فن خاص لکھنؤ کی اور وہ بھی میر انیس کے گھرانے کی ایجاد ہے۔ جسکی ترقی میں اب تک کوششیں جاری ہیں۔ اور ہمارے اسپیکر اپنی فصیح البیانی میں اثر پیدا کرنے کے لیے اگر ان باتوں کی شاگردی کریں تو نہایت ہی کامیاب اسپیکر ثابت ہوں۔

ڈراما کا فن سخن جو مغربی شاعری کی جان ہے اُس سے عربی و فارسی کا ادب مطلقاً خالی تھا۔ اور فارسی کی شاگردی کی وجہ سے اردو میں بھی اُس کی طرف کبھی توجہ نہیں کی گئی۔ سنسکرت میں اعلیٰ درجے کے ڈراما تھے۔ مگر اُن سے ہندوستان کی آخری سوسائٹی بالکل نا آشنا ہو چکی تھی۔ راجندر جی اور سری کرشن جی کے کارنامے البتہ ہندوؤں میں نہ ہی ادب کے ساتھ دکھائے جاتے تھے۔ مگر اردو شاعری کو اُن سے کسی قسم کا تعلق نہ تھا۔ رام چندر جی کے حالات انگلستان کے اُلپیڈا کی طرح کھلے میدانوں میں رزمیہ تقابلیوں کی شان سے دکھائے جاتے۔ اور سری کرشن جی کے حالات رقص و سرود اور موسیقی کے پیرائے میں نہ ہی اسٹیجوں پر بعینہ اُپیرا کے طریقے سے نظر آتے جو ”ہنس“ کہلاتے۔ واجد علی شاہ کو رہس سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اور رہس کے پلاٹ سے ماخوذ کر کے اُنھوں نے اپنا ایک ڈراما تیار کیا جس میں وہ گنہگار جی بنتے یا عشق کے ستارے ہوئے جو گئی بن کے دھوئی راتے۔ اور بہت ہی عورتیں پران اور عاشق فراراج

گو بیان بن کے اُنہیں ڈھونڈھتی پھرتی۔ پھر جب قیصر باغ کے سیلون کا دروازہ  
عوام الناس کے لیے بھی کھل گیا تو سارے شہر کے شوقینوں میں ڈراما کا فن خود بخود  
ترقی کرنے لگا۔ اور چند ہی روز میں اس شوق کو اس قدر ترقی ہوئی کہ بعض مشہور  
شعرا بھی اُس زمانے کے مذاق کے موافق طبع آزمائیاں کرنے اور ڈراما لکھنے لگے۔  
چنانچہ واجد علی شاہ کے شوق کے ساتھ ہی میان آمانت نے جو ایک مشتاق شاعر تھے  
اندر سبھا لکھی۔ اور موجودہ عہد کی کمپنیوں کی طرح شہر میں جا بجا مختلف جماعتیں  
اُن کی "اندر سبھا" کو اسٹیج پر کھیلنے لگیں۔ جن میں کہیں عورتیں اور کہیں لڑکے ایکٹ  
کرتے۔ اس اندر سبھا میں اصول موسیقی کے مطابق دلکش دھنیں قائم کی گئیں۔  
اور سارا شہر اندر سبھا کے جلسے دیکھنے کا مشتاق تھا۔ میان آمانت کی اندر سبھا کی  
کامیابیاں دیکھ کر اور لوگوں کو بھی شوق ہوا۔ اور اس قسم کے بہت سے ڈرامے  
ایجاد ہو گئے۔ اور سب کا نام "سبھا" قرار پا گیا۔ چنانچہ شہر میں ہندو لال وغیرہ  
کی بہت سی سبھائیں قائم ہو گئیں جن کے پلاٹ بدلے ہوئے تھے۔  
سبھا کے نئے رنگ نے شہر میں اسی زندہ دلی پیدا کر دی کہ سوا اندر سبھا کے کو  
کسی اور قسم کا ناچ گانا پسند ہی نہ کرتے تھے۔ ہر طرف سبھاؤں کی دھوم مچتی۔ اور  
اس کی بنیاد پڑ گئی کہ سوسائٹی کے مذاق کے مطابق اگلے عاشقانہ قصے نقل کے  
طریقہ پر اچھی نظموں میں اور دلکش مضموں کے ساتھ پبلک کے سامنے پیش کیے جائیں  
اس میں شک نہیں کہ پارسی تھیٹر میں نے اپنی انتظامی خوبیوں اور نمائشی دل  
فرمیوں کی وجہ سے سبھاؤں کا رنگ بھسکا کر دیا۔ لیکن یہ نہ سمجھو کہ ڈراما کا وہ پُرانا  
مذاق جو لکھنؤ میں ایجاد ہو کے مروج ہوا تھا مٹ گیا۔ اول تو پارسیوں نے بھی  
اس چیز کو لکھنؤ سے لیا ہے۔ اُن کا پہلا عام کھیل آمانت کی اندر سبھا تھا۔ اور باوجود  
اس کے لکھنؤ کے تمام قومی جلسوں میں آج تک پیپیرے۔ ہر تہی چندر وغیرہ کے  
ایسے میسوں پر فائز ہو رہے ہیں۔ اور اس مذاق کے اکیڑوں کا ایک مستقل  
گروہ پیدا ہو گیا ہے جو شرفا میں سے قومی مذاق اُٹھ جانے پر بھی عوام کو محفوظ  
کرتا ہے۔ ہر تقدیر اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ اُردو ڈراما کی بنیاد خاص  
لکھنؤ ہی میں پڑی اور یہیں سے سارے ہندوستان میں اس کا رواج ہوا۔

اردو شاعری کی ایک قسم واسوخت ہیں۔ یہ خاص قسم کے عاشقانہ مسدس ہوتے ہیں۔ اور ان کا معنوں عموماً یہ ہوتا ہے کہ پہلے اپنے عشق کا اظہار۔ اس کے بعد معشوق کا سراپا۔ اُس کی بے وفائیاں۔ پھر اُس سے روٹھ کے اُسے یہ باور کرانا کہ ہم کسی اور معشوق پر عاشق ہو گئے۔ اس فرضی معشوق کے حسن و جمال کی تعریف کر کے معشوق کو جلانا چھیڑنا۔ جلی کٹی مسانا۔ اور یوں اُس کا غرور توڑ کے پھر ملاپ کر لینا۔ نظم اردو کی یہ قسم لکھنؤ ہی سے شروع ہوئی۔ زمانہ وسط کے قریب قریب تمام شاعروں نے واسوخت لکھے ہیں اور ان میں بڑے بڑے لطف پیدا کیے ہیں۔ دہلی میں بھی بعد کے زمانے میں مختلف واسوخت لکھے گئے خصوصاً مومن خان نے کئی بہت اچھے واسوخت لکھے۔ مگر آغاز لکھنؤ ہی سے ہوا۔

امرا کی عیاشانہ طبیعتوں نے شاعری کی کئی اور صنفوں کو بھی پیدا کر دیا جن کا آغاز دہلی ہی سے ہوا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ بھل ہزل گئی ہے اور کسی قدر پُر لطف رہتی ہے۔ ہزل گئی کا آغاز دہلی میں جعفر زٹلی سے ہوا جو غالباً محمد شاہ کے زمانے میں تھے۔ ان کے کلام کو میں نے اول سے آخر تک دیکھا ہے۔ سوا فحش گئی اور حد سے گزری ہوئی جیجائی کے نہ کوئی شاعرانہ خوبی نظر آتی ہے اور نہ زبان کا کوئی لطف ہے۔ اسکے بعد دہلی ہی کی خاک نے صاحبزادان تخلص بلگرام کے ایک ہزل گو لکھنؤ میں آئے۔ اور یہیں چکے۔ ان کا نام سید آتام علی تھا۔ اور آصف الدولہ کے زمانے میں وارد لکھنؤ ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ

کے مبتذل مذاق والے رئیس زادوں میں ان کا نشوونما ہوا۔ ان کا دیوان ملتا ہے اور گو کہ کلام فحش اور تہذیب سے کوسوں دور ہے مگر پھر بھی اُس میں ایک بات ہے۔ شاعرانہ خوبوں کے ساتھ زبان اور محاوروں کا پورا لطف ہے۔ لیکن اس فن کو لکھنؤ کے آخری دور میں میان مشیر نے جو مرزا دبیر کے شاگرد تھے کمال کے درجے کو پہنچا دیا۔

مجھے اس موقع پر بلا لحاظ اس کے کہ شیعوں اور سنیوں کے متصانہ جذبات کا لحاظ کروں یہ بتادینا ضروری ہے کہ لکھنؤ میں جب شیعہ سلطنت قائم ہوئی تو شیعہ نے اپنے اصلی رنگ کو قائم رکھ کے کمال آزادی کے ساتھ اپنے ہر اصول میں ترقی

شروع کی۔ مذہب شیعہ کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ ایک تو لا۔ یعنی اہلبیت کرام اور خاندان نبوت کے ساتھ اظہار محبت۔ اور دوسرا تبرائے یعنی اُس خاندان محرم کے دشمنوں سے اپنی براہت ظاہر کرنا۔ جس نے باہمی رقابت و تعصب کے بڑھنے سے سبب و شتم کی صورت اختیار کر لی۔ اصولاً اس عقیدے میں سنی بھی اُن کے ساتھ شریک ہیں مگر فرق یہ آپڑا کہ پہلے تینوں جانشینان رسالت کو اہل سنت افضل الناس بعد انبیاء و رسل اور سچے جانشینان رسالت مانتے ہیں۔ اور شیعہ اُن کو غاصب و ظالم بتاتے ہیں۔ اور جب یہ بزرگ بھی اُن کے عقائد میں خاندان رسالت کے دشمن قرار پائے تو اُن سے بھی تبرا واجب ہو گیا۔ جس کو مذہب اور صاحب علم لوگوں نے اگر حرفت براہت کے صحیح معنوں کی حد تک رکھا تو عوام شیعہ اپنے مذاق کے مطابق اُن پر زبان سب و شتم دراز کرنے لگے۔ اور یہی چیز سنی شیعوں کے باہمی تعصب کی بنا قرار پائی گئی۔

ان دونوں مذہبی چیزوں نے لکھنؤ کی شاعری پر نہایت ہی عمدہ اور مناسب اثر ڈالا۔ تو لا نے مرثیہ گوئی کے فن کو اپنے آغوش میں لے کے جملہ اصناف شاعری سے بڑھا دیا تو دشمنان خاندان نبوت سے تبرا کرنے کے جوش نے پُرانی ہجو گوئی کو اختیار کر کے اُسے ہرزیہ گوئی کے نام سے ترقی دی۔ اس فن کے متعدد بالکمال لکھنؤ میں مشہور ہوئے مگر افسوس یہ چیز بالتحقیص اہل سنت کو ناگوار گذرنے والی تھی۔ عہد شاہی میں اسپر تلوار میں نکل پڑا کرتی تھیں۔ اور انگریزی میں بھی آج تک کبھی کبھی فوجداریان اور مقدمہ بازیان ہو جایا کرتی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہرزیہ گوئی دہریہ خوانی کو سکانون کی چار دیواری سے باہر نکلنے کی جرأت نہ ہوئی اگر ہرزیہ گوئی کا عام سبکٹ ایسا محدود اور مابہ النزاع نہ ہوتا تو زمانہ دکھتا کہ لکھنؤ کے ہرزیہ گوؤں نے اپنی ہیودہ گویوں اور فحاشیوں میں بھی کیسے کیسے کمال دکھائے ہیں۔

اس فن میں سب سے زیادہ شہرت مرزا دہیر کے شاگرد بیان مشیر کو حاصل ہوئی۔ ہجو گوئی اور فحاشی پہلے بھی تھی مگر مشیر نے جس قسم کے محاورات سے کام لیا۔ ہندش الفاظ۔ طرز ادا۔ اور استعمال تشبیہات میں جیسی مضحکہ خیزی پیدا



کی۔ اور صحبت کو مارے ہنسی کے لگا دینے اور سامعین کے پیٹ میں بل ڈال دینے کے لیے جو زبان اور جیسا اسلوب سخن اختیار کیا اُس کی خوبیاں اور بدترین بیان سے باہر ہیں۔ ابتذال میں بھی لطف پیدا کر کے اُسے شایستہ لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے قابل بنا دیا اُن کا خاص جوہر تھا جو اُن سے پہلے اور اُن کے بعد کسی کو نہیں نصیب ہوا۔

ہزل گوئی ہی کے سلسلے میں چرکین کا نام بھی لینا چاہیے۔ لکھنؤ کے زمانہ وسطیٰ میں عاشور علی قان نام ایک زندہ دل اور نہایت ہی قابل و با مذاق رئیس تھے۔ اُن کے وہاں کی صحبت اس وقت کی سوسائٹی کا ایک اکل ترین نمونہ تھی۔ انھیں نے جان صاحب اور چرکین کو پیدا کیا۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ انھیں کی صحبت میں صاحب قرآن کا بھی نشو و نما ہوا تھا۔ چرکین اپنے شعر میں پشاپ پینانے کی رعایت رکھتے۔ اور اُن کے اشارے سے اسی تعفن آتی جو کہ نام سننے ہی ہمارے ناظرین کے دماغ سرگٹے ہونگے۔ مگر چونکہ ایک قسم کی خصوصیت تھی ہم نے اُن کا ذکر کر دیا۔ اُنکے کلام میں بعض شاعرانہ خوبیاں اور اچھی تشبیہیں بھی ہیں مگر اُن کے مذاق نے اُن خوبوں کو بھی گندہ اور پسید کر دیا ہے۔

لیکن ریختی کافن باوجود غیر مہذب ہونے کے دلچسپ ہے اور چرکین کی شاعری کی طرح اذیت دسان نہیں۔ مردوں اور عورتوں کے محاوروں اور لہجے میں تھوڑا بہت فرق ہر زبان میں ہوا کرتا ہے۔ مگر اتنا نہیں جتنا ہمیں اپنی زبان میں نظر آتا ہے۔ فارسی عربی سب زبانوں میں یہ ابتداء موجود ہے۔ مگر اردو اس خصوصیت میں بڑھی ہوئی ہے۔ فارسی اور عربی کا پُرانا مذاق تھا کہ عورتیں شعر کہتیں تو اپنی زبان میں کہتیں۔ اور مرد کبھی عورتوں کی زبان سے کوئی خیال ادا کرتے ہیں تو زبان میں لطف پیدا کرنے کے لیے اُن کی زبان اختیار کر لیتے ہیں حال اگر تیری کا ہے۔ اردو شاعری ہمیشہ سے صرف مردوں کی زبان میں رہی یہاں تک کہ اس میں عورتیں کہتی بھی ہیں تو مردوں کے کہتی ہیں۔ مردوں ہی کی زبان اختیار کرتی ہیں اور اپنے لیے منمیرین تک ذکر استعمال کرتی ہیں۔ اگر شاعر

کا نام نہ معلوم ہو تو کوئی نہیں پہچان سکتا کہ یہ کسی مرد کا کلام ہے یا عورت کا۔  
 اردو شاعری کا تیسرا یا چوتھا ہی دور تھا کہ شوخ طبع جو انون میں خیال پیدا  
 ہوا کہ رنجیت کی طرح ایک رنجیتی ایجاد کی جائے۔ میر حسن نے اپنی مثنوی میں ضرورت  
 کے موقوف پر یہ زبان موزون کی تھی۔ مگر وہ ان تک معنا نقد نہ تھا۔ میان رنگین  
 نے اس رنگ کو مستقل طور پر اختیار کیا۔ جو دہلی کے رہنے والے تھے اور لکھنؤ کی  
 محبتوں میں شریک رہا کرتے تھے۔ ابتداءً ہند لوگوں کی صحبت نے اس رنگ کو  
 بے شرمی اور خلافتِ ہند میں جانا۔ چنانچہ سید انشا کی زبانی ہم نے لکھنؤ میں دہلی کے  
 جن ہندو سن رسیدہ بزرگ اور وہیں کی ایک رنڈی نوراً کی گفتگو لکھی ہے اُس میں  
 وہ بزرگ فرماتے ہیں ”اور سب سے زیادہ ایک اور شے کے سادات یا اہلکام  
 کا بیٹا انوری رنجیت اپنے کو جانتا ہے۔ رنگین مخلص ہے۔ ایک قصہ کہہ ہے۔ اس  
 مثنوی کا نام دلپذیر رکھا ہے۔ رنڈیوں کی بولی اُس میں باندھی ہے۔ میر حسن پر زہر  
 کھا یا ہے۔ ہر چند اُس مرحوم کو بھی کچھ شور نہ تھا۔ بد منیر کی مثنوی نہیں کہی گویا  
 سانڈے کا تیل بیچتے ہیں۔ بھلا اس کو شعر کیونکر کیسے؟ سارے لوگ دلی کے لکھنؤ  
 کے رنڈی سے لے کے مرد تک پڑھتے ہیں۔

جلی وہاں سے دامن اٹھاتی ہوئی کڑے سے کڑے کو بجاتی ہوئی  
 سو اُس بچا رہے رنگین نے بھی اسی طور پر قصہ کہاہے۔ کوئی پوچھے کہ بھائی تیرا  
 باپ رسالدار سلم۔ لیکن بچا راہ بھی بھالے کا ہلانے والا تینے کا چلانے والا تھا۔  
 تو ایسا قابل کہان سے ہوا؟ اور شہزادین مزاج میں رنڈی بازی سے آگیا ہے۔ تو  
 رنجیت کے تین چھوڑ کر ایک رنجیتی ایجاد کی ہے۔ اس واسطے کہ پہلے آدمیوں کی ہو  
 بیٹیاں پڑھ کر مشتاق ہوں۔ اور ان کے ساتھ اپنا منہ کالا کرے۔ بھلا یہ کلام  
 کیا ہے؟

ذرا گھر کو رنگین کے تحقیق کر لو یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہا رو  
 مرد ہو کر کہتا ہے۔ ۶۔ کہیں ایسا نہ ہو کجنت میں ماری جاؤں۔ اور ایک کتاب  
 بنائی ہے اُس میں رنڈیوں کی بولی لکھی ہے۔ جس میں آپر والیان چلیں۔ آپر والا  
 چاند۔ اُجلی دھوبن۔ وغیرہ وغیرہ۔“

مگر ہند بڑھے شکایت کرتے کرتے مر گئے۔ نوجوانوں کی لکھنوی نے لکھن کے مذاق کو ترقی دے ہی کے چھوڑا۔ اور رنجی مراد کا ایک فن ہو گیا جس کی ایجاد گو ایک دہلی ہی کے شاعر سے ہوئی تھی مگر لکھنوی میں ہوئی۔ اور یہیں اُسے فروغ ہوا۔ قصے کے سلسلے میں اس زبان کو میر حسن کے بعد نواب مرزا شوق نے جس اعلیٰ درجہ کمال کو پہنچا دیا تقریبت نہیں ہو سکتی۔ صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جائے یہی نہیں پتہ چلتا کہ موزون کرنے میں شاعر انداز موزون نے بولنے کی زبان پر کہیں کچھ تصرف بھی کیا ہے یا نہیں۔ لیکن غزل گوئی میں لکھنوی کی جانشینی جان صاحب نے کی جو لکھنوی کے ایک معمولی شخص تھے اور عاشور علی خان کی خراہ پر چڑھ کے تیار ہوئے تھے۔ گو کہ جان صاحب کے بعد اور رنجی گو بھی لکھنوی میں پیدا ہوئے۔ مگر جان صاحب پر کمال اور شہرت کا خاتمہ ہو گیا۔ اُنھوں نے غزلین کہیں۔ واسوختی کہی اور ادھر بھی کئی نظمیں کہیں۔

رنجی میں اگر نقش اور بدکاری کے مذاق سے پرہیز کر کے پاکدامنی کے جذبات اختیار کیے جاتے تو یہ فن ایک حد تک قابل ترقی ہوتا۔ مگر خرابی یہ ہوئی کہ اس کی بنیاد ہی بدکاری کے جذبات اور بے عصمتی کے خیالات پر تھی۔ اس لیے رنجی گوئیوں کا قدم ہمیشہ جاوہر ہند و اعدال سے باہر ہو گیا۔ اور اس سے زبان کو چاہے کسی حد تک فائدہ ہوا ہو مگر اخلاق کو نقصان پہنچا۔

(۱۱)

نثر اور وہ کی عمر نظم کے دیکھتے کم ہے۔ مدت تک تعلیم یافتہ لوگوں کی یہ وضع رہی کہ اگرچہ بعض لوگ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے مگر عام رجحان اور میلان اردو غزل سرائی کی طرف تھا۔ اور ہندوستان میں اردو شاعری کی تعداد فارسی شاعری سے بہت زیادہ تھی۔ مگر نثر میں سارے ملک کو فارسی ہی میں لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ علوم و فنون کی کتابیں فارسی میں لکھی جاتیں۔ دین و مذہب کی کتابیں فارسی میں تصنیف ہوتیں۔ یہاں تک کہ بوڑھے سے لے کے بچے تک سب فارسی ہی میں خط و کتابت کرتے۔ بچوں کو کتب میں فارسی ہی کی انشائیں پڑھائی جاتیں اور فارسی ہی میں خط لکھنا انھیں سکھایا جاتا۔ نتیجہ یہ تھا کہ بول چال میں اردو زبان

چاہے کیسی ہی شیریں و فصیح ہو گئی ہو لکھنے کی ضرورت پیش آئی اور سب گونگے ہو گئے۔

پہلے پہل اردو میں میرا تن دہلوی نے انگریزوں کی حوصلہ افزائی و ہدایت سے اپنی کتاب چادر ویش لکھی۔ اسی زمانے میں میرزا علی لطف نے اپنا تذکرہ شعر لے اردو تصنیف کیا۔ جو عبد اللہ خان صاحب مقیم حیدرآباد کی کوشش سے چھپ گیا ہے۔ اسی زمانے کے قریب مولوی اسماعیل صاحب شہید نے توحید و اتباع سنت پر اپنی کتاب تقویۃ الایمان تحریر فرمائی۔ جو کتاب میں اب چاہے جس نظر سے دیکھی جائیں اُن دنوں ادبی کمال دکھانے کے لیے نہیں لکھی گئی تھیں۔ اُن کی تصنیف سے صرف مقصود یہ تھا کہ بے تکلف اور سیدھی سادھی زبان میں مطلب ادا کر دیا جائے اور عوام فائدہ اٹھا سکیں۔ مذکورہ بالا بزرگوں کو اگر ادب اردو کا کمال دکھانا ہو تو اُس زمانے کی انشا پردازی کے اصول کے مطابق ظہوری و نعمت خان عالی اور ابوالفضل و طاہر وحید کا رنگ اختیار کرتے جو اس وقت ادبی دنیا پر حکومت کر رہا تھا۔ اور جسکے بغیر کوئی تحریر ناکستین قابلِ داد نہ تصور کی جاتی۔ تحریر ہی نہیں گفتگو میں بھی اگر زیادہ تہذیب و شائستگی ملحوظ خاطر ہوتی تو وہی انداز اختیار کر لیا جاتا جیسا کہ سید انشائے میرزا منظر جان جاناں کی تقریر کے چند الفاظ نقل کر کے بتا دیا ہے۔

پس پوچھیے تو اردو کی نشاری لکھنؤ ہی سے شروع ہوئی جبکہ پہلے مرزا رجب علی بیگ سرور نے فسانہ عجائب اور اپنی دوسری کتابوں کو شائع کیا۔ اُسی زمانے میں بعد نورتین بھی لکھنؤ میں لکھی گئی جس کے مصنف محمد بخش ہجو رشا گرد جبرأت لکھنؤ ہی کی صحبت کے ساتھ و پرداختہ تھے۔

رجب علی بیگ سرور نے یہ ہے کہ انشا پردازی کا اعلیٰ کمال دکھایا جو۔ اور جو وقت وہ کتاب شائع ہوئی ہے اردو صحبتوں میں حیرت کے ساتھ دیکھی گئی۔ مگر بد قسمتی سے اُنھوں نے دیباچے میں میرا تن پر حملہ کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے اُن کے تمام کمالات اہل دہلی کے نزدیک خاک میں مل گئے۔ یہاں تک کہ میر محمد حسین آزاد کے سے مہذب بزرگ بھی اُنھیں "لکھنؤ کا شہدا" فرماتے ہیں۔ اور معلوم نہیں رجب علی

ایک مرحوم سے اس گستاخی کا انتقام کب تک لیا جائے گا؟ میرا متن کا ہر انشا پر دوازی انگریزوں کو اُن دنوں چاہے نظر آ گیا ہو مگر ہندوستان کے اہل زبان میں کسی کو نہ نظر آیا تھا اور نہ نظر آ سکتا تھا۔ اس لیے کہ انگریزی تعلیم کے اثر نے اسوقت تک ملکی لٹریچر کا ذائقہ نہیں بدلا تھا۔ اور مشرقی ادب خیالوں اور دماغوں میں بسا ہوا تھا۔

ادبی رنگ کے متعلق میں نے کئی بار لکھا ہے اور پھر لکھتا ہوں کہ وہ بالکل تعلیم اور ذائقہ کی پرورش سے وابستہ ہوتا ہے۔ جس طرح غذاؤں خوشبوؤں اور رنگوں اور دیگر تمام چیزوں کو گرد کی معاشرت پسندیدہ بنایا کرتی ہے۔ اور مختلف قوموں اور ملکوں میں اس قدر اختلاف رہتا ہے کہ ایک کی لذیذ ترین اور محبوب ترین چیز دوسرے کے نزدیک نہایت ہی بد مزہ اور سخت قابل نفرت ہوتی ہے۔ ویسے ہی ادب اور لٹریچر میں ذائقہ کا حال ہے کہ جو رنگ ایک قوم میں پرورش پائے دماغوں اور زبانوں پر چڑھ جاتا ہے دوسری قوم کے نزدیک ہیو دہ بے لطف اور بد مزہ ہوتا ہے اور صحیح فیصلہ کوئی نہیں کر سکتا کہ کون اچھا ہے اور کون بُرا ہے۔

جاہلیت عرب میں فصاحت و بلاغت کا رنگ یہ تھا کہ مقفی فقرے لائے جائیں عبارت میں تناسب و متداول الفاظ مترادف آئیں۔ اور ایک ہی مطلب بار بار ادا کر کے موثر اور دلچسپ بنایا جائے۔ اسی ذائقہ کو قرآن نے چونکہ وہ لسان قوم میں تھا نہایت معجزانہ طرز سے کلیل کو پھونچایا۔ پھر وہی ذائقہ ادب عربی کا عنصر اعظم بن گیا۔ آج کل کے میاں سے دیکھا جائے تو عربی کی فصیح ترین کتابیں مقامات تحریری و تاریخ تیموری وغیرہ میں قافیہ پمائی۔ قطویل جیا۔ اور بے ضرورت الفاظ لانے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جس کا نہ توں اور صدیوں تک ایک دنیا مزہ لیتی رہی ہے یہی رنگ فارسی کے ادیبوں نے اختیار کیا۔ اور جو ادبی ترقی ہوتی گئی وہی رنگ پنختہ اور گہرا ہوتا گیا۔ اور اُس ذائقہ کے دماغوں میں بے ہوشی کی وجہ سے وہی رنگ اُردو کے اُدبائے اولین نے اختیار کیا اور دنیا سے داو پائی۔ لہذا یہ خیال کرنا کہ چار درویش جن دنوں لکھی گئی ہے اُن دنوں وہ سوا انگریزوں کو پسند ہونے کے جو اُردو کو جانتے ہی نہ تھے ہندوستان کے اہل علم میں کوئی ادبی کمال تصور کی گئی ہوگی بالکل بے اصل ہے۔

اب انگریزی کے اثر سے بیشک ایسا زمانہ آگیا ہے جب اردو کو پُرانے لٹریچر نے جو زیور اور لباس پہنا یا تھا اُٹار لیا گیا اور نئے مغربی کپڑے پہنائے گئے۔ چار درویش اور اُس کی سی دوسری کتابیں چمک پڑے ادینی زیور و لباس سے معری تھیں اس لیے لوگوں کو پسند آئیں۔ اس لیے نہیں کہ اُن میں کوئی خاص خوبی تھی بلکہ اس لیے کہ اُس پُرانے مقبول عام قومی لٹریچر کے رنگ سے معری تھیں جو موجودہ لوگوں کو ناپسند ہے۔

اسی زمانے میں لکھنؤ میں مولوی غلام امام شہید نے اپنا مشہور مولد شریعت لکھا جو اس وقت کے ادبی مذاق میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ لوگوں کو بہت پسند آیا اور مذہبی مقبولیت کی وجہ سے آج تک بہت پسند ہے۔

مگر موجودہ نثر اردو اصل میں دہلی ہی سے نکلی اور ہمیشہ دہلی کی زیر بارِ احسان رہے گی۔ مرزا غالب نے اردو انشا میں بے تکلفی کا رنگ اختیار کیا جو موجودہ مذاق سے بہت ہی قریب ہے۔ اگرچہ وہ بھی کبھی کبھی قافیہ بندی کی رعایت کر جاتے ہیں لیکن اس بے تکلفی کے ساتھ کہ پڑھنے والے کو قافیہ کا خیال بھی غور کرنے سے آہے۔ موجودہ تعلیم نے لوگوں کو اس رنگ کو قبول کرنے کے لیے خوب تیار کر دیا تھا۔

ہر صحبت میں واہ واہ ہونے لگی۔ اُنکے بعد سر سید نے اس سادگی میں متانت پیدا کی مگر اس کوشش کے ساتھ کہ زبانِ دقین نہ ہونے پائے۔ اور ایسی رہے کہ ہر ادبی و اعلیٰ اُسے سمجھ لے۔ مولوی محمد حسین آزاد نے اس میں متانت کے ساتھ اولیٰ طفت پیدا کر دیا۔ جبکہ لکھنؤ کے لوگ انگریزی کے اثر سے دُور ہونے کے باعث ہنوز پُرانے ہی رنگ کے دیوانے تھے۔ یہاں واجد علی شاہ کے آخری ایام زندگی تک رنگین اور محض عبارت لکھی جاتی تھی اور لوگوں کو اس سادگی کا مزہ نہیں ملنے پایا تھا۔ اب علی گڑھ سے تہذیبِ الاخلاق۔ آگرے سے تیرہویں صدی اور لکھنؤ سے اودھ پوچھ اغل رہے تھے جن میں سے ہر ایک نثر اردو کی ایک ممتاز شان رکھتا تھا۔ تہذیبِ الاخلاق میں متانت اور عالمانہ وقار کے ساتھ قومی درد کا سوز و گداز تھا۔ کبھی ہوئی صاف زبان تھی۔ اور نئے مغربی فلسفہ و ادب سے لیے ہوئے خیالات اور اثر ڈالنے والے مضامین و خطبات تھے۔ تیرہویں صدی میں اعلیٰ منشیانہ قابلیت

کے ساتھ قدیم ادبی مذاق کی نگہداشت نئی خیال آرائیوں اور جدتوں کے ساتھ کی جاتی تھی۔ اور پیرانا شرقی لٹریچر کچھ ایسی جدت طرازیوں کے ساتھ نئے لباس میں ظاہر کیا جاتا تھا۔ کہ نئے اور پرانے دونوں گروہوں سے بے اختیار داد و دہانے کے نعرے بلند ہوتے تھے۔

اور پینچ مین زبان اپنی اصلی شان میں دکھائی جاتی تھی۔ جس میں مذاق کا پہلو غالب رہتا۔ اس میں مختلف لکھنے والے تھے اور ہر ایک کا مذاق خاص لطیف اور خاص خوبیان رکھتا تھا۔ منشی سجاد حسین ایڈیٹر کی توشیان۔ مرزا چھو بیگ صاحب کی کوثر کی دھوئی ہوئی زبان۔ منشی احمد علی کسندوسی کی فارسیت کی اعلیٰ ادبی اور شاعرانہ دلچسپیاں ظاہر کرنے والا رنگ۔ پنڈت ترہون ناتھ بھڑکی ہندی نظمیں اور ان کی خوبون کو بنیاد و لچسپی کے ساتھ ظاہر کرنے والے مضامین اور دشرمین ایک عجیب زندگی و شگفتگی پیدا کر رہے تھے۔

اسی اثنا میں اردو اخبار کے ساتھ پنڈت رتن ناتھ کا ناول "فسانہ آزاد" شائع ہوتا شروع ہوا۔ جس نے ملک پر بہت بڑا اثر ڈالا۔ اور اردو دنیا ناول نویی کے مذاق سے آشنا ہو کے اُسکی بے انتہا فریقہ ہو گئی۔ فسانہ آزاد میں جہان مصنف نے اپنے قلم سے کوئی سین دکھایا ہے یا کوئی واقعہ لکھا ہے وہی فسانہ عجب کا پُرانا رنگ ترقیوں کے ساتھ اختیار کیا ہے اور جہان دوسروں کی زبان سے گفتگو کرانی ہی بہت ہی سادی اور بے تحلف زبان رکھی ہے۔ خصوصاً عورتوں کی زبان بہت ہی پاکیزہ ہے۔ گو کہ جا بجا غلطیاں بھی ہو گئی ہیں۔ گرچہ یہ ہے کہ اپنی کوشش میں وہ جس دریے تک پہنچ گئے ہیں اُن سے پہلے کوئی نہیں پہنچا تھا۔

یہی زمانہ ہے جبکہ مولوی نذیر احمد صاحب نے گورنمنٹ کی فرمائش سے تعزیرات ہند کا ترجمہ کیا اور اپنی کتابوں کے ذریعے سے ایک ایسی زبان ملک کے سامنے پیش کی جو کہین روانی اور صفائی میں بے نظیر ہے اور کہین لغات عربی سے ملو ہونے کے باعث سخت دقیق و بلیغ۔ اور اسی عہد میں مولوی محمد حسین صاحب آزاد کا لٹریچر ایک بہت ہی پسندیدہ رنگ پیش کر رہا تھا۔ خصوصاً انھوں نے زبان اردو کی تاریخ اور تذکرہ شریں اردو لکھ کے اب اردو میں خاص ناموری حاصل کی۔

اسی زمانے میں ۱۸۸۶ء میں مختصر نام ایک ہفتہ وار رسالہ مین نے مولوی محمد عہد الہیاسط صاحب محشر کے نام سے نکالا۔ جس کے ذریعے سے ایڈسین کا رنگ اردو میں ایسے دلکش عنوان اور سوز و غم و مناسب الفاظ و خیالات میں پیش کیا گیا کہ ملک بیک بیک چونک سا پڑا۔ ساتھ ہی میرے مضامین اودھ اخبار کے کالموں میں شائع ہوتا شروع ہوئے جنہوں نے ملک کے سامنے ایک بالکل نیا لٹریچر پیش کیا جو اس قدر مقبول ہوا کہ ہر طرف سے مرجبا کی صدا اُٹھنے لگی جاتے لگین۔ بیک بیک نظر آیا کہ اکثر مضامین نگار اُسی رنگ کو اختیار کر رہے ہیں۔ اور ملک کا عام رجحان اُسی طرف ہے۔ اُسی درمیان مین مین نے اپنا ناول دلچسپ اور موثر ڈراما شہید و فدا ملک کے سامنے پیش کیا۔ اور ہر طرف سے حوصلہ افزائی ہونے لگی۔

آخر ملک کا اصرار و تقاضا دیکھ کر آغاز ۱۸۸۸ء سے مین نے رسالہ دلگداز جاری کیا جس کا لٹریچر انگریزی و اتون اور پڑاٹے مذاق کے لوگوں دونوں میں مقبول ہوا۔ پھر ۱۸۸۸ء سے اُس کے ساتھ تاریخی ناولوں کا سلسلہ جاری کیا گیا جن میں سب سے پہلا ناول "ملک العزیز ورجنا" ہے۔ ان ناولوں کو ملک نے جس شوق سے لیا اُس کے بیان کرنے کی تو ضرورت نہیں ہے مگر اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ اُنھیں ناولوں کی وجہ سے واقعات کے معلوم کرنے اور کتابوں کے مطالعے کا شوق بڑھنے کی بنیاد پڑی۔ اُنھیں ناولوں کے ذریعے سے ملک میں تاریخ کے پڑھنے اور واقعات عالم سے دلچسپی حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا اور اُنھیں ناولوں اور دلگداز کے صفحوں نے وہ رنگ پیدا کیا جس پر موجودہ ادب اردو کی بنیاد قائم ہے۔

بہر حال شر اردو کا تعلق جہاں تک پُرانے ادبی رنگ سے ہے اسکی بنیاد لکھنؤ میں پڑی۔ ان جدید رنگ کا آغاز دہلی سے ہوا مگر اس کوشش میں جہاں تک ممکن ہوا لکھنؤ نے دہلی کی رفاقت کی۔ خصوصاً ملاحظہ کا مذاق تو لکھنؤ ہی سے پیدا ہوا اور لکھنؤ میں تکمیل کو پہنچا۔



لیکن زبان اُردو کو جو ترقیان لکھنؤ میں حاصل ہوئیں وہ شاعروں - ادیبوں - شاعروں اور مصنفوں ہی تک محدود نہیں ہیں مختلف سوسائٹیوں اور طبقوں میں ترقی و وسعت زبان کی نئی نئی صورتیں پیدا ہوئیں جنھوں نے ہر گروہ والوں کے لیے خاص دلچسپیاں پیدا کیں۔

ان میں سے زیادہ قابل توجہ داستان گوئی ہے۔ جو دراصل فی البدیہہ تصنیف کرنے کا نام ہے۔ یہ فن اصل میں عربوں کا ہے جہاں عہد جاہلیت میں بھی داستان گوئی کی صحبتیں مرتب ہو کر تھیں۔ لیکن ہندوستان کی داستان گوئی کی نسبت ہم نہیں جانتے کہ عرب کی قصہ خوانی سے اُن کا کوئی رشتہ ہے یا نہیں۔ امیر حمزہ کی داستان جو داستان گوؤں کی اصلی اور حقیقی جولان گاہ ہے وہ دراصل فارسی میں تھی اور کہتے ہیں کہ شہشاہ اکبر کے زمانے میں امیر خسرو نام ایک قابل شخص نے اُسے تصنیف کیا۔ تاریخ سے ثابت ہر کوئی لفظ کے عہد میں داستان امیر حمزہ موجود تھی۔

دہلی کے مشہور داستان گو لکھنؤ میں آنا شروع ہوئے۔ یہاں انیونین نے اُن کی یہاں تک قدر کی کہ داستان سننے کو اپنی صحبتوں کا ایک عظیم انعام قرار دے لیا۔ چند ہی روز میں لکھنؤ کے اندر اس کو اس قدر فروغ ہو گیا کہ کوئی دو لکھنؤ تھا جس کی سرکار میں کوئی داستان گو نہ مقرر ہو۔ سیکڑوں داستان گو پیدا ہو گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے آج کل کے مقبول سے مقبول اسپیکروں میں سے ابھی تک کسی کو فصیح البیانی میں وہ درجہ نہیں نصیب ہو سکا ہے جو قادر الکلام داستان گوؤں کو حاصل تھا۔ دہلی میں بھی دو ایک صاحب کمال داستان گو آج تک پڑے ہیں مگر لکھنؤ میں اُن کا شمار بہت زیادہ ہے۔ اور اُن کے طرز تقریر کا اثر عوام شہر کی زبانوں پر سید پڑ گیا ہے۔ نادلوں کا ذوق پیدا ہونے کے بعد جب اس بات کی کوشش کی گئی کہ داستان گو داستان گوؤں ہی کی زبان میں قلمبند کر لیا جائے تو لکھنؤ ہی ایسے بالکمال داستان گو پیش کر سکا جنھوں نے ضخیم بلدین لکھ کے اُردو دان پبلک میں پھیلا دیں۔ چنانچہ جاہ اور فخر کے تعانیٹ ملک میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھ جاتے ہیں۔

داستان کے چار فن قرار پائے ہیں۔ رزم - بزم - حسن و عشق اور عیاری۔

ان چاروں فنون میں لکھنؤ کے داستان گوؤن نے ایسے ایسے کمال دکھائے ہیں جن کا اندازہ بغیر دیکھے اور سنے نہیں ہو سکتا۔ الفاظ میں تصویر کھینچنا اور تصویروں کا نہایت گہرا پر پا اثر سامعین کے دلوں پر ڈال دینا ان لوگوں کا خاص کمال ہے۔ ان سوشل فکشن مذاق طرافت ساز و دل لگی کے عنوان سے بھی لکھنؤ میں علم زبا کے کئی فن پیدا ہو گئے جن میں کوئی مقام لکھنؤ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ان میں سے ایک فن پھبتی کہنا ہے۔ اسکو دراصل شاعرانہ تشبیہ و استعارے سے تعلق ہے لیکن اس میں اتنی خصوصیت ہے کہ یہ کسی کو بگاڑ کے دکھانے، اُسکے عیب کے نمایاں کرنے، اور برجستہ کوئی افواہی۔ ہنسائے والی اور عیب و نقصان ظاہر کرنے والی تشبیہ پیش کر دینے تک محدود ہے۔ لکھنؤ کے ادنیٰ ادنیٰ لڑکے۔ بازار میں عورتیں۔ جاہل ڈکاندار۔ ادنیٰ طبقتوں کے اہل حرفہ تک ایسی برجستہ پھبتیاں کہ جاتے ہیں کہ باہر والوں کو حیرت ہو جاتی ہے۔ ایک صاحب کو بلائے منٹے کی زیارت کر کے واپس آئے اور براق کپڑے پہن کے دوستوں میں آکے بیٹھے ہی تھے کہ ایک لونڈے نے کہا ”آمین یہ فرات کا بگلا کہاں سے آگیا؟“ ایک بوڑھے دولہا خضاب کرکٹ دولہن بیابانے کو آئے اور بڑی دھوم کی برات لائے۔ زمانے سے نکل کے وہ فضل میں آ رہے تھے۔ جوتا اتارنے کے لیے جھکے اور چند قدم فرش پر گھٹنے ٹیک کے چلے۔ کسی کی زبان سے نکلا ”دولہا کہاں ہیں؟“ شوخ مزاج زبڈی جو کھڑی جھڑے کر رہی تھی ہنس کے بولی ”اے وہ میٹھون میٹھون چلا تو آتا ہے“ ایک کپڑیا چوک میں پونڈے بیچ رہا تھا صدایہ تھی کہ ”اے بھی یہ کنکڑے کون لوٹے گا؟“ کیا اس سے زیادہ با مذاق کوئی استعارہ ہو سکتا ہے؟ نازک ترین ہتھکڑی وہ ہے جس میں مشبہ اور مشبہ بہ دونوں کا نام نہ لیا جائے۔ صرف مشبہ بہ کی کوئی خصوصیت بتانے کے کلام میں لطف پیدا کر دیا جائے۔ اس کی اس سے بہتر مثال کون ہو سکتی ہے کہ نہ پونڈے کا نام لیا نہ لگے کا جس سے کنکڑے لوٹے جاتے ہیں۔ صرف اتنا کہ کہ ”کنکڑے کون لوٹے گا“ یہ بتا دیا کہ یہ پونڈے لگوں کے برابر ہیں جن سے کنکڑے لوٹے جاتے ہیں۔ درپہر اس سے زیادہ مناسب اور بازاری لوگوں کے مذاق کی کوئی تشبیہ نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح کی صد ہا ہزار ہا مثالیں ہیں جو بیان کی

صحبتوں میں اٹھتے بیٹھتے ہر وقت سُنی جاتی ہیں۔

دوسرا ”منلع“ ہے۔ یہ دراصل شاعرانہ رعایت ہے جس سے عوام کی بات چیت اور مذاق کی گفتگو میں آکے خاص رنگ پیدا کر لیا ہے۔ منلع میں کوشش کی جاتی ہے کہ جس چیز کا تذکرہ آجائے اُس کے تمام متعلقات کسی نہ کسی پہلو سے باقون میں لے آئے جائیں۔ آزاد فقیر جو ایک خاص وضع رکھتے تھے منلع بولنے میں بالکمال مانتے جاتے تھے۔ آہانت نے اپنی شاعری میں رعایت کی اس قدر کوشش کی کہ تمام شاعرانہ خوبیوں سے قطع نظر کر کے رعایت ہی کو اپنا معقد قرار دے لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کا کلام شاعری کے درجے سے نکل کے منلع بولنے کے حکم میں داخل ہو گیا۔ مگر لکھنؤ کے اکثر عوام نے اپنی بے تکلفی کی صحبتوں میں اس فن کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ آہانت کی شاعری پیچھے پڑ گئی۔ سچ یہ ہے کہ کسی جگہ کے لوگ منلع بولنے میں اہل لکھنؤ کے عشر عشر درجے کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اس فن میں ایک کتاب بھی شائع ہوئی تیسرا فن ”ٹمک بندی“ ہے۔ یہ شاعری کی قافیہ بندی ہے۔ بہت سے جاہل جب ادھر توجہ کرتے ہیں تو جواب سوال میں اس طرح فی البدیہہ قافیہ استعمال کرتے ہیں کہ بڑے بڑے شعرا کو حیرت ہو جاتی ہے۔ ہم نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں ایک ہندو بڑھیا کے کاتے والا دیکھا تھا جو صبح کو خانچہ لگا کے نظارہ صورت دیکھتے ہی صد ہا بازاری لونڈے اُسے گھیر لیتے۔ اور وہ سر راہ خانچہ رکھ کے بیٹھ جاتا۔ فوراً لونڈوں سے اُس سے ”ٹمک بندی“ میں مقابلہ شروع ہو جاتا۔ سارا مجمع ایک طرف ہوتا۔ فریقین میں گالیوں کی بوچھاڑ ہوتی۔ مگر شرط تھی کہ کوئی گالی ”ٹمک“ سے باہر نہ ہو۔ اور کوئی قافیہ نہ جائے۔ ہم نے اُسے بیسیوں بار دیکھا۔ لکھنؤ اُس سے مقابلہ رہتا۔ مگر ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ جواب میں کبھی عاجز رہا ہو۔ کوئی نہ کوئی قافیہ ڈھونڈھ کے پیش ہی کر دیتا تھا۔

اسی طرح مذاق اور گفتگو میں طرح طرح کی خیال آفرینیاں ہوتی تھیں۔ اور جاہل عوام بعض وقت ایسے خیالات پیش کر دیا کرتے تھے کہ بڑے بڑے شعرا حیرت میں رہ جاتے۔ یہ زمانہ دراصل لکھنؤ کا گولڈن ایج تھا۔ شاعری اور ادبی خوبیاں لوگوں کے دگ و پے میں سرایت کر گئی تھیں۔ ہر شخص جو معمولی طور پر پڑھنے میں شہدہ

ہو جائے طبع آزمائی شروع کر دیتا۔ جبلا و عوام۔ ادنیٰ طبقے کے لوگوں۔ اور گھر کی بیٹھنے والی عورتوں تک میں شاعرانہ لوح اور ادبی نزاکتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ ان پر ہم کبڑے شاعر تھے۔ اور جبلا کی زبان بھی اس قدر شستہ و رفته۔ اخلاقی حفظ و رتبہ کے الفاظ سے مملو۔ اور تمدنی آداب سے لبریز تھی کہ اکثر صاحب علم ان کی گفتگو سن کے ششدر رہ جاتے۔ اور کسی کو ان پر جاہل ہونے کا گمان بھی نہ ہوتا۔ سودا بیچنے والوں کی صدائیں شاعرانہ نکات اور فصاحت و بلاغت کے خواص سے اس قدر آراستہ و پیراستہ تھیں کہ اور دن کو سمجھنا بھی دشوار تھا۔

ادنیٰ طبقے والوں نے بھی اپنے مذاق کے مطابق خاص ادبی دلچسپیاں پیدا کر لی تھیں۔ مثلاً ایک فن خیال کا پیدا ہو گیا۔ لوگ فی البدیہہ اشعار تصنیف کر کے دائرے پر لگاتے۔ اس کا نام خیال اس لیے رکھا گیا کہ ہر شخص اپنی تخیل کا جو ہر دکھائے اور کوئی نئی بات پیدا کرے۔ اس فن میں یہاں بہت سے باکمال پیدا ہوئے جن کو اعلیٰ سوسائٹی اور تعلیم یافتہ لوگوں کی محبتوں سے گو کوئی تعلق نہ تھا مگر بجائے خود اگر غور کیجیے تو وہ اصلی اور فطری شاعری تھی اور اسی وضع کی شاعری جیسی کہ عہد جاہلیت عرب میں تھی۔

اسی طرح ایک گروہ ڈنڈے والوں کا پیدا ہو گیا۔ ان لوگوں کی یہ شان تھی کہ قریب کے زمانے کے اہم اور مشہور واقعات کو کمال آزادی کے ساتھ موزون کرتے۔ جو جیسا ہوتا چاہے وہ کتنا ہی بڑا صاحب اثر اور دو لختہ ہو اُسے ویسا ہی بڑی بیباکی سے دکھاتے۔ اور ثابت کرتے کہ ملک و قوم کو اُس سے کیا فائدہ ہوا یا کتنا بڑا ضرر پہنچا۔ پھر اپنی ان نظموں کو ایک شعر خوانی کی خاص وضع میں ڈنڈے بجا بجا کے سناتے۔

عورتوں کی زبان مردوں کے مقابل ہر ملک اور ہر قوم میں زیادہ شستہ اور دلکش ہوتی ہے۔ مگر لکھنؤ میں یہ خاص بات تھی کہ محلات اور محرم خانہ ان کی مسخرہ بیگم کی زبان میں علاوہ نسائی و لہجہ بیوں کے ادبی اور شاعرانہ نزاکتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ باتیں کرتیں تو معلوم ہوتا کہ منہ سے پھول پھڑپھڑ رہے ہیں۔ اور غور کیجئے تو صحت الفاظ۔ پیاری بندشیں۔ اور طرزِ ادا کی نزاکتیں بتائیں کہ زبان

مذہب کی تردید کی ہے۔ اور اب ہم دیکھتے ہیں کہ مولوی عبد الشکور صاحب بھی اس فن میں اہل سنت کی طرف سے نمود حاصل کر رہے ہیں۔

ہمارے مذاق میں مذہبی رد و قدح چاہے کسی فریق کے لوگوں کو خوش کرنے مگر بالکل بے نتیجہ چیز ہے۔ اور اس کے نفع سے مضرت بڑھی ہوئی ہے۔ لیکن اس موقع پر ہم صرف یہ دکھانا ہے کہ اس فن میں بھی لکھنؤ نے جو عروج حاصل کیا ہے اس سے پہلے کبھی کسی شہر کو نہیں نصیب ہو سکا تھا۔

علوم دینیہ میں سے لکھنؤ میں تفسیر حدیث۔ رجال۔ اور تاریخ کی کمی تھی۔ ان میں سے تفسیر کا فن ایک معمولی درجے تک لکھنؤ میں موجود تھا۔ اور جتنا تھا اس سے زیادہ اور بھی کہیں نہ تھا۔ تاہم بعض شہروں میں بعض نامور مفسر لگے رہے ہیں مگر ان کا تبحر و کمال انہیں کی ذات تک محدود رہا اور انہیں پر ختم ہو گیا۔ حدیث کو دہائی ہی کے ساتھ خصوصیت رہی۔ آخر عہد میں مولانا محمد عبدالحی مرحوم کا معظمہ کے شیوخ حدیث سے درس و روایت حدیث کی سند حاصل کر کے آئے اور سلسلہ درس بھی جاری کر دیا۔ مگر اس فن کو یہاں اچھا نشوونما نہیں ہونے پایا۔ رجال کا فن حدیث کے تابع ہے۔ حدیث میں جس قدر تغزل بڑھتا ہے اسی قدر فن رجال میں انسان کی بصیرت بڑھتی جاتی ہے۔ لہذا علمائے لکھنؤ جس قدر حدیث کے فن میں ناقص تھے اسی قدر رجال میں بھی ناقص رہ گئے۔ باقی رہی تاریخ اس فن کو ہندوستان میں کبھی عروج نہیں حاصل تھا۔ اس میں شک نہیں کہ سوانحی کی ضرورت سے فارسی داؤن میں تاریخ کا بہت کچھ مذاق تھا۔ مگر علمائے ہند نے اس فن کو افسانہ خوانی سے زیادہ وقت کبھی نہ دی۔ جس کی وجہ سے عموماً علما میں ایک بہت بڑا نقص رہ جاتا تھا۔ اور یہی چیز تھی جس نے ہندوستان کے بچے بچے کے ذہن میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ "عالیوں کو زمانہ شناسی سے کیا کام؟ وہ لوگ تو سید سے سادے جتنی ہوتے ہیں۔"

لیکن زمانے کی ضرورتیں دیکھ کے دونوں فریق کے علمائے اپنے نصابوں میں مناسب اعتدال شروع کر دیا ہے۔ اور دوسری طرف ندوۃ العلماء کا دارالعلوم قائم ہے جو ان ضروری علوم کی طرف خاص توجہ کر رہا ہے جو اس وقت تک متروک تھے۔

لیکن ان نقصانات کے ساتھ بھی لکھنؤ میں جو کچھ ہوا دیگر مقامات سے بہت زیادہ ہے۔  
(۱۲)

یہ ہم بتا چکے ہیں کہ شیعہ خاندانِ اجتہاد اور فرنگی محل کے علماء اہل سنت کی برکت سے اس سوری دربار کے عہد میں علم و فضل نے لکھنؤ میں کیسا عروج حاصل کیا اور اپنی سواد میں کیسی علمی کشش اور مرجعیت پیدا کرادی۔ لیکن ابھی ہمیں طب یونانی سے بحث کرنا باقی ہے۔

یہ شریف ترین اور سب سے کمال عالم انسانی کے محفوظ رکھنے اور نسل انسانی کو ترقی دینے سے واسطہ ہے۔ گو کہ اس کا ثبوت ہر قدم ملک میں خود و طریقے اور جزئی تجربات سے ہوا ہے۔ قدیم الایام میں مغرب کی طرف اہل یونان نے اس فن میں بہت ہی نمایاں ترقی کی تھی۔ اور مشرق میں ہندوؤں کے نامورانِ سلطنت نے اسے اعلیٰ درجہ کمال پہنچا دیا تھا۔ مسلمانوں میں جب دربارِ خلافت قائم ہوا تو یہ فن دونوں جگہ سے آیا۔ اور دونوں سرزمینوں کے حاذق اطباء دربارِ بعداؤ کے طبیب تھے۔ اجتہاد ایک صدیوں تک تمام مستند اطباء سے دربارِ عباسی ہندو تھے۔ عباسی تھے۔ چھوٹے تھے۔ مگر مسلمان تھے۔ مگر اُس دور کے اطباء بالکمال چاہے کسی مذہب کے پیروہین آغوشِ اسلام کے پروردہ اور عالمِ اسلامی کے ممتاز نامور تھے۔ اور انہیں کے ہاتھوں سے فنِ طب ایک نئی شان اور نئے عنوان سے مدون و منضبط ہونا شروع ہوا جس میں تھوڑی سی اصلاح اور دو بدل کے بعد اصولی ترتیب تو یونانیوں کی برقرار رکھی گئی مگر تجربات ہر ملک اور ہر قوم کے یکساں طور پر لیے گئے۔

اس کے چند روز بعد مسلمان اطباء نامور پیدا ہونا شروع ہوئے۔ اور انہوں نے فنِ طب کو اپنے اجتہادوں اور اپنے تجربات سے اپنا بنانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ابن سینا نے قانون کی سی بے نظیر و لا جواب کتاب لکھ کے دنیا کے ہاتھ میں دیدی۔ اور اُس کے آگے مشرق و مغرب کی تمام قوموں نے سر جھکا دیا۔ اور ہر دربارِ اندلس نے علِ بالید اور تجربات میں مشرق سے بھی زیادہ ترقی کی۔ اور فنِ طب مسلمانوں کا خاص فن بن گیا جس کے مزج و ماویٰ ہر جگہ وہی تھے۔ ہر قوم اُسے

انہیں سے حاصل کر رہی تھی۔ اور اسی پر یورپ کی موجودہ اکثریتی کی عمارت قائم ہوئی جس کو زیادہ تعلق انڈس کے اسلامی طبی اسکول سے تھا۔

لیکن ادھر آخری صدیوں میں جب مسلمانوں کا زوال شروع ہوا تو اس کا اثر سب سے پہلے ان علوم و فنون میں اور سب سے زیادہ در طب میں نمایاں ہوا۔ اور اکثر مالکین اُس کی وہی حالت ہو گئی جو عروج یونان کے آغاز میں تھی یعنی مہولی قابلیت کے لوگ بغیر اس کے کہ فن کی اعلیٰ ترین کتبوں پر انکی نظر پڑی ہو اپنے جزئی تجربوں سے لوگوں کا علاج کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی روز میں مصر و عرب شام و عراق فن جاننے والے طبیبوں سے خالی ہو گئے۔ صرف ایران اور ہندوستان میں یہ فن باقی تھا۔ لیکن اس پچھلی صدی میں ایران کے طبیبوں سے خالی ہو گیا۔ اور تمام مالک اسلام میں اپنے اس فن قدیم کے متعلق جی جہالت تھی کہ جب یورپ کے فرانسیسی اور انگریز ڈاکٹر نمودار ہوئے تو عوام خواص سب کو ایک نعمت الہی نظر آئے۔ اور کسی کو اس کی حس نہ تھی کہ یہ اصناف ہمارا ہی تھا یا ہمارے یہاں بھی کبھی اظہا ہوتے تھے۔

مسلمانوں کی طب کو اگر فنا ہوئے سے بچایا تو صرف ہندوستان نے۔ جہاں آج تک اطباء یونانی یورپ کے جدید اصناف طب کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اور باوجود جلیلہ خیراتی ہسپتال کا فونڈ گاؤن موجود ہیں مگر پھر بھی لوگوں کو جو اعتبار یونانی ادبا کے علاج پر ہے ڈاکٹروں پر نہیں۔

دہلی میں اگلے دنوں اس فن کے بہت سے باکمال گذرے جن میں حکیم ایرانی۔ حکیم شنائی خان۔ حکیم علوی خان۔ حکیم محمد شریعت خان بہت اعلیٰ شہرت و کمال کے ادبا گذرے ہیں۔ لکھنؤ میں برہان الملک کے زمانے سے دہلی کے حاذق اطباء سرزمین اودھ میں آنا شروع ہو گئے۔ خصوصاً شجاع الدولہ کے عہد میں تو دہلی کے دو ایک طبیبوں کے سوا جتنے تھے سب یہیں چلے آئے۔ فیض آباد کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں جتنی سرکارین تھے ان میں سے ہر ایک سے کوئی یونانی طبیب ضرور وابستہ تھا۔ جن کا بہت کچھ ادب اور اس لحاظ کیا جاتا۔ اور ماہوار تنخواہ کے علاوہ روزانہ انعام و اکرام سے سرفراز ہوتے رہتے۔

آصف الدولہ کے زمانے سے جب لکھنؤ کا لون کی قدردانی کا مرکز قرار پایا تو  
دہلی کے بہت سے خاندانی اطباء نے یہیں توطن اختیار کر لیا۔ اور چند روز کے بعد زبا  
اور شاعری کی طرح فن طب بھی خاص یہیں کا فن بن گیا۔ چنانچہ لکھنؤ نے حکیم مسیح الدولہ  
حکیم شفاء الدولہ۔ حکیم مرزا محمد علی۔ حکیم سید محمد رفیع۔ حکیم مرزا کوچک۔ حکیم بٹا۔ حکیم  
مرزا محمد جعفر کے ایسے عالی پایہ و گران قدر طبیب پیدا کیے جو سچ یہ ہے کہ اپنے فنون کے  
مجتہد تھے۔ اور سلف کے سارے سرمایہ علمی پر ان کی نظریں تھیں۔ ہوتے ہوتے فن  
طب کو یہاں تک ترقی ہوئی کہ لکھنؤ کا شاذ و نادر ہی کوئی حلقہ ہو گا جس میں کوئی نامور  
خاندان اطباء نہ موجود ہو خاص شہر کے صد ہا محلوں کے علاوہ گرد و نواح کے گاؤں  
اور قصبوں میں بھی ہزاروں طبیب جاری تھے۔ اور ہندوستان کے جن درباروں  
اور شہروں میں مشہور و نامور طبیب تھے سب لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ کے تھے۔ چنانچہ  
قصبہ توبان کے ایک طبیب کو دربار لیکوٹا بڑودھ میں وہ عزت حاصل ہوئی جو  
بہت کم اطباء کو حاصل ہو سکتی ہوگی۔ غرض ایسے نامور طبیب خاک لکھنؤ نے پیدا کیے  
جن کی مسیحی نفسی کے کارنامے آج تک بچے بچے کی زبان پر ہیں۔  
دربار اودھ کے آخر عہد میں سید محمد رفیع کے ایک شاگرد سید حکیم محمد یعقوب نے  
اپنا مطب جاری کر کے ایسی مرجعیت عامہ حاصل کی کہ ان کی ذات سے ایک  
بہت بڑے نامور طبی خاندان کی بنیاد پڑ گئی۔ جو آج بلا سائلہ دنیا بھر میں جو اب  
نہیں رکھتا۔ اسی خاندان کے مرحوم ناموروں میں حکیم محمد ابراہیم۔ حکیم حافظ محمد  
عبد العلی۔ حکیم محمد اسماعیل۔ حکیم محمد مسیح۔ حکیم محمد عبدالعزیز۔ حکیم حافظ محمد عبد الوہاب  
تھے۔ اور حکیم عبد الحفیظ صاحب۔ حکیم عبدالرشید صاحب۔ اور حکیم عبدالعزیز صاحب  
اسوقت اپنی مسیحائی کے کمالات دکھا رہے ہیں۔ کاش یہ اپنے خاندانی فن کو  
چھوڑ کے دوسری ہوسوں میں نہ پڑتے۔

دہلی میں حکیم محمد شریف خان کا خاندان اسوقت تک موجود ہے جس میں حکیم  
محمود خان اور حکیم عبدالحمید خان کے ایسے بالکمال گذر چکے اور حاذق الملک حکیم  
محمد اجمل خان صاحب بزرگوں کے نام کو اپنے ذاتی کمالات سے آج تک ظاہر  
کر رہے ہیں۔ دہلی میں حکیم محمد اجمل خان صاحب نے ایک مدرسہ طبیبی بھی جاری



کو دیا ہے اور طبی ویدک کا نفرنس قائم کر کے اپنے فن کو بہت عروج دے رہے ہیں۔ اُن کے مقابل لکھنؤ میں حکیم عبدالعزیز صاحب نے مدرسہ تکمیل الطب قائم کیا جس سے ہر سال بیسیوں اطباء تیار ہو کر اقطار ارض میں پھیلے اور لکھنؤ کی طبی مرجعیت کا ثبوت دیتے ہیں۔

بہر تقدیر مسلمانوں کا برائے نام یونانی فن طب آج اگر دنیا بھر میں کہیں زندہ ہو تو ہندوستان میں۔ اور ہندوستان میں اسکے مرکز دو ہی شہر ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ۔ مگر دہلی میں صرف ایک حکیم محمود خان کا خاندان ہے۔ اور لکھنؤ میں ایسے بیسیوں خاندان پڑے ہیں۔ دہلی میں بعض اور اطباء بھی مطب کرتے نظر آتے ہیں مگر وہ اسی زمانے کے جاوید طبیب ہیں جنہوں نے اپنے مطب جمالیے ہیں۔ لکھنؤ میں گو کہ بہت سے نئے طبیب ہیں۔ لیکن ایسے بہت سے خاندان بھی ہیں جن میں صدیوں سے فن طب کو ترقی رہی۔

لکھنؤ اور دہلی کے اطباء میں ایک اور فرق بھی ہے۔ طب کا موجودہ نصاب تعلیم ہمیں نہیں معلوم۔ اطباء دہلی کا مرتب کیا ہوا ہے یا اطباء لکھنؤ کا۔ لیکن اس پر پورا پورا عمل جیسا اطباء لکھنؤ نے کیا۔ اطباء دہلی نہیں کرتے۔ پڑھائی وہاں بھی یہی کتابیں جاتی ہیں مگر دہلی میں طبیوں کا مطب ایک بڑی حد تک اُن کی مدونہ طب سے الگ ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اُنہوں نے ویدک کی دواؤں کے اختیار کر لینے میں اسی قدر تہین کیا کہ اُن نے اجزاء کو اپنے مطب میں داخل کر لیا بلکہ یہ بے احتیاطی بھی کی کہ اُن کے داخل کرنے میں اپنے قدیم مدونہ و سلمہ اصول خصوصاً مزاج کے مباحث سے چشم پوشی کر لی۔ اور اُن اجزاء کو استعمال کر دیتے ہیں جن کے مزاج اور افعال و خواص سے وہ پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ وہاں فی الحال سب سے بڑی شکایت یہ سنی جاتی ہے کہ مدرسہ طبیہ دہلی کے نصاب میں تشریح کے علاوہ ڈاکٹری کے دیگر اصول بھی اس کثرت اور بے احتیاطی سے اختیار کر لیے گئے ہیں کہ اصلی فن طب بجائے ترقی کرنے کے بالکل ٹٹا جاتا ہے۔ یہی بے احتیاطی اُنہوں نے پہلے اصول ویدک کے اختیار کرنے میں کی تھی اور یہی اب اصول ڈاکٹری کے لینے میں ہو رہی ہے۔ ایسی حالت میں دہلی میں ہمارے قدیم

فن طب کا جو انجام ہوتا نظر آتا ہے نہایت خطرناک ہے۔  
 برخلاف اس کے لکھنؤ کے تمام طبی خاندانوں خصوصاً حکیم یعقوب مرحوم کے  
 خاندان اور تکمیل الطب میں اصلی اصول طبی کے قائم رکھنے اور انکو انھیں کے  
 دائرے میں رکھ کے ترقی دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اُن کے مطب اس  
 وقت تک اپنے فن اور اپنی کتابوں سے ذرا بھی جدا نہیں ہیں اور اسی سلا  
 روی کے راستے پر جا رہے ہیں۔ جس سے امید ہو سکتی ہے کہ شاید اسلامی طب  
 درست بردمانہ سے بچ جائے۔ اگرچہ اصلی خدمت فن سے یہ لوگ بھی ہنوز بہت  
 دور ہیں۔ طب کی روح علم دوا سازی ہے جو ہمارے قدیم علم کی کیا کا ایک شعبہ  
 ہے۔ اُسی فن پر یورپ کے موجودہ مہرنا فن کیسٹری کی بنیاد قائم ہوئی ہے۔ اس  
 فن میں مسلمان مصنفین سلف کی کتابیں ابھی کلیتہً نہیں منظرِ بلکہ بہت سی باقی  
 رہ گئی ہیں۔ اساتذہ طب کا کام ہے کہ ہارپار اُن کا مطالعہ کر کے اُن کو سمجھیں۔ انکو  
 غور و غوض کر کے حل کریں۔ اور انھیں نصاب تعلیم میں داخل کریں۔ پھر اُنکے  
 اصول و ضوابط میں جدید تجربات سے فائدہ اٹھانے کے مجتہدانہ تصرف کریں۔ اور  
 اپنے دوا سازی کے فن کو باضابطہ بنالین۔ جس کے بغیر طب کے تمام کمالات  
 اکثر اوقات بے نتیجہ اور غیر سودمند ثابت ہو جاتے ہیں۔  
 مگر اس کمی کے ساتھ بھی لکھنؤ نے طب کو جیسی ترقی دی اور مضبوط بنایا دہلی  
 سے بہت زیادہ ہے۔ اور دنیا کے اور کسی حصے میں نہیں ہے۔

(۱۵)

لیکن باوجود اس کے کہ علوم عربیہ کے بڑے بڑے علمائے گران پایہ لکھنؤ کی خاک  
 سے پیدا ہوئے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عربی کی تعلیم مقتدایان امت اور  
 پیشواں ملت تک محدود تھی۔ ہندوستان میں درباری زبان فارسی تھی۔ ملازمت  
 حاصل کرنے اور ہند و معرذ صحبتوں میں چلنے کے لیے یہاں فارسی کی تعلیم بخوبی  
 کافی خیال کی جاتی تھی۔ اودھ ہی نہیں سارے ہندوستان میں ادبی و علمی  
 ترقی کا ذریعہ صرف فارسی قرار پائی تھی۔ مسلمان تو مسلمان اعلیٰ طبقے کے ہندوؤں  
 کا عام رُجحان فارسی ادب و انشا کی طرف تھا۔ یہاں تک کہ اعلیٰ درجے کی

انشائیں ہندو مصنفوں ہی کے قلم سے مرتب و مدون ہوئی تھیں۔ ایک چند ہمارے ہمارے عجم کی سی لا جواب کتاب تصنیف کر دی جو مصطلحات زبان فارسی کا ایک بے عدیل و نظیر ذخیرہ ہے۔ اور جس میں ہر محاورے کی سند میں اہل زبان کے بے شمار اشعار پیش کر دیے گئے ہیں۔ لکھنؤ کے ابتدائی عروج میں ملا قانع کا اور پھر مرزا قنبر کا نام مشہور ہوا جو ایک نو مسلم فارسی دان تھے۔ وہ خود تو مذاقاً کہا کرتے کہ ”بوسے کباب مرا سلمان کرد“ مگر سچ یہ ہے کہ فارسی کی تعلیم اُسکے شوق اور کمال فارسی دانی کی آرزو نے اُنھیں سلمان ہونے پر مجبور کر دیا۔ اُنھوں نے محض اسی شوق میں ایران کا سفر کیا۔ برسوں تیراڈ و اصفہان اور طہران و آذربائیجان کی خاک چھانی۔ اور ادب فارسی کے اس اعلیٰ کمال کو پہنچ گئے کہ خود اہل زبان بھی ایسے بالکمال زبان دان پر حسد کریں تو تعجب کی بات نہیں ہے۔ مرزا غالب نے جاسیہ مرزا قنبر پر خط لکھے ہیں۔ بے شک مرزا غالب کا مذاق فارسی نہایت اعلیٰ درجے کا تھا۔ وہ اس اصول پر بار بار زور دیتے تھے کہ سوا اہل زبان کے کسی کا کلام سند نہیں ہو سکتا۔ مگر اُن کے زمانے میں چونکہ اودھ سے جگلے تک لوگ قنبر کے پیرو تھے اور بات بات پر قنبر کا نام لیا جاتا تھا اس لیے مرزا غالب کو اکثر طیش آگیا۔ اور جب پیروان قنبر نے اُن کی خبر لیا شروع کی تو کہنے لگے۔

فیض از صحبتِ تعلیم نیست	رشک بر شہرتِ تعلیم نیست
مگر آنا کہ فارسی دان نہ	ہم برین عہد و رے پیا نہ
کہ ذرا اہل زبان نبود قنبر	ہرگز از اصفہان نبود قنبر
لاجرم اعتماد از اند سزد	گفتہ اش استناد از اند سزد
کین زبان خاص اہل ایرستان	مشکل ما و سهل ایران است
سخنت آشکار و پنهان نیست	دلہی و لکھنؤ از ایران نیست

مگر اس سے یہ نہیں نکلتا کہ قنبر نے فارسی دانی میں جو کوششیں کی تھیں اور اُس میں واقفیت و کمال حاصل کرنے میں جو زندگی صرف کی تھی وہ بالکل بیکار گئی۔ اس بات کے ماننے میں کسی کو عذر نہیں ہو سکتا کہ قنبر کا کوئی دعوے جب تک

وہ اہل زبان کی سند نہ پیش کرین قابل تسلیم نہیں ہے۔ اور نہ خود قتل کے ذہن میں کبھی یہ خیال گذرا ہوگا۔ لیکن اس کی خصوصیت قتل ہی کے ساتھ نہیں۔ ہندوستان کا کوئی شخص بچاے خود سند نہیں ہو سکتا۔ خود مرزا فوشہ غالب بھی کوئی فارسی کا محاورہ بغیر اہل عجم کے ثبوت پیش کیے نہیں استعمال کر سکتے۔ ہندوستانی فارسی دانوں کا اگر کچھ وقار قائم ہو سکتا ہے تو صرف اس بنا پر کہ کلام فارسی میں ان کی نظر وسیع ہے اور ہر لحظے صحیح محل استعمال سے واقف ہیں۔ اور اس حیثیت سے سچ پوچھیے تو غالب کے مقابلے میں قتل کا پایہ بہت بلند تھا غالب زندگی بھر ہندوستان کی خاک چھانتے رہے۔ اور اسکے ساتھ طلب معاش میں سرگردان رہے۔ قتل کو اطمینان کا زمانہ ملا تھا۔ اور مدتوں خاک پاک ایران میں رہ کے گاؤں گاؤں کی ٹھوکریں کھاتے پھرے تھے۔

بہر تقدیر لکھنؤ کی فارسی دانی کا آغاز قتل سے ہوا۔ اور ان سے کچھ پہلے ملا فائق نے جن کا خاندان آگرے سے آئے مصافحات لکھنؤ میں بس گیا تھا ادب و انشاء فارسی اور فارسی نظم و نثر میں اعلیٰ درجے کی بے نظیر کتابیں تصنیف کیں۔ فارسی گو اور فارسی دان ہندوستان میں ان سے پہلے بھی گذرے تھے۔ مگر فارسی دانی کے ساتھ زبان فرس کے اصول و ضوابط اور اس کی صرف و نحو کے مدون کرنے کا شوق پہلے پہل لکھنؤ ہی میں شروع ہوا۔ اور وہ اُنھیں کے قلم سے ظاہر ہوا۔ ان کی کتابیں اگر سچ پوچھیے تو بمثال ولا جواب ہیں۔

اس کے بعد فارسی بیان کی عام تعلیم میں داخل رہی۔ اور نصاب فارسی ایسا ملے و دقین رکھا گیا جو سچ یہ ہے کہ خود ایران کے نصاب سے زیادہ سخت تھا۔ ایران میں جیسا کہ ہر ملک کے لوگوں کا معمول ہے سیدھی سادی فصیح زبان جس میں صفائی کے ساتھ خیال آفرینی کی جائے پسند کی جاتی ہے۔ اور اُسی قسم کا نصاب بھی ہے۔ ہندوستان میں عربی و فنی و نفی اور بطوری و نفی، خان عالی کے ایسے نازک خیال شعر کا کلام داخل درس کیا گیا۔ ملا نظرا اور مصنف پنج رقعہ کے ایسے وقت پسندون کا کلام پڑھا اور پڑھایا جائے لگا۔ جس سے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی زبان دانی اس آخر عہد میں خود ایران سے بڑھ گئی تھی۔ اور ہمیں کے لوگوں نے فارسی کی تمام درسی

کتابوں پر اعلیٰ درجے کی شرحیں لکھ ڈالیں تھیں۔ اور اُسی کا یہ حیرت خیز نتیجہ ہے کہ جبکہ دنیا کی تمام زبانوں کے شعرا اہل زبان ہی کے حلقے میں محدود رہتے ہیں۔ اور غیر اہل زبان میں اگر دو چار شاعر پیدا بھی ہو جاتے ہیں تو اہل زبان میں اُن کی اعتبار نہیں ہوتا۔ فارسی کے شعرا ایران سے زیادہ نہیں تو ایران کے براہری ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ خصوصاً گزشتہ صدی میں جبکہ ترقی و تعلیم کی دنیا میں لکھنؤ کا درجہ بڑھ رہا تھا یہاں کا بچہ بچہ فارسی گو تھا۔ جاہل مذہبیوں اور بازاری مزدوروں کی زبان پر فارسی کی غزلیں تھیں۔ اور بھانڈا تک فارسی کی نقلیں کرتے تھے۔ قصبات اودھ کے تمام شرفا کا مہذب مشغلہ اور ذریعہ معاش فارسی پڑھانا تھا۔ اور ایسے اعلیٰ درجے کے دیہاتی فارسی مدرس لکھنؤ کی گلیوں میں مارے مارے پھرتے تھے کہ اُن کی زبان دانی پر خود اہل غم بھی غش غش کر جاتے۔ اُن کا لب و لہجہ اہل زبان کا سا نہ ہو مگر فارسی کے محاوروں اور بندشوں اور الفاظ کی تحقیق و تدقیق میں ان کو وہ درجہ حاصل تھا کہ معمولی اہل زبان کو بھی خطرے میں نہ لاتے تھے۔ لکھنؤ میں فارسی کا مذاق جس قدر بڑھا ہوا تھا اُس کا اندازہ لکھنؤ کی اردو زبان سے ہو سکتا ہے۔ جہلا اور عورتوں تک کی زبان پر فارسی کی ترکیبیں بندشیں اور اضافتیں موجود ہیں۔ اور لکھنؤ کی زبان پر حملہ کرنے والوں کو اگر کوئی اعتراض اتنے دنوں میں مل سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ اس میں فارسی اعتدال سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ لیکن اُس دور کے معیار ترقی کے لحاظ سے یہی چیز لکھنؤ کی زبان کی خوبی اور اُس کی معاشرت کے زیادہ بلند ہو جانے کی دلیل تھی۔ خود دہلی میں زبان اردو کی ترقی کے جتنے دور قانم کیے جائیں اُن میں بھی اگلے پچھلے دور کا امتیاز صرف یہی ہو سکتا ہے کہ پہلے کے بہ نسبت بعد والے میں فارسی کا اثر زیادہ ہے۔ مسلمانوں کی طرح ہندو بھی فارسی میں خود حاصل کر رہے تھے۔ اگرچہ یہ امر دولت منلیہ کے ابتدائی عہد سے ظاہر ہونے لگا تھا۔ اُس وقت بھی بعض نامور و مستند فارسی دان اور فارسی گو موجود تھے مگر اودھ میں یہ مذاق انتہائی کمال کو پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ جیسے باکمال فارسی دان ہندو سواد لکھنؤ میں موجود تھے کہیں نہ تھے۔ کاسیتھون اور کشمیری پنڈتوں نے تعلیم فارسی کو اپنے لیے لازمی قرار دے لیا

تھا۔ اور یہاں تک ترقی کی کہ کشمیری پنڈتوں کی تو فارسی زبان ہی اُردو ہو گئی۔ اور اُن کی اور مسلمانوں کی فارسی دانی میں بہت کم فرق تھا۔ کاسیتھ چونکہ ہین کے موطن تھے اس لیے اُنکی زبان بھاشا رہی۔ مگر تعلیم فارسی کی کاسیتھوں کے رگ و پے میں اس قدر سرایت کر گئی تھی کہ نہایت ہی بے اعتدالی اور بے بطنی کے ساتھ محاورات فارسی کو استعمال کرنے لگے۔ جو بات کہیں کے ہندوؤں میں نہ تھی اُن دنوں لوگ کاسیتھوں کی زبان کا مضحکہ اُڑایا کرتے تھے۔ مگر سچ یہ ہے کہ بجائے مضحکہ اُڑانے کے اُن کی قدر کرنی چاہیے تھی۔ اس لیے کہ اُن کی زبان اُن کی علمی ترقی کی دلیل تھی۔ جس طرح آج کل انگریزی لفظوں کے جاوید استعمال کو انگریزی دان اپنی علمی ترقی کا ثبوت خیال کرتے اور نہایت بدتمیزی سے انگریزی الفاظ اپنی زبان میں بھرتے چلے جاتے ہیں۔

لکھنؤ میں اُن دنوں فارسی کے مد ہاشا ر اور شاعر موجود تھے۔ اور اُردو کی طرح برابر فارسی مشاعروں کا بھی سلسلہ جاری تھا۔ فارسی شرفاوی نہیں عوام الناس تک کا شاعر و شاعر بن گئی تھی۔ اور اب باوجودیکہ فارسی درباری زبان نہیں باقی رہی اور حکومت کی مسند پر اُردو زبان قابض و مقرر ہو گئی ہے مگر ہندو سوسائٹی پر آج تک فارسی کا سک جھا ہوا ہے۔ اور عام خیال یہی ہے کہ فارسی مدارس و مکاتب سے نکل گئی اور تحصیل معاش کے لیے اسکی ضرورت نہیں باقی رہی مگر انسان بغیر فارسی پڑھے ہندو سوسائٹی میں بیٹھنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ صحیح معنوں میں انسان کامل بن سکتا ہے۔

انگلستان میں فرانس کی زبان کبھی درباری زبان تھی۔ اب اگرچہ مدت ہوئی کہ وہ دربار سے نکال دی گئی مگر معاشرت اور اخلاقی ترقی آج بھی وہاں بغیر فرانسیسی زبان کے کچھ نہیں حاصل ہو سکتی۔ کھانے پینے۔ اُٹھنے بیٹھنے۔ پہننے اور بھینے۔ اور ہنسنے بولنے۔ غرض زندگی کے تمام اسلوبوں پر فرانسیسی کی حکومت اب تک ویسی ہی موجود ہے۔ اور لڑکیاں بغیر فرنگ زبان حاصل کیے شایستہ میدان نہیں بن سکتیں۔ یہی حال لکھنؤ کا ہے کہ فارسی دربار سے گئی۔ خط و کتابت سے گئی۔ مگر معاشرت کے تمام شعبوں پر اب تک حکومت کر رہی ہے۔ اور بغیر فارسی

کی تعلیم پائے نہ ہمارا مذاق درست ہو سکتا ہے اور نہ ہمیں بات کرنے کا سلیقہ آ سکتا ہے۔  
 مٹیابرج (کلکتہ) میں آخری محرم القسمت تاجدار اودھ کے ساتھ جو چند  
 لوگ وہاں کے سکونت پذیر ہو گئے تھے اُن میں کوئی پڑھا لکھا نہ تھا جو فارسی نہ  
 جانتا ہو۔ دفتر کی زبان فارسی تھی اور ہندو مسلمانوں میں صدام فارسی گو شاعر تھے  
 عزیزین تک فارسی میں شعر کہتی تھیں۔ اور بچہ بچہ فارسی زبان میں اپنا مطلب  
 ادا کر لیتا تھا۔

موجودہ لکھنؤ میں اگرچہ فارسی کی تعلیم بہت کم ہو گئی ہے اور ہندوؤں نے تو اسے  
 اس قدر چھوڑ دیا کہ وہ کالیستھوں کی زبان ہی غائب و خیال ہو گئی جس کا زبان  
 دانی کی محبتوں میں مضحکہ اُڑایا جاتا تھا۔ اور بھیا نڈیمک اُس فارسی آمیز  
 زبان کی نقلین کرتے تھے مگر پھر بھی پڑے بزرگوں اور خصوصاً مسلمانوں میں  
 بہت کچھ فارسی کا مذاق موجود ہے۔ اس لیے کہ اُنکی اُردو دانی ہی ایک حد تک  
 اُنکے لیے فارسی دانی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ مسلمانوں میں اب تک خواجہ  
 عزیز الدین صاحب کا ایسا محقق فارسی اگلی بزم سخن کے یاد دلانے کو بڑا ہوا ہے  
 جو اپنے کمال کے لحاظ سے سارے ہندوستان میں کیا ہیں۔ اور پُرانے میں سید  
 ہندوؤں میں بھی متعدد فارسی کے اسکالرمین گے جن کا ایک نمونہ سندیلہ کے  
 راجہ درگا پور شاہ صاحب ہیں۔ جن کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ زمانہ بدل گیا  
 زمین و آسمان بدل گئے۔ آب و ہوا بدل گئی۔ مگر وہ آج تک وہی ہیں۔ فارسی  
 دانی کی یاد دینے اور لینے کو موجود ہیں۔ اور اگلی تاریخ کے اب کم خورہ ورق  
 کی طرح چومنے چاٹنے اور آنکھوں سے لگانے کے قابل ہیں۔

(۱۶)

علوم ہیست و امیتہ کتابت اور تحریر کے فن ہیں۔ مسلمانوں کا پُرانا خط عربی تھا  
 جس کو نسخ کہتے ہیں۔ خلافت ہندو کے ازمندہ وسطیٰ تک ساری دنیا اسلام میں  
 مشرق سے مغرب تک یہی خط تھا جو ارض حیرہ کے پُرانے خط سے خط کوئی اور خط کوئی  
 سے خط نسخ بن گیا تھا۔ خاندان طاہریہ کے زمانے سے وہ تمام علم و فن جو ہندو میں  
 پارہے تھے ایران و خراسان کی طرف آئے لگے۔ اور دلیوں اور سلجوقیوں کے زمانے

میں ہندو کے اکثر کمالات ایران میں بخوبی جمع ہو گئے۔ خصوصاً دلیپون کے علمی ذوق اور نقشن طبع سے ایران کا مغربی صوبہ آذربائیجان جو قدردا عراق عجم و عراق عرب کے آغوش میں واقع تھا۔ ہر قسم کی خوبیوں اور ترقیوں کا گوارہ قرار پایا گیا۔ اسی علاقے میں پہلے پہل خطائے بھی نئی وضع اختیار کرنا شروع کی۔ کتابت خطاطی کی حدود سے نکل کے نقاشی کی قلمرو میں داخل ہو گئی۔ اور اس میں مصورانہ نزاکتیں پیدا کی جانے لگیں۔ عجمی نزاکت پسندوں کو خط عرب کی پُرانی سادگی میں بھدا پن نظر آیا۔ اور پُرانی شان اور وضع خود بخود چھوٹنے لگی۔ نسخ میں قلم ہر حرکت اور لفظ میں اول سے آخر تک یکساں رہا کرتا تھا۔ حروف میں غیر موزون خمی اور غیر متناسب ناہمواری ہوتی تھی۔ دائرے گول نہ تھے بلکہ نیچے اور چبھٹے ہوتے اور ادھر ادھر اُن میں کونے پیدا ہو جاتے۔ اب نقاشی کی نزاکت کو خطاطی میں ملا کے تحریر میں نوک پلاک پیدا کی جانے لگی۔ حروف کی نوکین۔ گردنیں۔ اور دُمیں باریک بنائی جانے لگیں۔ دائرے خوبصورت اور گول لکھے جانے لگے۔ اس جدید مذاق کو پوری طرح پیش نظر رکھ کے سب سے پہلے میر علی تبریزی نے جو فاضل و عظیم پکار رہنے والا تھا۔ اس نئے خط کو با اصول و با قاعدہ بنا کے مشرقی بلاد میں رواج دیا۔ اور اُس کا نام نستعلیق قرار دیا۔ جو اصل میں نسخ تعلیق یعنی منہمک نسخ تھا۔

یہ نہیں معلوم کہ میر علی تبریزی کس زمانے میں تھے۔ منشی شمس الدین صاحب جو آج لکھنؤ کے مشہور و مستند خوشنویس ہیں اُن کا زمانہ تیمور سے پہلے بتاتے ہیں۔ لیکن نستعلیق کی کتابت اتنی پُرانی ملتی ہیں کہ تیمور درکنار ہم سمجھتے ہیں کہ اس خط کی ایجاد محمود غزنوی سے بھی پہلے ہو چکی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ محمود کے حملوں کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان میں فارسی خوش نویسوں کی بھی آمد شروع ہو گئی ہوگی۔ جن کے اثر سے یہاں اس خط کا رواج شروع ہوا۔ اور ہندوستان کے ہر صوبے اور ہر خطے میں نستعلیق کے خوش نویس کثرت سے پیدا ہو گئے۔ لہذا یا تو میر علی تبریزی کا زمانہ بہت قدیم ہے اور یا وہ اصلی موجد خط نہیں ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ دہلی و لکھنؤ بلکہ سارے ہندوستان کی موجودہ خوش نویس اپنا استاد اول میر علی تبریزی کو بتاتی ہے۔ ان کے ایک مدت دراز کے بعد ایران



میں خلیفہ کی اُستادی میں میر عابد الحسنی کا نام مشہور ہوا۔ جو خوشنویسوں میں بڑے ممتاز و نامور کاتب اور استاد اہل مائے جاتے ہیں۔ اُن کے بھائی آغا عبد الرشید علی نادہ شاہ کے حلوں کے زمانے میں دار و ہند ہوئے اور لاہور میں آکے ٹھہر گئے۔ لاہور میں اُن کے مدد ہا شاگرد پیدا ہوئے۔ جنہوں نے انقطاع ہند میں پھیل کے اُنھیں ہندوستان کی خوشنویسی کا آدم نہیں تو فوج ضرور ثابت کر دیا۔

اُنھیں کے دو شاگرد جو دلائی تھے وارد لکھنؤ ہوئے۔ ان دونوں بزرگوں میں سے ایک حافظ نور اللہ اور دوسرے قاضی نعمت اللہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ عبد اللہ بیگ نام آغا عبد الرشید کے ایک تیسرے بالکمال شاگرد بھی لکھنؤ میں آئے تھے۔ ان حضرات کے آنے کا زمانہ غالباً نواب آصف الدولہ بہادر کا عہد تھا۔ جب یہاں کوئی بالکمال آکے واپس نہ جاتے پاتا تھا۔ قاضی نعمت اللہ آتے ہی اس خدمت پر مامور ہو گئے کہ شاہزادوں کو اصلاح دیا کریں۔ اور حافظ نور اللہ کو بھی دیوار اووہ سے تعلق ہو گیا۔ اور ان دونوں نے یہاں ٹھہر کے لوگوں کو خوش نویسی کی تعلیم دینا شروع کی۔

ان بزرگوں کے علاوہ یہاں اور پڑانے خوش نویس بھی تھے۔ جن میں سے ایک نامور بزرگ منشی محمد علی بتائے جاتے ہیں۔ مگر آغا عبد الرشید کے شاگردوں نے اپنا ایسا سکھ جھالیا کہ خوشنویسی کے تمام شائق بلکہ سارا شہر اُن کی طرف رجوع ہو گیا۔ جسے خطاطی کا شوق ہوا اُنھیں کا شاگرد ہو گیا۔ اور تمام خوشنویسان سلف کے نام مٹ کے گناہی کے نام پیدا کما رسمند رہیں غرق ہو گئے۔ اور سچ یہ ہے کہ یہ بزرگ اپنے کمال کے اعتبار سے اسکے مستحق بھی تھے۔

حافظ نور اللہ کی لکھنؤ میں جو قدر ہوئی اُس کا اندازہ اسی سے نہیں ہو سکتا کہ وہ یہاں سرکار میں ملازم ہو گئے تھے۔ بلکہ لکھنؤ کی قدر دانی کا صحیح اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ لوگ اُنکے ہاتھ کے لکھے ہوئے قطوں کو موتیوں کے دامنوں میں لیتے۔ یہاں تک کہ اُنکی مہوئی مشق بازاری میں صرف ایک روپیہ حیرت کے حساب سے ہاتھوں ہاتھ یک جاتی تھی۔

اُن دونوں امرا اور شوقین لوگ اپنے مکانات کو بجائے تصویروں کے قطعات

سے آراستہ کیا کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے علی العموم قلعوں کی بے انتہا مانگ تھی۔ اور جہاں کسی اچھے خوش نویس کے ہاتھ کا قطعہ مل جاتا اُس پر لوگ پردانوں کی طرح گرتے اور اُسے آنکھوں سے لگاتے۔ اس سے سوسائٹی کو تو یہ فائدہ پہونچتا کہ اکثر اخلاقی اصول اور اصحانہ فقرے یا اشعار ہمیشہ پیش نظر رہتے۔ اور ہر وقت گھر میں اخلاقی سبق ملتا رہتا۔ اور خوش نویسی کو یہ فائدہ پہونچتا کہ خوش نویسوں اور صاحب کمال خطاطوں نے اپنے کمال کو قطعہ نویسی ہی تک محدود کر دیا تھا۔ جو آبادار اور عمدہ و صلیوں کو لکھ کے تیار کرتے۔ اور اسی میں وہ گھر بیٹھے دولتمند ہو جاتے۔ مگر افسوس اب ہندوستان سے قلعے اور کتبوں کا رواج اٹھتا جاتا ہے اور ان کی جگہ تصویروں نے لے لی ہے۔ جس کی وجہ سے اگلے نفیس و مہذب شرعی مذاق آرائش کے منٹ جانے کے ساتھ خوش نویسی بھی ہندوستان سے اٹھ گئی۔ اب کاتبین خوش نویس نہیں ہیں۔ اور جو دو ایک خطاط مشہور بھی ہیں وہ مجبور ہیں کہ کاپی نویسی اور کتاہت سے اپنا پیٹ پالین جو چیز کہ اصل میں خوش نویسی کی ذمہ ہے۔ بخلات اس کے اُن دنوں ایک گروہ قائم ہو گیا تھا جس کا کام فقط یہ تھا کہ خوش نویسی کو اپنے اصول پر قائم رکھے اور اُس کو وقتاً فوقتاً مناسب ترقیان دیتا رہے۔ چنانچہ اگلے خوش نویس کتاہت کو اپنی شان سے ادنیٰ سمجھتے تھے۔ اور خیال کرتے کہ جو شخص پوری پوری کتاہت لکھے گا وہ غیر ممکن ہے کہ اول سے آخر تک اصول و قواعد خوش نویسی کو پوری طرح نباہ سکے۔ اور سچ یہ ہے کہ جتنی محنت اور مشقت وہ لوگ ایک ایک و صلی کی درستی میں کرتے تھے اُس کی عشر عشر محنت بھی کاتب کسی پوری کتاب کے لکھنے میں نہیں کر سکتے۔

اُن کی محنت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حافظ نور اللہ سے ایک بار نواب سعادت علی خان نے فرمائش کی کہ ”مجھے گلستان کا ایک نسخہ لکھ دیجیے۔“ تو اب سعادت علی خان گلستان سعدی کے مجدد شائق تھے۔ اور کہتے ہیں کہ گلستان ہر وقت اُن کے سر ہائے موجود رہا کرتی تھی۔ اور کوئی ایسی فرمائش کرتا تو حافظ نور اللہ اپنی توہین سمجھ کے اُس کا منہ ہی فوچ لیتے۔ مگر فرمانِ روا سے وقت کا کتنا تھا۔ منظور کر لیا۔ اور عرض کیا ”تو مجھے اُسی گدھی کا غدار اُن دنوں یرم کو گدھی

کہتے تھے) ایک سو قلعہ تراش چا تو۔ اور خدا جانے کتنے ہزار قلعوں کے نیرے منگوا دیجئے۔ سعادت علی خان نے حیرت سے پوچھا "فقط ایکلی ایک گلستان کے لیے اتنا سامان درکار ہوگا؟" کہا "جی ہاں میں اتنا ہی سامان خرچ کیا کرتا ہوں" نواب کے لیے اس سامان کا فراہم کرنا کچھ دشوار تو تھا نہیں۔ منگوا دیا۔ اب حافظ صاحب نے گلستان لکھنا شروع کی مگر پوری نہیں ہوئے پانی تھی سات ہی باب لکھنے پائے تھے اور آٹھواں باب باقی تھا کہ انتقال ہو گیا۔ اُن کے بعد جب اُن کے بیٹے حافظ ابراہیم دربار میں پیش ہوئے اور اُنھیں سیاہ خلعت تعزیت عطا ہوا تو سعادت علی خان نے کہا "بھئی میں نے حافظ صاحب سے گلستان لکھوائی تھی خدا جانے اُس کا کیا حال ہوا؟" حافظ ابراہیم نے عرض کیا "اُن کے لکھے ہوئے سات باب تیار ہیں۔ آٹھواں باب باقی ہے اُسے یہ فقیر لکھ رہا ہے" اور اس قدر اُن کی شان سے ملا دے گا کہ حضور اتنا زندہ کر سکیں گے۔ لیکن ہاں اگر کسی مصرخوش نویس نے دیکھا تو وہ بیشک ہچان لے گا۔ نواب نے اجازت دی اور اُس گلستان کو حافظ ابراہیم نے پورا کیا۔

حافظ نور اللہ کے شاگردوں میں زیادہ ممتاز سب سے اول تو خود اُن کے بیٹے حافظ ابراہیم تھے۔ دوسرے نشی سرب سکھ نام ایک ہندو بزرگ تھے جن کو کوئی کالیستہ بتاتا ہے اور کوئی کشمیری پنڈت۔ اور تیسرے محمد عباس نام لکھنؤ کے ایک خوش نویس۔ حافظ ابراہیم نے بھی بہت نام پیدا کیا۔ سیکڑوں آدمیوں کو خوش نویس بنادیا۔ اور فن میں مجتہدانہ مرتبہ پیدا کر کے اپنے والد سے جدا ایک شان پیدا کی۔ حافظ نور اللہ کے دائرے بالکل گول ہوتے تھے۔ حافظ ابراہیم نے اُن میں ایک خفیت سی معیادیت اختیار کی۔ نشی سرب سکھ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اپنے اُستاد کی شان اس قدر اُڑالی تھی کہ صد ہا مسلمان حافظ نور اللہ کے نام سے پھیلا دیں۔ اور بڑے بڑے خوش نویس بالکل تمیز نہیں کر سکتے تھے اور یہ اُن دنوں خوشنویسی کا بہت بڑا کمال تھا۔

حافظ ابراہیم کے ممتاز شاگردوں میں پہلے تو اُن کے فرزند حافظ سید الدین تھے۔ ان کے علاوہ نشی فقیر حمید۔ نشی عبد الحمید جو سرکار شاہی میں احکام شاہی

اور پرچہ و پیام دہیتی مراسلت فی امین دولت انگلیشہ و دولت اودھ) لکھنے پر  
 مامور تھے۔ مگر حافظ ابراہیم کے دو شاگردوں نے بہت ہی فروغ پایا جو اپنے  
 زمانے میں سارے لکھنؤ کے استاد قرار پائے گئے تھے۔ ایک تو منشی منشا رام کشمیری  
 پنڈت جو اپنے فن کے بہت بڑے کمال تھے۔ اور دوسرے منشی محمد امدی علی جو تعلق  
 کے علاوہ نسخ اور طغرائی میں بھی لکھنؤ میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔  
 اُدھر تاقی نعمت اللہ کے شاگرد ایک تو اُن کے فرزند مولوی محمد اشرف  
 تھے اور دوسرے مولوی قل احمد۔

غرض تسلیق کے ہی لوگ استاد تھے جن سے لکھنؤ میں خوش نویسی کمال کو  
 پہنچی۔ پھر مطبع جاری ہونے کے بعد کتابت و کاپی نویسی کو فروغ ہوا۔ اور اصل  
 یہ اسی خاندان کی برکت ہے کہ لکھنؤ میں ہزاروں مسلمان ہزاروں کاسیتھ جن سے  
 نو سیتہ اور اشرف آباد کے تھے بھڑے ہوئے ہیں اور سیکنڈ و تھیرڈ کلاس خوشنویس  
 ہو گئے۔ مگر انھوں کشمیری پنڈتوں نے انگریزی تعلیم کے شوق میں اور خوشنویسی کی  
 کساد بازاری دیکھ کے اس فن کو مطلقاً چھوڑ دیا۔ اور اب بچنے اچھے لکھنے والے  
 ہیں سب مسلمان ہیں یا کاسیتھ۔

آخر زمانے میں سندلیہ کے ایک منشی عبدالحی بھی بڑے باکمال خوشنویس تھے۔  
 جن کے شاگرد منشی امیر اللہ تسلیم اُن کے بڑے بھائی منشی محمد عبد الطیف اوشی  
 اشرف علی وغیرہ تھے۔ فی الحال تسلیق میں منشی شمس الدین صاحب اور شیخ  
 میں منشی حامد علی صاحب کو شہرت ہے۔ اور یہ دونوں منشی ہمدانی علی صاحب  
 کے شاگرد ہیں۔

ہندوستان میں خط نسخ جن باکمالوں کی جانب منسوب کیا جاتا ہے اُن میں  
 سب سے پہلے شخص یا قوت مستقصی کے لقب سے مشہور ہیں جو یا قوت اول کہلاتے  
 ہیں۔ جن اس نام کا کوئی باکمال کاتب مستقیم باللہ کے عہد میں نہیں نظر آتا۔  
 کیا عجب کہ اس سے مراد عماد کاتب جو بنی الملقب بہ "فخر الکتاب" المتوفی ۱۰۰۵ھ  
 ہو۔ جس کی کتاب "خریدہ" مشہور ہے۔ اور جو پہلے ارض شام میں سلطان اتابک  
 نور الدین زنگی کا اور اُس کے بعد مصر میں سلطان صلاح الدین ایوبی فتح بیت المقدس

کا کا تب تھا۔ اس لیے کہ نسخ کا سب سے بڑا آخری خوشنویس وہی مانا جاتا ہے۔ اس کے بعد سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں مجدد عارف نام خط نسخ کے ایک بڑے بالکمال پیدا ہوئے۔ جن کو یا قوت رقم ثانی کا خطاب دیا گیا۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ انھوں نے خط نسخ کی نئی شان ایجاد کی اور بہ مقابل سابق کے اُسے زیادہ خوبصورت بنا دیا۔ یہاں تک کہ نسخ کے اساتذہ لکھنؤ دعویٰ کرتے ہیں کہ اُن کے کمال کا ساری دنیاے اسلام نے اعتراف کر لیا۔ مین اس کے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ یا قوت رقم ثانی کو ہندوستان میں چاہے جیسی فوقیت حاصل ہو گئی ہو مگر اُن عالمک میں جہاں کا قومی خط خط نسخ اور قومی مادری زبان زبان عربیہ لوگ یا قوت رقم کا نام بھی نہیں جانتے۔ اور نہ اُن کی شان کے پیرو ہیں۔

مجدد عارف یا قوت رقم کے زمانے میں عبداللہ بقی نام ایک شخص تھے جن کا پیشہ حدادی یعنی لوہاری تھا۔ انھیں یا قوت رقم کی مرجیت عامہ دیکھ کے شوق ہوا کہ خود بھی اس فن میں کمال پیدا کریں۔ اتفاقاً عبداللہ طباخ نام نسخ کے ایک اور خوش نویس اُن دنوں مشہور تھے۔ حداد جاکے اُن کے شاگرد ہوئے۔ اور ایسی محنت کی کہ اُس کا کمال مشہور ہو گئے۔ جب ان دونوں کا زمانہ گزر گیا تو یا قوت رقم کی جگہ اُن کے بھتیجے قاضی عصمت اللہ نے لی۔ اور حداد کی یادگار اُن کے دو فرزند علی اکبر اور علی اصغر تسلیم کیے گئے۔

اس کے بعد ہندوستان میں بڑے بڑے خوش نویس پیدا ہوئے۔ اور برابر نسخ کی کتابت ہندوستان میں ترقی کرتی رہی۔ آخر میں شاہ غلام علی صاحب کو شہرت ہوئی جو نسخ کے بالکمال خوش نویس تھے۔ اس کے بعد لکھنؤ میں ایک طرف مولوی ہادی علی صاحب کی شہرت ہوئی جن کا خاندان دہلی سے آیا تھا۔ اور کاشمی کے ایک خوشنویس میر اکبر علی کے وہ شاگرد تھے۔ مولوی ہادی علی صاحب کو طعنا نگاری میں بڑا کمال حاصل تھا۔

نشی ہادی علی کے ہم عصر نسخ کے ایک مشہور خوش نویس میرتبہ علی مرتضیٰ تھے اُن کے استاد نواب احمد علی نام ایک پرانے وقت کے رئیس اور نسخ کے بالکمال استاد تھے

میرتبندہ علی کے ہاتھ میں رشتہ تھا۔ مگر قلم جیسے ہی کاغذ پر لگتا معلوم ہوتا کہ لوہے کا ہاتھ ہے۔ کیا خیال کہ قایوسے باہر ہو۔ اُن کی نظر خط کے پچانتے میں ایسا کمال رکھتی تھی کہ بڑے بڑے لوگ لوہا مان گئے۔

منشی حامد علی صاحب فرماتے ہیں ایک موقع پر منشی ہادی علی منشی محمد سیدی (یہ بھی نسخ کے بڑے استاد تھے جنھوں نے طبع ہونے کے لیے لکھنؤ میں پہلا قرآن لکھا) منشی عبدالحی سندیلوی۔ اور میرتبندہ علی قریش ایک صحبت میں جمع تھے۔ یہ نسخ کے تمام بالکا لون کی صحبت تھی۔ کسی نے ایک قطعہ نسخ فروخت کے لیے لا کے پیش کیا۔ گو اُس میں کاتب کا نام نہیں لکھا تھا مگر اُن بالکا لون نے بالالتفات پہچان لیا کہ خاص یا قوت کے ہاتھ کا ہے۔ اور سب کو شوق ہوا کہ اُس اپنے قبضے میں کریں۔ مگر منشی ہادی علی صاحب نے کہا: ”یہ ایک دن میرے پاس رہے تو مجھے غور کرنے کے بعد اطمینان ہو گا کہ دراصل یہ یا قوت کے ہاتھ کا ہے یا نہیں۔“ مالک نے دے دیا اور وہ اُسے کھلائے۔ دوسرے دن لے جا کے پیش کیا۔ اور کہا ”واقعی یہ یا قوت ہی کے ہاتھ کا ہے۔“ ی کے ساتھ کا یا قوت کا ایک قطعہ میرے پاس بھی پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے لیجا کے اُس سے ملا یا تو بعینہ وہی پایا۔ اور مجھے یقین آ گیا کہ واقعی یا قوت کا ہے۔ اور دونوں قطعے سب کے سامنے رکھ دیے۔ سب نے بلا تامل تسلیم کر لیا کہ دونوں یا قوت ہی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ مگر میرتبندہ علی نے منشی ہادی علی والے قطعے کو غور سے دیکھا۔ پھر سُکرائے۔ اور اُس کے نیچے لکھ دیا ”ابن کار از قواید و مردان چنین کنند“ یہ تحریر دیکھ کے منشی عبدالحی صاحب بگڑے اور کہا ”کیا آپ کو اس میں کچھ شک ہے؟“ میرتبندہ علی نے کہا ”یہ قطعہ غویا قوت کے ہاتھ کا نہیں ہو سکتا۔“ منشی عبدالحی اور دیگر حریفان صحبت نے دعویٰ کیا کہ ”یہ خاص یا قوت کے ہاتھ کا ہے۔“ میرتبندہ علی نے اُس میں ایک واؤ کا سرا دکھلایا اور کہا ”یہ یا قوت کا نہیں ہو سکتا۔“ اب سب لوگ گو گو میں پڑے ہوئے تھے کہ منشی ہادی علی نے اُس وصلی کا ایک کوتا پھاڑ کے کاغذ کی تہ کے اندر سے نکال کے اپنا نام دکھلایا اور سب کو یقین آ گیا کہ یہ کارستانی منشی ہادی علی صاحب کی تھی۔ سب نے

اُن کی حیدریت کی۔ اور اُنھوں نے کہا "مگر میں تو میر بندہ علی صاحب کی نظر کا قائل ہو گیا۔"

خوش فزیون کے عام مذاق کے مطابق میر بندہ علی صاحب سے بھی قطعہ نوی کے سوا کتابت غیر ممکن تھی۔ زندگی بھر کبھی کوئی چھوٹی کتاب بھی نہ لکھی گئی۔ حاجی حرمین شریفین نے حیب مطبع جاری کیا تو ہزار سنت و ساجت میر بندہ علی کو اس پر راضی کیا کہ اُنھیں ایک پنجورہ لکھ دیں۔ میر بندہ علی نے بڑی محنت سے اور خدا جاسے نکتے و نون میں لکھا۔ اور لے گئے۔ مگر حاجی صاحب کے سامنے جب اُس پر آخری نظر ڈالی تو کچھ ایسا ناپسند ہوا کہ بجائے حاجی صاحب کے حوالے کرنے کے پھاڑ ڈالا۔ اور کہا "بھئی مجھ سے نہیں ہو سکتا۔"

ان بزرگوں کے تذکرے سے میرزا یہ مقصد نہیں ہے کہ خوش نویسی میں لکھنؤ کو کوئی ایسا امتیاز حاصل ہو گیا تھا جو ہندوستان میں عدیم النظر ہو۔ بخلاف اسکے میرا خیال ہے کہ نسخ کے جیسے جیسے بالکمال دولت منگی سے پہلے ہندوستان میں گزر چکے ہیں اُن کے عشر عشر درجے کو بھی یہ لوگ نہیں پاسکتے۔ بلکہ نسخ کا کمال ان دنوں مٹ چکا تھا۔ استغلیں کے متعلق اس قدر اللہ کہا جاسکتا ہے کہ حافظہ نور اللہ اور حافظہ ابراہیم کے ہاتھ کے قطعات جس ذوق و شوق سے سارے ہندوستان میں مقبول ہوئے اور کسی خوش نویسی کے شاید نہ ہو سکے ہونگے۔ لیکن اس پر بھی خطاطی کے فن میں لکھنؤ کا درجہ قریب قریب وہی تھا جو دیگر مندرجہ شہروں کا ہو سکتا ہے۔

مگر لکھنؤ کی خوشنویسی نے مطبع کی ترقی میں جو کام کیا شاید کہیں کی خوشنویسی نہ کر سکی ہوگی۔ مجھے اس کی تحقیق نہیں ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے مطبع کہاں سے جا رہی ہوا۔ کلکتہ میں اردو لٹریچر کی ترقی اور نیز عام مشرقی علوم کی تقویت میں بہت کچھ اہتمام کیا گیا۔ مگر وہاں ٹائپ کے سوا پتھر کے چھاپے کی بڑائی کتابت میں نہیں دیکھیں۔

لکھنؤ میں بہ عہد فاضل الدین حیدر (۱۲۳۳ھ) ۱۲۵۷ھ مجری مطابق ۱۲۱۳ھ (۱۸۲۶ء) اصل نام ایک یو روپین نے آ کے لوگوں کو مطبع کا خیال دلایا۔ اور

جب اہل علم شائق ہوئے تو اُس نے پہلا مطبع لکھنؤ میں کھولا۔ اس نے پریس اور تمام سامان بین تیار کر کے چھاپنا شروع کیا۔ اور زاد المعاد۔ ہفت قلم اور تاج اللغات (جو بہت سی جلدوں میں تھی) چھاپ کے پبلک کے سامنے پیش کیں۔ اُس سے سیکھ کے اور لوگوں نے بھی مطبع جاری کرنا شروع کیے۔ جن میں سے پہلا مطبع غالباً حاجی حرمین شریفین کا تھا۔ اُنھیں دونوں مصطفیٰ خان شیشہ آلات کے ایک دوہمتہ تاجر کچھ چھاپنے کے لیے حاجی حرمین کے پاس لے گئے اور حاجی صاحب کی زبان سے کوئی ایسا سخت کلمہ نکل گیا کہ مصطفیٰ خان نے گھر کے خود اپنا مصطفائی مطبع جاری کر دیا۔ جسے غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ قلوٹے دونوں بعد علی بخش خان نے علوی مطبع جاری کیا۔ اور لکھنؤ میں کثرت سے چھاپے خانے کھلتے گئے۔

ابتداءً طبع کا کام بیان تاجرانہ اصول پر نہیں بلکہ شوقینی کی شان سے جاری ہوا۔ عمدہ سے عمدہ آرولی کاغذ لگایا جاتا جو پتھر کے چھاپے کے لیے نہایت ہی موزن تھا۔ بڑے بڑے خوشنویسوں کو مجبور کر کے اور بڑی بڑی تنخواہیں دے کے اُن سے کتابت کا کام لیا جاتا۔ اور بغیر اس کے کہ کارگزاری کی کچھ بھی شرط ہو یا اس کا ذرا بھی خیال کیا جاتا ہو کہ وہ دن بھر میں کتنا لکھتے ہیں۔ لکھتے بھی ہیں یا نہیں۔ اُن کی خاطر داشت کی جاتی۔ اسی طرح پریس میون سے بھی نہ پوچھا جاتا کہ دن بھر میں کتنے کاغذ چھاپے۔ روشنائی کے لیے کڑوے تیل کے ہزاروں چراغ روشن کر کے اول درجے کا کاجل تیار کیا جاتا۔ کھٹائی کے عوض میون کاغذی سرنٹ ہونے اور کپڑے کی جگہ اصلی اسٹینج کام میں لایا جاتا۔ غرض ہر چیز اول درجے کی کام میں لائی جاتی۔ اس اہتمام کا نتیجہ یہ تھا کہ شاہی کے زمانے میں فارسی و عربی کی درسی و دینی کتابیں جیسی لکھنؤ میں چھپ کے تیار ہوئیں اہل بصیرت کے نزدیک کہیں نہ چھپ سکی ہوں گی۔ اُس وقت کی چھپی ہوئی کتابیں جس کسی کے پاس موجود ہیں ایک دولت ہیں اور لوگ ڈھونڈتے ہیں اور نہیں پاتے۔

میرے والد کے حقیقی چچا مولوی احمد صاحب کو سفر اور تجارت کا بڑا شوق تھا اور اُس زمانے میں جبکہ لوگ گھر سے باہر قدم نکالنے ڈرتے تھے اُنھوں نے حاجی



حرمین شریفین کے ایجنٹ کی حیثیت سے رفقوں اور بل گاڑیوں پر سوار ہونے کے  
اور ہزاروں کتابیں ساتھ لے کے لکھنؤ سے راولپنڈی تک سفر کیا تھا۔ اُن کا بیان  
تھا کہ کتابیں اُن دونوں عتقاتین - یہاں کی مطبوعہ کتابوں کو دیکھ کے لوگوں کی  
آنکھیں کھل جاتی تھیں اور پروانہ وار گرتے تھے۔ لوگوں کے شوق کا یہ عالم تھا کہ  
ہم جس شہر یا گاؤں میں پہنچتے ہم سے پہلے ہماری خبر پہنچ چکتی۔ اور ہمارا داخلہ  
عجب شان و شوکت سے ہوتا۔ ادھر ہم کسی بستی میں پہنچے ادھر خلعت نے گھیر لیا  
بھیڑ لگ جاتی تھی۔ اور ہم جس کتاب کو جس قیمت پر دیتے لوگ بے عذرے کے  
آنکھوں سے لگاتے۔ ہم کریم - امامتین وغیرہ کو فی جلد ۱۸ روپے کے حساب سے  
اور گلستان ہستان کو فی جلد تین روپیہ یا چار روپیہ کے نرخ سے بیچتے۔ اور اسپر  
یہ حال تھا کہ ہم مانگ کو پورا نہ کر سکتے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر تک پہنچتے  
پہنچتے کتابوں کا ذخیرہ ختم ہو جاتا اور نئے مال کے انتظار میں بیٹھ جانا پڑتا  
اُن دنوں مال کا چوڑا دھواں تھا۔ مگر ہم نے ایسا انتظام کر لیا تھا کہ برابر مال  
لکھنؤ سے آتا رہتا۔

شاہی کے آخر و حرمین مصطفائی مطبع اپنی چھپائی کے لحاظ سے دنیا میں جواب  
نہ رکھتا تھا۔ انتزاع سہولت کے بعد منشی نول کشور نے اپنا مطبع جاری کیا۔ گو وہ  
چھپائی کی خوبی میں مصطفائی مطبع کا مقابلہ نہیں کر سکا مگر تجارت کے اصول پر عمل کے  
اُس نے فارسی و عربی کی اتنی اتنی بڑی ضخیم کتابیں چھاپ دیں کہ آج کسی مطبع کو  
اُن کے مطبع کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ سچ یہ ہے کہ لکھنؤ میں اگلی شوقینی نے پریس  
کا ایسا مکمل سامان جمع کر رکھا تھا کہ اُس سے فائدہ اُٹھانے کے لیے منشی نول کشور ہی  
کے لیے بلند حوصلہ صاحب مطبع کی ضرورت تھی۔ آخر نول کشور پریس نے یہاں تک  
عروج پایا کہ سارے مشرقی لٹریچر کو اُس نے زندہ کر دیا۔ اور باعتبار وسعت مطبع  
کے جو فضیلت لکھنؤ کو حاصل ہو گئی اور کسی شہر کو نہیں نصیب ہو سکتی۔ اور اسی کی  
برکت تھی کہ وسط ایشیا میں کاشغریا، تاجرانک اور افغانستان و ایران کی ساری علمی  
مانگ لکھنؤ ہی پوری کر رہا تھا۔ چنانچہ آج تک نول کشور پریس علمی تجارت کی چنجی ہے۔  
جس سے کام لے بغیر کوئی شخص علمی دنیا میں قدم نہیں رکھ سکتا۔

مگر انیس اب لکھنؤ میں باوجود کثرتِ مطابع کے چھپائی کی حالت اسی خراب ہو رہی ہے اور روز بروز ابتر ہوتی جاتی ہے کہ دوسرے شہر اسپر فوجیت لے گئے ہیں۔ اور ہماری نظر میں پریسٹون کی اخلاقی حالت خراب ہونے کی وجہ سے اب لکھنؤ میں اکثر شہروں کے مقابلے میں خراب چھپتا ہے۔ مگر ہمارے اطمینان کے لیے اتنا کافی ہے کہ کانپور میں منشی رحمت اللہ صاحب کی وجہ سے مطابع کی حالت اچھی ہے۔ اور کانپور دراصل لکھنؤ ہی ترقیوں کا ایک نمونہ ہے۔

مطبع ہی کے ساتھ لکھنؤ میں مصلح سنگی کا فن ایجاد ہوا۔ پھر پُر جو کا پی جاتی جاتے آئے اسے کسی حد تک چھیل کے اور ظلم لنگا کے درست کرنا غالباً پورپ ہی سے شروع ہوا ہوگا اور ہاں اب بھی کیا عجیب کہ اصلاح کا یہ عمل جاری ہو۔ مگر نسخہ نقلیق کے حرفوں کو اس وضع سے درست کرنا کہ خوش نویس کی پوری شان باقی رہے اور کسی کو محسوس نہ ہو سکے کہ اس میں کسی اور کا بھی ظلم لنگا ہے خاص لکھنؤ کی ایجاد ہے۔ جہاں ابتداء یہ فن تو اسی حد پر محدود تھا کہ حروف اور نقش و نگار چاہے جس قدر اڑ گئے یا کچل گئے پھیل گئے ہوں ان کو درست کر دیا جائے۔ مگر چند روز بعد یہاں کی مدت پسندی اس حد سے آگے بڑھی۔ اور ایسے بالکمال مصلح سنگ پیدا ہونے لگے جو پھر پُر پوری پوری کد میں اُلٹی لکھ دیتے ہیں اور خط اپنی حد و پیر اس قدر مکمل رہتا ہے کہ مجال کیا جو کوئی پہچان سکے کہ یہ پھر پُر اُلٹا لکھا گیا ہے ابتداء اس کے صاحب کمال موجود ایک بڑے بزرگ تھے جو مصطفائی مطبع کی شہرت و ناموری کے باعث ہوئے۔ ان کے زمانے ہی میں ان کے شاگردوں کی کثرت نے یہاں کے مطابع کو فائدہ پہونچایا۔ بہت سے لوگوں نے ترقی کی۔ اور شہر سے مصلح سنگ بہم پہونچائے لگا۔ جب مصلح سنگی بہت عام ہو گئی تو منشی جعفر حسین نام ایک مشہور مصلح سنگ کو اُلٹی اعلیٰ شافی نے آمادہ کیا کہ مطبع کو کا پی نویسی سے بے پروا کر دیں۔ اُنھوں نے پھر پُر اُلٹا لکھنا شروع کیا۔ یہ کام ابتداء چھوٹے چھوٹے بازاری مطابع سے شروع ہوا۔ اور آخر میں اعلیٰ و ادنیٰ سب مطبعوں میں ایک حد تک اختیار کر لیا گیا۔ اب منشی سید علی حسین صاحب نے اس حد تک ترقی کی کہ ان کے اُلٹے لکھے ہوئے خط کو بہت سے مشہور خوش نویس بھی نہیں پا سکتے۔ چنانچہ اُلٹی

م لٹی کتابت کا ایک معمولی نوٹ ہمارا دلگذا بھی ہے۔ جس کی کا بیان نہیں لکھی جاتیں بلکہ منشی علی حسین صاحب معنائین کو پھر پر لٹا لکھ دیا کرتے ہیں۔ ناظرین دلگذا کو پڑھ کے اور اسکے خط پر غور کر کے اندازہ فرما سکتے ہیں کہ مسلح شکی کا فن لکھنؤ میں کس درجہ کمال کو پہنچ گیا ہے۔ گو کہ ہندوستان کے اکثر شہروں میں مسلح شکی لکھنؤ ہی کے ہیں لیکن اس وقت تک کسی اور شہر کے مسلح کو یہ بات نہیں نصیب ہوئی کہ کا بیان جاننے کی عمن عبارت پھروں پر لٹی لکھو اسکے چھاپین۔ یہ فن آج تک لکھنؤ ہی تک محدود ہے۔ مگر انسوس پیمینوں کی حالت خراب ہو جانے کے باعث لکھنؤ مسلح شکی کے اس کمال سے اس قدر فائدہ نہیں اٹھا سکتا جس قدر کہ ہونا چاہیے

(۱۶)

ابھی ہمیں لکھنؤ کی بہت سی خصوصیتیں بیان کرنی ہیں جن کو زیادہ تر تعلق اضلاقی چیزوں اور معاشرت کے امور سے ہے۔ مگر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر کچھ خصوصیت فنون جنگ کی بھی بیان کر دیں۔

سچ یہ ہے کہ یہ آخری دربار مشرق اُس وقت قائم ہوا جب مسلمانوں اور ملی الموم ہندوستانیوں کی سپہ گری کمزور پڑ چلی تھی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ صحیح یہ کہنا ہو گا کہ پُرانی سپہ گری کے فنون اتنے نہیں سٹے تھے جس قدر کہ پُرانے فنون اور آلات جنگ تھے قواعد جنگ اور جدید آلات حرب کے مقابلے میں بیکار ہو گئے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پُرانے فنون جنگ بجائے اسکے کہ مسلمانوں یا اہل ہند سے نکل کے کسی نئی ترقی یافتہ ہمار قوم میں عروج پاتے دنیا ہی سے مٹ گئے۔ اور ایسے سٹے کہ موجودہ نسل اپنے آباؤ اجداد کے شجاعانہ کارناموں اور اُنکے بہکراۓ کاموں سے بالکل نا آشنا ہے۔ اور آج جو اُن فنون کے تذکرے کے لیے ہم نے قلم اٹھایا ہے تو کوئی ایسا شخص بھی نہیں ملتا جس سے کچھ حالات معلوم ہوں۔ ہم شاہزادہ مرزا مسعود قدر بہادر بی اے۔ اور لکھنؤ کے ایک بہت قدیم بزرگ سلیمان خان صاحب (جو حافظ رحمت خان صاحب قدیم نامور فرما بزرگ بریلی کی نسل سے ہیں) نہایت شکر گزار ہیں کہ ان قدیم فنون جنگ کے متعلق جو کچھ لکھ رہے ہیں اُنھیں کی مدد سے لکھ رہے ہیں۔

سپہگری کے جن فنون کا نشو و نما دہلی میں اور دہلی کے بعد لکھنؤ میں ہوا وہ دراصل  
تین مختلف قوموں سے نکلے تھے اور تینوں کے امتزاج سے ان میں مناسب ترتیب  
ہوئی تھیں۔ اور حیرت کی بات ہے کہ باوجود میل جول کے ان میں آخر تک اصلی  
امتیاز باقی تھا۔ بعض فن آریہ قوم کے سپہگروں سے نکلے تھے، بعض کو ترک اور  
بہادران تاتار اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اور بعض خاص عربوں کے فن تھے جو ایران  
میں ہوتے ہوئے یہاں آئے تھے۔ لکھنؤ میں جن فنون کا رواج تھا اور جن کے  
باکمال استاد یہاں موجود تھے وہ حسب ذیل معلوم ہوتے ہیں:

(۱) لکڑی۔ (۲) پٹہ ہلانا۔ (۳) بانگ۔ (۴) بوٹ۔ (۵) کشتی۔ (۶) برجیا۔  
(۷) بانا۔ (۸) تیر اندازی۔ (۹) کلار۔ (۱۰) جل بانگ۔

(۱) لکڑی

یہ اصلی فن جسے پھنکیٹی کہتے ہیں آریہ لوگوں کا تھا۔ جو ہندوستانی اور ایرانی  
دونوں ملکوں کے آریوں میں مروج تھا۔ عربی فتوحات کے بعد ایران کی پھنکیٹی پر  
عربی جنگجوی کا اثر پڑ گیا۔ اور وہاں کی پھنکیٹی بمقابل ہندوستان کے زیادہ ترقی  
کر گئی۔ ہندوستان میں آخر تک یہ دونوں فن اپنی ممتاز و صنوع میں باقی رہے  
اور لکھنؤ میں دونوں اسکول قائم تھے۔ ایران کی عربی آئینہ پھنکیٹی یہاں علی مد کے  
نام سے مشہور تھی۔ اور خالص ہندی پھنکیٹی رستم خانی کے لقب سے یاد کی جاتی  
تھی مدین پھنکیٹ کا بایان قدم ایک مقام پر جارہتا اور صرف دہائے پانچون  
کو آگے پیچھے ہٹا کے پیترے بدلے جاتے۔ برخلاف اس کے رستم خانی میں پھنکیٹ  
پیترے بدلتے وقت دہائے بائیں اور آگے پیچھے جس قدر چاہتا یا جگہ پانا چاہتا رہتا  
اور ناگہان حریت پر آ پڑتا۔ ایک یہ امتیاز بھی تھا کہ علی مد کا فن خاص ریسوں  
اور شریفوں کے ساتھ مخصوص تھا۔ اُس کے استاد کبھی کسی رزویل یا ادنیٰ طبقے کے  
آدمی کو اپنا شاگرد نہ بناتے اور نہ اپنے فن سے واقف ہوتے دیتے۔ قص پٹہ ہلانا  
رستم خانی کا فن اجلاں اور ادنیٰ طبقے کے لوگوں میں عام تھا۔

علی مد کے ایک زبردست استاد فیض آباد میں شجاع الدولہ بہادر تھے۔ انکی نسبت  
بعد ان کی بوجہ جو کلیم صاحبہ کی سرکار سے وابستہ تھے۔ ان کا ذکر بطور آئے۔

مین ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اس فن کے سب سے پہلے استاد وہی تھے جو فیض آباد میں رہے۔ اور پھر وارد لکھنؤ ہوئے۔ دوسرے استاد اسی فن کے محمد علی خان تھے جو خاص ہمارے محلے کٹر ویزن بیگ خان میں رہتے تھے۔ اور علی مد کے موجد مانے جاتے۔ تیسرے استاد میر فتح الدین تھے جو شاہزادگان دہلی کے ساتھ پہلے بنارس میں گئے اور پھر وہاں سے لکھنؤ میں آئے۔ ان کا معمول تھا کہ صرف شریفیوں کو شاگرد کرتے۔ اور شاگرد کرتے وقت شاہزادوں سے دولت اور شریفیوں سے صرف مٹھائی لیتے۔ اور اُسے بجائے اس کے کہ اپنے کام میں لائیں خود لیمبا کے سادات بنی خاں کی نذر کر دیتے۔ یہ نواب آصف الدولہ کے عہد میں تھے۔ ایک بہت بڑے استاد میر عطاء حسین تھے۔ جو حکیم ہمدی کے مخصوص مین تھے۔ ایک بہت بڑے استاد ہے باز خان تھے جو اپنے کمال کے باعث غازی الدین حیدر کے زمانے میں علی مد کے موجد و بانی مشہور ہو گئے۔ ان کی نسبت کہا جاتا ہے کہ نو مسلم تھے۔ مگر وضع انکی بھی یہی تھی کہ سوا شریفیوں کے اپنا فن کبھی کسی اور فی طبقے کے آدمی کو نہیں بتایا۔ انھوں نے لکھنؤ میں اپنی یادگار ایک مسجد چھوڑی ہے جو دھنیا ہری کے پل سے آگے عالم نگر کے قریب آج تک موجود ہے۔

رستم خانی عوام میں رہی۔ اور اسی وجہ سے اس کو کوئی خصوصیت ہندو یا مسلمان کے ساتھ نہیں رہی۔ بلکہ اُسکے صد با استاد و اودھ کے تمام گانوں اور قصبوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ تاہم لکھنؤ میں سچئی خان بن محمد صدیقی خان نے جو کمال اور ناموری رستم خانی میں حاصل کی کسی کو نہ نصیب ہو سکی۔ نواب فتحیاب خان عالی مرتبہ رئیسوں میں ہونے کے باوجود بڑے خوش نویس بھی تھے۔ اور انھوں نے رستم خانی میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔ اسی طرح لکھنؤ کے ایک مشہور بانی پهلوان میر نگر باز بھی رستم خانی کے استاد تھے۔ اور اب تک تھوڑا بہت رواج باقی ہے تو سوائے ان میں علی مد کا فن شرفا کے ساتھ مخصوص تھا اور شرفا کو پہگری سے قدیم بزرگ سنیعین رہا۔ لہذا وہ فن بھی مٹ گیا۔ رستم خانی آئے لوگوں میں تھی بولی کی نسل راج بھی لڑتے بھڑتے رہتے ہیں لہذا ان میں رستم خانی کا رواج رہے ہیں اُنھیں پڑو ہے۔

علی مد کے دو ایک استاد میں نے میا برج میں دیکھے تھے۔ اور سب کے آخر میں میر فضل علی تھے جو حملہ محمود گرام میں بہتے تھے۔

(۲) پٹہ ہلا ۲

اس فن کی اصلی غرض یہ تھی کہ انسان دشمنوں کے ترغے میں پڑ جائے تو لکڑی کے ہاتھ چاروں طرف پھیلکتا ہوا سب کو ہٹا کے۔ سب سے بچ سکے۔ اور سب کو مارتا ہوا نکل جائے۔ بچے کو ٹیک کے اڑنا اس فن کا خاص کمال تھا اور سب سے بڑی تعریف اس بات کی تھی کہ انسان پر ایک ساتھ دس تیر بھی آ کے پڑیں تو ان کو کاٹ دے۔ یہ فن دہلی میں نکھا۔ لکھنؤ میں پورب سے آیا۔ اور جلاہون میں زیادہ مروج تھا۔ اگرچہ آخر میں جہت سے شرفائے بھی خصوصاً نصیبات کے شیخ زادوں نے اختیار کر لیا۔ قلام رسول خان کا بیٹا گوڑی بچے ہار لکھنؤ میں اس فن کا سب سے بڑا کمال مانا جاتا تھا۔ جسکے مدد ہا واقعات عوام میں مشہور تھے۔ مگر افسوس اب یہ افسانے بھی موجودہ نسل کو بھولنے جاتے ہیں۔

میر رستم علی کے سیفے میں دو زون طرف بارٹھ ہوتی اور اُسے ہلاتے ہوئے سیکڑوں حرینوں کو چیر کے نکل جاتے۔ اسیوں کے ایک شیخ زادے شیخ محمد حسین دو زون ہاتھوں سے پٹہ ہلاتے۔ چنانچہ فازی الدین حیدر کے زمانے میں ایک دن صاحب ریڈیٹ بہادر اور بعض یوروپین مہاذن نے اس فن کے کسی صاحب کمال کا کمال دیکھنا چاہا۔ شیخ محمد حسین آمو جو دہوے۔ چونکہ اُس وقت پٹہ اُنکے پاس نہ تھا شاہی اسلحہ خانے سے ایک پرتکلف مرصع و مکمل پٹہ دیا گیا۔ جسے لے کے اُنھوں نے ایسے ایسے کمالات دکھائے کہ ہر طرف سے تحسین کے نعرے بلند ہوئے۔ اور وہ اسی تحسین و مرجہا کے جوش میں پٹہ ہلاتے ہوئے جمع سے نکل کے چلے گئے۔ اور اپنے گھر پہنچے۔ اہل فن میں مشہور تھا کہ جو شخص پٹہ ہلانا جانتا ہے وہ دس تلوار والوں کو بھی پاس نہ پہنچنے دے گا۔

اسی فن کے ایک صاحب کمال لکھنؤ میں میر ولایت علی ڈنڈا توڑ تھے۔ انکی نسبت شہرت تھی کہ حرین کے ہاتھ میں کتنا ہی زبردست ڈنڈا ہو اُسے توڑ دالتے۔

## (۳) بانک

فنون جنگ میں یہ بہت ہی اہم اور نہایت بجا راہِ مدفن تھا۔ اور اصولاً دوسرے فنون پر فوقیت رکھتا تھا۔ اور شریف زادے خاص کوشش اور خاص شوق سے اس فن کو سیکھتے۔ اصلی غرض اس فن کی چھریوں سے حریت کا مقابلہ کرنا ہے۔ یہ فن قدیم الایام سے ہندوؤں میں بھی تھا اور عربوں میں بھی۔ مگر چھریاں دو دونوں کی جداگانہ ہوتی تھیں۔ ہندوؤں کی چھری سیدھی ہوتی جس پر دونوں طرف باڑھ ہوتی۔ اور عربوں کی چھری خم دار خم نا ہوتی جس پر ایک ہی طرف باڑھ ہوتی۔ مگر عربوں کی آخری چھری جنبیہ ہے جس کی نوک سے کچھ دور تک چاروں طرف چار باڑھیں ہوتی ہیں۔ اور اُس سے ایسا جو پھانکا زخم پڑتا ہے کہ کتے ہیں کہ اس میں ٹانگا لگا ناممکن ہوتا ہے۔ غرض اس حربے سے لڑنے کے فن کا نام بانک ہی اس کی تعلیم یوں ہوتی ہے کہ اُستاد شاگرد دونوں آنے والے دو زانو بیٹھے ہیں۔ مگر ہندوؤں والی سیدھی چھری کی تعلیم میں قاعدہ تھا کہ دونوں متقابل دو زانو بیٹھنے کے ساتھ ایک گھٹنا کھڑا رکھتے۔ اور عربوں والی چھری کی تعلیم میں بالکل دو زانو بیٹھے تھے۔ اور چوٹوں کے ساتھ بڑے زبردست پیچ ہوتے جن کے آگے کشتی کے پیچوں کی کچھ حقیقت نہ تھی۔ یہ فرق بھی بتایا جاتا ہے کہ عربوں کے فن میں اصلی سات چوبیس تھیں اور ہندوؤں کے فن میں نو۔ عربوں کی بانک میں پیچ پورا بندھ جاتا تو حریت کو زندہ چھوڑنا باندھنے والے کے اختیار سے باہر ہو جاتا۔ اور ہندوستان والوں کے فن میں آخر تک اختیار میں رہتا کہ جب چاہیں پیچ کھول کے حریت کو بچا دیں۔

اس فن میں صرف چوبیس ہی نہیں ہیں بلکہ بڑے بڑے زبردست پیچ ہیں۔ جن میں دونوں حریت گھٹنوں گھٹنوں پہنتے۔ اور پے درپے پیچ کر کے ایک دوسرے کے باندھ کے زخمی کر دینے کی کوشش کرتے۔ اس فن کے پیچ اس قدر پیچہ اور کھلی اور اصول کے ساتھ تھے کہ کہا جاتا کشتی اور لکڑی کے تمام پیچ بانک ہی سے نکلے ہیں۔ بانک کے اُستادوں میں مشہور تھا کہ بانک لیٹ کے پوزی ہوتی ہے۔ بیٹھ کے آدمی رہتی اور کھڑے ہو کے صرف چوٹائی رہ جاتی ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ

بلکیت کا کام صرف یہ ہے کہ حریت کو چھری سے زخمی کر دے۔ نہیں۔ اُس کا اصلی کام یہ ہے کہ حریت کو زندہ باندھ لے۔ اور بے بس کر کے گرفتار کر لائے۔

ایک یہ خاص بات بھی تھی کہ بانک والا اپنے فن کو حتی الامکان مخفی رکھتا۔ اُس کی وضع قطع اور طور پرین کسی بات سے نہ بچانا جاتا کہ وہ بہرگہے بلکیت عام ثقہ شریفین کی وضع رکھتے۔ کفشیں پہنتے۔ کوئی ہتھیار نہ باندھتے۔ حتیٰ کہ اُن میں لوہے کے قلندر اش یا سوئی تک کے پاس رکھنے کی قسم تھی۔ صرف ایک رومال رکھتے۔ اور اُس کے ایک کونے میں ایک لوہے کا چنا بندھا رہتا۔ بس یہی حربہ ضرورت کے وقت اُنھیں کام دے جاتا۔ یا اس سے بھی زیادہ تہذیب برتتے تو ہاتھ میں قبیس رکھتے۔ اور اُس میں لوہے کا بھڑا سا قبلہ لگا ہوتا۔ بس یہی حربہ اُن کے لیے کافی تھا۔

ہندوؤں میں قدیم الایام سے یہ فن خاص برہمنوں میں تھا۔ راجپوت نہیں جانتے تھے۔ نہ برہمن اُنھیں سکھانے اور نہ وہ اپنی وضع کے خلاف تصور کر کے اس کے سیکھنے کی کوشش کرتے۔ جس کی غالباً وجہ یہ تھی کہ بلکیت ہونے کے لیے ثقاہت شرط تھی۔ اور راجپوت کھلے سپاہی تھے۔ برہمن بلکیت قبلہ نما یا لوہے کے چنے کے عوض ایک کبچی رکھتے جو جنوب میں بندھی رہتی۔ اور اُس سے کام لے کے نہایت ہی تہذیب و متانت کے ساتھ دشمن کا کام تمام کر دیتے شاہنشاہ مرزا ہمایوں قدر بہادر فرماتے ہیں کہ لکھنؤ میں یہ فن شاہ عالم کے زمانے میں اُس وقت آیا جب مرزا خرم نجات بہادر پٹنہ آئے اور اس فن کے دو ایک باکمال اپنے ساتھ لائے۔ لیکن ہمیں معتبر ذریعہ سے اور تاریخ فیض آباد کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس فن کے باکمال مسعود علی خان بلکیت و شجاع الدولہ ہی کے زمانے میں فیض آباد میں آگئے تھے۔

نواب آصف الدولہ کے عہد میں بانک کے استاد لکھنؤ میں شیخ نجم الدین تھے اُسی قریب زمانے میں بانک کے ایک دوسرے استاد لکھنؤ میں موجود تھے جو میر بہادر علی کے نام سے مشہور تھے۔ اُن کو دعویٰ تھا کہ پٹنہ کے نیچے جنگلی کبوتر



چھوڑ دیجے۔ اور تاشا دیجیے۔ کسی طرف سے نکل کے اڑ جائے تو چاہیے کہ مین بکیت  
نہیں۔ اُنھیں پر منحصر نہیں بانکس کی یہی تعریف ہے۔ دور ہر استاد اس کا دعوے  
کر سکتا تھا۔ لکھنؤ میں ایک تیسرے استاد ولی محمد خان تھے۔ نصیر الدین حیدر کے زمانے  
میں شیخ نجم الدین کے شاگرد کے شاگرد میر عباس کا نام مشہور تھا۔ اور اُس کے چار  
شاگرد نامور ہوئے۔ جن میں سے ایک تو ڈاکو تھا۔ باقی تین مہذب شرفا تھے۔ اس  
فن کے آخری استاد میر حفیظ علی تھے۔ جو لکھنؤ کی تباہی کے بعد واجد علی شاہ کے ساتھ  
ٹیلی برج میں پونچے۔ اُنھیں مین نے دیکھا تھا۔ اور کہیں مین میں خود ان کا شاگرد  
ہوا تھا۔ مگر دو ایک مینے سکھ کے چھوڑ دیا۔ اور جو کچھ سیکھا تھا خواب و خیال  
سارہ گیا۔ اب نہیں جانتا کہ کوئی جاننے والا بھی باقی ہے یا نہیں۔

(۴) بوٹ

اس فن کی اصلی غرض یہ ہے کہ حریت کے ہاتھ سے تلوار اٹھ۔ یا کوئی حربہ  
ہو مگر اوسے۔ اور ایک رومال سے جس میں پیسہ بندھا ہوا کرتا ہے یا اپنے ہاتھ میں سے  
حریت کو ایسا مدد سے پونچائے کہ اُس کا کام تمام ہو جائے۔ اس فن کی نسبت  
لکھنؤ میں ابتدا سے مشہور تھا کہ اس کے بڑے بڑے زبردست استاد حیدر آباد دکن  
میں ہیں۔ اور وہاں چلنے اور دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ واقعی وہاں اب  
تک یہ فن ایک حد تک زندہ ہے۔ واقعہ کار کو گون کا بیان ہے کہ کھڑے ہو کر  
مقابلہ کرنے والا صاحب فن اگر ہوتا ہے تو کشتی ہے۔ اُس کے ہاتھ میں پھری ہے  
تو بانکس ہے۔ اور اگر کوئی دو گز کا لمبا سوٹا یا رومال اُس کے ہاتھ میں ہے تو بوٹ  
ہے۔ بوٹ واسلے بھی اپنے فن کو مخفی رکھتے ہیں۔ اور باہمی عہد ہے کہ صرف  
شریت کو سکھائیں گے۔ اور اُس سے عہد لیتے ہیں کہ کبھی کسی زبردست یا  
بے آزار آدمی پر حربہ نہ کریں گے۔ بوٹ والوں کے پیترے جنھیں وہ پاؤں لکھتے  
ہیں بہت ہی اعلیٰ درجے کے پھرتے ہیں اور بے انتہا صفائی چاہتے ہیں جو زیادہ عمر  
والوں کو نہیں حاصل ہو سکتے۔ اس کے علاوہ بوٹ والوں کو جسم انسانی کے تمام رگ  
پٹھوں کا پورا علم ہوتا ہے۔ اور خوب واقف ہوتے ہیں کہ کس مقام پر صرف انگلی  
سے دبا دینا یا ایک ہموٹی چوٹ انسان کو بیاب و بیدم کر دے گی۔ اگرچہ اس فن کے

یہ حیدر آباد مشہور تھا مگر لکھنؤ میں بھی اس کے بہت سے بالکال موجود تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں سب سے پہلے محمد ابراہیم خان رام پور سے لائے تھے۔ طائب شیر خان یہاں ایک بڑے زبردست بانکے تھے اور تلوار کے دھنی اُنھوں نے جو ابراہیم خان کا دعویٰ سنا تو تلوار کے مقابلے کو تیار ہو گئے۔ محمد ابراہیم خان نے بھی مقابلہ منظور کر لیا۔ طائب شیر خان نے جیسے ہی تلوار ماری محمد ابراہیم خان نے اپنا روال جس کے کونے میں پیسہ بندھا ہوا تھا کچھ ایسی خوبی سے مارا کہ طائب شیر خان کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کے جھن سے دوڑ جا گری۔ منہ دیکھ کے رہ گئے۔ اور سب نے محمد ابراہیم خان کی اُستادی کا اعتراف کر لیا۔

اس کے بعد لکھنؤ میں آخر تک یہ فن رہا۔ یہاں تک کہ ٹیپا برج میں بھی محمد ہمدی نام ایک شخص جو نواب مشتاق علی کے وہاں کے داروہ تھے بوٹ کے بالکال اُستاد مانے جاتے تھے۔

(۵) کشتی

یہ فن خاص آریوں کا تھا۔ ہندوستان میں بھی اور ایران میں بھی۔ عرب اور ترک اس سے بالکل نا آشنا تھے۔ ہندوستان کے قدیم باشندوں میں بھی جو آریہ لوگوں سے پہلے تھے اس فن کا پتہ نہیں چلتا۔ لکھنؤ میں بچپن اور حریت کے زہر کرنے کے طریقوں کا بہت نشو و نما ہوا۔ مگر کشتی کا اصلی دار و مدار جسمانی قوت پر ہے۔ اور قوت میں لکھنؤ والے لاکھ کوشش کرین مشرقی مالک خامنہ پنجاب کے لوگوں کا ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لکھنؤ کی آب و ہوا کو قدرت نے یہ صلاحیت بھی نہیں دی ہے کہ اسکی خاک سے غلام وغیرہ کے ایسے پلٹن پلو ان پیدا ہوں۔ اس لیے لکھنؤ کا کشتی کا فن صرف بچپنی کا کمال دکھانا تھا جس میں زیادہ سے زیادہ اپنے بے دُونے پر قلبہ حاصل ہو جاتا۔ مگر اس سے زیادہ طاقت والے کو زیر کرنا غیر ممکن تھا۔ لکھنؤ کے اکھاڑوں اور اگلے پلو انوں کے قصے بہت مشہور ہیں۔ مگر سب بچپنی کے لحاظ سے نہ زور آوری کے اعتبار سے۔ ایک بار میں نے یہاں کے ایک مشہور پلو ان سید کی لڑائی ایک دُونے قد کے پنجابی پلو ان سے دیکھی۔ وہ چھوٹا اور مین شک تین کہ سید کی لڑائی ابتدا سے نہایت خوبصورت تھی۔ اسکی پلٹ

اور اُس کا پھر تیلابن قابلِ تعریف تھا۔ مگر انجام یہ ہوا کہ کھنڈ بھر میں سید بسینے میں  
ڈوبا ہوا تھا۔ طاقت جواب دے چکی تھی اور دم پھول گیا تھا۔ اور بچا بی بیٹوں  
پر جو اُسے کھلا رہا تھا کچھ اثر نہ ہوا تھا۔ آخر سید خود ہی میدان چھوڑ کے بھاگ گیا  
اور بے لڑے ہاری مان لی۔

(۶) برچھا

جگونی کا یہ پرانا فن ہے جو آریوں - ترکوں - اور عربوں سب میں تھا۔ عربوں  
کا برچھا لمبا ہوتا۔ اور اُس کا پھل جگنا۔ ترکوں کا برچھا چھوٹا ہوتا اور پھل گول  
تو کہ اریوں یعنی عسروٹی - اور ہندوستان کے آریوں کا برچھا لمبا ہوتا مگر اُس کا  
پھل تپلا باڑھ دار پان کی قطع کا۔ اور تعجب یہ ہے کہ تینوں طرح کے نیزے لکھنؤ  
میں موجود تھے۔ بڑے برچھے پانچ گز کے لمبے ہوتے اور چھوٹے برچھے تین گز کے  
بڑے برچھے کی یہ تعریف تھی کہ خوب لچکے بیان تک کہ دھرا ہو جائے۔ اور چھوٹے  
کی یہ تعریف تھی کہ اُس میں نام کو بھی لچک نہ ہو۔ اور اسی مناسبت سے دونوں  
کے چکارتے کے فن جدا جدا تھے۔ لکھنؤ کے مشہور اور اصلی برچھیت میر کو تھے۔  
جن کا نام برہان الملک کے زمانے ہی میں چک گیا تھا۔ اُن کے بعد میر اکبر علی  
برچھیت مشہور ہوئے۔ پھر بریلی اور راجپور سے اکثر برچھیت آنا شروع ہو گئے۔  
غازی الدین حیدر کے زمانے میں بادشاہ کو ہاتھیوں کے شکار کا شوق ہوا تو برچھے  
کا فن جاننے والوں کی بڑی قدر ہوئی۔ اور لڑائیوں میں بھی حربہ زیادہ کام دینے  
لگا۔ افسوس یہ قدیم حربہ جس سے بڑی بڑی برائی قوموں نے ناموری پیدا کی تھی  
لکھنؤ میں اصلی یا نقلی طور پر آج بھی کثرت سے باقی ہے۔ مگر صرف برائیوں کے  
جلوس کا کام دیتا ہے۔

(۷) بانا

یہ فن بھی ادنیٰ درجے کے لوگوں میں تھا اور کسی حد تک اب بھی باقی ہے۔

لکھنؤ کی لڑائی کے ہاتھ اور زمین اسی سے نکلی ہیں۔ غرض اور فائیت بانے کی  
پٹھوں کا پورا علم ہے کہ بانا یا لکھ چلاتا ہو انسان دشمنوں کے ترسے میں سے نکل جائے۔ بانا  
سے دبا دینا یا ایک لکڑی کا نام تھا جس کے ایک طرف اٹھ ہوتا۔ اور دوسری طرف

دالور

لٹو رکھتے۔ اور اس طرح ہلاتے کہ کوئی قریب نہ آ سکتا۔ بعض لوگ لٹوؤں میں کپڑا باندھ کے اور تیل میں ڈبو کے اُنھیں روشن کرتے۔ اور اس طرح ہلاتے کہ اپنے اوپر آگ کا مطلق اثر نہ ہو اور دشمن آگ کی وجہ سے دُور ہی دُور رہے۔

(۸) تیر اندازی

یہ دنیا کی تمام جنگجو قوموں کا پُرانا حربہ اور عہد قدیم کی ہندو قوم ہے جس میں بڑے بڑے کمالات دکھائے جاتے۔ اور شریعت و ردیل سب اس کی تعلیم لازمی سمجھتے۔ یہی حربہ ہے جس سے راجہ راجپوت پندہ جی اور اُن کے بھائی کچھن جی نے راون اور اُس کے ایسے کون پیکر حریفوں کو مار کے گرادیا۔ اگرچہ ہندو قوم کی ایجاد نے اُس کا زور کم کر دیا تھا مگر پھر بھی پہلے کی اعلیٰ جوہر تیر اندازی بھی جاتی۔ کمانبیں اتنی کڑی رکھی جاتیں کہ اُن کا چلہ کھینچنا ہر ایک کے لیے آسان نہ تھا بلکہ جس کی کمان چلتی زیادہ کڑی ہوتی اُسی قدر زیادہ اُس کا تیر دُور جانا۔ اور کاری ہوتا۔ عربوں نے اپنی فتوحات کے زمانے میں تیر اندازی کے ایسے کمالات دکھائے ہیں جو حیرت انگیز ہیں۔ اُم ایوب نام میں تاریخ ہی روز کی بیاہی ہوئی ایک عربیہ دولہن نے فتح دمشق کے موقع پر اپنے شہید دولہا کے انتقام میں ایسے زبردست تیر بوسائے کہ پہلے نے دشمنوں کے علمبردار کو مار کے گرادیا۔ اور دوسرا دشمنوں کے بہادر سردار تاس کی آنکھ میں اس طرح پوسٹ ہو گیا کہ کسی کے نکالنے نہ نکل سکا۔ اور آخر گانسی کاٹ کے آنکھ ہی میں چھوڑ دی گئی۔

اور عہد کے پاسی اور پھر اس فن کو پہلے سے بخوبی جاننے تھے۔ پھر نے نے اُسٹادم ملی سے آئے۔ اور آصف الدولہ کے عہد میں اُسٹاد فیض بخش نے بادشاہ کے اشارے سے مرزا حیدر کے والد کو جو باغی پر سوار آ رہے تھے اسی پھرتی سے تیر مارا کہ کسی نے اُن کو نشانہ بازی کرتے دیکھا اور نہ انھیں خبر ہوئی۔ حالانکہ تیر پٹیک کو توڑ کے نکل گیا تھا۔ وہ آخر تک بچر رہے۔ گھر پونچ کے پٹیک کھولا تو وہ خون آلود تھا۔ اور ساتھ ہی زخم سے خون کا فوارہ چھوٹا اور دم بھر میں مر گئے۔

اس کی تعلیم کا طریقہ بھی شکل تھا۔ مگر اب یہ فن دنیا کی تمام متمدن قوموں میں  
فنا ہو گیا۔ اس لیے کہ موجودہ آتشبار اسلحہ نے اسے بالکل بیکار کر دیا ہے۔ مگر  
ہندوستان کی وحشی قوموں میں آج تک باقی ہے جو شکار اور درندوں کے مارنے  
میں عموماً اور کبھی کبھی باہمی جنگ و پیکار میں بھی تیروں سے کام لیا کرتی ہیں۔  
(۹) کٹار

یہ پُرانا خاص آریہ قوم کا حربہ تھا۔ اور آخر میں اُس سے زیادہ ترچر اور  
قزاق کام لیتے۔ اُس سے حریت پر ٹوک کے حملہ کیا جاتا، بلکہ اُسے غافل رکھ  
کے حملہ کیا جاتا۔ اسی وجہ سے غالباً دہلی میں بھی اور خاصۃً لکھنؤ میں شرفائے  
اُس سے کام لینا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ کٹار سب باندھتے مگر اس سے لڑنا اور جرح  
کرنا کوئی نہ جانتا تھا۔ اُس سے حربہ کرنے کی تربیت یہ تھی کہ جب چاہیں تو حربہ  
کریں مگر دشمن کے جسم میں کہیں خراش بھی نہ آئے۔ اور جب چاہیں تو قبضے  
تک پار ہو جائے۔ اس سے چور اکثر راتوں کو غافل اور سوتے حریت پر حملہ کرتے  
اور چھپ کے اُس کا کام تمام کر آتے۔

(۱۰) جل بانک

یہ دہی بانک کا تذکرہ فن تھا جو پیرا کی اور شادری سے وابستہ کر دیا  
گیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ گہرے پانی میں دشمن پر قابو حاصل کریں۔ اور اُسے باندھ  
لائیں یا پانی ہی میں اُس کا کام تمام کر دیں۔ تاریخ میں اور کسی جگہ اس کا تذکرہ  
نہیں۔ مگر لکھنؤ میں پیرے کے ایک استاد تیرک جان نے اسے ایجاد کیا۔ اور  
سیکڑوں شاگردوں کو سکھایا۔ یا دی النظر میں اس کی ایجاد لکھنؤ ہی میں ہوئی  
اور آج بھی پیرا کی کے بعض سین کے استاد جانتے ہیں۔ اور کہیں اس فن کا  
نام و نشان بھی نہیں۔

پیرایون میں لکھنؤ نے جو ترقی کی اُس کا تذکرہ ہم آئندہ کریں گے۔

(۱۱)

اردو میں مثل مشہور ہے کہ "بڑا بھاپے میں انسان کی قوت شہوانی زبان میں  
آجایا کرتی ہے"۔ ویسے ہی بہادر وں اور جاننا زوں کی قوت شجاعت کی نسبت

اکثر تجربہ ہوا ہے کہ جب کمزوری آتی ہے یا ہاتھ پیروں کی طاقت جواب دہتی ہے تو ساری بہادری اور شجاعت دست و بازو سے نکل کے زبان اور آنکھوں میں جمع ہو جاتی ہے۔ اب وہ اپنی گزشتہ شجاعت و ناموری کے افسانے بیان کرتے اور شجاعت کے کاغذ اپنی ذات سے نہیں دکھاتے بلکہ ان کا تماشا لٹنے والے جانوروں کے ذریعے سے دیکھتے اور دوسروں کو دکھا دکھا کے داد طلب ہوتے ہیں۔

یہی حال لکھنؤ کا ہوا۔ جب لوگوں کو ملک گیری و صفت آرائی سے فرصت ملی اور میدان جنگ میں کھڑے ہونے کا حوصلہ نہ رہا تو جنگجوئی کے جذبات نے جانوروں کو لڑا لڑا کے جاننازی و خون ریزی کا تماشا دیکھنے کا شغف پیدا کیا۔ یہ شوق یوں تو تھوڑا بہت سب جگہ ہے مگر اس میں جس قدر انہماک اہل لکھنؤ کو ہوا اور ان بے نتیجہ ملک شکنگی کی دلچسپیوں کو ان لوگوں نے جس درجہ کمال کو پہنچا دیا اور مقابلے کے لوگوں کے خواب و خیال میں بھی نہ گذرا تھا۔ اور اگر غور سے دیکھیے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس شوق اور ان مشاغل کے جیسے کرشمے اور دلکش تماشے سوا لکھنؤ میں دیکھے گئے دہلی یا ہندوستان کا کوئی دربار کنارا غالباً ساری دنیا کے کسی شہر میں نہ دیکھے گئے ہوں گے۔

لکھنؤ میں غیر کی شجاعت سے اپنے دل کی بھر اس نکالنے کا یہ شوق تین طریقوں سے پورا کیا گیا۔ (الھت) درندوں اور چو پاؤں کو لڑا کے (دب) طیور کو لڑا کے۔ (ج) تھکین اور کنکوے لڑا کے یعنی تینگ بازی کے ذریعے سے۔ ان تینوں قسموں کو ہم بعد از اپنی جیتو اور سلومات کے جدا جدا تفصیل سے بیان کرنا چاہتے ہیں۔

قسم اول یعنی درندوں اور چو پاؤں کی لڑائی کا تماشا یہاں مندرجہ ذیل جانوروں کو لڑا کے دیکھا گیا (۱) شیر۔ (۲) چیتے۔ (۳) تیندوے (۴) ہاتھی۔ (۵) اونٹ۔ (۶) گینڈے۔ (۷) بارہ شگھ۔ (۸) مینڈھے۔ درندوں کے لڑنے کا مذاق قدیم ہندوستان میں کہیں یا کبھی نہیں سنا گیا تھا۔ یہ اصلی مذاق پراسنے رومیون کا تھا جہاں انسان اور درندے کبھی باہم اور کبھی ایک دوسرے سے لڑائے جاتے تھے۔ سیحیت کے عروج پرستہ ہی وہاں بھی یہ مذاق چھوٹ گیا تھا مگر اب ملک اسپین میں اور بعض دیگر ممالک یورپ میں وحشی سانڈ باہم اور کبھی کبھی انسانوں

سے لڑائے جاتے ہیں۔ لکھنؤ میں غازی الدین میدر بادشاہ کو قاتل کیا اُسکے یورپین دوستوں نے درندوں کی لڑائی دیکھنے کا شوق دلایا۔ بادشاہ فوراً آمادہ ہو گئے۔ اور چند ہی روز میں شاہی دلچسپی ان خوفناک اور وحشیانہ لڑائیوں میں ایسی بڑھی کہ کوئی امکانی کوشش نہیں اُٹھا رکھی گئی۔ موتی محل میں عین لب دریا دونوں کو ٹھکان مہارک منزل اور شاہ منزل تعمیر کی گئیں۔ اُنکے مقابل دریا پار کو سون تک ایک فرحت بخش سبز و زرد چلا گیا تھا۔ جس میں آہنی کٹھڑے سے گھیر کے ایک وسیع رمنہ بنایا گیا تھا۔ اُس میں قسم قسم کے ہزار ہا جانور لاکے چھوڑے گئے تھے۔ اور درندے کھڑوں میں بند کر کے رکھے گئے تھے۔ اسی رستے کے سلسلے میں دریا کنارے ہی وحشی جانوروں کے لڑائے کے لیے بڑے بڑے میدان بانس کے ٹھاٹھروں یا آہنی حصار سے محفوظ کیے جاتے جو شاہ منزل کے عین محاذی دریا کے اُس پار ہوتے۔ دریا کا پاٹ وہاں بہت کم ہے۔ بادشاہ اور اُنکے ہمراہ و مساجدین شاہ منزل کے بالائی حصہ پر لنگھتے جتنی شامیاؤں کے سائے میں بیٹھ کے اطمینان اور آرام سے سیر دیکھتے اور پار کے محصور میدان میں درندوں کی قیامت خیز لڑائی کا مشرک ہوتا۔ درندوں اور دست ہاتھیوں کا لڑنا تو آسان ہے مگر اسکی سنبھال نہایت ہی مشکل ہے۔ ایک دست ہاتھی یا شیر کٹھڑے سے چھوٹ جاتا ہے تو شہروں میں بھگدڑ پڑ جاتی ہے اور بہت سی جانیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ مگر یہاں لوگ اس خوفناک کام میں ہفتہ ہوشیار ہو گئے تھے کہ اُس وقت جو یورپین سیاح دربار میں موجود تھے۔ خود اپنی تحریروں میں اقرار کرتے ہیں کہ وحشی جانوروں کے پالنے۔ سدھانے۔ اور اُن کی داشت اور سنبھال کر لے والے آدمی لکھنؤ سے بہتر دنیا بھر میں کہیں نہیں ہیں۔ یہی لوگ ہاتھیوں اور درندوں کو لاکے چھوڑتے۔ اُن کو اپنے بس میں رکھتے۔ اُن کے ہارتے وقت غالب و مغلوب دونوں درندوں کو اپنے قابو میں کرتے۔ اس کام کے لیے سیکڑوں سانپ مار اور بلم بردار مقرر تھے جو اُنھیں مارتے اور اپنے آپ کو اُن کے حملوں سے بچاتے۔ لوہے کی دہکتی ہوئی سلاخوں اور آتشبازیوں سے اُنکو جھڑپا ہٹے موڑتے اور جہاں چاہتے ہٹکا لیجاتے۔ شیروں اور تیندوؤں کو کھڑوں میں بند کرتے۔ غرض اُن لوگوں کی پھرتی۔ چالاکی۔ اور چلت پھرت اور ہوشیاری

خود جانوروں کی لڑائی سے زیادہ دلچسپ اور حیرت انگیز تھی۔ جن قانون کو دیکھ کے دم بھر میں نظر آ جاتا کہ ان بڑے بڑے دیوانیل جانوروں اور مہیب وحشی درندوں پر انسان دنیا میں کن اسباب سے غالب آیا ہے۔ اب ان جانوروں میں سے ہر ایک کی لڑائی کا جدا جدا حال سنیں جو غالباً لطف سے خالی نہ ہوگا۔

## (۱) شیر

بادشاہ نے بہت سے شیر جمع کر رکھے تھے۔ جو یہاں کی ترائی سے بڑے بڑے لائے جاتے۔ ان میں سے بعض بہت بڑے تھے۔ بعض مختلف لڑائیوں میں غالب آ کر کے بادشاہ کو بہت عزیز ہو گئے تھے۔ لڑائی کے لیے اُن کے کھڑے میدان کے حصار کے پاس لاکھ کھول دیے جاتے۔ دونوں حریت چھوڑتے ہی غرا کے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے۔ اور آہستہ آہستہ اور بچوں سے ایک دوسرے کو زخمی کرتے۔ باہم گتھ جاتے۔ کبھی یہ اُس کو گرا کے اوپر چڑھ بیٹھا۔ کبھی وہ اس کو زیر کرتا۔ دیر تک ایک نہایت ہولناک لڑائی ہوتی رہتی۔ جس میں کبھی تو ایک حریت جان سے مارا جاتا اور کبھی سخت زخمی ہو کے جھٹ ہارتا۔ کثرت سے خون نکل جانے کے باعث کمزور ہو کے بھاگتا۔ اور حریت غصے سے اُس کا تعاقب کرتا۔ اُس وقت اُن دونوں کے سنبھالنے اور قابو میں لانے کے لیے لڑائے والوں کا کمال اور انکی دوڑ دھوپ اور کارستانیان دیکھنے کے قابل ہوتی۔

شیر اکثر تین دوں سے لڑائے جلتے۔ مگر یہاں ایسے ایسے زبردست تیندے تھے جن سے شیر بہت ہی کم جیت سکتا۔ اُن کی لڑائی کی شان بھی وہی ہوتی جو شیروں کے باہم لڑنے کی ہے۔ کبھی کبھی شیر اور ہاتھی بھی لڑا دیے جاتے۔ لڑائی جوڑکی نہ ہوتی۔ اور اُس کے نتیجے میں ہر طرف اُسید مختلف قسم کے ہولناکیاں ہوتی تھیں۔ خوب جیال ہوا تو شیر بہت کم اُس سے پیش پا سکتا تھا۔ کبھی تو وہیں میدان لڑائی شیر اور گھوڑے کی ہوتی۔ گھوڑا سوا پیٹ کے حصہ نہ لیتا تھا۔ ہوا ہے۔ اُس پر نہ شیر کے وانت اثر کرتے ہیں نہ بچے۔ اس

زخم میں وہ کسی زبردست سے زبردست حریت کی پروا نہیں کرتا ہی دلچسپ سرحد بکا کے حریت کے پیٹ کے نیچے گھسائے تو اپنے بائیں کے اوپر دشاہ کے



سینگ پیٹ مین اس طرح پوست کر دیتا ہے کہ آنتین باہر نکل پڑتی ہیں۔ اور حریف کا کام تمام ہو جاتا ہے۔ شاذ و نادر ہی کبھی ایسا ہوا کہ شیر نے گھوڑے کو چاروں شانے چت کر کے اپنے ناخنوں اور دانتوں سے اُس کا پیٹ بھاڑ ڈالا ہو۔ ورنہ اکثر یہی ہوتا کہ گھینڈا اپنا سینگ بھونک کے شیر کو مار ڈالتا۔

مگر سب سے زیادہ حیرتناک یہ چیز ہے کہ نصیر الدین حیدر بادشاہ کے زمانے میں ایک مرتبہ ایک گھوڑے کے مقابلے میں شیر دن کو بڑی ذک اٹھا نا پڑی۔ یہ عجیب و غریب گھوڑا تھا جو مردم آزاری میں درندوں سے بھی بڑھ گیا تھا۔ مجال یہ تھی کہ کوئی آدمی اُس کے پاس جائے۔ دانہ دُور سے اُس کی طرف بڑھا دیا جاتا۔ اور جب چھوٹ جاتا بہت سے آدمیوں کو ہلاک کر ڈالتا۔ جو سامنے آتا اُسے مار کے ہڈیاں سلیمان چاڈالتا۔ اور لاش اسی جگہ ڈالتا کہ پہچانی نہ جاتی۔ مجبوراً تجویز ہوئی کہ اُس پر شیر چھوڑ دیے جائیں۔ چنانچہ چھوڑا نام شیر جو بادشاہ کو عزیز تھا اور اکثر بازیان لے جا چکا تھا اُس پر چھوڑا گیا۔ گھوڑا سب سے اس کے شیر سے خوف کھلنے لپٹنے کو تیار ہو گیا۔ اور دیکھ ہی شیر جست کر کے اُس پر آیا اُس نے اس طرح اگلا جسم جھکا یا کہ شیر پشت پر گر ا اور اُسے پٹھوں میں ناخنوں کے خنجر پوست کر دیے۔ ساتھ ہی گھوڑے نے اس زور سے پشتکاری کہ شیر تلابازیان کھاتا ہوا دُور جا گرا۔ مگر پھر سنبھلا اور چند منٹ ادھر اُدھر تاوے لنگ کے پھر جست کر کے گھوڑے پر جا رہا۔ گھوڑے نے پھر وہی حرکت کی کہ اگلا جسم جھکا دیا۔ شیر پٹھوں پر جا پڑا اور ارادہ کیا کہ اُسے پنجوں و اسٹک مار ڈائے مگر گھوڑے نے اب کی اس زور سے دھلتی جھاڑی کہ شیر کے لوگ ہاتھیوں گئے۔ اور چاروں شانے چت ہو کر جا گرا۔ لیکن اس چوٹ سے شیر ہارنے وقت غالباً تھی کہ گھوڑے کی طرف پیٹھ پھیر کے بھاگنے لگا۔ اور تماشائی لیے سیکڑوں سانپے اور سراسر سے بڑا شیر چھوڑا گیا۔ اُس نے رُخ ہی نہ کیا۔ اُن کے حملوں سے بھاگ گیا۔ اور تین آرتے بھینٹے چھوڑے گئے۔ وہ بھی گھوڑے بدر صرچا ہتے موٹوٹے نے بڑھ کے بے پھیرے ایک بھینٹے پر اس زور سے مین بند کر دیا وہ بھی تیار گیا۔ اور اُس کے دونوں ساتھی اس طرح

سر ہلانے لگے گویا داد دے رہے ہیں کہ ”ہاں! یہ ہوئی!“ آخر گھوڑے کی جان بخشی کی گئی۔ اور نصیر الدین حیدر نے کہا ”میں اس کے واسطے ایک اتنی کھڑا بنوا دوں گا۔ اور اس کی پرورش کا بھی سامان کر دوں گا۔ اتنا جانی کے سر کی قسم یہ بڑا ہمارے ہے۔“

(۲) پتیا

سب ہی درندے لڑائی کے لیے دو ایک دن پیشتر سے بھوکے رکھے جاتے ہیں مگر چیتے کے بارے میں اس کا خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ چیتا جس قدر زیادہ ظالم و خوشخوار ہے اسی قدر بعض وقت بزدل بھی ثابت ہوتا ہے۔ علی العموم بگڑے امیر زادوں کی طرح وہ خوشامد طلب خیال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ میدان میں جب اُس کا جی چاہے لڑتا ہے اور جیب نہ جی چاہے لاکھ جتن کرو نہیں لڑتا۔ لڑائی میں وہ کتراتا اور کھینچتا ہوا حریت پر جاتا ہے۔ پہلے جست کر کے ایک دوسرے کو زخمی کرنا چاہتا ہے۔ ایسی دو ایک جستوں کے بعد دونوں پھیلے پاؤں پر کھڑے ہو کے بچوں سے لڑنے لگتے ہیں۔ یہ بڑی خونریز لڑائی ہوتی ہے۔ جس میں دونوں غارتے جاتے ہیں اور حریت پر پہنچے مارتے جاتے ہیں آخر زبردست کمزور کو گرا کے چکیتیں مار مار کے حریت کا کام تمام کر دیتا ہے۔ مگر خود بھی سر سے پاؤں تک زخمی ہو جاتا ہے۔

(۳) تیندوا

تیندوا چھوٹے پیمانے کا شیر ہوتا ہے۔ مگر کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ میں شیروں سے اکثر لڑنے والے تیندوے تھے جو قیامت کی لڑائی لڑتے۔ اور اکثر شیروں پر غالب آ جاتے۔ تیندوے کی لڑائی بالکل شیروں کی سی ہوتی ہے۔ لڑتے لڑتے دونوں حریت سخت زخمی ہو جاتے ہیں۔ اور مغلوب حریت کبھی تو وہیں میدان میں گر کے مر جاتا ہے اور کبھی دشمن سے ہار کے بھاگ کھڑا ہوتا ہے

(۴) لکھنؤ

لکھنؤ میں ہاتھیوں کی لڑائی بہت پسند کی جاتی تھی اور نہایت ہی دلچسپ سمجھی جاتی۔ اور یہ شوق اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ نصیر الدین حیدر بادشاہ کے

زمانے میں ڈیڑھ سو لڑائی کے ہاتھی تھے جن کو سواری سے تعلق نہ تھا۔ ہاتھیوں کی لڑائی کے لیے شرط یہ ہے کہ دوست ہو گئے ہوں۔ اس لیے کہ ہاتھی جب تک مست نہ ہوں نہیں لڑتے۔ اور لڑیں بھی تو ان میں فتحیابی اور حریت پر غالب آنے کا سچا جوش اور غصہ نہیں ہوتا۔

لڑائی کے وقت ان کی گردن سے دم تک ایک رتسا بندھا ہوتا ہے۔ حریت کا سامنا ہوتے ہی دونوں حریت سونڈین اور دمیں اٹھا کے زور سے جھگڑتے ہوئے ایک دوسرے پر بھیٹ پڑتے ہیں۔ اور بڑی زبردست ٹکرو ہوتی ہے۔ اس کے بعد برابر ٹکروں پر ٹکروں ہوتی رہتی ہیں جن کی آواز بڑی دُور تک جاتی ہے۔ پھر دونوں ایک دوسرے سے منہ ملائے اور دانتوں کو اڑا کے ایک دوسرے کو رلیا اور ڈھکیلنا شروع کرتے ہیں جس میں ان کے جسم کے پیچ و تاب کھانے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیسا زور لگا رہے ہیں۔ فیلیان انکس مار مار کے زور لگانے پر اُٹھیں اور زیادہ اُبھارتے رہتے ہیں۔ آخر دونوں میں سے ایک ہاتھی کمزور پڑتا اور ریلے کی تاب نہ لاکے زمین پر گرتا ہے۔ غالب ہاتھی اُس وقت اکثر دانت سے اُس کا پیٹ پھاڑ ڈالتا اور کام تمام کر دیتا ہے۔ لیکن اکثر ہاتھیوں کا معمول ہے کہ کمزور پڑتے ہی دانت چھڑا کے بھاگتے ہیں اور غالب آئے والا تعاقب کرتا ہے۔ باگیا تو کمزور مار کے گرانا اور اکثر دانتوں سے پیٹ پھاڑ کے مار ڈالتا ہے اور اگر وہ نکل گیا تو جان بچ جاتی ہے۔

لکھنؤ میں ہاتھیوں سے اکثر گنیڈے بھی لڑائے جاتے تھے۔ لیکن شکل یہ تھی کہ یہ دونوں جانور باہم لڑتے ہی نہ تھے۔ اور اگر کبھی لڑ گئے تو بے شک سخت لڑائی ہوتی۔ اگر کبھی ہاتھی نے گنیڈے کو ڈھکیل کے اُلٹ دیا تو اُس کے دانت پیٹ میں پوسٹ ہو کے اُس کا کام تمام کر دیتے۔ اور اگر گنیڈے نے موقع پا کے اپنا بالائی سینگ ہاتھی کے پیٹ میں اُتار دیا تو کھال دُور تک پھٹ جاتی۔ مگر ہاتھی سونڈ کی مدد سے گنیڈے کے سینگ کو اپنے جسم میں زیادہ دُور تک نہ گھسنے دیتا۔ اور کاری زخم سے بچ جاتا۔

یوں تو دنیا میں ہر ذی روح لڑ سکتا ہے لیکن اونٹ سے زیادہ غیر موثر و  
لڑائی کے لیے کوئی جانور نہیں ہو سکتا۔ مگر لکھنؤ میں اونٹ بھی مست اور پُرجوش  
بنا کے لڑائے جاتے۔ اونٹ کی پکڑ مشہور ہے۔ اور اُس کا بے طریقے کرنا اُس  
کے حق میں نہایت ہی خطرناک ہے۔ اونٹوں کا جوش کف نکالنے اور جھاک اُڑانے  
سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ کف اُڑاتے ہوئے دوڑتے ہیں۔ اور گالیان دینے  
اور ایک دوسرے کے منہ پر تھوکنے یعنی بکھلانے اور جھاک اُڑانے سے لڑائی  
شروع ہوتی ہے۔ جسے موقع مل گیا حریف کا لٹکا ہوا ہونٹھ دانتوں سے پکڑ لیتا ہے  
اور کھینچنا شروع کرتا ہے۔ جس اونٹ کا ہونٹھ حریف کے دانتوں میں آ گیا وہ اکثر  
گر پڑتا اور ہارتا ہے۔ اور اسی پر لڑائی ختم ہو جاتی ہے۔

(۶) گینڈا

گینڈے سے زیادہ مضبوط جانور کوئی نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ وہ قد و قامت میں  
شیر اور ہاتھی سے چھوٹا ہے۔ مگر اسباب و زمین تن پیدا کیا گیا ہے کہ نہ اسیر ہاتھی کے دانت کا کر سکتے  
ہوئے تین نہ شیر کے پنجہ و زناخن۔ صرف پیٹ کی کھال نرم ہوتی ہے۔ اگر کوئی جانور اس پر کڑکا تو مار لیتا ہے و نہ ہر جانور  
اپنا زور صرف کرتے کرتے تھک جاتا ہے اور آخر میں گینڈا اپنا بانسے پر کا زبردست  
سینگ اُس کے پیٹ میں بھونک بھونک کے مار ڈالتا ہے۔

لکھنؤ میں گینڈے ہاتھیوں سے۔ شیروں سے۔ تیندوؤں سے اور خود گینڈوں  
سے لڑائے جاتے تھے۔ نازی الدین حیدر بادشاہ کے زمانے میں لڑانے کے علاوہ  
بعض گینڈے اس خوبی سے سدھائے گئے تھے کہ گاڑی میں جوتے جاتے۔ اور  
ہاتھی کی طرح انکی پیٹھ پر ہودہ کس کے سواری لی جاتی۔ گینڈا باطنع لڑنے والا  
جانور نہیں ہے۔ بلکہ جہاں تک ممکن ہو تا ہے لڑائی کو طرح دیتا ہے۔ لیکن ہاں اگر  
اُسے چھیڑا جائے تو مقابلے کے لیے تیار ہو کے نہایت ہی موذی بن جاتا ہے نصیر الدین  
حیدر کے زمانے میں لڑائی کے پندرہ برس گینڈے موجود تھے جو چاند گچ میں رہا  
کرتے جب سوار اُنھیں دیکھ کے ایک دوسرے کے مقابل کر دیتے تو وہ سر جھکا کے  
ایک دوسرے کی طرف دوڑتے اور ٹکرتے ہوئے لگتے۔ دونوں کی یہ کوشش  
ہوتی کہ حریف کے پیٹ کو اپنے سینگ سے پھاڑ ڈالیں۔ اور اسی کوشش میں

وہ دیر تک ایک دوسرے کو ریلے پیلے اور ڈھیلے رہتے۔ بڑے زور زور سے  
 غراتے۔ سینگ کو سینگ سے ٹکراتے۔ اور آخر میں لڑتے لڑتے سر جوڑ کے گتھ  
 جاتے۔ اور حریت کو ڈھیلے رہتے۔ یہاں تک کہ جو حریت مکرور پڑتا ہے وہ آہستہ  
 آہستہ بیٹھنے اور جگہ چھوڑنے لگتا ہے۔ اور اس پر بھی جان نہیں چھوٹی تو بھاگتا ہے۔  
 مگر غالب رگیدر گید کے مارتا ہے۔ آخر مکرور اپنا سینگ الگ کر کے مقابلے سے منہ ہٹاتا  
 اور بڑے زور سے بھاگتا ہے۔ اگر محصور میدان ہوا تو غالب حریت بھاگتے ہیں اس پر  
 حملہ کر کے اُسے گراتا اور پیٹ مین سینگ بھونک کے کام تام کر دیتا ہے۔ اور اگر  
 وسیع کھلا میدان ہو۔ اور شکست خوردہ گینڈا بھاگ سکا تو بھاگ کے اپنی جان  
 بچا لیتا ہے۔ اس وقت سوار رگیدر گید کے اور گرم سلاخوں سے مار مار کے غالب کو  
 مغلوب کے تعاقب سے روکتے اور ہٹاتے جاتے ہیں۔ گینڈوں کی لڑائی کا سارا  
 دار و مدار اس پر ہے کہ وہ سر جھکائے اور اپنے پیٹ کو بچائے رہیں۔ اگر دھوکے  
 میں بھی کسی کا سر اٹھ گیا تو مقابل حریت اپنا کام کر گزرتا ہے۔ چنانچہ ایک گینڈا  
 غالب آگیا اور اُس کا حریت بھاگنے لگا۔ اُسے بھاگتے دیکھ کے غالب نے سرا دینا  
 کر دیا۔ اور ساتھ ہی اُسی شکست خوردہ گینڈے نے سبلی کی طرح دوڑ کے اُس کے  
 پیٹ میں سر ڈال دیا اور پیٹ پھاڑ ڈالا۔

(۷) بارہ شگھا

یہ چھوٹا نازک اور خوبصورت جانور ہے۔ اور شاید لکھنؤ کے سوا اور کسی جگہ نہیں  
 طبع کے طور پر نہ لڑایا گیا ہوگا۔ مگر اس کی لڑائی بڑی خوبصورت ہوتی ہے۔ ہرن  
 شعرا کے مشوق کا بمشکل ہے۔ اس لیے اُس کی لڑائی میں بھی مشوقانہ اور تین ظاہر  
 ہوتی ہیں۔ مقابلے کے وقت پہلے بڑی خوبصورتی کے ساتھ دونوں حریت پیتر سے  
 بدلتے رہتے ہیں۔ اور آخر مکرور ہونے لگتی ہیں۔ جن میں سینکڑوں سے وہ تلوار کا بھی  
 کام لیتے ہیں اور سپر کا بھی۔ آخر دیر تک کی ٹکروں کے بعد دونوں کے سینگ  
 آپس میں اس طرح اُلجھ جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے قفل پر لگی۔ اب ایک دوسرے  
 عہ مولانا حبیب الرحمن خان صاحب خروانی نے بتایا اور ہیں بھی بد کو تارخون میں نظر آ کر  
 درخت سے اور باقی میں دہلی میں بھی لڑائے جاتے تھے۔

کو ریلے اور ڈھکیلتے رہتے ہیں۔ اسی ریل پٹی میں ایک کمزور پڑ جاتا ہے۔ اور اسپر منگولی کی ایسی ہیبت طاری ہو جاتی ہے کہ نازک پاؤں تھر تھرتھرتے لگتے ہیں۔ اور سارے تن بدن میں رعشہ پڑ جاتا ہے۔ مگر حریف ترس کھانے کے عوض زور میں آکے اور ڈھکیلتا ہے۔ اور ڈھکیلتا ہوا میدان کے خاتمے یعنی ٹھاٹھ تک پہنچا دیتا ہے۔ اب مغلوب کو بالکل ناامیدی ہوتی ہے۔ آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو اور سینگوں سے خون کے قطرے ٹپکنے لگتے ہیں اور وہ سینگ چھڑا کر لڑائی سے منہ پھیر لیتا ہے۔ اُس وقت حریف سینگوں سے اُسکے جسم کو زخمی کرنا شروع کرتا ہے اور مغلوب بارہ ٹکھا زور سے بھاگتا ہے۔ جس پھرتی سے وہ بھاگتا ہے اسی تیزی سے غالب حریف اُس کا تعاقب کرتا ہے۔ یہ دوڑ دیکھنے کے قابل ہوتی ہے دو فون ہوا سے باتیں کرنے لگتے ہیں اور اُن پر نگاہ نہیں ٹھہرتی ہے۔ مگر بے رحم دشمن مغلوب کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ جہاں پاتا ہے زخمی کرتا ہے۔ آخر زخموں سے چور کرتے کرتے مار ڈالتا ہے۔ اور مرنے کے بعد اُس کی لاش کو اپنے سینگوں سے جھنجھوڑ کے ہٹاتا اور اپنی فتح پر نازاں ہوتا ہے۔

(۸) مینڈھا

یہ نہایت ہی غریب اور بے آزار جانور ہے مگر اُس کی ٹکر بڑی زبردست ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے دو پہاڑ لڑ گئے۔ چنانچہ انھیں ٹکرون کا تماشہ دیکھنے کے لیے لوگ اُنھیں لڑاتے ہیں۔ اور آج ہی نہیں قدیم الایام سے ان کی لڑائی دیکھی جاتی رہی۔ ان کے لڑائے کا آغاز ہندوستان میں بلوچی لوگوں سے ہوا۔ اور انھیں سے دوسرے مقاموں میں شوق پیدا ہوا۔ مگر لڑائی کے لیے اُن کے پالنے اور تیار کرنے کا کام اکثر قسائیوں اور ادنیٰ طبقے کے لوگوں سے متعلق رہا۔ امراد شرفا انھیں سامنے بلوائے لڑائی کا تماشہ دیکھ لیا کرتے تھے۔ سنا جاتا ہے کہ نواب آصف الدولہ اور سعادت علی خان کو مینڈھوں کی لڑائی دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے سامنے بھی اکثر مینڈھے لڑائے گئے۔ واجد علی شاہ کو کلکتہ کے قیام میں بھی کسی حد تک شوق تھا۔ نقشبی سلطان بہادر اُن کی دلچسپی کے لیے اکثر قسائیوں کے زیر اہتمام بہت سی جوڑیں

تیار رکھتے تھے۔ اور میں نے کئی بار دیکھا کہ کسی زبردست میڈسے کی ایسی ٹکڑی کی کہ وہ سرے حریف کا سر پھٹ گیا۔ میڈھا جب ہارتا ہے اور مقابل حریت کی ٹکڑی کی تاب نہیں لاسکتا تو اس کی ٹکڑی دسے کے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار بادشاہ کارنہ دیکھنے کے لیے مقررہ سالانہ تاج کو کلکتے کے صدر انگریز جمع تھے۔ بادشاہ سلامت اپنی وضع کے خلاف بوجے پر سوار نکل آئے۔ اور ان کا ٹون کے خوش کرنے کے لیے حکم دیا کہ میڈسے لاکے لڑائے جائیں۔ چنانچہ ان کی ٹکڑیوں کا ہنگامہ بلند ہوا۔ اور اس سے زیادہ شور پور میں لوگوں نے ”ہرے“ اور خوشی کے نعرے بلند کر کے مچایا۔ اور عجیب جوش و خروش کا عالم نظر آتا تھا۔ لکھنؤ میں استراغ سلطنت کے بعد بھی نواب حسن الدولہ بہادر کو میڈھوں کی لڑائی دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اب شرقا اور امرا سے یہ مسئلہ چھوٹ گیا ہے۔ سادنی لوگوں میں مہمونی حد تک باقی ہے۔

(۱۹)

دردنوں کی لڑائی لکھنؤ میں صرف سلطنت اور امرے دربار تک محدود تھی۔ اس لیے کہ ان کی داشت۔ تیار سی۔ لڑائی کے وقت ان کو سینھا لیا۔ اور تاشا ہون کو ان کی مسرت سے بچانا ایسی چیزیں ہیں جو غرابو کنار بڑے بڑے امیرون کے امکان سے بھی باہر ہیں۔ اور اسی لیے دردنوں کی لڑائی سواد لکھنؤ میں اسی وقت تک دیکھی گئی جب تک اگلا دربار قائم تھا۔ اور وہ دربار برخواست ہوا اور اُدھر وہ وحشت ناک ونگل بھی اُجڑ گئے۔

لیکن یقیناً لڑائی ایسی نہ تھی۔ اس کا شوق ہر امیر و غریب کر سکتا تھا۔ اور ہر شوقین محنت کرنے کے لڑائی کے قابل مرغ یا بیڑ تیار کر سکتا تھا۔ جو طیور لکھنؤ میں شوق اور دلچسپی کے ساتھ لڑائے گئے حسب ذیل ہیں :- (۱) مرغ۔ (۲) بیڑ۔ (۳) نیمتر۔ (۴) لوسے۔ (۵) گلدم۔ (۶) لال۔ (۷) کبوتر۔ (۸) قوتے۔ ان میں سے ہر ایک کھیل کے جدا جدا بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ لکھنؤ کی کبوتر بازی اور بیڑ بازی عام طور پر مشہور ہے۔ جس پر آج کل کے تعلیم یافتہ اور موجودہ تہذیب کے دلاوہ اکثر تضحیک کرتے ہیں۔ وہ اس سے سلق واقف نہیں کہ ان شوقوں اور کھیلوں میں سے

ہر ایک کو ان لوگوں نے کس درجہ کمال پر پہنچانے کے ایک مستقل فن بنا دیا تھا لیکن جب وہ یورپ میں جا کے وہاں بھی اسی قسم کے لغوشوق دیکھیں گے تو کم سے کم اُنھیں اپنے اُن الفاظ پر ندامت ضرور ہوگی جو اپنے وطن کے ان شوقینوں کی نسبت اکثر بے ساختہ کہہ بیٹھے ہیں۔

### (۱) مرغ بازی

لڑنے اگرچہ ہر قوم کے مرغ ہیں مگر لڑائی کے لیے مخصوص اصل مرغ ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ دنیا میں اصل مرغ سے زیادہ ہمار کوئی جانور نہیں ہے۔ مرغ کی سی ہادری و حقیقت شیریں بھی نہیں ہے۔ وہ مر جاتا ہے مگر لڑائی سے مٹ نہیں موڑتا۔ اصل مرغ کی نسبت یہاں کے محققین کا خیال ہے کہ اُنکی نسل عرب سے لائی گئی ہے۔ اور یہ قرن قیاس بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کئی زمانہ اصل کی جس قدر زیادہ اور اعلیٰ نسلیں حیدر آباد وکن میں موجود ہیں کہیں نہیں ہیں۔ اور ہندوستان میں وہی ایک شہر ہے جہاں اہل عرب سب جگہوں سے زیادہ آباد و مقیم ہیں۔ بلندی ہند میں مرغوں کی نسلیں ایران ہوتی ہوئی آئیں۔ لکھنؤ کے نامی مرغ بازوں میں سے ایک صاحب کا بیان تھا کہ بازی میں اُن کا مرغ اتفاقاً ہار گیا تھا۔ دل شکستہ ہو کے وہ ارض عراق میں چلے گئے۔ بخت اشرار میں کئی بیٹے تک مصروف عبادت رہے اور شب و روز دعا کرتے کہ خداوند اپنے ائمہ معصومین کا صدقہ سمجھے ایسا مرغ دلوا جو لڑائی میں کسی سے نہ ہارے۔ ایک رات کو خواب میں بشارت ہوئی کہ ”جنگل میں جاؤ“ صبح آنکھ کھلتے ہی اُنھوں نے کوہ و بیابان کا راستہ لیا۔ اور ایک مرغی ساتھ لیتے گئے۔ یہ ایک ایک درہ کوہ سے لکڑیوں کوں کی آواز آئی۔ اُنھوں نے فوراً قریب جا کے مرغی چھوڑی جس کی آواز سنتے ہی مرغ نکل آیا۔ اور یہ فوراً کسی حکمت سے اُسے پکڑ لائے۔ اُس کی نسل ایسی تھی کہ پھر کبھی پالی میں اُنھیں شرمندہ نہ ہوتا پڑا۔

مرغوں کی لڑائی کا شوق یہاں نواب شجاع الدولہ کے عہد سے آخر تک برقرار رہا۔ نواب آصف الدولہ کو بے اتہاشوق تھا۔ نواب سعادت علی خان باوجود



بیدار مغزی کے مرغ بازی کے دلدادہ تھے۔ اُن کے شوق نے سوسائٹی پر ایسا اثر ڈالا کہ لکھنؤ کے اُنہرے دربار و کنار اُس زمانے میں جو اہل یورپ یہاں موجود تھے اُنہیں بھی جی شوق ہو گیا تھا۔ چنانچہ جنرل مارٹن جن کی کوٹھی لکھنؤ کی ایک قابل دید عمارت اور دوہین بچوں کی درس گاہ ہے اول درجے کے مرغ باز تھے۔ اور خواب سعادت ملی خان اُن سے بازی بد کے مرغ لڑایا کرتے۔

لکھنؤ میں مرغوں کی لڑائی کا یہ طریقہ تھا کہ مرغ کے کانٹے باز نہ دیے جاتے۔ تاکہ اُن سے ضرر نہ پہنچا سکے۔ چوچ چاقو سے پھیل کے تیز اور نوکیلی کی جاتی۔ اور جوڑ کے دونوں مرغ پالی میں چھوڑ دیے جاتے۔ مرغ باز اُن کے پیچھے پیچھے رہتے مرغ کو دوسرے مرغ کے مقابلے میں چھوڑنا بھی ایک فن تھا جس میں یہ کوشش ہوتی کہ ہمارا ہی مرغ پہلے چوٹ کرسنے کا موقع پائے۔ اب دونوں مرغ چوچوں اور لاقوں سے لڑنا شروع کرتے۔ مرغ باز اپنے اپنے مرغ کو اُٹھارتے اور اشتعال دیتے۔ اور چلا چلا کے کہتے "ہاں مٹیا شائش ہے!" "ہاں مٹیا کاٹ!" "پھر مین پٹیا مرغ اُٹھی لکھاروں اور بڑھاؤں پر اس طرح بڑھ بڑھ کے لائیں اور چنچن مارنے۔ کہ معلوم ہوتا ہے کچھتے اور اُنکے کٹنے پر عمل کرتے ہیں۔ جب لڑتے لڑتے زخمی اور بچور ہو جاتے تو بالفاظ فریقین تھوڑی دیر کے لیے اُٹھالے جاتے۔ یہ اُٹھالیتا مرغ بازی کی اصطلاح میں "پانی" کہلاتا ہے۔ اُس وقت مرغ باز اُنکے زخمی سروں کو پونچھتے۔ اُن پر پانی کی پھوہار میں دیتے۔ زخموں کو اپنے منہ سے چوستے۔ اور ایسی ایسی تمیزیں کرتے کہ جذبات کے اندر مرغوں میں پھر نیا جوش پیدا ہو جاتا اور تازہ دم ہونے کے دوبارہ پالی میں چھوڑے جاتے۔ اسی طرح ہر ایر پالی ہوتے رہتے۔ اور لڑائی کا خاتمہ چارپانچ روز بعد اور کبھی کٹھ تو روز بعد ہوتا۔ تب ایک مرغ اندھا ہو جاتا یا ایسی چوٹ کھا جاتا کہ اُسٹھ کے قابل نہ رہے۔ یا اور کسی وجہ سے لڑنے کے قابل نہ رہتا تو سمجھا جاتا کہ وہ مار گیا۔ یا یہ ہوتا کہ مرغ کی چوچ ٹوٹ جاتی۔ اس صورت میں بھی جہاں تک بتا مرغ باز چوچ باز نہ کر لڑا کرتے۔

حیدر آباد کا کھیل یہاں کے خلعت بہت سخت ہے۔ وہاں کانٹے نہیں بانٹتے

جاتے بلکہ بھوسہ باندھنے کے چاقو سے پھیل کے بر جھبی کی آئی بنا دیے جاتے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑائی کا فیصلہ گھنٹہ ہی ڈیڑھ گھنٹہ میں ہو جاتا ہے۔ لکھنؤ میں خارون کے باندھنے کا طریقہ غالباً اس لیے اختیار کیا گیا تھا کہ لڑائی طول کیچنے اور زیادہ زمانے تک لطف اٹھایا جاسکے۔

لڑائی کے لیے مرغون کی تیاری میں مرغ باز کے کمالات غذا اورداشت کے علاوہ اعتدال کی مالش۔ پھوٹی یعنی پانی کی پھو ہار دینے چوچ اور خار ہنا۔ یا خار کے باندھنے اور کوفت کے مٹانے میں نظر آتے ہیں۔ اس اندیشے سے کہ زمین پر دانہ چلنے میں چوچ کو نقصان پہنچ جائے۔ اکثر مٹھین دانہ ہاتھ پر کھلا یا جاتا ہے۔

یہ شوق واجد علی شاہ کے زمانے تک زورون پر تھا۔ بیابا برج میں نواب علی نقی خان کی کوٹھی میں مرغون کی پالی ہوتی تھی۔ اور کلکتے سے بعض دیگر بزرگ اپنے مرغ لڑانے کو لایا کرتے تھے۔ بادشاہوں کے علاوہ اور بہت سے رئیسوں کو بھی مرغ بازی کا شوق تھا۔ مرزا حیدر۔ ہوٹیم صاحبہ کے بھائی نواب سلا دنگ حیدر بیگ خان۔ سیر سو اس جو نصیر الدین حیدر کے زمانے میں تھے اور خود بادشاہ سے مرغ لڑاتے تھے۔ آغا بہان الدین حیدر۔ بھی مرغ بازی کے شائق تھے۔ آخر الذکر رئیس کے وہاں آخر زمانے تک دو اڑھائی سو مرغ رہتے۔ نہایت ہی صفائی اور نفاست سے رکھے جاتے۔ دس بارہ آدمی انکی داشت پر مامور تھے۔ میان دار اب علی خان کو بڑا شوق تھا۔ نواب گھسٹا نے بھی اس شوق کو آخر تک نباہا۔ علی آباد کے معزز پٹھانوں کو بھی بہت شوق تھا۔ اور انکے پاس اصل مرغون کی بہت اچھی نسلیں محفوظ تھیں۔ یہاں مشہور مرغ باز جو اپنے فن میں استاد یگانہ مانے جاتے۔ بہت سے تھے۔ میرا داد علی۔ شیخ گھسٹا۔ منور علی جن کو یہ کمال حاصل تھا کہ مرغ کی آواز سن کے بتا دیتے کہ یہ بازی لے جائے گا۔ صفدر علی۔ اور ایک اول درجہ کے وشیہ وار سپرین بھی مشہور تھے۔ اس آخری زمانے میں مندرجہ ذیل لوگوں کا نام مشہور ہوا۔ فضل علی جمعدار۔ قادر۔ جیون خان۔ حسنین علی۔ نوروز علی۔ نواب محمد تقی خان جو یہاں

کے ایک عالمی مرتبہ رئیس تھے۔ میان جان۔ دل۔ چھنگا۔ حسین علی بیگ۔ آجمن۔ ان میں سے اب کوئی زندہ موجود نہیں ہے۔

یہی لوگ ہیں جھون نے مرغ بازی کو بہانہ تہائی کہاں کے درجے پر پہنچانے دکھا دیا۔ مگر میرا خیال ہے کہ فی الحال مرغ بازی کا شوق حیدر آباد و کنین بڑھا ہوا ہے۔ ان کے بہت سے امیرون جاگیرداروں اور منصب داروں کو شوق ہے اور ان کے پاس مرغون کی نسلیں بھی بے مثل ہیں۔ جن کی وہ بہت حفاظت کرتے ہیں۔

### (۲) بٹیر بازی

بٹیر بازی کا شوق لکھنؤ میں پنجاب سے آیا۔ پنجاب کے بعض کھن لوگ جن کی عورتیں عصمت فروشی کا پیشہ کرتی ہیں ذواب سادات علی خان کے عہد میں وارد لکھنؤ ہوئے۔ اور گھاگس بٹیر اپنے ساتھ لائے۔ جنکو وہ لڑاتے تھے۔ آجکل کی بعض نامور نڈیان انھیں لوگوں کی مثل سے ہیں۔ بٹیروں کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک گھاگس اور دوسری چٹنگ۔ پنجاب میں صرف گھاگس بٹیر ہوتا ہے۔ وہ چٹنگ سے بڑا زبردست اور طاقتور ہوتا ہے۔ لکھنؤ میں گھاگس اور چٹنگ دونوں ہوتے ہیں۔ چٹنگ گھاگس سے قد میں چھوٹا اور نازک ہوتا ہے مگر لڑنے میں زیادہ مضبوط اور بہت جیالا ہوا کرتا ہے۔ اور اس کی لڑائی زیادہ شاندار اور خوبصورت ہوتی ہے۔ ہر حال اس بات کا پتہ لکھنؤ ہی میں لگا کہ لڑانے کے لیے چٹنگ بٹیر زیادہ موزوں ہے۔

بٹیر کی لڑائی کے لیے نہ کسی بڑے میدان کی ضرورت تھی نہ گھر سے باہر نکل کے معین تک بھی آنے کی۔ بلکہ کمرے کے اندر ہی صاف سمہرے فرش پر ہتدیب کے ساتھ بیٹھ کے اسکی لڑائی کی سیر دکھی جاسکتی ہے۔ اس لیے لکھنؤ کی سوسائٹی نے اسی کو بہت پسند کیا۔ نہایت نفیس۔ خوبصورت۔ اور سبک کا کپڑا بٹیروں کے لیے ایجاد کی گئیں جو ہاتھی دانت کی نغنی نغنی گزیوں سے آراستہ کی جاتیں اور ان میں بٹیر رکھے جاتے۔

اس کا کہیں یوں ہے کہ پہلے موٹہ یعنی پانی میں جھگو جھگو کے گھسٹوں ہاتھوں

مین دیاے رہنے سے اُس کی وحشت دُور ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ بولنے اور چوہنچین مارنے لگتا ہے۔ اس کے بعد بھوک دے کے اور دست آور اجزا جن میں مہر بہت مخصوص ہے دے دے کے اُس کا جسم درست کیا جاتا ہے۔ پھر رات گئے یا آدھی رات کو اُن کے کان میں پتلا کے "کو" کہا جاتا ہے۔ جسے کوکنا کہتے ہیں غرض ان خیرون سے چربی چھنٹ جاتی ہے۔ بعد ازاں دُور ہو جاتا ہے۔ اور جسم نہایت ہی پھرتیلا اور قوی ہو جاتا ہے۔ یہی میسر کی تیاری ہے۔ اور ان باتوں میں جس قدر زیادہ پورا ہے اُسی قدر سمجھیے کہ لڑائی کے لیے زیادہ موزوں ہے۔

لڑائی کے وقت فرش پر چاروں طرف ہلکا ہلکا دانہ پھینکا دیا جاتا ہے اور میسر کا بک سے نکالے جاتے ہیں۔ پہلے دونوں میسروں کی چوہنچین چاقو سے بنا کے خوب تیز کر دی جاتی ہیں۔ اسکے بعد ایک دوسرے کے مقابل چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ میسر کی لڑائی مرغ سے ملتی ہوئی ہے۔ چوہے سے کاٹتا اور بچوں سے لات مارتا ہے۔ چوہے سے حریف کے منہ کو زخمی اور اُٹو کر دیتا ہے۔ اور بچوں سے بعض وقت حریف کا پوتا تک پھاڑ دیتا ہے۔ لڑائی پندرہ بیس منٹ یا کبھی اس سے زیادہ دیر تک رہتی ہے۔ اور آخر منسوب حریف بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ اور بھاگنے کے بعد پھر وہ کسی میسر کے سامنے لڑائی میں نہیں ٹھہرتا۔

میسر کی ترقی کے تین درجے ہیں اور اُس کی ناموری کے تین دور سمجھے جاتے ہیں۔ اول تیار چوہے اور پہلے پہل انوس کر کے لڑایا جاتا ہے۔ اگر وہ بہت سی لڑائیوں میں جیتا اور نہ بھاگا تو لڑائی کی فصل ختم ہوتے ہی معمولی پھر دن میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب وہ پُرانے پر بھاڑ کے نئے نکال لاتا ہے۔ اسے کریر ٹھکانا کہتے ہیں۔ یہ زمانہ ختم ہوتے ہی دوسرے سال اُس کی ترقی کا دوسرا درجہ اور دور ہوتا ہے۔ اور اُسے نوکار کہتے ہیں۔ پھر اس کے بعد دوبارہ کریر ٹھکانا کہ جب تیسرے سال وہ لڑائی کے لیے تیار کیا جاتا ہے تو کریر کہلاتا ہے۔ اور یہ اُنکی ترقی کا تیسرا دور اعلیٰ درجہ ہے۔

عموماً تسلیم کر لیا گیا ہے کہ لڑائی میں نوکار نے سے اور کریر نوکار سے زبردست ہوتا ہے۔ بنا میسر کریر سے دو چوہنچین بھی مشکل سے لڑ سکتا ہے۔ اعلیٰ درجے کے میسر باز

اور شوقین رئیس صرت گریزون کو لڑاتے ہیں۔ اور نئے ٹیڑوں کا لڑانا بالکل معمولی کھیل ہے۔ لڑائی میں طرح طرح کے فریب و فن بھی کیے جاتے ہیں۔ بعض لوگ اپنے ٹیڑے کے منہ پر کبھی کوئی ایسی لڑوی اور زہریلی چیز یا عطر لگا دیتے ہیں کہ دوسرا ٹیڑو ایک چوچن مارتے ہی پیچھے ہٹنے اور لڑائی سے منہ موڑنے لگتا ہے۔ اور اگر اسپر بھی لڑتا رہا تو لڑائی کے بعد مر جاتا ہے۔ بعض لوگ کیف کا کھیل کھیلے ہیں۔ یعنی لڑائی سے ایک ساعت پہلے اپنے ٹیڑے کو کوئی ایسی تیز نشہ دالی چیز کھلا دیتے ہیں کہ وہ لڑائی میں جیس ہو کے بھاگنا بھول جاتا ہے۔ اور جب تک حریت کو پالی سے نہ بھگا دے جھوٹوں کی طرح لڑتا رہتا ہے۔

لکھنؤ میں ٹیڑے بازی کے شوق نے ایسے ایسے بالکال ٹیڑے باز پیدا کر دیے جن کا کہیں نظیر نہیں مل سکتا۔ بعض لوگوں نے یہ کمال پیدا کیا تھا کہ کسی کے اچھے نامی ٹیڑے کو ایک نظر دیکھا اور کسی معمولی ٹیڑے کی ویسی ہی صورت بنا دی۔ اور کسی موقع پر باتوں باتوں میں بدل لیا۔ خیر یہ تو ایک بیودہ چوری تھی مگر بعض اُستادوں نے یہ کمال حاصل کیا کہ بھگے ٹیڑوں کو تیار کر کے اچھے اچھے گریزون سے لڑا دیتے اور بازی لے جاتے۔ کیف کے کھیل والے اُستادوں میں ایک صاحب کیف کی نہایت اعلیٰ درجے کی گولیاں تیار کرتے جو سو روپے کی دس گولیاں ہکتیں۔ اور لوگ شوق سے لے جاتے۔

ان لوگوں کی سب سے بڑی اُستادی ٹیڑوں کے علاج میں نظر آتی ہے۔ اور ایسے ایسے بیمار اور اذکار و بقتہ ٹیڑوں کو درست کر لیتے ہیں اور اس خوبی سے اُن کے مریض کی تشخیص کرتے اور مناسب اجزاء استعمال کرتے ہیں کہ اُطبا اور ڈاکٹر حیرت میں رہ جاتے ہیں۔ اس کی بہت کوشش کی گئی کہ ٹیڑوں کو پال کے انڈے سے بچے دوئے جائیں مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی۔

ٹیڑوں کے نام بھی بڑے بڑے شاندار رکھے گئے۔ جیسے رستم۔ سہراپ۔ شہرہ آفاق۔ پالیون میں بڑی سے بڑی بانیاں دی جاتی ہیں۔ اور ایک ہزار روپیہ تک کی بازی میں لے خود دیکھی ہے۔ اس کا شوق بھی بعض بادشاہوں کو رہا تھا لیکن حیدر اپنے سامنے میز پر ٹیڑوں کی لڑائی دیکھ کے خوش ہوتے تھے۔

پڑانے بیس بازون میں میر بچو - میر عہدو - خواجہ حسن - میر خدا علی - چنگا - میر  
عابد اور سید میرن کے نام یادگار ہیں۔ آج سے چالیس سال پہلے ٹیپا برج میں  
داروغہ غلام عباس - چھوٹے خان - اور غلام محمد خان خالص پوری کو جوڑے  
معر اور سن رسیدہ لوگ تھے اس فن میں نہایت باکمال پایا تھا۔ قائب علی بیگ -  
مرزا اسد علی بیگ - نواب مرزا - میا جان - شیخ مومن علی - اور فاتحی الدین خان  
نے بھی آخر عہد میں بہت ناموری حاصل کی تھی۔

بیسرون کا شکار بھی لکھنؤ والوں کے لیے بڑی دلچسپی کی چیز ہے۔ پہلے اس میں  
صرف شوقینی تھے جس کی بدولت بہت سے ہمیں آدمی جھپٹن لے کر بھی شہر سے  
باہر کی سوا دہنیں دیکھی تھی کھیتوں اور جنگلوں کی ہوا کھا آتے تھے۔ مگر اب اسی پر  
ہتون کی روٹیاں چلتی ہیں۔

کہتے ہیں کہ بیس ہاڑون سے رات کو نکلتے اور اوپر کی فضا میں اڑتے ہوئے  
جاتے ہیں۔ شکار کے شوقین بڑی آواز سے ہلنے والے بیسرون کو تیار کرتے ہیں۔  
جو برابر رات بھر ہلے رہتے ہیں۔ ایسے بیسرون کو بھڈیت کہتے ہیں۔ کسی ادھر  
کے کھیت کے اطراف میں اکثر جال پھیلا دیا جاتا ہے۔ پھندے توں کی آواز سن کے  
بیسر اوپر سے اترتا اور گرنا شروع ہوتے ہیں۔ اور رات بھر میں بہت سے  
جمع ہو جاتے ہیں۔ صبح ہوتے ہی وہ سب طرف سے ہنکا کے جال کی طرف بھاگ  
جاتے ہیں۔ جس میں پھنسے ہی پڑ جاتے ہیں۔

(۳) تیسرون کی لڑائی۔

یہ بھی دلچسپ ہے۔ تیسر اور بیس کی پھنسٹ اُچک اُچک کے لڑتا ہے۔ مگر  
اس کا شوق سوا دیہاتی لوگوں اور اگلے درجے والوں کے امر اور شرف کو کبھی  
نہیں رہا۔ تیسر لوٹ سے اور دوڑا دوڑا کے تیار کیے جاتے ہیں۔ ان میں  
جوش اور غصہ پیدا کرنے کے لیے ان کو دیکھلائی جاتی ہے۔ مگر یہ کوئی بڑا  
کھیل نہیں ہے۔ اور نہ ہیڈ سوسائٹی میں اختیار کیا گیا۔ ہاں لکھنؤ کے ادنیٰ  
طبقے والوں میں کثرت سے رہا۔ اور ہے۔

(۴) لون کی لڑائی

لو اچھوٹے قسم کا میٹر ہے جو میٹر سے بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ وہ پیالے دانے کے سدا یعنی مادہ پر لڑا کرتا ہے۔ اُسے لڑاتا ہوتا ہے تو مادہ کا پیرالا کے ساتھ رکھ دیا جاتا ہے۔ اس کا شوق ریاست دیوان وغیرہ میں لوگوں کو زیادہ تھا لکھنؤ میں بھی پسند کیا گیا اور ایک حد تک اختیار کیا گیا۔ اوسے کی لڑائی سچ یہ کہ کہ میٹر سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہے۔ وہ گندے کھول کے لڑاتا اور گتھ جاتا ہے اور پھول کی طرح کھل کھل کے اُٹھتا اور گر جاتا ہے۔ لکھنؤ کے بعض ادماء کو اس کا شوق ہو گیا تھا۔ ٹیاریج میں واجد علی شاہ مرحوم کی سرکار میں ایک بڑے اُستاد اوسے لڑانے والے تھے۔ جنھوں نے بہت اچھی اچھی جوڑین تیار کی تھیں۔ اور جب اُنھیں سامنے لاکے لڑاتے تو بڑا لطیف آتا۔ لوگوں کی تیاری بھی زیادہ تھوٹ اور بھوک سے ہوتی ہے۔ اور اس کی لڑائی کا رواج میٹر کے میٹر سے تھا۔ مگر آخر میں میٹری بازی کا اس قدر رواج ہوا کہ اوسے کا شوق پھیل پڑ گیا۔ اس کا شکار بھی عجیب طریقے سے ہوتا ہے۔ یہ بھی میٹر کی طرح ادھر کی نشانیں اُڑتا ہوا جاتا ہے۔ لوگ میٹر کے پھندہ تون کی سی چھپر پر ایک گھڑا باندھ دیتے ہیں۔ اس کے مونہ پر چھتری منہ کے ایک سینک میں ڈورا باندھ کے اُس سینک کو بھتی میں چھو کے اندر لٹکا دیتے ہیں۔ اور اُس ڈور سے کو ہاتھ سے سوتا شروع کرتے ہیں۔ جتنی سے ایک بے شکم بھون بھون کی آواز نکلنا شروع ہوتی ہے جو لوگوں کو اس قدر پسند ہے کہ اُسے اُڑتے اُڑتے نیچے اُتر پڑتے ہیں۔ اور صبح کو جال میں پھنس کے میٹر دن ہی کی طرح پکڑیلے جاتے ہیں۔

(۵) گلدیم لڑانا

گلدیم کو غوام بلبل کہتے ہیں مگر یہ غلطی ہے۔ بلبل پریشان و عجم کی ایک نغمہ سخی چڑیا ہے۔ اور اس چڑیا کی دُم کے نیچے ایک سرخ گل ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کا نام گلدیم رکھا گیا ہے۔ اس کی لڑائی بھی دیہاتیوں اور بازاری لوگوں میں زیادہ ہے۔ شامینہ سوسائٹی نے اُسے کبھی دلچسپی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ مگر اس کی لڑائی لطف سے خالی نہیں ہوتی۔ دانے بڑھنے میں۔ اور لڑائی میں دونوں حریف کرتے ہوئے اُپر اُڑتے اور گتھ کے کرتے ہیں۔

## (۶) لال لڑائی

لال صرف پتھروں میں رکھ کے پائے کے لیے ہیں لڑائی کے لیے موزوں نہیں۔ مگر نفس پرست انسان نے انہیں بھی لڑاکے دو گھڑی دل بہلا لیا۔ لالوں کا پہلے تو اس حد تک مانوس بنا تا کہ کل ہوتا ہے کہ پتھر کے باہر نکال کے چھوڑ دیا جائے اور اڑتے جائیں۔ دوسرے انہیں اس قدر مست بھی ہونا چاہیے کہ دوسرے لال سے لڑنے کو تیار ہو جائیں۔ چنانچہ ان کا لڑ جانا ہی دستور ہوتا ہے۔ مگر جب لڑ گئے تو خوب گتہ گتہ کے اور اڑتے لڑتے ہیں اور بڑی دیر تک لڑتے رہتے ہیں۔ لالوں کی لڑائی دوسرے چھوٹے طیور کی لڑائی کی یہ نسبت دیر تک رہتی ہے۔ لالوں کی لڑائی کا شوق اہل لکھنؤ میں بہت کم رہا۔ صرف دو ہی ایک استاد پیدا ہوئے جنہوں نے لڑایا ورنہ عام رجحان اس کے خلاف تھا۔ اور اُس کے شوقین بھی عوام اور بازار ہی تھے۔

## (۷) کبوتر بازی

کبوتر ان مانوس جانوروں میں ہیں جن کا شوق لوگوں کو قدیم زمانے سے لے کے آج تک ہر ملک اور ہر سرزمین میں کسی کسی حد تک ضرور رہا۔ کبوتروں کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جن میں اڑنے والے گروہ باز اور گولے ہوتے ہیں۔ اور جو محض خوبصورتی اور خوش رنگی کے لحاظ سے پائے جاتے ہیں۔ ان میں شیرازی گلی۔ نثاروی۔ گلوے۔ لہے۔ موٹن۔ اور چوچا چند وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ مگر کبوترات دن کو بچے اور بچہ کا دم بھرنے کی وجہ سے عبادت گاہوں کو زیادہ پسند تھے۔ اور اکثر فقر و مشائخ کو ان کا شوق تھا۔

سنئے ہیں کہ گروہ باز پہلے پہل کابل سے لائے گئے۔ پہلے عموماً وہی اڑائے جاتے تھے گولے بعد کو آئے جن کی نسل عرب و عجم اور ترکستان سے آئی۔ گروہ باز کی یہ شان ہے کہ صبح کو اڑے تو گھنٹوں مکان کے عین محاذی آسمان پر چکر لگاتے رہے۔ اس طرح کہ صحن کے اندر گن میں جانی بھر کے رکھ دیکھتے تو اُس میں ہمیشہ نظر آتے رہیں گے۔ بعض دن دن بھر اڑتے رہتے ہیں۔ اور شام کو اُترتے ہیں۔ اپنے مکان کے پچاٹنے اور وطن پرستی کے دلدادہ ہونے میں



گرہ باز اتنا کمال رکھتے ہیں کہ خود میرے بیان کا ایک کبوتر کسی کے دہان میں بیٹھا تھا جس نے پر کاٹے دیے۔ تین سال کے بعد جب اسے موقع ملا اور پر نکل آئے تو واپس آیا۔ اور اپنے خانے میں گھس کے اس کبوتر سے لڑنے لگا جواب اس میں مقیم تھا۔ لیکن گرہ باز کی دس بارہ سے زیادہ کی ٹکڑی نہیں اڑتی۔ لوگوں کو سو سو دو سو کبوتروں کی ٹکڑیاں اڑاتے کا شوق ہوا تو گوئے اختیار کیے گئے کبوتر بازی کا فن وہی ہی میں اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ کتے ہیں آخری وارث و ولت منسلک تبادر شاہ کی سواری نکلتی تو دو سو کبوتروں کی ٹکڑی اوپر ہوا میں سواری کے ساتھ اڑتی ہوئی جاتی اور جہاں پتا ہر سایہ کیے رہتی۔

کبوتر کو اپنے گھر سے بہت زیادہ اُٹس ہوتا ہے۔ کابک کو ٹھیل پر رکھ کے لیجاتے اور جہاں کہا جانے روک کے اڑاتے اور پھر کابک پر بلا لیتے کمال بھی وہی ہی میں پہلے نظر آچکا تھا۔

لکھنؤ میں کبوتر بازی اس خاندان فرزان روائی کے ابتدائی دور ہی سے شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ نواب شجاع الدولہ کو کبوتروں کا بڑا شوق تھا۔ سید یار علی نام ایک شخص نے جو بریلی کا رہنے والا تھا اپنے آپ کو ایک کامل کبوتر بازی کی حیثیت سے دربار میں پیش کیا اور انکی بڑی قدر کی گئی۔ نواب آصف الدولہ اور نواب سعادت علی خان کو بھی شوق تھا۔ اور غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے زمانے میں تو کبوتر بازی یہاں بہت اعلیٰ درجے پر پہنچ گئی تھی۔ میر عباس نام بیان کے ایک کامل فن کبوتر باز نے یہ کمال دکھایا کہ جو کوئی پانچ روپے نذر کر کے ان کی دعوت کرتا چاہے وہ کمین رہتا ہو کابک لے کے پہنچ جاتے اور اسی کے گھر سے کبوتر اڑا دیتے۔ اڑاتے اور سیٹی پر بلا لیتے۔ مجال کیا کہ کوئی کبوتر کسی اور جگہ گر جائے۔ شوق اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ بعض امیروں کے ہاں صرف نو سو کبوتر بیان ایسا ساتھ اڑتے۔ اور بعض رئیس اتنے ہی یا اس سے زیادہ تعداد میں نہ کبوتر اڑاتے۔

خوست (علاقہ سرحدی افغانستان) سے پشت نام ایک خاص رنگ کے کبوتر آئے تھے۔ جو نہایت قیمتی تھے۔ اکثر رئیس ہزاروں روپیہ صرف کر کے انھیں کو اڑاتے۔

ایک جدت پسند بزرگ نے لکھنؤ میں یہ کمال کیا کہ کبوتر کے دو بچپون کو لے کے ایک کا داہنا اور ایک کا بائیں بازو کاٹ دیا۔ اور کئے ہوئے بازوؤں کی جگہ اُن دونوں میں ٹانگے لگا کے ایک دوہریا کبوتر بنا لیا۔ اور اسی داشت سے پالا کہ وہ بڑے ہوئے اور اڑنے لگے۔ ایسے بہت سے دوہریا کبوتر تیار کیے۔ اکثر معمول تھا کہ جب نصیر الدین حیدر چھتر منزل سے بھرے پر سوار ہو کے پار جاتے اور کوٹھی دلا رام میں بیٹھ کے دریا کی سیر دیکھتے وہ اس پار سے اپنے اُن عجیب الخلق دوہریا کبوتروں کو اڑا دیتے جو پار جا کے بادشاہ کے قریب بیٹھ جاتے۔ باوٹا و اُٹھین دیکھ کے بہت مخطوط ہوتے۔ اور انعام دیتے۔

میرا ان علی نام ایک بزرگ نے یہ کمال پیدا کیا تھا کہ کبوتر کو رنگ کے جیسا چاہتے بنا دیتے۔ اکثر جگہ پر اُکھاٹ کے دوسرے رنگ کا پر اُسی کے سوراخ میں رکھ کے اس طرح جما دیتے کہ وہ اصلی پروں کی طرح جم جاتا۔ اور بہت سے مقامات پر رنگ سے کام لیتے۔ مگر ایسا مضبوط اور سنجہ رنگ کہ مجال کیا جو ذرا پھیکا بھی پڑ جائے۔ بس پھر تک رنگ قائم رہتا۔ مگر جب گریز میں پڑ کر جاتے تو پھر اصلی رنگ نکل آتا۔ اُن کے ان کبوتروں میں سے ہر ایک پندرہ بیس روپے کو لگتا۔ اور امرابڑے شوق سے لیتے۔ وہ یہاں تیبہ بھی بنا لیا کرتے جو لاکھوں میں ایک نکلتا ہے۔ اور رنگ کے حدود اور گلوں کے اعتبار سے بے مثل ہوتا ہے۔

ایک بڑے کبوتر باز ذواب پائے تھے جو گرو باز کبوتروں کو گولوں کی طرح اُڑاتے کمال یہ تھا کہ جس جگہ اد جس مکان پر چاہتے چھپی کے اشارے سے بازی کر دیتے یعنی کبوتر جو امین تلا بازیان کھانے لگتے۔

واجد علی شاہ نے ٹیپا بروج میں بہت سے نئے کبوتر جمع کیے تھے۔ کہتے ہیں کہ ریشم پرے کبوتروں کا جوڑا بچیس ہزار کو لیا تھا۔ اور ایک قسم کے ہنر کبوتر بن کی نسل بڑھائی تھی۔ جب استعمال ہوا ہے تو چوبیس ہزار سے زیادہ کبوتر تھے۔ جن پر سیکڑوں کبوتر باز نوکر تھے۔ اور اُن کے داروغہ غلام عباس کبوتر بازی کے فن میں جواب نہ رکھتے تھے۔

شو قین اور فن دانی نے پالنے کے رنگین کبوتروں میں بھی بے مثل ترقی کی تھی۔

یہ صرف مشہور نہیں ہے بلکہ ایسا شیرازی جو گز بھر کے پتھر سے کی دست کو پھرتے۔ اور ایسا گلی جو ایک بارہ برس کی لڑکی کی چوڑی میں سے نکل جائے میں نے خود اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں۔ (یہ ذکر ابھی ختم نہیں ہوا۔ باقی آئندہ نمبر میں عرض کروں گا)

(۲۰)

ٹیور کو لڑا فرائی اسکے دلچسپی پیدا کرنا اور تفتن کے کمالات دکھانا لکھنؤ کے بیگمروں کا نہایت ہی عام مشغلہ ہو گیا تھا۔ کبوتروں اور میروں کے تیار کرنے اور لڑانے میں انھوں نے اس قدر ترقی کی کہ اب ہندوستان کے جس شہر میں اور جہاں کہیں کسی رئیس کو ان چیزوں کا شوق ہے (اور کینچیت شوق ناما عاقبت اندیش دولتمندوں میں اکثر ہوا کرتا ہے) وہاں استاد لکھنؤ ہی سے بنائے جاتے ہیں اور اس مدد کا سارا کارخانہ انھیں کے زیر اہتمام ہوتا ہے۔

تو سنے

ٹیور لڑانے کے مد سے گزر رہے ہوئے شوق نے اُس میں جتن پیدا کرنا شروع کیں۔ اور بعض شوقیوں کا خیال اس جانب مبذول ہوا کہ جو کام کبوتروں سے لیا جاتا ہے وہ رکن ٹیور سے لیا جاسکتا ہے؟ چنانچہ تیر محمد علی نام ایک بزرگ نے تو تون سے کبوتروں کا کام لینے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

تو تا فطرۂ نہایت ہی بیوفاجا نور ہے۔ زندگی بھر رکھے اور پائے لیکن پتھر سے اڑا تو پھر اُدھر کا رخ نہیں کرتا۔ تو تا چسپی نام ہی بے وفائی کا ہو گیا ہے۔ وہ بولتا ہے۔ باتیں کرتا ہے۔ جانوروں کی پولیاں اڑا لیتا ہے۔ جو فقرے یاد کرنا دیکھے اُن کی رٹ لگاتا ہے۔ مگر اڑانے کے کام کا نہیں۔ اس لیے کہ پتھر سے چھوٹے ہی پھر وہ کسی کے بس کا نہیں ہوتا۔ مگر میر صاحب موصوف نے مذاجانی کس تدبیر سے اُس کی فطرت بدل دی تھی کہ دس بار تو تون کی ٹکڑی اڑاتے۔ اور چال کیا کہ وہ سیٹی بجا کے ”آ“ کرین اور وہ آسمان سے اتر کے سیدھے پتھر میں نہ چلے آئیں۔ وہ ان تو تون کو روز حسین آباد میں لاکے اڑاتے۔

ٹیور رکھنے والے تیار ہونے کا حال بیان کر کے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اہل لکھنؤ نے جتنی محنت ٹیور کی تیار کی ہے کاش خود اپنی اور اپنے جسم کی تیاری میں کرتے

تو یہ انجام ہرگز نہ ہوتا ہو۔

### چنگ بازی

کنکوٹے اڑانے کا شوق کسی نہ کسی حد تک سارے ہندوستان میں ہے۔ اور آج کل عموماً لڑکوں اور فوجیوں کا ہنر ہی دلچسپ کھیل ہے۔ اسکی کثرت اور تقسیم دیکھ کے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ ہندوستان کی بہت پرانی چیز ہوگی۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ فن ایک صدی پیشتر کا بھی شکل سے کما جا سکتا ہے۔ اور اس کا مرکز ترقی لکھنؤ ہی ہے۔

یورپ میں لڑکے ایک قسم کے کپڑے کے کنکوٹے اڑایا کرتے ہیں۔ جن کو جب تک ڈور کپڑے بھاگتے رہو اڑتے ہیں۔ اور ادھر قدم رکھا اور ادھر وہ زمین پر آ رہے۔ ان کی نسبت یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ کب سے ہیں؟ اور کہاں سے لیے گئے؟

سنا جاتا ہے کہ دہلی میں شاہ عالم بادشاہ اول کے عہد میں یہ شوق شروع ہوا۔ ابتداً بعض خاص خاص لوگ چنگ اڑایا کرتے تھے۔ چنگ بڑے اہتمام سے بنایا جاتا تھا۔ اس میں دو ٹکڑے تھوڑے فصل سے آگے پیچھے برابر کھڑی کر کے جوڑوسی جاتیں۔ ٹکڑوں کی شکل یہ ہوتی تھی جس میں تین طرف مدور کونے نکلتے۔ اس میں ایک کپڑا پھیل کے بیچ میں کھڑی لگائی جاتی جو ٹھنڈا کھلاتی اور دو کھپا چین خوب چھیل کے اور نرم کر کے اوپر نیچے لگائی جاتیں جو کانپیں کھلاتیں۔ اوپر کی کانپ کی وضع یوں ہے کہ رہتی اور نیچے کی کانپ کی یوں ہے کہ ان کے درمیان میں ہلکا باریک کاغذ منڈھ دیا جاتا۔ یہ ایک ٹکڑا ہوتی۔ اسی دو ٹکڑوں کو آگے پیچھے رکھ کے اور درمیان میں جا بجا آڑی پھینچان لگا کے جوڑ دیا جاتا۔ اور چاروں طرف سے بھی کاغذ منڈھ کے ایک خاص وضع کی کٹی قدیل بنادی جاتی۔ جس کے اندر ایک کپڑے کا بنا ہوا تیل میں ڈوبا گیند تار میں باندھ کے لٹکا دیا جاتا۔ اور اسے روشن کر کے رات کو لوگ مضبوط سوئی پارشی ڈور پر اڑاتے۔ چنگ کی شان یہ تھی کہ معلوم ہوتا ایک لکڑی کے آسٹون پر اڑ رہی ہے اور غبار سے کے خلاف اڑانے والے کے اختیار میں ہے۔ جب چاہیں اڑائیں

اور جب چاہیں اُتار لیں۔ وہ ہوا میں قائم رہتا۔ کبھی اوندھا ہوتا تو پھر سیدھا ہو جاتا۔

اُسی زمانے میں بعض لوگ اسی وضع سے انسان کا ایک پتلا بنائے اڑاتے بلکہ بعض قابل و ثوق یادگار ان سلف کا بیان ہے کہ سب کے پہلے وہ پتلا ہی دہلی میں ایجاد ہوا تھا۔ پھر اُسی سے ترقی کر کے چنگ ایسا ہوا۔ جس کا طول و عرض برابر ہونے کی وجہ سے اڑانا اور ہوا میں ٹھہرانا زیادہ آسان تھا۔ اس کا شوق زیادہ تر ہندوؤں میں تھا۔ اور کیا عجیب کہ اُنکے وہاں کی قومی و مذہبی چیز ہوا و آس دیا وغیرہ کے خیال سے ماخوذ ہو۔ پھر اُس چنگ کے کاٹنے کے لیے یادوں کو اڑانے کے خیال سے نکل اڑنے لگی۔ جو دراصل آدھا چنگ یا چنگ کی فقط ایک طرف کی دیوار تھی۔ نکل میں خوبی یہ تھی کہ بہ نسبت چنگ کے آسانی سے اڑ سکتی تھی۔ اُس میں چلت پھرت تھی۔ آسمان پر ہوا میں ناجیتی اور دور ہوتی چلی جاتی تھی۔ چنگ ایک جگہ قائم رہتا۔ اور نکل ادھر ادھر چلتی پھرتی تھی۔ اور اُس پر اتنا قابو تھا کہ جب چاہیں اُس کی ڈور سے رگڑا دیے دوسرے چنگ کو کاٹ دیں۔

نکل نے دراصل تبدیل یا روشن پتلا اڑانے کا خیال بھلایا۔ اور لوگوں کو اس جانب متوجہ کیا کہ ہوا میں کوئی ایسی چیز اڑائی جائے جو زیادہ قابو میں ہو۔ ادھر ادھر آسمان پر دوڑے اور قاپے۔ نکل کا شوق سلمان ایسروں کا اور معزز ہندوؤں میں بڑھا۔ اُس پر دولت صرف ہونے لگی۔ اعلیٰ درجے کی نکل کا نام پتنگ مشہور ہوا۔ جس کا ٹھکانہ مرشد آباد سی بانس کا ہوتا۔ جس میں آستی روپے لاگت آتی۔ بیس روپے کی بھل بھل ہوتی۔ دو روپے کا کاغذ لگتا۔ اور پانچ روپے بوائی پڑتی۔ غرض ایک سو سات روپے میں ایک پتنگ تیار ہوتا۔ ہر حال دہلی میں نکل اور پتنگ ہی تک ترقی ہوئی تھی کہ قدردان دربار دہلی سے لکھنؤ میں منتقل ہوا۔ اور اُس کے ساتھ ہی زمانے کے شوقین بھی یہاں پہلے آئے۔ اب پتنگ اڑانے سے پتنگ اڑانے کا شوق نکلا۔ ایسی زوردار تکلیف بنائی جانے لگیں جن کو معمولی قوت کا آدمی مشکل سے سنبھال سکتا۔ آٹھ آٹھ کی

مضبوط ڈور چرخوں پر چڑھائی جاتی۔ اور اُنھیں چرخوں کے ذریعے سے تنکوں کا زور بٹھالا جاتا۔ لڑائی کی یہ شان تھی کہ دو تنکوں کی ڈور ایک دوسری میں ڈال کے دونوں طرف سے ڈھیل دی جاتی۔ دونوں تکلیں چکر گھنی کھاتی ہوئی اوپر چڑھتی اور لیندہوتی چلی جاتیں۔ اور دونوں طرف سے چرخوں پر چڑھنے والی ہوئی رہتیں۔ لکھنؤ کے شوق کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نواب مسلمانوں کی نکل میں پانچ روپے کی معیش کی کھچیل ہوتی جو لوٹ کے لاتا اُسے پانچ روپے دے کے نکل لے لی جاتی۔ اور نہ لاتا تو بھی جان چاہتا کھچیل پانچ روپے کو بیچ لیتا۔

چنگ بازی کے پرانے نامی اُستاد لکھنؤ میں میر عہدو۔ خواجہ جٹن۔ شیخ امداد تھے۔ ایک جولاہے نے بھی اُن دنوں اس فن میں کمال حاصل کیا تھا جسکی وجہ سے امر کی صحبتوں میں اُس کی بڑی قدر ہوتی۔

امجد علی شاہ کے زمانے میں بیک بیک گڈی اسیجا دہوتی جس کی قطع لوزات کی سی ہوتی۔ وہ نکل کی پسند آسانی سے بنتی۔ نکل میں دو کاہنیں اور ایک ٹھڈا ہوتا تھا۔ گڈی میں صرف ایک ہی کانپ اور ایک ہی ٹھڈا رہ گیا۔ واپس علی شاہ کے زمانے میں ڈیڑھ کٹا کنکو ابن گیا۔ جس کی قطع موجودہ کنکوٹے کی تھی مگر نیچے نکل کی یادگار میں کاغذ کا چھوٹا سا ٹھنڈا ہوتا۔ اب نواب محمد حسین خان سالار جنگی۔ آغا ابونواب خان اور دو ایک شوقین رئیسوں نے ٹھنڈے کی جگہ نیچے پتہ لگا کے وہ کنکو اپنا دیا جو فی الحال مروج ہے۔ اور جس میں ابھی تک اور کسی ترقی کی گنجائش نہیں نظر آتی۔ فی الحال سارے ہندوستان میں پتہ دار کنکو آیا پھندے دار کنکو اچھوڑ دیا کہلاتا ہے اُڑتا ہے۔ مگر اس کی آبیاد لکھنؤ ہی میں ہوئی ہے۔ یہیں سے سب جگہ گیا اور مقبول عام ہوا۔

کنکوٹوں کے لڑانے میں بھی پہلے نکل کی طرح ڈھیل کا رواج تھا۔ بڑے بڑے کنکوٹے بنتے اور میروں ڈور پیٹے چلے جاتے۔ آخر شاہی اور آغا زنگریزی کے مشہور اُستاد ولایت علی جو ولایتی کہلاتے۔ انہی بخش ٹھڈے جو میا برج میں جا کے مشہور ہوئے۔ اور لکھنؤ کے سیکڑوں باکمال اُستاد تھے جن کے نام سبھے

اس وقت نہیں یاد آتے۔ مگر سچ یہ ہے کہ لکھنؤ کے پچ لڑانے کے بادشاہ تھے۔ انگریزی کے آغاز میں کھینچ لڑانے کا رواج ہوا۔ اس کا آغاز تو ان چھوٹے لڑکوں سے ہوا جن کے پاس تھوڑی سی ڈور ہوتی۔ اور دوسرے کے لکھنؤ میں پچ ڈال کے اپنی بے باکی سے بے تحاشا کھینچ جاتے اور کاٹ دیتے۔ پڑانے استاد ان دنوں ان لوگوں کو حمارت کی نظر سے دیکھنے اور اپنے لکھنؤ کو ان سے الگ رکھتے۔ مگر آخر کار کھینچ ہی لکھنؤے بازی کا اعلیٰ ترین فن ہو گیا۔ جس میں بڑے بڑے استاد پیدا ہوئے۔ اور آج لکھنؤ میں بیسیوں استاد پڑھتے ہیں جو اسی شوق میں لاکھوں روپے اڑا کر استاد بنے ہیں۔ اور گھر گھر لڑکے اتنی فوقیت حاصل کی ہے کہ لکھنؤ کے میدانوں میں بڑے شوق سے بلاتے اور اس وقت تقسیم کے ہاتھوں سے لے کے آنکھوں پر بٹھائے جاتے ہیں۔

(۲۱)

اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ فن موسیقی کا اور اسکے سلسلے میں ان لوگوں کا جو اس فن سے وابستہ ہیں لکھنؤ میں کیا حال رہا۔ گانا ان چیزوں میں سے ہے جن کو انسان کی فطرت نے سب سے پہلے ایجاد کیا۔ جن الفاظ کے ادا کرنے میں جوش ظاہر کرنے کو جی چاہا لوگ گانے لگے۔ اور جن حرکات و افعال میں جذبات نے اظہار انا چاہا شروع کر دیا۔ اور چونکہ سب زیادہ جوش و متیاز انہی عبادت میں ہوتا ہے اور دنیوی امور میں سب سے زیادہ بے احتیاری کا ناقابل برداشت جوش عشق و محبت کے اظہار میں ہوتا ہے۔ اس لیے گانے کا آغاز بھی ابتداء عبادت و عشق میں ہوا۔ ہندوستان میں گانے کا آغاز قطعا عبادت سے ہوا۔ اس لیے کہ یہاں کے پہلے گوئیے خاص برہمن تھے۔ جو ابتداء عبادت کرتے اور کرتے وقت اپنے مسودوں کی تعریف کے بھن گایا کرتے۔ کھنچا جی کی ولادت سے ان کی محبت اور ان کے عشق کو عبادت بنا کے عاشق موسیقی ایجاد کی

اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں شاعری اور موسیقی دونوں کا اظہار غزل کی زبان سے ہوا اگر تاہم۔ ابتداء برہمن فقط گیت اور شکیلت یعنی سیدھے سا

گائے گا یا کرتے تھے۔ جن میں فن کی ترقیوں کا ذرا بھی شائبہ نہ تھا۔ گریہ کو مصروف یا بیون اور ایرانی محققوں کے مذاق کی آمیزش سے ایک فن کی بنیاد پڑی۔ اور سب سے پہلے سات سرا کیا دہے۔ اس لیے کہ ہر آواز پھیلنے میں ایک حد پر پہنچنے کے بدل جاتی ہے۔ ان تبدیلیوں کا صحیح اندازہ کر کے محققین نے سات سرا ایجاد کیے۔

اس کے بعد ہندوستان میں موسیقی کی تقسیم اس حیثیت سے ہوئی کہ جو راگ عبادت میں گائے جاتے وہ یا تو پرہا (پیدا کرنے والی قوت اُتھی) کی منقبت میں ہوتے یا بٹن (چلانے اور پالنے والی قوت اُتھی) کی تعریف میں ہوتے۔ یا پھر یعنی ہما دیو (مارنے والی قوت اُتھی) کی مدح میں ہوتے۔ اسی لحاظ سے تین قسم کے راگ بن گئے۔ پہلی قسم کے راگوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ برہمنوں نے کسی کو نہ بنائے اور اپنے ساتھ لے کر مر گئے۔ جو راگ تمام مراحل زندگی زچہ خانے۔ شادی۔ اور دنیا بھر کے کاروبار کے متعلق تھے وہ دوسری قسم کے راگ قرار پائے۔ آخری قسم کے راگ بعد الموت کی حالت اور ثواب و عقاب سے وابستہ تھے۔ وہ اکثر مہیب خوف دلائے والے اور دل پر عالم کے فانی ہونے کا اثر ڈالنے والے ہوتے۔ عاشقانہ راگ بھی محض اس لیے کہ عاشق مرگ کا خواہاں ہوتا ہے، اسی قسم میں شامل کر دیے گئے۔ خصوصاً اس لیے کہ کھنڈیا یا سری کرشن جی ہما دیو ہی کا ایک اوتار تھے۔ اس قسم کے راگ عموماً ”بروگ“ کہلاتے۔ اُن کے راگ بھیرون۔ ترس راگ۔ اور راگنیاں بھیروین۔ پدچ۔ کالنگرا۔ سوتہنی سندھ۔ پتکو وغیرہ ہیں۔

اس کے بعد جب برہمنوں کو راجاؤں کے دربار میں اُن کی مدح کے قصائد گانا پڑے تو اُن کے مناسب رعب داب اور سطوت و شوکت کے راگ ایجاد ہوئے۔ جیسے مالکوس۔ درباری۔ شاپانہ (اڈانا) وغیرہ۔

مسلمان اپنے ساتھ اپنا موسیقی لائے تھے۔ اُن کا موسیقی سب کے پہلے ابن مسیح نے مدون و مکمل کیا تھا۔ اُس کے بعد جب عراق میں عباسی دربار قائم ہوا تو غزنی اور فارسی موسیقی سے مل کے ایک نیا اور نہایت مکمل فن غنا ایجاد ہوا



جو ساری دنیا میں پھیل گیا۔ اور وہی آخر میں عجیب موسیقی تھا۔ مسلمان اُسی فن کو ہندوستان میں لائے۔ اور جو گائے اُنکے ساتھ یہاں آئے تھے اُنھیں کی یادگار آج کل قوال ہیں۔ اُن کے آلات طرب سرود۔ چگت۔ ٹھنائی (سینائی) + برکٹ اور رباب ہیں

ہندوستان میں ہر چیز پر مسلمانوں نے اپنا اثر ڈالا۔ تمام علوم و فنون۔ اور معاشرت کی تمام باتوں کو بدل دیا۔ مگر یہاں موسیقی پر بہت کم اثر ڈال سکے جس کی وجہ عموماً یہ خیال کی جاتی ہے کہ خود یہاں کا موسیقی اس قدر باطنی اور اعلیٰ درجے کا تھا کہ اپنی مضبوطی و باقاعدگی کے باعث بیرونی اثر سے متاثر ہی نہ ہو سکا۔ لیکن حقیقت حال اور اُس کا اصلی باعث یہ ہے کہ کسی ملک اور زبان کی موسیقی کی طرف انسان اس وقت توجہ کرتا ہے جب اُس ملک کا باشندہ یں لے اور وہاں کی زبان و معاشرت کا رنگ اُس پر چھ جائے لہذا یہاں اُنکے بعد حملہ آور مسلمان جب تک عربی یا انگریزی رہے یہاں کے موسیقی کی طرف توجہ نہ کی۔ اور جب توجہ کی تو اُس وقت ہندوستانی اُنکے رنگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ اپنے قومی راگون کو بھول چکے تھے۔ اور یہاں کے فنون کے وکدادہ تھے۔ اُس وقت وہ اس قابل ہی نہیں رہے تھے کہ یہاں کے موسیقی میں کسی قسم کا تصرف کرتے یا اُس میں کچھ نکتہ چینی کر سکتے۔

پھر بھی عجیب قوالوں کے فنون نے ہندوستان کے موسیقی پر بھونٹا بہت اثر ڈال ہی دیا۔ چنانچہ اُنکے متعدد راگ ہندی موسیقی میں شامل ہو گئے۔ زنگولہ (جنگلا) زلیفت۔ شامانہ۔ درباری۔ منلع (کھاج) وغیرہ کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ انگریزی راگ ہیں جو ہندوستانی فن غنائ میں شامل ہو گئے ہیں۔

امیر خسرو نے دو فنون کو حاصل کیا۔ اور دونوں کے ملائے کی بہت کچھ کوشش کی۔ کہتے ہیں کہ ستار کو اُنھیں نے ایجاد کیا۔ اور یقیناً بہت سی دھنیں اُن کی ایجاد کی ہوئی ہیں۔ لیکن اس کا پتہ لگانا بہت مشکل ہے کہ امیر خسرو نے یہاں کی موسیقی میں کون کون خاص چیزیں بڑھائیں۔

مسلمانوں میں معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہوں سے پہلے مشائخ صوفیہ نے موسیقی کی

طرت توحید کی۔ اور حال و حال کی جو بھینیں عراق و عجم کے زہا و سلفت میں عبادت کی شان سے قائم تھیں ہندوستان میں بھی قائم ہو گئیں۔ اور جو گویے اس سے شہر تھانوں میں بھیج گایا کرتے تھے۔ مسلمان زہاد و صوفیہ کے حلقے میں بیٹھ کے معرفت کی غزلیں گانے لگے۔

بادشاہوں کے دربار میں بھی یہاں کے گویے اور گانے مانجے والی رنڈیاں موجود رہا کرتیں۔ مگر ان کا افسر اعلیٰ کوئی عجیب گویا ہوا کرتا جو اس کے موسیقی پر اپنا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ڈالتا۔ پھر تعلق کے عہد میں دربار کا سب سے بڑا گویا امیر خس الدین تبریزی تھا اور کل دن و مردار باب نشاط اُس کے زیرِ علم تھے۔ انھیں دنوں دیوگرہ یعنی دولت آباد کے متصل ارباب نشاط کی ایک پوری سستی آباد تھی جو ”طرب آباد“ کہلاتی۔ اُس کے چوڑے بازار کے بیچ بیچ میں ایک برج تھا جس میں روز بعد عصر ارباب نشاط کا چودھری آ کے بیٹھا اور اس کے سامنے تمام گویوں اور رنڈیوں کے طائفے یاری یاری آ کے گاتے۔ ان میں سے اکثر مسلمان تھے اور صوم و صلوة کے پابند۔ اس سستی میں جا بجا مسجدیں تھیں جن میں ماہ مبارک رمضان میں تراویح پڑھی جاتی۔ بڑے بڑے راجہ یہاں آ کے گانا سنتے۔ کئی مسلمان ”ناہداروں“ نے بھی یہاں آ کے گانا سنا تھا۔ اہل طرب کے سرگرو اور چودھری چ نکہ عوام مسلمان تھے اس لیے ظاہر ہے کہ عربی و عجمی اور ہندوستانی فنون غنا کس قدر جلد مل جل گئے ہوں گے۔

ہندو موسیقی کے مرکز شمالی ہند میں تھرا۔ (جو دھیا اور بنارس تھے۔) یہاں مذہبی عنصرِ عظیم ہونے کی وجہ سے موسیقی کا فن ہمیشہ پرورش پاتا رہتا تھا۔ جو پور کے سلاطین شرتقی میں سے سلطان حسین شرتقی کو موسیقی کا شوق بہت تھا۔ وہ خود ایک بڑا گویا تسلیم کیا جاتا۔ اور چونکہ جو دھیا اور بنارس دونوں اس کی فکر و میں تھے اس لیے یقیناً اُس نے ہندوستان کے اس شریعت فن کو بڑا فائدہ پہنچایا ہوگا۔ اکبر نے اس فن کی یہاں تک قدر کی کہ اُس کے عہد کا سب سے بڑا نامور گویا ”ناسیم اُس کے نورتن“ میں شامل ہوا۔ ایک مسلمان شنشاد کی یہ توجہ و عنایت دیکھ کے وہ خود یا اُس کا بیٹا بلاس خان مسلمان ہو گیا۔ اس خاندان میں دربار کی

قدردانی سے ہندی موسیقی کو روز بروز عروج حاصل ہوتا رہا۔ بعد کے درباروں میں اسی نسل کے گویے سرفراز ہوتے رہے۔ چنانچہ آج تک اس خاندان کے لوگ اپنے آپ کو دربار منلیہ ہی سے وابستہ خیال کرتے ہیں۔ عموماً سمجھا جاتا ہے کہ اسی نسل کے ذریعے سے ہندوؤں کا یہ فن مسلمانوں میں آیا۔ مگر جن واقعات کو ہم بیان کر رہے ہیں اُن سے صاف ظاہر ہے کہ اس خاندان سے بہت پہلے مسلمانوں نے اس ہندی کمال کو حاصل کر لیا تھا۔ چنانچہ فی الحال ہندی موسیقی کے تمام بالکمال اور نکل نامی گویے مسلمان ہی ہیں۔

دہلی میں اس فن پر سب سے پہلے شاہجہان بادشاہ کے عہد میں کتاب ”شمس الاموات“ لکھی گئی جو آپ کہیں نہیں ملتی۔ پھر اکبر ثانی کے عہد میں تیر زافا نام ایک بزرگ نے پنڈتوں اور علماء سنکرت کی مدد سے کتاب ”تحفۃ الہند“ تصنیف کی جس کے دو ہی ایک نسخے بعض لوگوں کے پاس رہ گئے ہیں۔ اس میں بہت سے ہندی فنون کو جمع کیا ہے۔ جہاں خوش۔ سرو و معا۔ سادہ رک۔ کوک۔ نالکہ بھید۔ اندر جال وغیرہ مختلف فنون پر بحث کی ہے وہاں ہندی موسیقی کو بھی بتایا ہے۔

دہلی میں اسی حد تک ترقی ہونے پائی تھی کہ یہ دلچسپ فن دربار لکھنؤ میں منتقل ہو آیا۔ اور نواب شجاع الدولہ کی قدردانی و فیاضی نے سارے ہندوستان کے موسیقی دانوں کو اودھ کی سرزمین پر لاکے اکٹھا کر دیا۔ یہاں اچودھیا اور بنارس کے موسیقی کے پرائے اسکول قائم ہی تھے۔ جو پور کے شرفی سلاطین کی قدردانی کی کچھ کچھ یادگارین بھی باقی تھیں۔ اُن میں جب دہلی کے بالکمال گویے اور تانہ سین خان کے مستند اسکول کے استادان موسیقی بھی آکے مل گئے تو خاص شان پیدا ہو گئی۔ اور موسیقی کا دراصل ایک نیا دور شروع ہو گیا۔

شجاع الدولہ کی نسبت مصنف تاریخ فیض آباد لکھتے ہیں کہ ارباب نشاط کا بڑا شوق تھا۔ ہزار ہا گانے والی رنڈیاں عموماً دہلی سے اور دیگر بلاد و دروازوں سے یہاں آکے جمع ہو گئی تھیں۔ عام رواج پڑ گیا تھا کہ نواب وزیر کے علاوہ اور تمام اُمراء و سرداران فوج بھی کسی طرف کوچ کرتے تو ارباب نشاط اور رنڈیوں

کے ٹوہرے اُن کے ساتھ ساتھ جاتے۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ذاب آصف الدولہ ہمارے عہد میں فارسی زبان میں کتاب "اصول الفناات الالمغنیہ" لکھی گئی۔ ہندوستان کے فن موسیقی پر اس سے بہتر کوئی کتاب آج تک تصنیف نہیں ہو سکی۔ اگرچہ اس کتاب کے بھی بہت ہی کم نسخے دستیاب ہوئے ہیں میرے پاس جو دو ہو۔ اور میں نے لکھنا چاہا ہے۔ مصنف خجستہ مغز۔ صاحب علم فضل ہے۔ عربی فارسی اور سبکدست تینوں زبانوں میں پوری دستگاہ رکھنے والا معلوم ہوتا ہے۔ جس نے اس امر میں بڑی کامیابی کو شش کی ہے کہ ہندوستان کی موسیقی کو بہت ہی وضاحت کے ساتھ ہر شخص کے ذہن نشین کر دے۔ اسد اللہ خان گوکب مرحوم جیفون نے چند ہی روز ہوئے انتقال کیا موسیقی کے اعلیٰ درجے کے صاحب علم استاد تھے۔ اور کلکتہ میں ہندوستانی موسیقی کے پروفیسر مشہور تھے۔ وہ اس کتاب کی نسبت مجھے اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "موسیقی کا یہ فارسی رسالہ میرے پاس موجود ہے۔ یہ رسالہ اُن معتبر کتابوں سے جو اس علم کی قدیم مایہ بساط میں مضامین اخذ کر کے بڑی تحقیق اور تدریق سے لکھا گیا ہے۔" افسوس یہ لا جواب کتاب آج تک نہیں چھپی۔ اور اس کے نسخے اس قدر کمیاب ہیں کہ اُس کے فنا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اگر کوئی رئیس توجہ کریں تو ملک اور اپنی قدیم تاریخ پر بڑا احسان کریں۔

یہ رسالہ ہی بتا رہا ہے کہ آصف الدولہ کے عہد کے لکھنؤ میں موسیقی کو کس قدر ترقی ہو گئی تھی۔ اس کا مصنف ایک بڑا محقق معلوم ہوتا ہے جس نے ابن سینا کی کتاب شفا سے لے کر عربی اور فارسی موسیقی کے اصول بھی بھرت بتا دیے ہیں۔ دلگداز کے اس مضمون کی تکمیل کے لیے ہم نے پروفیسر گوکب مرحوم سے مدد مانگی تھی۔ اُنھوں نے جواب میں ہمیں جو کچھ لکھا اُسے ہم مجنبہ شائع کیے دیتے ہیں۔ اس سے بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ لکھنؤ میں آنے کے بعد فن موسیقی کی کیا حالت رہی؟ افسوس اب وہ دنیا میں نہیں ہیں ورنہ ہمیں اُن سے بہت زیادہ مدد ملتی۔ خصوصاً اس لیے کہ اپنی نئی کتاب جو فن موسیقی میں لا جواب ہے وہ ہمارے یہاں چھپوانا چاہتے تھے۔ آصف الدولہ کے عہد کی ترقی موسیقی

تسلیم کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں :-

نواب سعادت علی خان کے زمانے میں موسیقی پر اُس پر گئی۔ قاضی الدین حیدر کے زمانے میں اس فن کا ایک بہت بڑا کامل و اکمل شخص لکھنؤ میں موجود تھا۔ جس کا نام حیدری خان تھا۔ یہ صاحب اپنی وارثت مزاجی کی وجہ سے ”سڑے حیدری خان“ مشہور تھے۔ اور گو کہ گنج میں رہتے تھے۔ قاضی الدین حیدر کو انکا گانا سننے کا بڑا شوق تھا۔ اگر کبھی اس کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایک روز سرسپر کو قاضی الدین حیدر ہوا اور پر سوار دریا کنارے تفریح کو نکلے۔ دروہی دروازے کے نیچے لوگوں نے دیکھا کہ ”سڑے حیدری خان“ سچے جاتے ہیں۔ بادشاہ سے عرض کی کہ قبلہ عالم حیدری خان ہی ہیں۔ بادشاہ کو فوجی اشتیاق تھا ہی حکم دیا کہ ”بلو“ لوگ پکڑ لائے۔ اور سارے کھڑا کر دیا۔ بادشاہ نے کہا ”اُسے میان حیدری خان۔ کبھی نہیں اپنا گانا نہیں سُناتے؟“ بولے ”جی ہاں کیون نہ سُناؤں گا۔ مگر مجھے آپ کا مکان نہیں معلوم ہے۔“ بادشاہ نے اختیار نہیں پڑا اور کہا ”اچھا ہمارے ساتھ چلو۔ ہم خود تمہیں اپنے مکان پر لے چلیں گے۔“ بہت خوب کہ کے بے تکلف ساتھ ہو لیے۔ چھتر منزل کے قریب پہنچے تھے کہ حیدری خان ہتھ پر سے اُکھڑ گئے۔ اور بولے ”میں چلتا تو ہوں مگر پوریان اور بالائی کھلو اپنے گا تو گکاؤں گا۔“ بادشاہ نے وعدہ کیا۔ اور محل میں بیٹھ کے گانا سننے لگے۔ ٹھوڑی ہی دیر میں کے بہت محفوظ ہوئے۔ وجد کا عالم طاری ہوا۔ اور بخود دیتا ہوا ہو گئے۔ یہ حالت دیکھ کے حیدری خان خاموش ہو گئے۔ بادشاہ نے پھر گلے کو کہا تو بولے ”حضور۔ یہ تبا کو جو آپ کے پچوان میں بکھرا ہوا ہے بہت ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ آپ کس کی دکان سے منگواتے ہیں؟“ قاضی الدین حیدر خود بھی آشتیہ مزاج تھے۔ اور سڑی مشہور تھے۔ اس سوال پر منقص ہوئے تو مصاحبون نے عرض کیا ”قبلہ عالم! یہ سڑی تو مٹی ہے۔ ابھی تک ہی نہیں سمجھا ہے کہ کس سے باتیں کر رہا ہوں۔“

اب لوگ بادشاہ کے ایسے حیدری خان کو دوسرے کمرے میں لے گئے۔ پوریان بالائی کھلوائی۔ حقہ پلویا۔ آپ نے پاؤ بھر پوریان آدھ پاؤ بالائی

اور ایک پیسے کی شکر منگو کے اپنی بی بی کو بھیجوائی (جو ان کا ہر جگہ معمول تھا) جب تک ان کا مون مین رہے بادشاہ نے بادہ ناب کے جام پیے۔ اور جب نشے کا زور ہوا تو پھر حیدری خان کی یاد ہوئی۔ فوراً گلو کے گانے کا حکم دیا مگر جیسے ہی انھوں نے اپنا نغمہ شروع کیا روک کے کہا "حیدری خان نشے ہو اگر مجھے خالی خوش کیا اور لایا تبین تو یاد رکھو کہ گوستی مین ڈیو ادون گا۔" اب تو حیدری خان کی عقل چکر مین آئی۔ سمجھے کہ یہ بادشاہ ہیں۔ کہا "حضور امڈ مالک ہے۔" اور جی توڑ کے گانے لگے۔ خدا کی قدرت۔ یا یہ کہیے کہ حیدری خان کی زندگی تھی کہ تقوڑی ہی دیر مین بادشاہ پر اثر ہوا۔ بے اختیار روئے لگے۔ اور خوش ہوئے کہا "حیدری خان۔ مانگ کیا مانگتا ہے؟" عرض کیا "جو مانگوں گا دیجیے گا؟" بادشاہ نے وعدہ کیا۔ اور حیدری خان نے بین وقتہ قبولہ کے کہا "حضور یہ مانگتا ہوں کہ مجھے پھر کبھی نہ بلوائیے گا اور نہ گانا سنائیے گا۔" بادشاہ نے تعجب سے پوچھا "کیوں؟" عرض کیا "آپ کا کیا ہے؟" مجھے مروا ڈالیے گا۔ پھر مجھ سا حیدری خان نہ پیدا ہوگا۔ اور آپ مرجائیں گے تو فوراً دوسرا بادشاہ ہو جائے گا۔" اس جواب پر غازی الدین حیدر نے ناراض ہو کے منہ پھیر لیا۔ یہ موقع پاتے ہی حیدری خان اپنی جان لے کے بھاگے اور اپنے گھر آئے۔

غرض غازی الدین حیدر کے زمانے مین ہی ایک باکمال موسیقی دان لکھنؤ مین تھا۔ نصیر الدین حیدر کے زمانے مین یون تو ہزاروں گانے والے تھے مگر اس پائے کا گویا کوئی نہ تھا۔ محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ کے زمانے ثقافت آبادی کے عہد تھے۔ اس لیے کہ محمد علی شاہ مین پیرانہ سالی کی بے حسی تھی اور امجد علی شاہ بغیر شباب قیلہ و کعبہ سے پوچھے کوئی کام نہ کرتے تھے۔ لہذا ان کے زمانے مین بعض شو قین و رساے شہر اگر ریاب نشاط کے قدر دان بھی تھے تو چھپ چھپ کر گانا سنتے۔ اس لیے اب اس فن کی جو کچھ قدر ہوئی و امجد علی شاہ کی عہد شباب کی تحت نشینی مین ہوئی۔ جبکہ لکھنؤ کا ساغر عین چھلکنے کو تھا۔ اور گل ہونے والا چراغ آخری مرتبہ بھڑک کے روشن ہوا تھا۔

(۲۲)

اگرچہ ہم نصیر الدین حیدر اور بعد والے فرمان روا یان عہد کے موسیقی کے بارے میں کچھ اور بھی بیان کرنا چاہتے ہیں مگر اس سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسد اللہ خان کو کب مرحوم کے خط کا باقیانہ حصہ بھی اپنے ناظرین کو مسدا دین جس سے لکھنؤ کی موسیقی پر ایک سنسنہ ماہر فن کی رے معلوم ہو جائے گی۔

وہ تحریر فرماتے ہیں "واجد علی شاہ کے عہد میں لکھنؤ میں بالکالان موسیقی کا گرو و کثیر جمع ہو گیا تھا۔ لیکن دربار کے رسوخ یا قہ اور صاحب خطاب گوئیے کا طہین فن نہ تھے۔ صرف ایک قلعہ الدولہ رامپور کے رہنے والے البتہ ستار خوب بجانے تھے۔ اور اپنے فن میں اچھے تھے۔ انیس الدولہ۔ معاحب الدولہ۔ وحید الدولہ اور رتھی الدولہ اگرچہ گوئیے تھے مگر ایسے بالکال نہ تھے۔ فقط عنایت شاہی سے دولہ ہو گئے تھے۔ کالین فن میں یہ لوگ تھے۔ پیار خان۔ جعفر خان۔ حیدر خان۔ باسط خان۔ یہ سب لوگ میان تان سین کے خاندان کی یادگار تھے۔ اس خاندان کے دو نامی شخص آج کل بھی موجود ہیں۔ ایک وزیر خان جو ریاست رامپور میں ہیں۔ دوسرے محمد علی خان جو ریاست پرستھامین طانم ہیں۔ محمد علی خان کے والد باسط خان تھے جن کا نام اُد پر آچکا ہے۔"

اس موقع پر گوگب خان مرحوم بتاتے ہیں کہ میرے والد مرحوم نعمت اللہ خان نے باسط خان ہی سے علم موسیقی حاصل کیا تھا۔ نعمت اللہ خان تقریباً گیارہ سال تک میا برنج میں وواجد علی شاہ کے ساتھ رہے۔ پھر اُس کے بعد تیس برس تک دربار نیپال میں رہے۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں :- وواجد علی شاہ کے عہد میں موسیقی کا خوب چرچا رہا۔ لیکن علم موسیقی اپنے بلند پائے سے گر کے چھوٹی چھوٹی چیزوں پر آ گیا تھا۔ لکھنؤ میں کہہ رہے تھے میاں تصنیف کر کر کے عوام میں پھیلاؤ میں۔ اور موسیقی کو جس حد تک دیا چنانچہ انثر شیدایان موسیقی اعلیٰ درجہ کی راگ راگنیوں کو چھوڑ کے کہہ رہے تھے میاں پسند کرنے لگے۔ موسیقی کے مذاق میں تنزل محمد شاہ رنگیلے ہی کے عہد سے شروع ہو گیا تھا۔ جب میان سارنگ نے خیال کو تصنیف کیا جس سے فن موسیقی اصولاً انہیں

ہو گیا۔ مگر اس سے بدرجہا زیادہ خرابی کدھر کی ٹھہریوں سے پیدا ہو گئی۔ اور اب عوام دروہوں کی یہ حالت تھی کہ اعلیٰ قسم کی موسیقی کو اگر سنتے بھی تھے تو دلچسپی و شوق سے نہیں۔ بلکہ ناپسند کرتے تھے۔

واجد علی شاہ کے مصاحب گو قون مین سے انیس الدولہ اور مصاحب الدولہ نے موسیقی کو پیا رخان سے حاصل کیا تھا جو بہت بڑا مصاحب کمال اُستاد تھا۔ اور جو کچھ اُس نے ان دونوں شاگردوں کو بتایا وہ بیشک اعلیٰ پیمانے پر تھا لیکن اس کا کیا علاج کہ دربار میں ایسے موسیقی کی قدر ہی نہ تھی۔ جس جو قیصر باغ میں ہوتا تھا جس میں واجد علی شاہ خود کھیتا بنے تھے بہت ہی ہندو درجے کا موسیقی تھا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ رغبت نہ ہونے پر بھی اہل کمال کی دباؤ شاہی میں پڑی قدر ہوتی تھی۔ جس کی اصلی وجہ یہ تھی کہ واجد علی شاہ نے بھی باسط خان سے فن موسیقی حاصل کیا تھا۔ اور فن میں پوری بصیرت رکھتے تھے۔ اپنی عالی دماغی کی وجہ سے بادشاہ نے اپنے طرز میں نئی راگنیاں تصنیف کیں جن کے نام اپنی طبیعت داری سے جوگی کنڑ۔ جوہی۔ شاہ پسند وغیرہ رکھے واجد علی شاہ کو اس فن میں اساتذہ کا درجہ حاصل تھا۔ مصاحب کمال تھے۔ لیکن اس الزام سے نہیں بچ سکتے کہ اُن کے عامیانہ مذاق نے لکھنؤ میں موسیقی کو سبک دیا۔ ہم فہم بنا دیا۔ زمانے کا یہ رنگ دیکھ کے نفیس طبیعتیں رکھنے والے گو یون نے بھی راگ راگنیوں کی مشکلات کو ترک کر کے چھوٹی چھوٹی سادھی دلکش اور عام فہم چیزوں پر موسیقی کو قائم کیا۔ عوام میں غزل ٹھہری کا چرچا ہو گیا۔ اور دھڑ دھڑ و ہوری وغیرہ جو نہایت ثقیل اور مشکل چیزیں ہیں اُن کی طرف مطلق توجہ نہ کی گئی۔ کلتاج جھنجھوٹی۔ بھیروین۔ سیندور۔ تاک کا مو۔ تپلو وغیرہ چھوٹی چھوٹی مزہ دار راگنیاں اہل مذاق کے فاضل کے لیے منتخب کی گئیں۔ اور یہی چیزیں بادشاہ کو بالطبع مرغوب تھیں۔ یہ راگنیاں لکھنؤ کی قدردان سوسائٹی کے مذاق میں جان تک سرایت کر گئیں کہ آج سارے ہندوستان میں لکھنؤ کے سفیدے خرید و زون کی طرح لکھنؤ کی بھیروین بھی شہور ہو گئی۔ اور سچ یہ ہے کہ بھیروین لکھنؤ ہی کا حصہ ہے ایسی بھیروین ہندوستان کے کسی حصے میں نہیں گائی جاتی۔



سوز خوانوں نے بھی انھیں عام پسند و عام فہم راگنیوں کو زیادہ رواج دیا جو مذہب کی سفارش سے گھر کی بیٹھنے والی عورتوں تک کے گلے میں اُتر گئیں۔ یہاں تک کہ ان کی فوج خوانی سُن کے بڑے بڑے بالکمال گویتے نقش حیرت بن جاتے ہیں۔ سوز خوانوں میں سے اکثر پتیا رخاں اور حیدر خان کے شاگرد تھے۔

”سُے“ ایک اہم جزو موسیقی ہے۔ جس کو عرف میں ٹائم یا وقت کہنا زیادہ موزون ہے۔ اُس کا مادہ واجد علی شاہ میں بہت زیادہ تھا۔ جسے قدرت کی دین کہنا چاہیے۔ اور یوں سُے کا مادہ کم و بیش ہر شخص میں ضرور موجود ہوتا ہے۔ شعرا نے جو اوزان مقرر کیے ہیں وہ بھی ”سُے“ ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ علم عروض دراصل مکمل سُے ہے۔ ارکانِ تال کے اجزاء ہیں۔ یہ بدیہی امر ہے کہ جس شخص میں فطرۃً سُے کا مادہ بہت بڑھا ہوا ہوگا اُس کے ہر عضو اور رُبُن موسے حرکت پے اختیار ہو رہی ہوگی پیدا ہو جائے گی۔ اور نے پر عضو عضو پھرنے لگے گا۔ عوام کی نظر میں یہ حرکت بے وقعت اور مہمل معلوم ہوتی ہے۔ لیکن وہ شخص جس سے سرزد ہوتی ہے مجبور ہے۔ وہ دانستہ اُس فعل کو نہیں کرتا بلکہ اعضا خود بخود سُے پر حرکت کرنے لگتے ہیں۔ واجد علی شاہ کے اسی فعل کو لوگ کہتے ہیں کہ وہ ناچتے تھے۔ حالانکہ وہ ناچتے نہ تھے بلکہ سُے داری میں محو ہو کے اُنکے اعضا سے ایسے حرکات سرزد ہونے لگتے تھے۔ جو لوگ اصول موسیقی سے ناواقف ہیں کہنے لگے بادشاہ ناچتے ہیں۔ دراصل واجد علی شاہ کبھی اور کسی زمانے میں نہیں ناچے اُن کا ناچنا بس یہی تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ سُے داری میں کوئی اعلیٰ درجے کا کامل فن گو یا بھی بادشاہ کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ میں نے اُنکی محبت کے بہتر گویوں سے سنا ہے کہ بادشاہ کے پانوں کا انگوٹھا سوتے میں بھی لے ہی بہر چلتا تھا۔

نرت جس کو بھاؤ بتانا کہتے ہیں یہ فن بھی علم موسیقی کا ایک خاص جز ہے۔ نرت کا مقصد یہ ہے کہ مافی الضمیر حرکات اور اشاروں سے ارکایا جائے جس کو انگریزی میں ٹوشن کہتے ہیں۔ موٹن بڑے بڑے جید اسپیکروں اور لکچراروں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن انھیں کوئی بہت ملاست نہیں بناتا۔ گرجا پر سے واجد علی شاہ

محض اپنی لئے داری کی وجہ سے بدنام کیے جاتے ہیں۔  
 یہ ہے جو لکھنؤ کی موسیقی اور واجد علی شاہ کے شعل کو کتب مرحوم کی تحریر سے معلوم  
 ہوا۔ اس سے صاف پتہ چل سکتا ہے کہ لکھنؤ نے چاہے اعلیٰ درجے کے موسیقی کو  
 رواج نہ دیا ہو مگر اسکے سدھارنے اور عام پسند بنانے کا یہ فہر کتنا بڑا زبردست  
 اسکول قرار پا گیا تھا۔

غازی الدین حیدر ہی کے زمانے میں یہاں اعلیٰ درجے کے قوالوں کی شہرت  
 تھی۔ چچو خان اور غلام رسول خان استاد فن مانے جاتے تھے۔ شورہی اتنا بڑا  
 زبردست موجد فن تھا کہ بچے کا موجد وہی مانا گیا ہے۔ بخشو اور ستاری اُن  
 دونوں طلبہ بچانے کے استاد مانے جاتے تھے۔ اور اُن کے مقابل کسی کو طلبہ چھوٹے  
 کی جرات نہ ہوتی تھی۔

اس آخر زمانے میں صادق علی خان سارے ہندوستان میں استاد بے بدل  
 مانے جاتے تھے۔ چھوٹے اور بڑے سنے خان کے گانے میں ایسا مزہ اور لطف  
 تھا کہ باوجود کامل فن ہونے کے تاوقت عوام کو بھی اپنے نغمے پر فریفتہ کر لیتے۔  
 مٹیا برج میں جو ڈھاڑی واجد علی شاہ کے دربار میں ملازم تھے اُن سب کو  
 میں نے خود سنا تھا۔ احمد خان۔ تاج خان اور غلام حسین خان اُس وقت کے  
 زبردست صاحب کمال مانے جاتے۔ دُتی خان جس نے سارے کلکتہ میں اپنی  
 دھوم مچا رکھی تھی اور اپنے سحر آفرین گلے سے ہر ادنیٰ و اعلیٰ کو فریفتہ کر لیا کرتا۔  
 لکھنؤ ہی کا تھا۔ اور لکھنؤ ہی کے اسکول موسیقی کا تعلیم یافتہ تھا۔ مرد گویوں کے  
 علاوہ لکھنؤ میں بعض رنڈیوں نے وہ کمال حاصل کیا کہ بڑے بڑے ڈھاڑی اُنکے  
 سامنے کان پکڑتے تھے۔ زہرہ و شیری جو شاعرہ بھی تھیں گانے میں اپنا جواب  
 نہ رکھتی تھیں۔ چوڑے والی حیدر کو وانا موری حاصل ہوئی کہ اُس کے گلے سے  
 سوز سننے کے لیے لوگ محرم کے انتظار میں دن گنا کرتے۔ اور محرم میں باہر کے سیکڑوں  
 ہزاروں شوقین لکھنؤ میں آکے حیدر کے امام باڑے میں گھنٹوں اُسیدوار بیٹھنے  
 رہتے کہ کب بی حیدر اپنا نغمہ غم شروع کریں گی۔

طلبہ بچانے میں آخری عہد کا کامل محمد جی تھا جس کی سارے ہندوستان میں

شہرت تھی۔ تفریبا تیس سال کا زمانہ ہوا۔ مجھے چوک میں ایک مسلمان مرہٹہ ملا جو کوٹ پتلون پہنے تھا اور کسی معزز خدمت پر مامور تھا۔ مجھ سے مل کے اُس نے کہا کہ ”میں لکھنؤ میں صرف اس شوق میں آیا ہوں کہ یہاں کے بالکالان موسیقی کا کمال دیکھوں۔“ میں نے پوچھا ”آپ کون ہیں؟“ کہا ”میں خاندانی گویا ہوں اور میرے باپ دادا سیوا جی کے دربار کے گویے تھے۔ اگرچہ اب انگریزی تعلیم پانے کے بعد نوکری کر لی ہے مگر اپنے خاندانی فن کو بھی جانتا ہوں۔“ اتفاقاً اُس وقت ایک اور صاحب آگے جو لکھنؤ کی مشہور گائے والی ”محمدی“ کے وہاں آتے جلتے تھے بولے ”چلیے آپ میرے ساتھ چلیے۔“ وہ مرہٹے صاحب مجھے بھی اپنے ساتھ لکھنؤ لے گئے۔ اور ہم سب محمدی کے وہاں پہنچے۔ اتفاقاً وہاں صادق علی خان بھی موجود تھے۔ اور سب نے اپنا کمال دکھایا۔ خود وہ مرہٹہ بھی گایا۔ اسکے بعد سب جو دھراؤن کے وہاں گئے جو گھر یہاں صاحبان فن کا سب سے بڑا کلب سمجھا جاتا ہے۔ وہاں دونوں نے خان بولے گئے۔ اُنھوں نے گاکے اپنا کمال دکھایا۔ آخر میں اُس مرہٹے نے کہا ”مجھے تو صرف اتنی تمنا یہاں لانی ہے کہ میں ایک ترانہ گائوں اور محمد جی میرے ساتھ طبلہ بجاوے۔ فوراً محمد جی بولنے لگے۔ اور مرہٹے مسلمان کے گائے اور محمد جی کے بجائے میں کل حاضرین کو بڑا مزہ آیا۔ سب عیش و عشرت کر گئے۔ اور آخر میں اُس مرہٹے نے قبول کر لیا کہ ”میں سب جگہ گیا ہوں مگر محمد جی سے زیادہ بالکال طبلہ نواز آج تک آنکھ سے نہیں دیکھا تھا۔“ لکھنؤ میں موسیقی کو اس قدر عروج ہو گیا تھا کہ بجلاؤ اور شہروں کے اُمرا اور دولتمندوں کے یہاں کے امرا ذوق صحیح رکھتے ہیں۔ سمجھتے ہیں۔ دُشمنوں راگوں اور راگینوں کو پہچانتے ہیں۔ اور وہی ایک تانپن سُن کے سمجھ جاتے ہیں کہ یہ گویا کس پائے کا ہے۔ معمولی گانے والا یہاں کی محبتوں میں فروغ نہیں پاسکتا۔ بازاری لوگ اور عموماً لڑکے جو شرکون اور گزرگاہوں میں گاتے پھرتے ہیں۔ وہ بھی مختلف چیزوں کو ایسے سچے سُرُون میں دہا کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے۔ راگنی اور لے گلے میں اُتری ہوئی ہے۔ اکثر شہروں میں لوگ کثرت سے ایسے ملین گے جو شہروں کو موزوں نہیں پڑھ سکتے۔ بجلاؤ اسکے یہاں

آپ کو ایسا جاہل ڈھونڈھے نہ لے گا جو اشعار کو موزون نہ پڑھ سکتا ہو۔ دلیل ہے اس بات کی کہ سنے داری وہاں کے بچے بچے کے رگ و پے میں سراپت کر گئی ہے۔ بعض اوقات کسی بازاری لڑکے کو بھیڑیں۔ سوہنی۔ بہاگ۔ یا کسی اور دھن میں ایسی خوبی سے گاتے سنا گیا ہے کہ سنے والے محو ہو گئے۔ اور بڑے بڑے گویوں کو دُن پر حسد آنے لگا۔

موسیقی کے سلسلے میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم سازوں اور آلاتِ موسیقی کا بھی حال بیان کر دیں۔

موسیقی میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ سُراورے۔ ان دونوں چیزوں میں بگڑنا گانے کا ناقابلِ عفو عیب ہے۔ لہذا ان دونوں کی نگہداشت کے لیے دو ہی سازوں کی ضرورت ہوتی۔ چنانچہ فی الحال سُراپر رہنے کی مدد کے لیے سازاگئی اورے پر قائم رہنے کی ضرورت سے فلکد کام میں لائے جاتے ہیں۔

سُروں کی مدد کے لیے ہندوستان کا پُرانا ساز بھین تھی۔ جس میں ایک بھوت چوبلی تلی کے دونوں سروں پر دو تونیاں لگائی جاتیں۔ اور اُس پر ساؤن سُروں کے ساتھ تار کھینچے جاتے۔ جن کا نغمہ تلی کے اندر سے دونوں جانب دوڑنے کے

دونوں تونوں میں گونجتا۔ مسلمان اپنے ساتھ رباب۔ چنگ اور سرود لائے۔ رباب غالباً عربی یا جاتھا جس سے عباسیہ کے دور میں بہت ترقی کی تھی۔ چنگ اور سرود عجیبی طرح تھے۔ ان میں سے چنگ بہت ہی پُرانا ساز ہے جس کا سرخ اسیر یا۔ یا بل۔ مصر۔ یونان اور روم عرض تمام اگلی قوموں میں لگتا ہے۔ سرود خالص فارسی یا جاتھا۔ جس کو عباسی دور کے مغنیوں نے اختیار کر کے بہت

ترقی دی۔ ہندوستان میں آنے کے بعد جب ہندوؤں اور مسلمانوں کے نمونہ میں میل جول ہوا تو پہلے طنبورہ ایجاد ہوا جو دراصل بین کا اختصار اور صرف سُروں کے قائم رکھنے کا کام دیتا تھا۔ اور تہا بجائے کی چیز نہ تھا۔ چند روز بعد ابیر خسرو نے ساز ایجاد کیا جو دراصل بین اور طنبورہ دونوں میں ایک آسان اور عام پسند نصرت تھا۔ لیکن بین یا طنبورہ یا ساز رگے کا پورا ساتھ کوئی مددے سکتا تھا۔ یہ کمی دیکھ کر محمد شاہ رشیدی کے دربار کے زبردست و نامور مثنوی میان سازنگ نے

سارنگی ایجاد کی جو انھیں کی طرف منسوب ہے۔ سارنگی نے بین طنبورے اور سار  
سب کو پیچھے ڈال دیا۔ اور رقص و سرود کی محفلوں میں ابھار سوخ ماحصل کیا  
کہ ان اگلے سازوں کے بجائے والے بھی فنا ہو گئے۔ انھیں پُرانے سازوں میں  
یہاں ایک قانون بھی تھا جسے یقیناً سلمان شام و عراق سے اپنے ساتھ لائے تھے۔  
اسکے بجائے والے بھی اب کہیں شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔ غرض عیش و طرب کی  
محفلوں سے سارنگی نے ان سب کو نکال دیا۔ اور ان قدیم سازوں کی یہ شان رہ گئی  
کہ اعلیٰ درجے کے اُستاد گویتوں میں کبھی کبھی کوئی ایک فنیا نظر آ جاتا ہے جسے بین یا سرود۔  
رباب یا قانون کے بجائے بین کمال حاصل ہوتا ہے۔ ستارہ تو جوانوں کے نقشِ طبع کے  
پلے رہ گیا۔ جسے وہ بغیر گانے کے بجاتے اور سنتے ہیں۔ اور کبھی اُس کے ساتھ  
کوئی گانے بھی لگتا ہے۔

اب رہا طبلہ۔ یہ اگرچہ نے کے لیے بہت ہی لازمی چیز ہے مگر اس قسم کی کسی چیز  
کا پتہ دیگر ملک کی پُرانی قوموں میں نہ تھا۔ لڑائی میں قبل جنگ بیجا۔ نوبت میں  
نفاذہ بجا یا جاتا۔ مگر ناچ گانے کے ساتھ سواہندوستان کے اور کہیں اس قسم کی  
کوئی چیز اگلے زمانے میں نہ تھی۔ سوادت کے جو عربوں میں تھی۔ اور گانے کے  
ساتھ بجائی جاتی تھی۔ یہاں بھی گانے کے ساتھ سب سے پہلے وقت کا رواج معلوم  
ہوتا ہے۔ جو بین کے ساتھ بجتی اور نے کے قائم رکھنے میں مدد دیتی۔ اس کے بعد  
قدیم الایام ہی میں مردانگ نکلی جو غالباً تہری کشن جی کے زمانے میں موجود تھی  
اور ان کی بانسری کے نغے کے ساتھ مردانگ کی لگ بھی جہاں کنا رہے برج کے جنگل  
میں سُنی جاتی تھی۔ مردانگ کے بعد ترقی یہ ہوئی کہ کچھ راج بنی جو اعلیٰ موسیقی کا  
خوب ساتھ دے سکتی تھی۔ اب اسکے بعد سے عام لوگوں میں اور گھر کی بیٹھنے والی  
عورتوں میں ڈھول کا رواج ہوا جو مردانگ اور کچھ راج سے نکل کے عام پسند  
ہو گئی۔ اور خاص بالکمان موسیقی کی اعلیٰ محفلوں کے لیے طبلہ ایجاد ہوا جس میں  
کچھ راج کے دو دفون رُخ دو جدا سازوں میں تقسیم ہو کے دیتا اور بایان کے نام  
سے مشہور ہوئے۔ طبلہ یقیناً مسلمانوں کے آنے کے بعد کی ایجاد ہے۔ اگرچہ بین بنین معلوم کہ  
نے داری کے ان سازوں میں مذکورہ ترقیان کب اور کس کے ہاتھ سے ہوئیں۔

(۲۳)

موسیقی کے ساتھ ناچ نے بھی ایک ممتاز فن کی حیثیت سے لکھنؤ میں بہت نمایاں ترقی کی۔ رقص ہر قوم میں تھا۔ اور قدیم سے قدیم زمانے میں تھا۔ فرعون مصر کے سامنے بالکی ریلی عورتیں کھڑی ہو کے سائے کے ساتھ ناچا کرتی تھیں۔ حضرت مسیح کے عہد میں بیتلہ دینے والے یوحنا کا سر ہر وہاں ناچ ہی کے کوٹایا تھا۔ مگر ہندوستان میں بہت صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ گانے کی طرح ناچنا بھی عبادت میں داخل تھا۔ اور یہاں فن رقص کی پرورش ہمیشہ مذہب ہی کے آغوش میں ہوئی۔ چنانچہ اس فن کے جانتے اور کرتے والے خاص بہمن تھے۔ اور ان کا مرکز یا تو آجودھیا اور بنارس کے کھٹک تھے یا شہر اور برج کے دس دھاری۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان کے تمام قدیم مندروں میں اگرچہ سیکڑوں ہزاروں عورتیں دیوتاؤں کی صورتوں کے سامنے روز بھر کیا کرتی تھیں۔ اور جہاں بڑے معبد تھے وہاں قدیم سے قدیم زمانے میں تپچے والیوں کا ایک بڑا بھاری گروہ بھی موجود رہا کرتا تھا مگر تپچے کی استاد ہی ہمیشہ مردوں میں رہی اور وہی جوان عورتوں کو اس کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

ناچنا دراصل حرکات جسمانی کے باقاعدہ بنانے کا نام ہے۔ حرکات کی اس باقاعدگی کو اگر بہت سے اشخاص کے حرکات کے موافق کیا جائے اور موزوں بنائے سے تعلق ہو تو وہ ڈریل یا فوجی قواعد ہے۔ یا یورپ کے میوزک ہالوں کا وہ ناچ ہے جو "بیلڈ" کہلاتا ہے۔ اور اب اکثر ہندوستان کے ٹھیٹھروں میں نظر آ رہا یا کرتا ہے۔ اور اگر وہ حرکات کی باقاعدگی موسیقی کی ملے اور آواز کے نشیب و فراز کے موافق بنانے سے علاقہ رکھے تو وہ رقص ہے۔ ہندوستان کا اصلی خالص رقص یہی ہے کہ جسم کے حرکات و سکنات گیتوں اور شعروں کے زیر و بم کے مطابق اور مناسب بنایا جائے۔ یہ اصلی ناچ ہے جو ہندوستان میں ایک بہت بڑا وسیع فن بن گیا۔ اس کی سیکڑوں گیتیں اور بیٹیاں رتوں سے اور ٹکڑے ایجاد ہو گئے۔ اس کے بعد رقص میں جذبات و خیالات کا اشاروں اور حرکتوں سے ادا کرنا بھی شامل کر لیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کبھی گانا ناچنے کی شرح

جن جاتا ہے۔ پھر جب خوبصورت عورتوں کا ناچنا لوگوں کو نظر کا زیادہ پسند آیا تو مشوقانہ ناز و انداز دکھانا۔ اور نزاکت و نازنینی کی اداؤں کا ظاہر کرنا بھی اس کا جز بن گیا۔ لکھنؤ کے اسکول نے انھیں امور کا لحاظ کر کے زمانے اور مردانے طائفوں میں امتیاز پیدا کر دیا۔ نزاکت کے ساتھ بتانا۔ مشوقانہ ناز و انداز دکھانا۔ اور ہر حرکت میں مشوقیت و نازنینی کا لحاظ رکھنا ناچنے والی عورتوں کے ساتھ مخصوص رہا جو بعض وقت اگر بے مزہ ہو تو ناظرین کی طبیعتوں کو سست اور سست کر دیتا ہے۔ اس کے مقابل حرکات کوئے کے مناسب بنانے میں چلت پھرت دکھانا اور شاعرانہ دلکشی سے اظہار جذبات کرنا۔ مردانے طائفوں کے لیے خاص ہو گیا۔ اگرچہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے فن کا ایک مناسب حد تک ضرور لحاظ رکھتے ہیں مگر یہ امتیاز نمایان طور پر قائم ہے۔

یہ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ اودھ اور لکھنؤ میں ارباب نشاط اور نچرا کر توالی زبڈیوں کے طائفوں کا آ آ کر جمع ہونا نواب شجاع الدولہ ہی کے زمانے میں انتہائی درجے کو پہنچ گیا تھا۔ اُنکے علاوہ اچودھیا اور بنارس کے کھٹک جوہین یا قریب ہی موجود تھے قدر دانی دیکھ کے دربار کے مرکز کی طرف کھینچے لگے۔ اور دونوں کے سیل جول سے قس کا فن نمایان ترقی کرتے کرتے یہاں خاص شان پیدا کرنے لگا۔

مرد ناچنے والوں کے یہاں دو گروہ ہیں۔ ایک مند و کھٹک اور دوسرے ہاری۔ اور دوسرے مسلمان کشمیری بھانڈ۔ مگر اصلی ناچنے والے کھٹیک ہیں۔ اور کشمیری طائفوں نے معلوم ہوتا ہے اپنی نقالی کے کمالات میں جان ڈالنے کے لیے اپنے گروہ میں ایک ناچنے والا نو عمر لڑکا بڑھا لیا۔ جو بال بڑھا کے عورتوں کا سا جوڑا بانہا ہے۔ اور نہایت ہی پھرتیلے پن سے ناچ کے اپنی چلت پھرت سے محفل میں زندہ دلی اور تانگی پیدا کر دیتا ہے۔

ہندو کھٹیکوں میں سے کوئی نہ کوئی با کمال ہر زمانے میں یہاں موجود رہا۔ یہ لوگ اپنے فن کا بانی ہمارا دیوی۔ پاربتی جی۔ اور کٹھیا جی کو بتاتے ہیں۔ شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے عہد میں خوشی ہمارا ج ناچنے کا بڑا زبردست استاد تھا۔ نواب

سعادت علی خان - قاضی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے دور میں تہاں جی پرگاش جی اور دیا لوجی مشہور ناچنے والے تھے۔ محمد علی شاہ کے زمانے سے و آجہ علی شاہ کے عہد فرمان روائی تک پرگاش جی کے بیٹوں درگاہ پرشاد اور ٹھا کر پرشاد کے ناچ کی شہرت رہی۔ درگاہ پرشاد کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ناچ میں و آجہ علی شاہ کا استاد تھا۔ اُس کے بعد درگاہ پرشاد کے بیٹوں کا لکا اور بندہ دین کی شہرت ہوئی۔ اور قریب قریب تمام لوگوں نے مان لیا کہ سارے ہندوستان میں ناچنے کا ان دونوں سے زیادہ صاحب کمال استاد کوئی نہیں ہے۔ پُرانے استاد کو کسی خاص بات میں نو د حاصل کرتے تھے۔ مگر ان دونوں بھائیوں خصوص بندہ دین نے ناچ کے تمام فنون میں کمال دکھا کے اپنے آپ کو ہر حیثیت سے استاد بے بدل ثابت کر دیا۔ اور آج کل کے اکثر مشہور ناچنے والے انہیں دونوں بھائیوں کے شاگرد ہیں۔ اور ان کا گھر ہندوستان بھر کا سب سے بڑا رقص کا اسکول ہے۔

لکا ٹھا تھوڑا زمانہ ہوا کہ مر گیا۔ اور سچ یہ ہے کہ اُس کے مرنے سے بندہ دین کے ناچ کا مزہ اُٹھ گیا۔ بندہ دین کی عمر سو قوت ۷۷ سال کی ہے۔ اور اب بھی ناچ کے شائق اُس کا تجربہ دیکھنے کو اپنی زندگی کی ایک یادگار مسرت تصور کرتے ہیں۔ اُس کا گت پرنا چٹا۔ رقص کے استادانہ ٹوڑے اور ٹکڑے اصلی صورت میں دکھانا۔ گھونگھرو بجانے میں یہ اختیار اور قدرت ظاہر کرنا کہ بے گھونگھرو چاہے بجانے۔ اور اُس کے بعد ہر ہر لفظ اور ہر ہر چیز کو بتانا ایسی چیزیں ہیں جن کا بندہ دین ہی پر خاتمہ ہے۔ وہ ایک ایک چیز کو سو سو ادائوں - وضعوں - نزاکتوں اور و لفریب اشاروں سے بتاتا ہے۔ اور اُس میں ایسی نازک خیالی اور حدت طرازی ہوتی ہے کہ دیکھنے والا جانتا نہ ہو تو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ معمول تھا کہ بندہ دین بتاتا اور کا لکا پاس کھڑے ہو کے اُس کی تشریح کرتا جاتا۔ اُس کی تشریح ہی سے لوگوں کو پتہ چلتا کہ بندہ دین اپنے فن میں کیسا کمال دکھا رہا ہے۔ ناچ میں اُس کے پانچوں اس نزاکت سے زمین پر پڑتے ہیں کہ مشہور ہے بعض اوقات وہ تلوار کی باڑھ پرنا چٹا اور بجال کیا جو تلوسے میں چرکا آیا ہو۔



(۲۴)

مرد اپنے والدین کا دوسرا گروہ بھائی ہیں۔ ان کے بھروسے کی شان یہ ہے کہ ایک نوخیز و خوش دودھ کا جس کے بال عورتوں کی طرح لمبے ہوتے ہیں رنگین اور ذرق برق کپڑے پہن کے اور پائوں میں گھونگر و بانڈھ کے ناچتا گاتا ہے۔ اُس کے ساتھ کا سارے میں ڈوبا ہوا اور دونوں کو اُٹھارنے والا ہوتا ہے۔ اُس کے ناچ میں غیر معمولی چلت پھرت اور شوخی و چالاکی ہوتی ہے۔ اور اُس کا گانا بھی اسی رنگ اور مذاق کے مناسب ہوتا ہے۔ ساتھ سجانے والوں کے علاوہ سات آٹھ یا اس سے زیادہ بھائی رہتے ہیں جو اُس کے ناچ گانے پر واہ واہ کے نعرے بلند کرتے۔ تاثر ہو ہو کے تال دیتے۔ اور اکثر خلافت تہذیب بے اعتدالوں سے اُس کے حرکات و سکنات اور اُس کی آوازوں پر ہنساتے والے رہا رک کرتے رہتے ہیں۔ اور جہاں وہ اُن کا ٹھوڑی دیر کا چکا وہ سامنے آ کے نقلین کرتے اور بذلہ سنجی و نقالی کا کمال دکھاتے ہیں۔

لکھنؤ میں ان لوگوں کے دو گروہ ہیں۔ ایک کشمیری جو کشمیر سے آئے ہیں۔ اور دوسرے خاص بیان کے جن کا پیشہ ابتدائے کچھ اور تھا۔ مگر اب نقالی اُن کا خاص فن ہو گیا ہے۔

نقالی اور خصوصاً رقص و سرود کے ساتھ نقالی ہندوستان کا بہت ہی پرانا فن تھا۔ جو راجہ بکرماجیت کے دربار میں یعنی حضرت مسیح سے بھی پہلے بہت ترقی پر تھا۔ مگر اس وقت اُس میں اعلیٰ درجے کے ڈراما دکھائے جاتے۔ اور یہ ہے کہ وہ بہت ہی ہندو و شالیستہ نقالی تھی۔ ہندوستان کی ادنیٰ قوموں کی تفریبوں میں آج تک معمول ہے کہ جب وہ لوگ خود ہی ناچتے گاتے ہیں تو اُنھیں کے ساتھ مضحک نقلین بھی کرتے ہیں۔

مسلمانوں کے زمانے میں دولت مغلیہ سے پہلے بھائیوں اور نقالوں کا پتہ نہیں لگتا۔ ممکن ہے کہ ہوں اور اُس دور کے واقعات نگاروں نے ان کو قابلِ لحاظ نہ خیال کیا ہو۔ مگر دولت مغلیہ کے زمانے میں بھائیوں نے خاص نمود حاصل کر لی تھی۔ اُن کا پتہ اور رنگ زیب عالمگیر کے بعد سے ملتا ہے جب امرا

وسلاطین دہلی کو ملک گیری و ملک داری کی زحماتوں سے چھٹی مل گئی تھی۔ اور صرف دربار داری و عیش پرستی کو اپنا آبائی حق تصور کرنے لگے تھے۔ مگر دراصل ان بھانڈوں نے یہاں کی سوسائٹی میں عجیب عجیب کام کیے۔ یہی یہاں کے نیشنل سٹائز ہیں۔ اور انھوں نے قریب قریب وہی کام کیے جو انگلستان میں ایکٹیو اور پاسیو نے کیے تھے۔ دہلی کا سب سے پہلا بھانڈا کرنا مشہور ہے۔ جو محمد شاہ کے عہد میں تھا۔ کسی بات پر ناراض ہوئے محمد شاہ نے حکم دیا کہ بھانڈوں کو ہمارے ملک سے نکال دو۔ دوسرے دن بادشاہ کی سواری نکلی تو اوپر سے ڈھول بجتے اور بھانڈوں کے گانے کی آواز آئی۔ تعجب سے سر اٹھا کے دیکھا تو کرنا بھانڈا اور چند بھانڈا ایک کچھو کے درخت پر چڑھے ہوئے ڈھول بجا بجا کے گارہے تھے۔ سواری رکوائے پوچھا "یہ کیا گستاخی ہے؟ اور ہمارے حکم کی تعمیل کیوں نہ ہوئی؟" عرض کیا "قبیلہ عالم۔ ساری دنیا تو جہان پناہ کے زیر نگین ہے جائیں تو کہاں اس لیے عالم بالا کا ارادہ کیا۔ اور یہ پہلی منزل ہے۔" اس جواب پر بادشاہ اور جملہ مصاحبین ہنس پڑے۔ اور ان کا قصور معاف کیا گیا۔

لکھنؤ میں آنے کے بعد ان لوگوں کی کچھ ایسی قدر ہوئی کہ ان طاغوتوں کا اصلی مرکز لکھنؤ ہی قرار پا گیا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے فی الحال دہلی میں بھانڈے نہیں ہیں۔ اور ہوں تو بہت ہی کم اور گننا مہین۔ ہاں بریلی میں پرانے زمانے سے بھانڈوں کے طائفے موجود ہیں۔ اور اکثر لکھنؤ کے ڈوم ڈھارنی بھی بریلی سے آئے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خواتین روٹیاں کھنڈ بھی موسیقی اور رباب نشاط کے قدردان تھے۔ جن کی فیاضی سے بریلی و مراد آباد میں ان لوگوں کا نشوونما اچھی طرح ہوا۔ اور وہاں سے بھی صاحب کمال ڈھارنی اور نقال لکھنؤ میں آئے۔ اگرچہ اب ان کا اصلی مرکز لکھنؤ ہی بنایا ہوا ہے۔

ان کے لطیفے۔ نوک جھونک کے فقرے۔ اور نقالی کے عجیب کمالات لکھنؤ میں مشہور ہیں۔ فواب سعادت علی خان کے اشارے سے اس وقت کے سب سے بڑے بانگے کے سامنے جو چوٹ کھڑا ہوا فقرہ ایک بھانڈے نے کہا تھا اس سے پہلے ہم اپنے ناظرین کو سنا چکے ہیں۔ اُسی زمانے کا ایک یہ واقعہ بھی یادگار رہے کہ

کسی رئیس نے انعام میں دو شالہ دیا۔ گروہ دو شالہ بوسیدہ اور پرانا تھا۔ ایک نقل نے ہاتھ میں لے کے اُسے غور سے دیکھنا شروع کیا۔ اور اُس پر بہت ہی گہری نظریں جمادین۔ دوسرے نے پوچھا ”دیکھتے کیا ہو؟“ کہا ”دیکھتا یہ ہوں کہ اس پر کچھ لکھا ہوا ہے۔“ پوچھا ”آخر کیا لکھا ہے؟“ تنیک نکال کے لگائی۔ اور ایک ایک کے بڑی مشکوں سے پڑھا ”لا الہ الا اللہ“ پوچھا ”بس اتنا ہی؟ محمد رسول اللہ نہیں لکھا؟“ جواب دیا ”محمد رسول اللہ کیسے لکھا ہو۔ یہ تو ہمارے حضرت سے پہلے کا ہے۔“

لکھنؤ کے ایک ذواب صاحب ”گرٹھیا“ والے ذواب ”مشہور تھے۔ اس لیے کہ ان کے مکان کے قریب ایک گرٹھیا تھی۔ اُنھیں کے وہاں کسی تقریب میں محض تین سو روپے تھے۔ ایک بھانڈ بکھرایا ہوا نکل کے سامنے آیا اور سب ساتھیوں سے کہا ”اٹھو اٹھو تعظیم کرو۔“ سب نے کہا ”کس کی تعظیم کریں؟ کوئی ہے بھی؟“ بولا ”ذواب صاحب آتے ہیں۔“ اور یہ کہ کے ایک ہانڈی جو کھولی تو ایک بڑا سا منڈک اُچھل کے بیچ محفل میں بیٹھ گیا۔ اور سب سے کہنا شروع کیا ”جلدی اٹھو جلدی اٹھو۔“ ساتھیوں نے حیران ہو کے پوچھا ”آخر کس کے لیے اُٹھیں؟“ کہا ”تم نے بچا نا نہیں۔ آپ گرٹھیا کے ذواب ہیں۔“

اُن لوگوں کی نسبت مشہور تھا کہ جب کے وہاں جا کے ناچتے اُس کی نقل منرو کرتے اور ممکن نہ تھا کہ اُس پر چوٹ نہ کریں۔ اور سچ یہ ہے کہ جیسی جیسی خوبصورتی سے ان لوگوں نے اُمر اور دوسا کو سبق دیے ہیں اور اُن کی لغزشوں پر اُنھیں متنبہ کیا ہے اور کسی طرح ممکن ہی نہ تھا۔ اسی طرح نقالی میں جس کی نقل کرتے اُسکا ایسا مکمل ہر وہ پبھرتے اور ایسا سچا کیرکیر دکھاتے کہ لوگ عیش کر جاتے۔ آج کل انگریزوں کی صحبت میں جس طرح بابوز انگلش ”کامفیکر اڑا کر تا ہے اُن دنوں کا پتھوں کی فارسی آمیز اردو کا مضحکہ اڑا کر تا تھا۔ اُنکی نقل اور دیوان جی کا کیرکیر ایسا اعلیٰ درجے کا یہ بھانڈ دکھایا کرتے تھے کہ لوگ عو حیرت ہو جاتے یہاں دوسرا کر لیا بھانڈ نصیر الدین حیدر کے زمانے تک موجود تھا۔ اُسکے بعد سجن تانم۔ داتم۔ رحیمی۔ نوشاہ۔ بی بی قدر وغیرہ کی شہرت ہوئی۔ علی نقی خان مع

اپنی بی بی کے جن کا بہت کچھ دُور دور اٹھا قائم کی سبیل دیکھنے کو آئے جسے وہ  
 خوب سجتا اور شربت پلایا کرتا تھا۔ ان معزز زائرون کو دیکھتے ہی قائم سامنے  
 آگیا اور ہاتھ جوڑ کے کہا ”خدا نواب صاحب کو سلامت اور یکم صاحب کو قائم  
 رکھے!“ اتنا سخت فقرہ تھا مگر نواب اور یکم دونوں کو انعام ہی دیتے تھے۔  
 قائم کا کمال یہ تھا کہ ایک مرتبہ ساڑھے تین گھنٹے تک فقط طرح طرح کے منہ  
 بناتا رہا۔

آخر زمانے میں فضل حسین - کھلونا - بادشاہ پسند - کیا خوب کے طائفے بہت  
 مشہور تھے۔ اب بھی علی جان غنیمت ہے۔ یہ اُن طاقتوں کے ناچنے والوں کے  
 نام ہیں جنہوں نے رقص میں بڑی ناموری حاصل کی تھی۔ اور جو اب نہ  
 رکھتے تھے۔

مگر لکھنؤ کی سوسائٹی پر ان سب لوگوں سے زیادہ اثر ڈومنیوں کا پڑ گیا تھا۔  
 تمام قصبات اور کل شہروں میں شادیوں میں گانے والی میراٹھیں اور جاتھنیں  
 مدت ہائے دراز سے ہوتی آئی ہیں۔ جن کی وضع ڈھالیوں کی طرح ہمیشہ کیان ہی  
 مگر ڈومنیوں نے لکھنؤ میں عجیب نمایاں ترقی کی۔ ڈھول کو چھوڑ کے اُنھوں نے  
 رنڈیوں اور مردانے طاقتوں کی طرح طلبہ سارنگی اور مجیرے اختیار کیے۔ صرف  
 گانے کی حد سے ترقی کر کے ناچنا شروع کیا۔ اور اسی پر کھایت نہ کی بلکہ بھارت  
 کی طرح زمانائی محفلوں میں تعین بھی کرتے لگین۔ شادی کی تمام رسموں کا وہ  
 سب سے بڑا عنصر بن گئیں۔ اور دو تہہ گھراؤن کی بلیوں کو ایسا گرویدہ کر لیا  
 کہ کوئی محل اور کوئی ڈیوڑھی نہ تھی جس میں ڈومنیوں کا کوئی طاقت نہ نوکر ہو۔  
 اُن میں سے اکثر گانے اور ناچنے میں پیش ہوتی تھیں۔ اور ایسے فور کے گلے پاتے  
 تھے کہ زمانائی محفلین مردانہ محفلوں سے زیادہ شاندار اور حد درجہ دلکش و لطیف

ہو گئیں۔ خصوصاً محفلوں میں اُنکی شوخیان اور جدت طرازیان ایسی دلچسپ  
 ہوتی تھیں کہ مردوں کو اکثر تنہا رہتی تھی کہ کسی طرح ڈومنیوں کا مجرا دیکھنے کا  
 موقع ملے۔ اس لیے کہ ڈومنیان مردانہ صحبتوں میں گانا ناچنا کسی طرح گوارا  
 نہ کرتی تھیں۔ اب بھی ڈومنیان کثرت سے موجود ہیں۔ اور اسی شان و وضع

پربین۔ مگر کمال اٹھ گیا۔ جیسی جیسی نامی نے دار اور گلے باز ڈومنیان لکھنؤ میں  
گذر گئیں ویسے گویے بھی کہیں نہ پیدا ہوئے ہوں گے۔

(۲۵)

ناچنے کی استاد سی اگرچہ مردوں ہی میں مخصوص ہے مگر علی العموم جس سمت  
اور تقسیم کے ساتھ گانے والی رنڈیوں نے اس فن کو ترقی دی مردوں سے ممکن نہیں۔  
ناچنے کو عورتوں کے ساتھ خصوصیت اور روز و رات بھی زیادہ ہے یہ چیز ایک حد تک  
ہندوستان کے ہر شہر میں نظر آئے گی۔ مگر جیسی باکمال ناچنے اور پٹانے والی رنڈیاں  
لکھنؤ میں پیدا ہوئیں شاید کسی شہر میں نہ ہوئی ہوگی۔ آج سے چالیس سال پیشتر  
لکھنؤ کی ایک مشہور رنڈی "منعم" والی گوہر نے نکلتے ہیں جا کے نمود حاصل کی تھی میں  
نے ایک محفل میں اُس کا یہ رنگ دیکھا کہ کامل ترین گھٹنے تک ایک ہی چیز کو ایسی  
خوبی سے بتاتی رہی کہ حاضرین محفل دھن میں میا بوج کے تمام باکمال ڈھماڑی اور  
معزز لوگ موجود تھے) اول سے آخر تک محو حیرت و سکوت تھے۔ اور کوئی بچہ بھی  
نہ تھا جو ہمہ تن غرق نہ ہو۔ زہیرہ و شہری شاعرہ اور صاحب کمال گانہ و لیلیان  
ہی نہیں بے نظیر رقاصہ بھی تھیں۔ جتن نے ایک مدت تک زمانے کو اپنے  
رقص و سرود کا گرویدہ رکھا ہے۔

یہاں کی رنڈیاں عموماً تین قوموں کی تھیں۔ اول پنجاب جو اصلی رنڈیاں  
تھیں اور اُن کا پیشہ علی العموم محنت فروشی تھا۔ دہلی اور پنجاب ان کے اصلی سک  
تھے۔ جہاں سے اُنکی آمد شجاع الدولہ ہی کے زمانے سے شروع ہو گئی۔ شہر کی  
نامی رنڈیاں اکثر اسی قوم کی ہیں۔ دوسرے چوڑے والیاں۔ اُن کا اصلی کام  
چونا بچپا تھا مگر بعد کو بازاری عورتوں کے گروہ میں شامل ہو گئیں۔ اور آخر  
میں انھوں نے بڑی نمود حاصل کی۔ چوڑے والی حید جس کے گلے کا شہرہ تھا  
اور سمجھا جاتا تھا کہ اُس کا سا گلا کسی نے پایا ہی نہیں اسی قوم کی تھی۔ اور اپنی  
برادری کی رنڈیوں کا بڑا گروہ رکھتی تھی۔ تیسری ناگر لیلیان۔ یہ تینوں وہ  
شاہان بازار ہیں جنھوں نے اپنے گروہ قائم کر لیے ہیں اور برادری رکھتی ہیں۔  
دریہ بہت سی اور قومیں بھی آوارگی میں پڑنے کے بعد اسی گروہ میں

شامل ہو جاتی ہیں۔

گوپون اور ناپچے والوں کے بعد یہاں اسی نوعیت کا ایک اور گروہ بھی ہے جس کا نشوونما لکھنؤ میں بہت ہوا۔ اور اُسے لکھنؤ کے ساتھ مخصوص کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ وہ رتس والے ہیں۔ رتس خاص مقتر اور پرج کا فن ہے وہین کے رتس وھاریون نے آ آ کے لکھنؤ کو اُس کا شوق دلایا۔

واجد علی شاہ کو جب رتس پسند آیا تو اُنھوں نے اپنے مذاق اور اپنے خیالی پلاٹ کا ایک نیا رتس تیار کیا۔ اُسکو دیکھتے ہی رعایا میں اس بات کا خاص شوق پیدا ہوا کہ عاشقانہ قصے جو اُن دفون پریون کے حسن و عشق سے زیادہ وابستہ تھے علی صورت میں دکھائے جائیں۔ پبلک کا یہ رجحان دیکھ کے مینان امانت نے جو رعایت لفظی میں کمال رکھنے والے ایک مشہور شاعر تھے اپنی اندر سمجھا تصنیف کی۔ جس میں ہندوؤں کی دیو مالا میں مسلافون کے فارسی مذاق کی آمیزش کا پہلا نمونہ نظر آیا۔

یہ اندر سمجھا جیسے ہی شہر میں دکھائی گئی ہر شخص والد و شیدا ہو گیا۔ یکا یک بیسیوں سمجھائیں شہر میں قائم ہو گئیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اُن کا اس قدر رواج ہوا کہ گوپون اور ناپچے والی زڈپون کا بازار چند روز کے لیے سرد پڑ گیا۔ اب امانت کے سوا اور بہت لوگوں نے نئی سمجھائیں بنا کر شروع کیں۔ جن میں اردو شاعری چاہے گڑبڑتی ہو مگر زبان سنجی اور پورب کی دیہاتی اور ہندو اہل حرفہ کی آبادی میں سرایت کرتی جاتی تھی۔ اس مذاق نے ڈراما اور تھیٹر کی مضبوط بنیاد ڈال دی تھی۔ اور اگر چند روز اور شاہی کا دور رہتا تو بہت اچھے اصول پر خالص ہندوستانی نامک ایک خاص صورت پیدا کر لیتا جو بالکل اچھوتی اور ہندوستانی مذاق میں ڈوبی ہوتی۔

مگر یکا یک ہندو سوسائٹی کو جس میں پرانی موسیقی گھر گھر چلی تھی ان کھیلوں میں ابتذال نظر آیا۔ فن موسیقی کے شوق نے شرفا کو پھر گوپون اور بھر کر نوالے طائفوں کی طرف متوجہ کر دیا۔ اور یہ چیزیں جو نامک کی شان رکھتی تھیں عوام الناس اور بازاری لوگوں ہی تک محدود رہ گئیں۔ مگر اگلے ذوق نے شہر میں

اُس مذاق کو علمی صورت میں دکھانے والا ایک خاص گروہ پیدا کر دیا جن کو آج کل کی اصطلاح میں ایکٹر کہا جاتے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ ہمارے یہ ایکٹر پہلے تو مہذب سوسائٹی کی قدردانی سے زبان اردو میں ترقی کرتے جاتے تھے۔ مگر چونکہ اُن کا شمار ادنیٰ درجے کے بازاری لوگوں میں رہ گیا ہے ایسے وہ مہذب زبان چھوٹ گئی۔ بازاری زبان میں آج کل بھی یہ لوگ بیسیوں طرح کے پرفارمنس دکھاتے ہیں۔

ہمارے ان ایکٹروں کے مبتدل ہو جانے کا سب سے بڑا سبب یہ ہو کہ ہمیں کے پارسیوں نے انگریزی مذاق کے تھیٹر کھڑے کیے۔ جن میں سچ یہ ہے کہ نہ فن موسیقی ہی تھا اور نہ صحیح ایکٹ۔ مگر اُن کی صفائی۔ ترتیب۔ طلسم نائی۔ اور اُنکے ذوق برق پردوں نے ہمارے قومی ڈراما کا جو ایک بچے کی طرح کمبوز گوارے میں تھا گلا گھونٹ دیا۔ اعلیٰ سوسائٹی کے لوگ ناٹکوں کی شان داری پر فریفتہ ہو کے صحیح مذاق کو بھول گئے۔

سچ یہ ہے کہ ہمیں کے تھیٹر دن نے ہندوستان کو بلحاظ فنونِ قص و سرود کے مجید نقصان پہونچا دیا۔ سب سے پہلے موسیقی کو تباہ کیا۔ اور اسی وضع کے بے اصول فنون کو اختیار کر کے بازاروں میں پھیلا دیا جن سے زیادہ مہل کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد اُس نے ہمارے رقص کو جو بہت ہی اعلیٰ درجے کا فن تھا مٹانا چاہا۔ اور اپنے اسٹیج پر ناچ کے نام سے یورپ کے ڈورل کو رواج دیا۔ جس میں چند لڑکے اپنی ترتیب اور وضع بدل کے دلچسپی پیدا کر لیتے ہیں۔ لیکن رہس والوں کا موسیقی اور ایکٹ اگرچہ دونوں ناقص ہیں مگر وطنی رنگ میں ڈوبے ہیں اور قومی مذاق رکھتے ہیں۔ اُن کے چھوڑنے کی باتیں بلکہ اُن کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

(۲۶)

موسیقی ہی کے سلسلے میں سوز خوانی کے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ اس نے مذہبی فن کو گانے بجانے کے خلاف شرع فنون میں داخل کرنا بے ادبی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ سوز خوانی ایک خاص قسم کی موسیقی ہی ہے۔ محرم میں

شہادت سبط مہر علیہ السلام کی یاد تازہ کرنا ہندوستان میں خاص شیعوں سے شروع ہوا۔ خصوصاً اس وقت سے جبکہ مذہب اثنا عشری ایران کا قومی مذہب بنا اور وہاں کے لوگ آہ کے ہندوستانی دربار میں رسوخ حاصل کرنے لگے۔ تاہم دہلی میں چونکہ تاجداروں اور شاہی خاندان کا مذہب سنت و جماعت تھا اس لیے وہ خاص چیزیں جو شیعوں کے مذہبی معاشرت کے ساتھ مخصوص تھیں وہاں نشو و نما نہ پاسکیں۔ اس لیے اُن فنون کی پرورش کا گہوارہ شہر لکھنؤ اور اُس کا گلا شیعہ دربار قرار پایا گیا۔

جس طرح مذہبی سرگرمی نے شاعری میں مرثیہ گوئی اور تحت اللفظ خوانی کو پیدا کیا اُسی طرح موسیقی میں سوز خوانی پیدا کر دی۔ پھر ان دونوں فنون کو یہاں تک ترقی دی کہ مستقل فن بن گئے۔ اور ایسے فن جو ابتدا سے انتہا تک لکھنؤ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ تحت اللفظ خوانی مرثیوں کا تہانت اور جملے کے ساتھ اس طرح پڑھنا اور بتانا کہ سنانا ہے جس طرح شاعر مشاعرے میں اپنی غزل سنانا ہے۔ اور سوز خوانی اُن کو پڑھنا اور گدازنے کے ساتھ سنانا ہے

اصلی اور پرانی مرثیہ خوانی سوز خوانی ہی تھی۔ یعنی مرثیہ مجلسوں میں ہمیشہ نغمے کے ساتھ سنانے جاتے تھے۔ اور اُن کا رواج دہلی ہی نہیں ہندوستان کے اُن تمام شہروں میں تھا جن میں حضرات شیعہ آباد تھے۔ مدراس اور دکن تک میں زور و شور سے اُس قسم کی مرثیہ خوانی ہوتی تھی۔ اور ڈیڑھ دو سو برس کے تصنیف کیے ہوئے نغمے آج تک موجود ہیں۔ مرثیوں کو شاعروں کی شعر خوانی کہتے ہیں اور اگر تا خاص لکھنؤ کی ایجا وہ ہے۔ اور اس میں میرانیس اور مرزا جبر وغیرہ نے جو کمالات دکھائے اُن کا ذکر ہم شاعری کے سلسلے میں کر چکے ہیں۔

سوز خوانی اگرچہ پہلے سے تھی اور ہر جگہ تھی مگر اُس میں بھی لکھنؤ کے سوز خوانوں نے ایسے ایسے کمال دکھائے کہ اس فن کو بھی اپنے ساتھ مخصوص کر لیا۔ سارے ہندوستان کی اگلی سوز خوانی کا اندازہ اس مثل سے ہو سکتا ہے کہ ”بگڑا گویا مرثیہ دان“ لکھنؤ نے سوز خوانی کا پایہ اس قدر بلند کر دیا کہ صاحب کمال گو یوں کا ذرا بھی سوز خوانوں کے آگے سر نہ پڑ گیا۔



لکھنؤ میں سوز خان و دیگر اہل فن کی طرح نواب شجاع الدولہ کے ساتھ یا ان کے عہد میں آئے۔ تاریخ فیض آباد میں لکھا ہے کہ شجاع الدولہ کی بیوی ہو بیگم صاحبہ کے محل میں جلسین ہوتیں۔ اور جو اہر علی خان خواجہ سراجو ان کی ڈیوڑھی اور سارے علاقے کا مختار تھا مرثیہ خوانوں کی ذمہ داری سنا کرتا۔ مگر اس وقت تک یہاں کی سوز خوانی وہی تھی جو ہر جگہ عام تھی۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ خواجہ حسن سودودی سے یہ فن شروع ہوا۔ وہ مصنف نعمات الاسفہ کے استاد تھے اور باوجود عطائی ہونے کے فن موسیقی میں ایسا کمال رکھتے تھے کہ دور دور تک کہیں ان کا جواب نہ تھا۔ اگرچہ سخی المذہب تھے مگر انھوں نے موسیقی کی خاص خاص دھنیں سوزون میں قائم کر کے اپنے شاگردوں کو بتائیں اور اس فن کے باضابطہ و باقاعدہ بننے کی بنیاد پڑ گئی۔ اسکے بعد جب بڑے حیدری خان کا زمانہ آیا تو ان کا ممول تھا کہ محرم میں اپنے مذاق کی مناسب دھنوں میں ذمہ داری کیا کرتے۔ چونکہ وہ بہت بڑے صاحب کمال گویے تھے۔ اور دربار قدردان تھا اس کوشش میں ان کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور پتہ لگ گیا کہ اگر ترقی دی جائے تو یہ فن جداگانہ طور پر ایک خاص اور ممتاز نشان پیدا کر سکتا ہے۔ موسیقی کی ہزار ہا دھنوں میں سے وہ دھنیں منتخب کی گئیں جو اظہار حسن و طلال اور مین کے لیے مناسب ہوں۔ اور وہ صد ہا سوزون میں قائم کی گئیں۔ آخر میں حیدری خان نے اپنی سوز خوانی سید میر علی صاحب کو سکھادی جو ایک شریف اہل سید زادے تھے۔ اور انھوں نے مذہبی جوش و ہمت اس فن کو بہت زیادہ ترقی دی۔ اور اپنے زمانے میں اتنے بڑے صاحب کمال مشہور ہوئے کہ نواب سعادت علی کے عہد میں انھوں نے کسی بات پر بوجہم ہو کے لکھنؤ سے چلے جانے کا ارادہ کیا تو انشاء اللہ خان نے اپنے موثر شاعرانہ انداز اور تسخر کی شان سے سفارش کی۔ اور نواب نے دلہی و قدروانی کے ساتھ انھیں روکا۔

اس کے بعد تاشین کے خاندان کا ایک گویا ناصر خان لکھنؤ میں آیا اور شجاع الدولہ کی سوز خوانی کی طرف لوگوں کا توجہ دیکھا تو اس نے بھی اپنے موسیقی کے کمال

کو فوج خوانی میں شرف کر کے مقبولیت و شہرت حاصل کی۔ اور آپ بڑے پیر کی ایک مفلس و بیوہ سیدانی پر ترس کھا کے اُن کے دو بچوں میر علی حسن اور میر بندہ حسن کو سوز خوانی کی تعلیم دی۔ ان دونوں کا کمال تمام ماسبق استادوں سے بڑھ گیا۔ اور سوز خوانی میں بے حدیل و نظیر ثابت ہوئے۔ اُنھوں نے سوز خوانی کو اعلیٰ درجے کا راگ بنادیا ہے۔ یہاں تک کہ موسیقی کے اصلی راگوں کے بول تو اکثر گویوں تک کو یاد نہیں مگر ایسے سوز اکثر سوز خوانوں کو یاد نہیں جو راگوں کے بول ہیں جن کو سُن کے حقیقی راگ اور سچی دھنیں متاثر ہو کر پتھر کی جاسکتی ہیں۔

انھیں بزرگوں کی وجہ سے لکھنؤ میں سوز خوانی کا فن گویوں سے نکل کے شرفا میں آ گیا۔ اور کثرت سے ایسے لوگ پیدا ہوئے گئے جو ڈوم ڈھار میں شریف و وضع ہیں۔ مگر سوز خوانی میں ایسا کمال رکھتے ہیں کہ گویوں کا انداز اُن کے سامنے سرد پڑ گیا ہے۔

فی الحال مخبوج صاحب اور دو ایک اور بزرگ سوز خوانی میں ایسا کمال اور ایسی شہرت رکھتے ہیں کہ ہندوستان بھر میں ہر جگہ اُن کے استقبال میں شوق کی آنکھیں بھجائی جاتی ہیں۔ اور دیگر بلاد کے لوگوں کی قدردانی ماہِ محرم اور عزاداری کے خاص ایام میں ہمیشہ اُنھیں شایقین لکھنؤ کے ہاتھ سے چھین لیا کرتی ہے۔ سب سے زیادہ اثر اس مذاق نے لکھنؤ کی عورتوں پر ڈالا۔ سوزوں کی موسیقی اور دل کو پاش پاش کر دینے والی دھنیں میر علی حسن اور میر بندہ حسن کے عہد موسیقی میں اُن کے کمال کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مرہٹوں کی دست بردگ زماں میں وہ میاں میں سوار لکھنؤ سے اٹاؤے کی طرف جارہے تھے۔ راستے میں کئی گاؤں میں گزرا اور سنا گیا کہ اُس گاؤں پر مرہٹے تاخت کرتے والے ہیں۔ کہا روئے جو بہت دور سے اُنھیں لیے چلے آتے تھے یکا یک میاں نہ رکھ دیا اور کہا ہم میں اب آگے چلنے کی طاقت نہیں ہے۔ ہزار کہا گیا کہ یہ مقام خطرناک ہے مگر اُنھوں نے ایک نہ سنی۔ خواجہ صاحب نے زندگی سے مایوس ہو کے وضو کیا اور عصر کی نماز پڑھی اور بیٹھے بیٹھے کچھ الٹا پٹا شروع کیا اور اُس کا کہا روئے پر اس قدر اثر پڑا کہ تازہ دم ہو گئے اور امن کی جگہ پہنچا دیا۔

گذشتہ لکھنؤ

کے مند با شریف مردوں کے گلے میں آئین اور ان کے ذریعے ہزار ہا شریف شیعہ خاندانوں کی عورتوں کے فیر کے گلون میں آتر گئیں۔ عورتوں کو فطرہ گانے بجاتے کا زیادہ شوق ہوتا ہے۔ اور ان کے گلے نمون کے لیے عموماً زیادہ موزوں ہوا کرتے ہیں۔ یہ با اصول اور با قاعدہ فوج خوانی عورتوں میں پونجی فائس میں قیامت کی دلکشی پیدا ہو گئی۔ اور چند روز میں شیعہ ہی نہیں ادنیٰ طبقے کی سنیوں کی عورتوں میں بھی فوج خوانی کا شوق پیدا ہو گیا۔ اور یہ حالت ہو گئی کہ محرم میں اور اکثر مذہبی عبادتوں کے ایام میں لکھنؤ کے گلی کوچوں میں تمام گھروں سے پرسوز و گلازماؤں اور دلکش نمون کی عجیب حیرت انگیز مندائیں بلند ہوتی ہیں۔ اور کوئی مقام نہیں ہوتا جہاں یہ سامان نہ بندھا ہو۔ آپ جس گلی میں کھڑے ہوں گے سننے لگے ایسی دلکش آوازیں افسانہ سیاست و خیون کرے والا نغمہ سننے میں آجائے گا کہ آپ زندگی بھر نہیں بھول سکتے۔ ہندوؤں اور بعض خاص خاص سنیوں کے مکاؤں میں تو خاموشی ہوتی ہے۔ باقی بدھکان لگائے فوج خوانی کے قیامت خیز نمون ہی کی آوازیں آتی ہوتی ہیں۔

تقریب داری چونکہ فوج خوانی کا ہانا ہے۔ اس لیے سنی اور شیعہ دونوں گروہوں کے گھروں میں فوج خوانی کے شوق میں تقریب داری ہونے لگی۔ اور سنی مسلمان ہی نہیں ہزار ہا ہندو بھی تقریب داری اختیار کر کے فوج خوانی کرنے لگے۔ جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ لکھنؤ میں تقریب داری کے بہت زیادہ بڑھنے اور فروغ پانے کا زبردست باعث فوج خوانی ہے۔

لکھنؤ میں بعض شریف ثنائیت اور تعلیم یافتہ عورتیں ایسی اچھی سوز خوان ہیں کہ اگر پردے کی روک نہ ہوتی تو مرد سوز خوان ان کے مقابلے میں ہرگز فروغ نہ پاسکتے۔ اس کو بہت مدت ہوئی کہ ایک سال چلم کے موقع پر چند احباب کے ساتھ میں تال کوڑے کی کر بلا میں گیا تھا اور وہیں ایک غمے میں شب باش ہوا تھا۔ دو بجے رات کو یکایک آنکھ کھلی تو ایک ایسے دلکش نغمے کی آواز کان میں آئی جس نے سب دوستوں کو جگا کے بیتاب کر دیا۔ ہم سب اس آواز کے شوق میں غمے سے نکلے۔ اور دیکھا کہ آخر شب کا ساٹما ہے۔ چاندنی کھیت کیے ہوئے ہے

اور اُس میں عورتوں کا ایک ٹول تعزیر لے ہوئے آ رہا ہے۔ سب بال کھولے  
اور سر پر ہتہ ہیں۔ بیچ میں ایک عورت شمع ہاتھ میں لیے ہے۔ اس کی روشنی میں  
ایک حسین مرد قد نازنین چند اوراق میں سے پڑھ پڑھ کے فوج خوانی کر رہی ہے  
اور کئی اور عورتیں اُس کے ساتھ گلے بازی کر رہی ہیں۔ اُس سنائے۔ اُس وقت  
اُس چاندنی۔ اُن پر ہتہ سر حلیوں۔ اور اُس پر موز و گداز نغے نے جو سماں  
پیدا کر رکھا تھا اُس کو میں بیان نہیں کر سکتا۔ نازک اداؤں کا یہ مجمع جیسے ہی  
کر بلا کے پھاٹک میں داخل ہوا اُس سرو قامت نازنین نے پرچ کی دھن میں  
یہ فوج شروع کیا۔

جب کاروان شہر دہندہ لٹا ہوا      چوتھا قریب شام کے قیدی بنا ہوا  
نیزے پہ سر حلیوں کا آگے دھرا ہوا      اور پچھلے پچھلے بیویوں کا سر گھلا ہوا  
اس مناسب حالت مرثیے نے یکا یک ایسا سماں بانڈھ دیا کہ شہہ ہوتا تھا کہ ان  
اشعار کے ذریعے سے وہ خاتون واقعہ کر بلا کی تصویر کھینچ رہی ہے۔ یا خود اپنے  
اس ماتمی جلوس اور اپنے داخلہ کر بلا کی۔

اصل یہ ہے کہ لکھنؤ کی عورتوں اور اُن کے ساتھ مردوں پر بھی سوز خوانی  
و عزاداری نے جو نمایاں اثر ڈالا ہے اور کسی چیز نے نہیں ڈالا۔ اسکی پہلی  
برکت تو یہ ہے کہ تمام عورتیں بہت اچھی گلے باز ہو گئیں۔ اور موسیقی کے سچے  
اصول کے ساتھ فوج خوانی کرنے لگیں۔ دوسری برکت یہ ہے کہ سارے اہل شہر  
کو عام اس سے کہ مرد ہوں یا عورت موسیقی کے ساتھ مناسبت ہو گئی۔ یہ جو لکھنؤ  
کے گلی کوچوں میں دیکھا جاتا ہے کہ ادنیٰ درجے کے لڑکے اور بازاری لوگ اکثر  
چلتے چلتے گانے گاتے۔ اور گانے میں ایسی گلے بازی کرتے اور شکل سے شکل  
دھنوں کو اس آسانی سے اڑا لیتے ہیں کہ باہر کے لوگوں کو حیرت ہو جاتی ہے۔  
اس کا اصلی باعث یہ فوج خوانی و سوز خوانی کا مذاق ہے۔ اور تعریف کی بات  
یہ ہے کہ سوز خوانی کا نشو و نما باوجود عوام الناس اور ادنیٰ درجے کے چھلا میں  
پھیلنے کے صحیح اصول پر رہا اور موسیقی کے صحیح مذاق سے باہر نہیں ہونے پایا  
نچلاٹ اور چیزوں کے جو عوام میں پوسختے ہی بے قاعدہ اور خراب ہو جایا کرتے

سوز خوانی کو گو کہ عوام شیعہ موجب ثواب تصور کرتے ہیں۔ مگر علماء شیعہ نے اسوقت تک اسکے جواز کا فتوے نہیں دیا ہے۔ وہ پابندی شرع میں شدید ہیں اب تک مجتہدین اور ثقہ لوگوں کی مجلسوں میں صرف حدیث خوانی یا تحت الحفظ خوانی ہوتی ہے۔ اور عوام کی جن مجالس میں علماء شریعت شریک ہوتے ہیں ان میں بھی ان کے سامنے سوز خوانی نہیں ہوتی۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سوز خوانی نے اپنی عام مقبولیت کی وجہ سے علماء کے فتووں پر پوری فتح پالی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اہل سنت کے علماء حدیث اور مشائخ صوفیہ کے نزدیک تو غنا کے جواز کی بہت گنجائش ہے۔ مگر شاید فقہ اثنا عشری میں اتنی گنجائش نہیں۔ ورنہ اس فن نے اب تک سند جواز حاصل کر لی ہوتی۔

(۲۷)

ارباب نشاط اور فن موسیقی اور اس سے نکلے ہوئے فنون کے متعلق ہم بہت کچھ بیان کر چکے ہیں۔ لیکن اسی سلسلے میں بازاری باجون کا حال بیان کرنا باقی ہے۔ لہذا آج ہم یہ بتاتے ہیں کہ ان باجون پر لکھنؤ کا کیا اثر پڑا۔ اور اسی پر ہم موسیقی کی بحث ختم کر دیں گے۔ باجون کے جوڑ جوڑ شادی وغیرہ کے جلوسوں کے ساتھ جاتے ہیں چھ طرح کے ہیں، (۱) ڈھول تانے، (۲) روشن چوکی (۳) فوبت (۴) تڑہی اور قرنا۔ (۵) ڈنکے اور گیل (۶) انگریزی باجا جو ارگن باجا کہلاتا ہے اور روز بروز زیادہ رواج پاتا جاتا ہے۔

پہلا یعنی ڈھول تاننا ہندوستان کا قدیم پیشہ تھا جس کا انگریز انڈین ٹام ٹام نام رکھ کے اپنی عدم واقفیت اور جہالت سے مضحکہ اڑاتے ہیں۔ ۱۸۹۶ء میں جب انگلستان کی نمائش گاہ "آرٹس کورٹ" میں ہندوستانی معاشرت اور یہاں کے فنون و مشاغل کے مد ہانوں نے دکھائے گئے تھے تو وہاں اس باجے کا نمونہ میں نے خود اپنی آنکھ سے یہ دیکھا کہ ایک نہایت ہی سیاہ قام شخص جسکے پنڈے پر سوا ایک سیلے لگوٹے کے کچھ نہ تھا۔ عام مجمع میں برہمنہ آکے کھڑا ہو جاتا اسکے گلے میں ایک ڈھول ہوتی۔ اور وہ نہایت ہی وحشیانہ طریقے سے بغیر کسی نے اور ترتیب کے ہنوں کی طرح سر ہلا ہلا کے زور زور سے ڈھول کو لکڑی

سے پٹنے لگتا۔ اور کہا جاتا کہ یہی ہندوستان کا باجا نام ہے۔ مگر یہ ان لوگوں کی جہالت و بے عقلی ہے۔ یہ بہت ہی کمل یا جا ہے۔ اور اس کا بجانا ایک باقاعدہ فن ہے جس میں نہایت اعلیٰ درجے کی لے رکھی گئی ہے۔

اس میں لکھنؤ میں عموماً دو اور کبھی تین تین چار چار بڑے ڈھول ہوتے ہیں۔ اور کم سے کم ایک درتہ دو تین تاشے و لے ہوتے ہیں۔ اور کم سے کم ایک جھانچہ والا ہوتا ہے۔ جھانچہ کا پتہ ایران وغیرہ میں بھی پنا ہے۔ اور تاشے مصر وغیرہ میں بھی مروج ہیں۔ مگر ڈھول خالص ہندوستان کی چیز ہے۔ لکھنؤ میں یہ باجا فوجوں اور خوش بانٹوں کے ساتھ دہلی سے آیا۔ مگر دہلی میں اس کے نوڑ میں صرف ڈھول اور جھانچہ تھیں۔ تاشے لکھنؤ میں پرکھائے گئے۔ اور رواج پاتے ہی اس قدر ضروری اور اہم نظر آئے کہ معلوم ہوا جیسے ان سے اس باجے میں جان پڑ گئی۔ اگرچہ اکثر شہروں میں صرف ڈھول اور جھانچہ ہی ہوتی ہیں مگر لکھنؤ میں تاشے جزو لازمی ہو گئے ہیں۔ اور بغیر ان کے ڈھولین کہیں بجتی ہی نہیں ہیں۔ مگر صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس باجے میں سب سے زیادہ کمال وہی شخص دکھاتا ہے جو تاشا بجاتا ہے۔ وہی لے قائم کرتا ہے اور لے میں اس کی پیروی ڈھول والے کرتے ہیں۔ تاشا بجانے کی یہ صفت ہے کہ اتنی جلدی جلدی ضربیں پڑیں کہ ایک قرعے کا دوسرے سے امتیاز نہ ہو سکے۔ اور ان متواتر و مسلسل قرعوں سے نشیب و فراز یا زیروم سے لے اور گت پیدا ہو۔ لکھنؤ میں اس باجے کے بجانے والے ایسے ایسے اُستاد تھے کہ اُنھوں نے اس معمولی باجے کو جو سب جگہ بے اصول تھا بہت ہی باقاعدہ بنا دیا۔ اور اب بھی یہاں ایسے چابکدست بجانے والے پڑے ہیں کہ ان کے سامنے کسی شہر کے ڈھول بجانے والا نہیں بجا سکتے۔

لکھنؤ میں چلم کے بعد ایک تفریہ اُٹھتا ہے جو بخشو کا تفریہ کہلاتا ہے۔ اب تو اس کے جلوس نے شیعین شیون کے جھگڑے کی وجہ سے دوسری صورت اختیار کر لی ہے۔ مگر دس بارہ برس پہلے اس کی شان یہ تھی کہ چونکہ شاہی کے ایک پسر محب اہل بیت کی یاد دگرتھا۔ اور اب اس کے اُٹھانے والے غریب دیے مروسالان

لوگ تھے اس لیے ہر قسم کے باجون کے بے نظیر و بے بدل اُستاد ثواب سمجھ کے شریک ہوتے اور ثواب کے ہاتھ اپنے اپنے فنون کا کمال اہل شہر کو دکھاتے اور اسی وجہ سے اُن کا معمول تھا کہ جہاں کھڑے ہو گئے قدر و انون نے گھیر لیا۔ اور وہ گھنٹوں اُسی جگہ کھڑے اس بات کا دعویٰ کر رہے ہیں کہ کوئی ہے جو ہمارے سامنے آئے بجائے؟ بڑے بڑے اُستاد گویے اُن کی داد دیتے اور وہ جوش میں آئے اور زیادہ خوبی سے بجاتے۔ خصوصاً اُن میں تاشا بجانے والے بڑے اُستاد ڈھماڑی ہوتے جو موسیقی میں کمال رکھتے اور گتون میں جدتیں پیدا کرتے۔

ڈھول تاشا بجانے کے فن کے اہم اور با اصول ہونے کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہوگا کہ آخری معزول تاجدار اودھ واجد علی شاہ کو جو موسیقی کے اُستاد بے بدل تھے میں نے سیکھے میں اپنی آنکھ سے دیکھا کہ محرم کی ساتویں تاریخ جب مہندی کا جلوس اُن کی آسمانی کوٹھی سے روانہ ہوا تو وہ خود گلے میں تاشا ڈال کے بجاتے بڑے بڑے گویوں کے گلوں میں بڑی بڑی ٹھولیں ہوتیں۔ معزین دربار گرد و حلقہ باندھے ہوتے۔ اور وہ اسی نزاکت اور خوبی سے تاشا بجاتے کہ ناؤقت مستے والے بھی عیش کر جاتے۔ اور گویوں کی واہ وا تو ہمارے مشاعرہ کے ہنگاموں کو بھی مات کر دیتی۔ اسی طرح میں نے اُنھیں کئی بار ڈھول بجاتے بھی دیکھا۔

بہر حال ہندوستان کے اس قدیم ترین بابے میں بھی لکھنؤ کی سوسائٹی نے اپنا تصرف کیا۔ اور ایسا تصرف کیا جو نہایت ہی مقبول اور ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص آکے یہاں کے تاشہ نوازوں کا کمال دیکھے تو اُسے معلوم ہوگا کہ کس قدر مناسب تصرف ہے۔ اور اُس نے ڈھول اور تھانچہ کو کس قدر اہم بنا دیا ہے۔

دوسرا جوڑ روشن چوکی کا ہے۔ روشن چوکی بہت پرانا بنا جا ہے اور اگر کل نہیں تو اُس کے اہم ترین اجزاء کو مسلمان اپنے ساتھ لائے۔ کیونکہ تھانچے اس کا اہم جز ہے۔ اور اس کی نسبت مشہور ہے کہ شیخ الرئیس ابن سینا کی ایجاد ہے۔ بلکہ انسان کے گلے کی طرح جس قدر سچے سرنگے بازی کے اعلیٰ ترین کمال کے ساتھ تھانچے

سے ادا ہوتے ہیں اور کسی بابے سے نہیں ادا ہو سکتے۔ روشن چوکی میں کم از کم دو شہنائی نواز ہوتے ہیں اور ایک پٹیلچی جسکی کمر میں چھوٹے چھوٹے دو طبل بندھے ہوتے ہیں۔ طبل نے کو قائم رکھتے ہیں۔ ایک شہنائی نواز اصلی سُر قائم رکھنے کے لیے سُر دیتا رہتا ہے اور ایک آواز کی چلت پھرت اور گلے بازی کی مشق دکھاتا ہے۔ اور بھی اصلی شخص ہوتا ہے جو غزلوں یا ٹھمریوں وغیرہ کو عجب دلکش سرون میں ادا کرتا ہے۔

روشن چوکی ہندوستان کا خاص و زباری با جاتھا۔ جو بادشاہوں اور عالی ترین امرا کے خاصے کے وقت بجا کرتی۔ رات کو آرام کے وقت روشن چوکی شاہی قصر کے گرد گشت کیا کرتی۔ اور اُس کا نغمہ دُور سے بہت ہی لطیف و تینا۔ دولتِ مغلیہ میں یہ بہت ہی اہم اور لطیف با ج خیال کی جاتی۔ اور دہلی میں خدا جانے کب سے مروج تھی۔ یقیناً لکھنؤ میں روشن چوکی بجانے والے دہلی سے آئے ہونگے۔ مگر اسکے صاحب کمال ان اطراف میں بھی مدت سے موجود تھے۔ بنارس کے اکثر مندروں میں آج تک صبح کو روشن چوکی بجا کرتی ہے۔ اور تڑکے منہ اندھیرے کہیں قریب سے جا کے سینے تو بہت ہی لطیف آتا ہے۔

لکھنؤ میں علی العموم شادی کے جلوسوں میں روشن چوکی بجانے والے دو لھا کے قریب رہتے ہیں۔ خصوصاً ہندوؤں کی براتوں میں راستے بھر قدم قدم پر اُنھیں انعام دیا جاتا ہے۔ روشن چوکی بجانے والے سیرے خیال اور تجربے میں لکھنؤ سے اچھے آج کل کہیں نہ ملین گے۔ جس قدرے داری اور ہر چیز کو دلکش دُصنوں میں سچے سرون کے ساتھ اہل لکھنؤ ادا کر لیتے ہیں اور کسی مقام کے روشن چوکی نواز نہیں ادا کر سکتے۔ اُنکے کمال اور فن دانی کا اندازہ اُس وقت ہو سکتا ہے جب کوئی شوق سے سنے اور داد دیتا جائے۔ اُسی تجش کے تعزے میں جس کا ذکر آچکا ہے روشن چوکی بجانے والے بھی اپنا کمال دکھاتے تھے اور اس طرح جان توڑ کے کوشش کرتے تھے کہ پھر اُنکے بعد اور کسی کی شہنائی میں مزہ نہ آتا تیسرا جوڑ نوبت کا ہے۔ ہمارے پُرانے نغمہ ہاے طرب میں سیہ سب سے زیادہ عالیشان بند ہے۔ اس میں دو تین شہنائی نواز ہوتے ہیں۔ ایک تعارہ بجانوالا



ہوتا ہے جو دو بہت بڑے بڑے عظیم الشان نقارون کو اپنے آگے خمیدہ رکھ کے دونوں کو ایک ساتھ چون سے بجاتا ہے۔ ان نقارون کی آواز بہت بڑی ہوتی ہے۔ اور گرد کی فضا میں بہت دُور تک گونجتی ہے۔ اور ساتھ ہی ایک جھانچہ والا بھی رہتا ہے۔

نوبت بھی تاریخی پایا جا ہے۔ اور لٹھار شوکت کے لیے مدتوں کام میں لایا جاتا رہا ہے۔ تاریخ اسلام میں ہمیں وثق و لہذا دو نصیر کے درباروں میں بھی اس کا پتہ لگتا ہے۔ لہذا دین عباسیہ کے درمیانی دور میں ہر میر کی ڈیوڑھی پر نوبت بجاتی تھی۔ اور موجب احترام و عظمت تصور کی جاتی۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ ہی یہ ہندوستان میں آئی۔ ممکن ہے کہ ہندوستان میں پہلے سے موجود ہو۔ اور گوکہ شہنائی نہ تھی مگر خالی نقارہ اور جھانچہ سمیٹتی ہو۔ لیکن اسکی موجودہ صورت وہی ہے جو ایران و عراق میں مرتب ہونے کے بعد بیان آئی۔

بادشاہوں اور خانی حرات امیروں کے جلوس اور لشکر کے ساتھ نوبت بہت ہی لازمی شے تھی۔ اُلوا اعظم تاجداروں کے جلوس کے آگے آگے ہاتھیوں پر نوبت جھتی جاتی۔ لڑائیوں میں غالب آنے والا گروہ اپنی فتح مندی اور غلبہ کے اظہار کے لیے زور شور سے نوبت بجاتا کرتا۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے حیدر آباد کو فتح کر کے اُس کے قریب ایک پہاڑی پر نوبت بجاتی تھی جو آج تک نوبت پہاڑ کہلاتی ہے۔ دولتہ مغلیہ میں دربار کے اعلیٰ ترین طبقے کے رئیسوں اور عہدہ داروں کو بادشاہ کی طرف سے نوبت کا حق دیا جاتا۔ جو اپنی ڈیوڑھیوں اور نیزائی سواری میں نوبت بجاتا کرتے۔ نوبت بجاتے والوں کے لیے کوئی ملہزیرج منتخب کیا جاتا چنانچہ اکثر شاہی محلوں کے پھاڑ کون کے اوپر نوبت خانہ بنوایا جاتا ہے جس کے نوے ہر بڑے شہر میں جہان کوئی بڑا دربارہ چکا ہو نظر آتے ہیں۔

اسی قدیم رواج کی پیروی میں لکھنؤ میں آج تک معمول ہے کہ جس دولہندہ شخص کے دہان شادی یا کوئی خوشی کی تقریب ہوتی ہے تو اُس کے دروازے پر لمبی لمبی تلیان کھڑی کر کے اور سرخ کپڑے اور پتی وغیرہ سے منڈھ کے عارضی طور پر ایک لہند نوبت خانہ بنوایا جاتا ہے

دن بھر گھر کے مختلف اوقات میں بار بار بت سجا یا کرتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس جب براتین یا تیزیوں کے جلوس چلتے ہیں اسی قسم کے مصنوعی نوبت خانے جو تختوں پر بنائے جاتے ہیں کہا روں کو کندھوں پر سب کے آگے آگے چلا کرتے ہیں۔ اور راستے پھر ان پر نوبت بگیتی جاتی ہے۔

یہی نوبت اگلے دنوں خصوص لکھنؤ کے دربار میں وقت پہچاننے کا ذریعہ قرار پا گئی تھی۔ ان دنوں وقت کی تقسیم یہ چوبیس گھنٹوں کی نہ تھی جو آب انگریزی گھڑیوں کے رواج سے ہم میں مروج ہو گئی ہے۔ ان دنوں وقت کی تقسیم کا یہ حساب تھا کہ دن اور رات کے آٹھ گھنٹے ہوتے ہیں۔ چار پہر دن کے اور چار پہر رات کے۔ اور ہر پہر کی آٹھ گھنٹیاں ہوتیں۔ ہر نوبت خانے میں ایک پٹیلے یا ناندے میں پانی بھرا رہتا۔ اس میں کٹورا جس کے پینے میں ایک بار ایک سا سوراخ ہوتا تھا خالی کر کے ڈال دیا جاتا۔ وہ پانی پر تیرتا رہتا تھا۔ اس سوراخ سے آہستہ آہستہ اس میں پانی آتا رہتا تھا۔ اور وہ سوراخ کر کے بنایا جاتا تھا کہ ایک گھڑی بھر میں پانی سے بھرنے کے لیے ڈوب جائے۔ پہر شروع ہونے کے بعد جب پہلی مرتبہ کٹورا ڈوبنا تو ایک گھڑی سجا ئی جاتی۔ جب دوبارہ ڈوبنا دو گھنٹیاں سجا ئی جاتیں۔ اسی طرح مسلسل آٹھ گھنٹیاں سجا ئی جاتیں۔ اور آٹھویں گھڑی کے ساتھ گھر سجا یا جاتا۔ یعنی پہلے منازطو پر آٹھ ضربیں سجا کے گھڑیاں پر ایک ساتھ بہت سی بے شمار ضربیں جلدی جلدی لگادی جاتیں جس میں یہ اشارہ تھا کہ پہر پورا ہو گیا۔ اور گھڑیوں کا سلسلہ پھر ایک سے شروع ہو جاتا۔

جن ڈیڑھ گھنٹوں پر نوبت ہوتی وہاں ہر پہر کے خاتمے پر تقریباً ایک گھڑی تک نوبت بگیتی رہتی۔ اس قریب سے رات دن کے آٹھ پہروں کی آٹھ نوبتیں ہوئیں۔ مگر معمول یہ تھا کہ صبح سات ہی نوبتیں سجا کر تین۔ پہلی نوبت ترکے نماز کے وقت یعنی پہلے پہر کے نماز پر بگیتی اور صبح کی نوبت کہلاتی۔ دوسری آسوقت جب ایک پہر دن آ جاتا۔ یہ پہر دن چڑھنے کی نوبت کہلاتی۔ تیسری جب آفتاب نصف النہار پر ہوتا۔ یعنی ٹھیک بارہ بجے۔ یہ دو پہر کی نوبت کہلاتی۔ اس کے بعد

جب آٹھ گھڑیاں پوری ہو جاتیں تو تیسری نوبت بچتی۔ اور یہ تیسرے پہر کی نوبت کہلاتی۔ اس کے بعد چوتھا پہر ختم ہونے پر مغرب کے وقت نوبت بچتی۔ اور چھام کی نوبت کہلاتی۔ اسکے بعد جب پانچواں پہر پورا ہو جاتا تو پانچویں نوبت بچتی جو پہر رات گئے کی نوبت کہلاتی۔ پھر جب چھٹا پہر گزرتا تو چھٹی نوبت بچتی جو آدمی رات یا دو پہر رات کی نوبت کہلاتی۔ اسکے بعد جب ساتواں پہر پورا ہوتا اور رات کے تین پہر گزر جاتے تو آسوقت لوگوں کے آرام میں خلل نہ پڑنے پانے کے خیال سے نوبت نہ بجائی جاتی۔ صرف گجر بجا دیا جاتا۔ پھر اسکے بعد آٹھویں پہر کے خاتمے پر صبح کی نوبت بچتی۔

اوقات کا یہ حساب تھا جو دربارِ نعلیہ میں اور نیز از قراع سلطنت تک لکھنؤ میں مروج رہا۔ اور کھلتے میں جب تک واجد علی شاہ زندہ رہے اسی حساب سے پہر اور گھڑیاں بچتی رہیں۔ مگر اتنے ہی دنوں میں وہ حساب اس قدر مفقود ہو گیا کہ اب شاہِ نادر ہی کوئی شخص ہوگا جو پہرون اور گھڑیوں کا حساب جانتا ہو۔ مگر خرابی یہ ہے کہ باوجود شب و روز کی تقسیم اوقات کے بدل جانے کے اگلا حساب ہماری زبان کے لگ وپے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ ہم کہتے ہیں ”گھڑی بھر میں آؤں گا“۔ ”دو پہر کو سوؤں گا“۔ ”پہرون چڑھے کھانا کھاؤں گا“۔ مگر ہم نہیں جانتے کہ پہر کتنا ہوتا ہے اور گھڑی کسے نکلتے ہیں۔ ہم عموماً سنا کرتے ہیں کہ ”پہرہ بیٹھ گیا“ اور ”پہرے کے سپاہی“ مگر نہیں جانتے کہ پہرے کا لفظ اُسی پہر سے نکلا ہے۔ اس لیے کہ اُن دنوں پہر پہر بھر کی نوکری ہر ایک کو دینا پڑتی تھی۔ تقسیم اوقات کا یہ پرانا حساب ہندوؤں کا ہے۔ مگر ایران میں بھی آگے دنوں ہی حساب مردن تھا۔ اور اسی حساب سے نوبت بجا کرتی تھی۔ ہمارے موجودہ حساب سے ایک پہر تین گھنٹوں کا ہوا کرتا تھا۔

نوبت نواز بھی لکھنؤ میں ایسے اعلیٰ درجے کے تھے کہ ہر جگہ اور ہر شہر میں یہاں سے جایا کرتے۔ ایہاں کے استادوں کے شاگرد ہوتے۔ لیکن نوبت میں کوئی ترقی یا اضافہ نہیں ہوا۔ بجائے دولوں کی تعداد وہی رہی۔ باجے وہی رہے اور بجانے کا طریقہ وہی رہا۔ پھر بھی اتنا ضرور ہوا کہ لکھنؤ کے اسکول موسیقی نے

جن چیزوں اور جن دھنوں کو منتخب کر کے عام سوسائٹی میں مقبول کر دیا تھا وہی دھنیں اور چیزیں تقارخاؤں میں بھی سنی جاتے گئیں۔ مگر باوجود اسکے نوبت بجاتے کا جو قدیم طریقہ تھا وہ بھی اپنی حد پر قائم رہا۔ امیر خسرو نے اپنے زمانے کی نوبت نوازی کی جو تصویر اپنی نظم میں دکھائی ہے اس سے اس وقت کی نوبت بجنے کے طرز کا بہت کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہی طرز آج تک مروج ہے اور اس میں بہت کم فرق آیا ہے۔ لیکن اسپر بھی ہشتائی سے جو دھنیں اور گیت بجاتے ہیں ان پر لکھنؤ کی موسیقی کا جو کچھ اثر پڑا ہے وہ سننے ہی نظر آ جاتا ہے۔

ترہی اور قرنا ہندوستان کے بہت پرانے قومی باجے ہیں۔ جن کو فوجوں کے ساتھ زیادہ خصوصیت تھی۔ مگر یہی کی صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کے ساتھ ہندوستان میں آئی اور ان کے ورود کے ابتدائی دور میں رواج پا گئی مگر قرنا خاص ایرانی باج ہے۔ اور اس کی آواز میں کچھ ایسا رعب و داب ہے کہ میدان جنگ میں رعب بٹھانے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ ان دونوں باجوں کا بھی لکھنؤ کے جلوسوں میں رواج ہے۔ لیکن مستقل باجے کی حیثیت سے نہیں بلکہ فوجی دستوں یا پلٹونوں کے ساتھ ایک ترہی نوازی یا قرنا نوازی کرتا ہے جو تھوڑے تھوڑے وقفے سے اپنا باجا بجا کے اپنے گروہ کی موجودگی کی اطلاع دے دیا کرتا ہے۔ ان دونوں باجوں کے مقابل ہندوؤں کا قدیم باجا تر سنگھار ہے جو اکثر ہندوؤں کے مذہبی جلوسوں کے ساتھ بجا کرتا ہے۔ یہ باجے دہلی سے آئے۔ اور جیسے تھے ویسے ہی رہے۔ اور شاید ان میں ترقی کی گنجائش بھی نہیں ہے۔

بگل اور ڈنگا جو فی الحال لکھنؤ کے شادی کے جلوسوں میں نظر آیا کرتا ہے وہ دراصل رگل اور کھیلے باجوں کا ایک مبتذل مجموعہ ہے۔ ڈنگے سے مراد وہ نقارہ ہے جو اگلے دنوں فوجوں اور زبردست فاسٹوں کے ساتھ گھوڑے پر ہا کرتا تھا اور اسپر چوب پڑتے ہی لوگوں پر ایسا رعب پڑتا کہ بڑے بڑوں کے کیلچے دھل جاتا کرتا تھے۔ بگل یا بیوگل انگریزی فوج کا وہ باج ہے جس کے ذریعے سے فوج کو حسب ضرورت نقل و حرکت اور دوسرے کاموں کا حکم دیا جاتا۔ لہذا اب ڈنگے کے ساتھ بگل کو شریک کر کے ایک نیا جوڑ بنا لیا گیا جو شادی کے جلوسوں

کے ساتھ نظر آیا کرتا ہے۔ مگر چونکہ کراچی کے اور بہت ہی متزلزل حالت کے لوگ ہوتے ہیں اس لیے اُن کا لباس اُنکے گھوڑے اور خود انکی صورتیں ایسی ذلیل و خوار ہوتی ہیں کہ اُن سے بجائے رونق کے اور ابتذال اور ایک شرناک منظر پیدا ہو جاتا ہے۔

اب سب کے آخرین اور سب سے زیادہ ترقی پذیر باجا انگریزی باجا ہے۔ یہ خالص انگریزوں کا لایا ہوا ہے جو اُن سے پیشتر مطلقاً نہ تھا۔ لکھنؤ میں خدا جانے کیوں گرامر اسکے بجانے والے صرف مہتر ہی ہیں۔ جو پانچھانے صاف کرتے کے علاوہ اس کام کو بھی کرتے ہیں۔ غالباً اسکی وجہ یہ ہو کہ ابتدائے ہندوستان دونوں گروہوں کو عیسائیوں سے ایسی سوشل نفرت تھی کہ اگر وہ کسی برتن کو ہاتھ لگا دیتے تو ہمیشہ کے لیے چھوٹ ہو جاتا۔ اور اس باجے کو انگریزوں سے سلکھنا اور اُسے منہ لگانا پڑتا۔ اس لیے سواہتروں کے اور کسی کو اُسکے اختیار کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ہر حال اب قریب قریب یہ ہتھروں کا لازمی پیشہ ہو گیا ہے۔

چونکہ اس کام کو یہاں ایک ایسے گروہ نے اختیار کیا جو سب سے زیادہ ذلیل و خوار ہے اور جسے موسیقی سے بالکل مس نہیں۔ اس لیے اسید نہ تھی کہ اس فن میں یہاں ذرا بھی ترقی ہو سکے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہتھروں ہی میں ترقی کا شوق پیدا ہوا۔ اور چونکہ شہر کی سوسائٹیوں میں ہندوستانی موسیقی کی دھنیں پھیلی اور مذاق میں سراسیمہ کی ہوئی تھیں اس لیے ہتھروں کو مجبور ہونا پڑا کہ اس مغربی ارغنون میں اپنی دھنوں کو ادا کریں۔ انگریزوں یا انگریزوں کے بجانے والے فوجی یا ہوں سے اُنھوں نے صرف یہ حاصل کیا تھا کہ انگریزی باجون کا بجانا آجائے یا دو چار مغربی موسیقی کی دھنیں سلکھ لی ہوں گی۔ لیکن اب اُنھوں نے ہندوستانی دھنوں میں مروجہ چیزوں کو بجانا شروع کیا تو روز بروز اُس میں ترقی ہی کرتے گئے۔

انگریزی باجا میں نے ہر جگہ سنا ہے۔ اور سب جگہ اسی انگریزی کی خبریں بجاتی جاتی ہیں۔ جن کو اُنھوں نے اپنے انگریزی میڈیا یا ٹرون سے سلکھ لیا ہے

یہ کہیں نہ نظر آیا کہ اس باجے کو بجانے والوں نے ہندوستانی موسیقی کے سانچے میں ڈھال لیا ہو۔ یہ بات اگر غور سے دیکھیے تو لکھنؤ ہی میں نظر آئے گی کہ جن غزلوں یا ٹھریوں کو روشن چوکی والے شہنائی سے ادا کر رہے ہیں۔ انھیں چیزوں کو انگریزی باجے والے اپنے باجون سے ادا کر رہے ہیں۔ اور ایسی خوبی سے کہ خواہ مخواہ سننے کو جی چاہتا ہے۔

انگریزی باجے کے بنڈھتروں کی مستعدی سے لکھنؤ میں سیکڑوں قائم ہو گئے ہیں۔ جن میں سے بعض ایسے ہیں کہ ان میں پچیس پچیس تیس تیس بجانے والے ہوتے ہیں اور بعض میں چھ سات یا چار ہی پانچ۔ اُنھوں نے گوروں کی دردیوں میں ہندوستانی مذاق کے مطابق تصرف کر کے اپنے لیے رنگ رنگ کی وردیاں بھی بنائی ہیں۔ اور اگر وہ وردیاں سات اور نئی ہوں تو اُنکو بہن کے جہیز برات کے ساتھ ارگن یا جابجائے ہوئے چلتے ہیں تو بہت اچھے اور بہت شاندار معلوم ہوتے ہیں۔

وردی کی خصوصیت انھیں لوگوں میں ہے۔ اور قسم کے باجے والوں کو کبھی اس کا خیال نہ آیا کہ اپنے لیے کوئی وردی ایجاد کریں۔ وہ نہایت ہی ذلیل اور کثیف کپڑے پہنے ہوا کرتے ہیں۔ مگر انگریزی مینڈوالے ہتروں نے اپنے لیے طرح طرح کی وردیاں ایجاد کر کے اپنی شان بڑھالی ہے۔ اور ہندوستانی موسیقی کو انگریزی ارغنون میں شامل کر کے لوگوں میں اپنی قدر بھی زیادہ کر لی ہے۔

(۲۸)

انسانی معاشرت میں سب سے زیادہ ضروری اور سب سے اہم کھانا پینا ہے۔ اور کسی گروہ اور قوم کے ترقی کرتے وقت سب سے پہلے شوق اپنی خوش بڑاتی اور جدتوں کا اظہار و سترخان پر کرتا ہے۔ اسی لیے اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ باورچی خانہ اور دسترخان کے متعلق لکھنؤ کے مشرقی دربار نے کیا رنگ دکھایا۔ اور کیا کیا حدت طرازیان کیں۔ اور اس فن میں یہاں کے لوگوں نے کس درجے تک ترقی کی۔

اور وہ کے تمدن کی تاریخ شجاع الدولہ سے اور اُنکے بھی آخر عہد سے شروع

ہوتی ہے۔ یعنی اس وقت سے جبکہ وہ کبوتر کی لڑائی میں شکست کھا کے اور انگریزوں سے نیا معاہدہ کر کے خاموش بیٹھے اور فوجی سرگرمیوں کی طرف سے بے توجہی ہوئی اس زمانے میں ان کے ہتھم باورچی خانہ حسن رضا خان عرت مرزا حسو تھے جو ایک دہلی کے آئے ہوئے معزز و اشریف گھرانے سے تھے۔ صفی پور ضلع اناؤ کے ایک شیخ زادے مولوی فضل عظیم جو لکھنؤ میں طالب علمی کو آئے تھے خوش قسمتی سے مرزا حسو کے گھر میں اُنکی رسائی ہو گئی۔ اور ان کے ساتھ ہی مل کے اور کھیل کود کے بڑے ہوئے تھے۔ ان کو انھوں نے اپنی طرف سے نائب ہتھم باورچی خانہ مقرر کر دیا تھا۔ اور ان کا معمول تھا کہ خاصے کے خاؤن کو درست کر کے اور ان میں اپنی ہر لگانے نوابی ڈیوڑھی میں لیجاتے۔ اور ہوٹلیم صاحبہ کی ڈیوڑھی کی مخصوص ہریون دھنیا پنیا۔ اور مینا کے حوالے کر دیتے۔ محض اس غرض کے لیے کہ یہ ہریاں اُنکے خلات کوئی کارروائی نہ ہوئے دین مولانا نے ان ہریون سے بھائی چارہ کر لیا تھا۔ چنانچہ یہ ہریاں بہت ہی نازک موقعوں پر ان کے کام آئیں۔

نواب شجاع الدولہ کا معمول تھا کہ محل کے اندر اپنی بی بی ہوٹلیم صاحبہ کے ساتھ کھانا کھاتے۔ ہریاں خاؤن کو ہوٹلیم صاحب کے سامنے لیجا کے کھاتے۔ اور دسترخوان پر کھانا چٹا جاتا۔

نواب اور ہوٹلیم کے لیے ہر روز چھ باورچی خاؤن سے کھانا آیا کرتا۔ (اول اند کو رہ بالا اصلی نوابی باورچی خانے سے جس کے ہتھم مرزا حسو تھے۔ اور مولوی فضل عظیم خان کے خاؤن خودے کے ڈیوڑھی میں حاضر ہوتے۔ اس باورچی خانے میں دو ہزار روپیہ روز کی سخت ہوتی۔ جسکے یہ معنی ہوئے کہ باورچوین اور دیگر ملازموں کی تنخواہوں کے علاوہ ساٹھ ہزار روپیہ ماہوار یا سات لاکھ بیس ہزار روپیہ سالانہ کی رقم فقط اللوان نعمت اور غذاؤں کی قیمت میں صرف ہوتی تھی۔ (دوسرے) سرکاری چھوٹے باورچی خانے سے جس کے ہتھم پہلے تو مرزا حسن علی ہتھم قوشہ خانے تھے۔ لیکن بعد ازاں وہ غیر علینان خواجہ سر کے سپرد ہو گیا تھا۔ اس میں تین سو روپیہ روز یعنی ایک لاکھ آٹھ ہزار روپیہ ہر سال کھانوں کی تیاری میں صرف ہوتے۔ (تیسرے) خود ہوٹلیم صاحبہ کے محل کے اندر کا باورچی خانہ جس کا ہتھم ہمار علی خان خواجہ سر تھا۔ چوتھے

نواب یگم صاحب یعنی شجاع الدولہ کی والدہ محترمہ کے باورچی خانے سے (پانچون) مرزا علی خان کے باورچی خانے سے - اور (چھٹے) نواب سالار جنگ کے باورچی خانے سے - آخر الذکر دونوں رئیس ہو یگم صاحب کے بھائی اور شجاع الدولہ بہادر کے سارے تھے۔

اُس عہد کے یہ چھ باورچی خانے شاہی باورچی خانے کے ہم پلہ تھے۔ اور جن میں روز پُر تکلف اور لذت کھانے فرمان روا سے وقت کے خاصے کے لیے تیار کیے جاتے۔ ایک دن کسی کھانے میں جو بڑے سرکاری باورچی خانے سے آیا تھا خاص نواب صاحب کے سامنے ایک کھنی نکل آئی۔ نواب نے برہم ہو کر دریاٹ کیا کہ یہ کھانا کہاں سے آیا ہے؟ دھنیائے خیال کیا کہ اگر سرکاری باورچی خانے کا نام لیتی ہوں تو مولانا بھائی کی تعضا آ جائے گی۔ بولی "حضور یہ کھانا نواب سالار جنگ بہادر کے وہاں سے آیا ہے۔"

نواب شجاع الدولہ کے بعد دربار فیض آباد سے لکھنؤ میں منتقل ہوا۔ اور نواب آصف الدولہ نے مرزا حسن رضا خان کو سرفراز الدولہ خطاب دے کے خلعت وزارت سے سرفراز کیا تو داروغگی باورچی خانہ کو اپنی شان کے خلاف خیال کر کے اُنھوں نے مولوی فضل عظیم صاحب کو مستقل مہتمم باورچی خانہ سرکاری مقرر کر دیا۔ مگر مولوی فضل عظیم صاحب پہلے جس طرح خاکسے کے خوان لے کے ہو یگم صاحب کی ڈیوڑھی پر حاضر ہوا کرتے تھے اسی طرح اب لکھنؤ میں بھی نواب آصف الدولہ بہادر کی ڈیوڑھی پر حاضر ہونے لگے۔ اور اپنے دیگر اعزہ کو بھی بلا کے اپنے کام میں شریک کر لیا۔ جن میں اُن کے سگے بھائی مولوی فائق علی اور چچا زاد بھائی غلام عظیم اور غلام مخدوم زیادہ پیش تھے۔ اور باری باری چاروں بھائی ڈیوڑھی پر خاصہ لیجا یا کرتے۔

آصف الدولہ بہادر کے بعد وزیر علی خان کے چند روزہ عہد میں حسین خان وزیر ہوئے تو اُنھوں نے اُن برادران صنفی پور کو ہٹا کے ایک اپنے آدمی غلام محمد عرف بڑے مرزا کو مہتمم باورچی خانہ مقرر کر دیا۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کو اپنے ابتدائی عہد ہی میں ایسے



بڑے بڑے زبردست اور شوقین کے باورچی خانے نصیب ہوئے جن کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ نہایت ہی اعلیٰ درجے کے باورچی تیار ہوں۔ غذاؤں کی تیارابی میں تکلفات بڑھیں۔ مدت طرازیات ہوں۔ اور جو صاحب کمال باورچی دہلی اور دیگر مقامات سے آئے ہوں وہ یہاں کی خراپہ جرگہ کے اپنے ہنرمین خاص قسم کا کمال اور اپنے تیار کیے ہوئے کھانوں میں نئی طرح کی تقاضا اور خاص قسم کی لذت پیدا کریں۔

یہ معمول ہے کہ جو کام جس شخص کے ذریعے سے ہوتا ہے وہ اُس میں کچھ نہ کچھ ترقی ضرور کرتا ہے اور اُس کا شوقین بن جاتا ہے۔ چنانچہ لکھنؤ میں کھانے کے ابتدائی شوقین بھی وہی رؤسا تسلیم کیے جاتے ہیں۔ جن کے باورچی خانوں کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ خود حسن رضا خان سرفراز الدولہ کا دسترخوان بیٹ ویسے تھا۔ کھانے کھانے کے وہ نہایت ہی شائق تھے۔ اور جب اُن کا یہ مذاق دیکھ کے اعلیٰ ترین سرکاری باورچی خانہ اُنکے سپرد ہو گیا تو اُنہیں اپنے شوق کے فہم میں ایسا دو اختراع کا کہاں تک موقع نہ ملا ہوگا؟

اور اسی کا نتیجہ یہ بھی تھا کہ یوں تو اس سرزمین میں کھانے کے شوقین صد ہا نہیں پیدا ہو گئے۔ مگر نواب سالار جنگ کے خاندان کو آخر تک الوانِ نعمت کی ایجاد و ترقی میں خاص شہرت ہوئی۔

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ خود نواب سالار جنگ کا باورچی جو صرف اُنکے لیے کھانا تیار کیا کرتا تھا یا رہ سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتا تھا۔ تنخواہ آج بھی کسی بڑے سے بڑے ہندوستانی دربار میں کسی باورچی کو نہیں ملتی۔ خاص اُنکے لیے وہ ایسا بھاری پلاؤ پکاتا کہ سوا اُنکے اور کوئی اُسے مضمت نہ کر سکتا۔ یہاں تک کہ ایک دن نواب شجاع الدولہ نے اُن سے کہا ”تم نے کبھی ہمیں وہ پلاؤ نہ کھلایا جو خاص اپنے لیے پکویا کرتے ہو؟“ عرض کیا ”بہتر ہے۔ آج حاضر کروں گا۔“ باورچی سے کہا ”جتنی پلاؤ روز پکاتے ہو آج اُس کا دو تاپکا نا۔“ اُس نے کہا ”میں تو صرف آپ کے خالص کے لیے نوکر ہوں۔ کسی اور کے لیے نہیں پکا سکتا۔“ کہا ”اے نواب صاحب نے فرمائش کی ہے۔ ممکن ہے کہ میں اُن کے لیے نہ لے جاؤں؟“

اُس نے کہا "کوئی ہو۔ میں تو اور کسی کے لیے نہیں بچا سکتا" جب سالار جنگ نے زیادہ اصرار کیا تو اُس نے کہا "بہتر۔ مگر شرط یہ ہے کہ حضور خود لے جاکے اپنے سامنے کھلائیں۔ اور پندرہ لکھوں سے زیادہ نہ کھائے دیں۔ اور احتیاطاً آبدار خانے کا انتظام بھی کر کے اپنے ساتھ لے جائیں۔" سالار جنگ نے یہ شرطیں قبول کیں۔ آخر باورچی نے پلاؤ تیار کیا اور سالار جنگ خود لے کے پوچھے اور دسترخوان پر پیش کیا۔ شجاع الدولہ نے کھاتے ہی بہت تعریف کی۔ اور غبت کے ساتھ کھاتے لگے۔ مگر دو ہی چار لقمے کھائے تھے کہ سالار جنگ نے پڑھ کر ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہا "بس۔ اس سے زیادہ نہ کھائیے۔" شجاع الدولہ نے حیرت سے اُن کی صورت دیکھی اور کہا "ان چار لکھوں میں کیا ہوتا ہے؟" اور یہ کہہ کر زبردستی دو ایک لقمے اور کھا ہی لیے۔ اب پیاس کی شدت ہوئی۔ سالار جنگ نے اپنے آبدار خانے سے جو ساٹھ گیارہ پانی منگو منگو کے پلانا شروع کیا۔ بڑی دیر کے بعد خدا خدا کر کے تشنگی موقوف ہوئی۔ اور سالار جنگ اپنے گھر آئے۔

آج کل کے مذاق میں یہ غذا کی کوئی خوبی نہیں سمجھی جاسکتی۔ مگر اُس زمانے میں اور پرانے مذاق کے کھاتے والوں کے نزدیک اب بھی غذا کی خوبی کا پہلی معیار یہی ہے کہ غذائیں بہ ظاہر نفیس و لطیف ہوں مگر اصل میں اس قدر قوی اور معدے پر گراں ہوں کہ ہر معدہ برداشت نہ کر سکے۔

دوسرا کمال یہ تھا کہ کسی ایک چیز کو مختلف صورتوں میں دکھائے ایسا بنا دیا جائے کہ دسترخوان پر ظاہر میں تو یہ نظر آئے کہ بیسیوں قسم کے الوان نعمت موجود ہیں۔ مگر چکھیے اور غور کیجیے تو وہ سب ایک ہی چیز ہیں۔ مثلاً معتبر ذرا بچ سے سنا جاتا ہے کہ دہلی کے شاہزادوں میں سے مرزا آسمان قدر فرزند مرزا حرم بخش جو لکھنؤ میں آ کے غلیہ ہوئے اور چند روز یہاں ٹھہرنے کے بعد بنارس میں جا کے قیام پذیر ہو گئے۔ قیام لکھنؤ کے زمانے میں واجد علی شاہ نے اُنکی دعوت کی تو دسترخوان پر ایک مرتبہ لاکے رکھا گیا جو صورت میں نہایت ہی نفیس و لطیف اور مرغوب معلوم ہوتا تھا۔ مرزا آسمان قدر نے اُسکا لقمہ کھایا تو چکر ائے۔ اسلئے

کہ وہ مرتبہ نہ تھا بلکہ گوشت کا ٹکین تو رہا تھا۔ جس کی صورت رکا ہمارے بعضینہ  
مرتبے کی سی بنا دی تھی۔ یوں دھوکا کھا جانے پر انھیں ندامت ہوئی۔ اور  
واجد علی شاہ خوش ہوئے کہ دہلی کے ایک معزز شاہزادے کو دھوکا دیدیا۔  
دو چار روز بعد مرزا آسمان قدس نے واجد علی شاہ کی دعوت کی۔ اور  
واجد علی شاہ یہ خیال کر کے آئے تھے کہ مجھے ضرور دھوکا دیا جائے گا۔ مگر اس  
ہوشیار پر بھی دھوکا کھا گئے۔ اس لیے کہ آسمان قدس کے باورچی شیخ حسین علی  
نے یہ کمال کیا تھا کہ گو دسترخوان پر صدا ہالوان نعمت اور قسم قسم کے کھانے  
چنے ہوئے تھے۔ پلاؤ تھا۔ زردہ تھا۔ برائی تھی۔ تو رہا تھا۔ کباب تھے۔  
توکاریاں تھیں۔ چٹیاں تھیں۔ اچار تھے۔ روٹیاں تھیں۔ پراٹھے تھے  
شیرمالین تھیں۔ غرض کہ سب نعمت موجود تھی۔ مگر جس چیز کو چکھا شکر کی بنی ہوئی  
تھی۔ ساکن تھا تو شکر کا۔ چائوں تھے تو شکر کے۔ اچار تھا۔ تو شکر کا۔ اور  
روٹیاں تھیں تو شکر کی۔ یہاں تک کہ کتنے ہن تمام برتن۔ دسترخوان۔ اور  
سلیچی آفتابہ تک شکر کے تھے۔ واجد علی شاہ گھبرا گھبرا کے ایک ایک چیز پر  
ہاتھ ڈالتے تھے اور دھوکے پر دھوکا کھاتے تھے۔

ہم بیان کر آئے ہیں کہ نواب شجاع الدولہ ہمارے خاصے پرچہ مقاموں سے  
کھانے کے خوان آیا کرتے تھے۔ مگر یہ انھیں ایک مختصر نہ تھا۔ ان کے بعد بھی یہ طریقہ  
جاری رہا کہ اکثر معزز امرا خصوصاً اعزائے شاہی کو یہ عزت دی جاتی کہ وہ خاصے  
کے لیے خاص خاص قسم کے کھانے بلاناغہ بھیجا کرتے۔

چنانچہ ہمارے دوست نواب محمد شفیع خان صاحب ہاوریٹا پوری کا بیان ہے  
کہ اُن کے نانا نواب آقا علی حسن خان صاحب کے گھر سے جو نیشاپوریوں میں سب  
زیادہ نامور اور ممتاز تھے بادشاہ کے لیے روغنی روٹی اور پیٹھا بھیجایا کرتا۔ روغنی  
روٹیاں اس قدر پارک اور نفاست سے پکا لی جاتیں کہ موٹے کاغذ سے زیادہ  
گندہ نہ ہوتیں۔ اور پھر یہ ممکن نہ تھا کہ چٹیاں پڑیں اور نہ یہ مجال تھی کہ کسی جگہ پر  
بکچی رہ جائیں۔ پیٹھا بھی ایک خاص چیز تھا جو بڑے اہتمام سے تیار کرایا جاتا  
دہلی میں بریانی کا زیادہ رواج ہے اور تھا۔ مگر لکھنؤ کی نفاست نے پلاؤ کو

اُس پر ترجیح دی۔ خواہم کی نظر میں دونوں قریب قریب بلکہ ایک ہی ہیں۔ مگر بریائی میں سالے کی زیادتی سے سالن ملے ہوئے چاولوں کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پلاؤ میں اتنی لطافت۔ نفاست۔ اور صفائی ضروری سمجھی جاتی ہے کہ بریائی اُس کے سامنے مغلوبہ سی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ معمولی قسم کے پلاؤ سے بریائی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ وہ پلاؤ شکہ معلوم ہوتا ہے جو عیب بریائی میں نہیں ہوتا۔ مگر اعلیٰ وجہ کے پلاؤ کے مقابل بریائی نفاست پسند لوگوں کی نظر میں بہت ہی لدھڑا اور بد نما غذا ہے۔ بس یہی فرق تھا جس نے لکھنؤ میں پلاؤ کو زیادہ مروج بنا دیا۔

پلاؤ یہاں کہنے کو تو سات طرح کے مشہور ہیں۔ اُن میں سے بھی صرف گزرا پلاؤ۔ نور پلاؤ۔ کوکو پلاؤ۔ موتی پلاؤ۔ اور پیل پلاؤ کے نام ہیں اس وقت یاد ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ یہاں کے اعلیٰ درجے کے دسترخوان پر بیسیوں طرح کے پلاؤ ہوا کرتے تھے۔ محمد علی شاہ کے بیٹے مرزا عظیم الشان نے ایک شادی کے موقع پر ستمھی ملاپ کی دعوت کی تھی جس میں خود فرمان روا سے وقت واصلی شاہ بھی شریک تھے۔ اُس دعوت میں دسترخوان برنگین اور شیشے کی ستر قسم کے چاول تھے۔

فاتر الدین حیدر بادشاہ کے عہد میں نواب سالار جنگ کے خاندان سے ایک رئیس تھے۔ نواب حسین علی خان۔ اُنھیں کھانے کا بڑا شوق تھا۔ خصوصاً پلاؤ کا۔ اُن کے دسترخوان پر بیسیوں طرح کے پلاؤ ہوا کرتے۔ اور وہ ایسی نفاست اور لطافت کے ساتھ تیار کیے جاتے کہ شہر بھر میں اُن کی شہرت ہو گئی۔ یہاں تک کہ روٹا و عائد میں سے کوئی اُن کے مقابلے کی جرأت نہ کر سکتا۔ خود بادشاہ کو اُن پر رشک تھا۔ اور کھانے کے شوقینوں میں وہ ”چاول دا لے“ مشہور ہو گئے تھے۔

نصیر الدین حیدر کے عہد میں باہر کا ایک باورچی آیا جو پستے اور بادام کی کھچڑی پکاتا۔ بادام کے سڈول اور صاف ستھرے چاول بناتا۔ پستے کی دال تیار کرتا۔ اور اس نفاست سے پکاتا کہ معلوم ہوتا نہایت عمدہ نفیس اور بھری

ماش کی کچڑی ہے۔ مگر کھائیے تو اور ہی لذت تھی۔ اور ایسا ذائقہ جس کا مزہ زبان کو زندگی بھر نہ بھولتا۔

نواب سعادت علی خان کے زمانے میں ایک صاحب کمال باورچی صرف چائوں کی گلتھی پکاتا۔ مگر ایسی گلتھی جو شاہی دسترخوان کی رونق فرما کر اس وقت کو نہایت ہی مرغوب تھی۔ اور شہر کے تمام رئیسوں کو اس کا ایک لقمہ لچانے کی تمنا تھی۔ مشہور ہے کہ نواب آصف الدولہ کے سامنے ایک نیا باورچی پیش ہوا۔ پوچھا گیا ”کیا پکاتے ہو؟“ کہا صرف ماش کی دال پکاتا ہوں۔ پوچھا ”تو آہ کیا لوگ؟“ کہا ”پان سو روپیہ۔“ نواب نے ذکر رکھ لیا۔ مگر اس نے کہا ”میں چند شرطوں پر نوکری کروں گا۔“ پوچھا ”وہ شرطیں کیا ہیں؟“ کہا ”جب حضور کو میرے ہاتھ کی دال کا شوق ہو ایک روز پہلے سے حکم ہو جائے۔ اور جب اطلاع دون کہ تیار رہے تو حضور اسی وقت تناول فرمالیں۔“ نواب نے یہ شرطیں بھی منظور کر لیں۔ چند ماہ کے بعد اسے دال پکانے کا حکم ہوا۔ اس نے تیار کی۔ اور نواب کو خبر کی۔ اُنھوں نے کہا ”اچھا دسترخوان سجھاؤ میں آتا ہوں۔“ دسترخوان سجھا۔ مگر نواب باؤن میں لگے رہے۔ اس نے جاکے پھر اطلاع دی کہ ”خامہ تیار ہے۔“ نواب کہہ پھر آئے میں دیر ہوئی۔ اس نے سہارہ خبر کی۔ اور اسپر بھی نواب صاحب نے آئے تو اس نے دال کی ہانڈی اٹھا کے ایک سوکھے پیڑ کی چڑ میں اڈیل دی۔ اُسے استفادے کے چلا گیا۔ نواب کو افسوس ہوا۔ ڈھونڈھوا یا مگر اس کا پتہ نہ لگا۔ مگر چند روز بعد دیکھا تو جس درخت کے نیچے دال پھینکی گئی تھی وہ سرسبز ہو گیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس واقعے میں مبالغہ ہے۔ جس نے اسے خلاف قیاس ہونے کے سوجے تک پہنچا دیا ہے۔ مگر اس سے اتنا اندازہ الیہ ہو جاتا ہے کہ دربار میں باورچیوں کی کس درجہ قدر ہوتی تھی۔ اور کوئی صاحب کمال باورچی آ جانا تو کس فیاضی سے روک لیا جاتا۔

امیروں کا یہ ذوق و شوق دیکھ کے باورچیوں نے بھی طرح طرح کی جدت طرائف شروع کر دیں۔ کسی نے پلاؤ اور دانہ ایجاد کیا۔ اس میں ہر چاؤل اور دھایا وقت کی طرح سرخ اور جلادار ہوتا اور آدھا سفید۔ مگر اس میں بھی شیشہ

کی سی چمک موجد دہوتی۔ جب دسترخوان پر لائے لگایا جاتا تو معلوم ہوتا کہ پلٹ  
مین ایلن رنگ کے جواہرات رکھے ہوئے ہیں۔ ایک اور باورچی نے فورتن  
پلاؤ پکا کے پیش کیا جس میں فورتن کے مشہور جواہرات کے مثل نورنگ کے چانول  
ملا دیے۔ اور پھر رنگوں کی صفائی اور آب و تاب عجیب نقاست اور لطافت  
پیدا کر رہی تھی۔ اسی طرح کی غذا جانے کتنی ایجادیں ہو گئیں جو تمام گھروں  
اور باورچی خانوں میں پھیل گئیں۔

کھانے کے شوقین اگلے رئیسوں میں سے ایک نواب مرزا خان نیشاپوری  
تھے جو کہتے ہیں کہ چودہ ہزار ماہوار کے وثیقہ یاب تھے۔ اچھا کھانے کے شوق  
میں انھوں نے وہ کمال دکھایا اور ایسے اچھے اچھے باورچی جمع کر لیے کہ  
شہر میں ان کے دسترخوان کی دھوم تھی۔ دوسرے مرزا حیدر تھے۔ یہ بھی  
نیشاپوری اور ایسے محترم رئیس تھے کہ تمام نیشاپوری انکو اپنا سرتاج اور  
بزرگ مانتے۔ ان کی شان یہ تھی کہ جس کی دعوت میں جاتے ان کا آبدار خانہ  
گلوریوں کا سامان۔ اور سوڈیٹھ سوختے ان کے ساتھ جاتے۔ ان کی اس من  
اسے اکثر متوسط الحال لوگوں کو بڑی مدد مل جاتی۔ کسی نہ کسی طرح خوشامد  
درآمد کر کے ان سے دعوت قبول کرالیتے۔ اور ان کے قبول کر لینے کے  
یعنی تھے کہ محفل میں حقون۔ گلوریوں۔ اور پانی کا انتظام اُنکے دے ہو گیا۔  
اور پھر کیا انتظام جو کسی بڑے سے بڑے رئیس کے بھی امکان سے باہر تھا۔  
کھانا تیار کرنے والے تین گروہ ہیں۔ پہلے دیگ شو۔ جن کا کام دیگوں کا  
دھونا اور باورچیوں کی ماتحتی میں مزدوری کرنا ہے۔ دوسرے باورچی۔ یہ  
لوگ کھانا پکاتے ہیں اور اکثر بڑی بڑی دیگین تیار کر کے اُتارتے ہیں۔ تیسرے  
رکابدار۔ یہی لوگ اس فن کے اعلیٰ درجے کے ماہر اور صاحب کمال ہوتے ہیں  
یہ لوگ علی العموم چھوٹی ہانڈیاں پکاتے ہیں۔ اور بڑی دیگین اُتارنا اپنی شان  
اور مرتبہ سے ادنیٰ کام خیال کرتے ہیں۔ اگرچہ اکثر باورچی بھی چھوٹی ہانڈیاں  
پکاتے ہیں۔ مگر رکابداروں کا کام فقط چھوٹی ہانڈیوں تک محدود تھا۔ یہ لوگ  
میوہ جات کے پھول کترتے۔ کھانا نکالتے اور لگاتے میں سلیفہ۔ نقاست۔ اور

شکلف ظاہر کرتے۔ چوبھون اور قابون میں جو پکا دیا زردہ نکالا جاتا اس پر سوہ اجات اور دیگر طریقوں سے گلکاریاں کرتے اور نقش و نگار بناتے۔ تہا رت نفس اور لطیف مرنے اور اچا رتیار کرتے اور کھانوں میں اپنی طبیعت داری سے صد ہا قسم کی صنعتیں دکھاتے۔

غازی الدین حیدر پہلے شاہ اودھ کو پرستے پسند تھے۔ اُن کا رکابدار ہر روز چند پرستے پکاتا۔ اور فی پر اٹھا پانچ سیر کے حساب سے ۳۰ سیر گھی روز لیا کرتا۔ ایک دن وزیر سلطنت مستعد الدولہ آغا میر نے شاہی رکابدار کو بلانے پوچھا "اے بھئی تیس سیر گھی کیا ہوتا ہے؟" کہا "حضور پرستے پکاتا ہوں" کہا "بھلا میرے سہانے تو پکاؤ" اُس نے کہا "بہت خوب" پرستے پکائے۔ جتنا گھی کھیا کھیا یا۔ اور جو باقی بچا پھینک دیا۔ مستعد الدولہ آغا میر نے یہ دیکھ کے حیرت اور استعجاب سے کہا "یو را گھی تو خرچ نہیں ہوا؟" اُس نے کہا "اب یہ گھی تو بالکل تیل ہو گیا۔ اس قابل تھوڑے ہی ہے کہ کسی اور کھانے میں لگا یا جائے" وزیر سے جواب تو نہ بن پڑا مگر حکم دے دیا کہ "آئندہ سے صرف پانچ سیر گھی دیا جائے" فی پر اٹھا ایک سیر بہت ہے۔ رکابدار نے کہا "بہترین اتنے ہی گھی میں پکا دیا کر دن گا" مگر وزیر کی روک ٹوک سے اس قدر ناراض ہوا کہ معمولی قسم کے پرستے پکانے کے بادشاہ کے خاصے پر بھیج دیے جب کئی دن یہی حالت رہی تو بادشاہ نے شکایت کی کہ "یہ پرستے اب کیسے آتے ہیں؟" رکابدار نے عرض کیا "حضور جیسے پرستے ذاب مستعد الدولہ بہادر کا حکم ہے پکاتا ہوں" بادشاہ نے اس کی حقیقت پوچھی تو اُس نے سارا حال بیان کر دیا۔ فوراً مستعد الدولہ کی یاد ہوئی۔ اُنھوں نے عرض کیا "جہاں پناہ۔ یہ لوگ خواہ مخواہ کو لوتے ہیں" بادشاہ نے اس کے جواب میں دس پانچ تھپڑ اور گھونٹے رسید کیے۔ خوب ٹھونکا۔ اور کہا "تم نہیں لوٹے ہو؟ تم جو ساری سلطنت اور سارے ملک کو لٹے لینے ہو اس کا خیال نہیں۔ یہ جو تھوڑا سا گھی زیادہ لے لیتا ہے اور وہ بھی میرے خاصے کے لیے۔ یہ تمہیں نہیں گوارا ہے؟ بہر حال مستعد الدولہ نے توبہ کی۔ کان اُٹھے۔ تو خلعت ہوا۔ جو اس بات کی نشانی تصور کی جاتی کہ آج

جہاں پناہ نے درست شفقت پھیرا ہے۔ اور اپنے گھر آئے۔ پھر اُنھوں نے کبھی اُس رکابدار سے قرض نہ کیا۔ اور وہ اُسی طرح ۳۰ سیر بھی روزانہ لیتا رہا۔

(۲۹)

نواب ابوالقاسم خان ایک شوقین رئیس تھے۔ اُنکے وہاں بہت بھاری چمچاؤ لگتا۔ ۲۵۰ سیر گوشت کی بخنی تیار کر کے مقطر کر لی جاتی اور اُس میں چائول دم کیے جاتے۔ اور پھر اس لطف کے ساتھ کہ لقمہ منہ میں رکھتے ہی معلوم ہوتا کہ سب چائول خود ہی گھل کے حلق سے اُتر گئے۔ پھر اُسکے ساتھ اس درجہ لطافت کہ بچال کیا چوڑا بھی محسوس ہو سکے کہ اُس میں کسی قسم کی گرائی ہے۔ اتنی ہی یا اس سے زیادہ قوت کا پلاؤ واجد علی شاہ کی خاص محل صاحبہ کے لیے روزانہ تیار ہوا کرتا تھا۔

ممدوح بالا معزول شاہ اودھ کے ہمراہ ٹیپو برج میں ایک رئیس تھے جن کا منشی السلطان بہادر خطاب تھا۔ بڑے و صندار اور نفیس مزاج شوقینوں میں تھے کھانے کا بے حد شوق تھا۔ اور اگرچہ کئی صاحب کمال باورچی موجود تھے مگر اُنھیں حیب تک دو ایک چیزیں خود اپنے ہاتھ سے نہ پکا لیتے کھانے میں مزہ نہ آتا۔ آخر اُنکے اچھے کھانے کی بیان تک شہرت ہوئی کہ واجد علی شاہ کہا کرتے اچھا تو منشی السلطان کھاتے ہیں۔ میں کیا اچھا کھاؤں گا۔ بچپن میں چھ سات برس تک ٹیپو برج میں اُنھیں کے ساتھ رہا۔ اور اُنھیں کے ساتھ دسترخوان پر شریک ہوتا رہا۔ میں نے اُن کے دسترخوان پر تیس چالیس قسم کے پلاؤ اور بیسیوں قسم کے سالن کھائے۔ جن میں سے بعض ایسے تھے کہ پھر کبھی کھانا نہ نصیب ہو سکے۔ اُنھیں حلوا سوہن کا بھی بڑا شوق تھا۔ جس کا ذکر اپنے محل پر آئے گا۔

آخر زمانے میں اور غدر کے بعد لکھنؤ میں حکیم بندہ ہمدی مرحوم کو کھانے اور پینے کا بے حد شوق تھا۔ اور بڑے بڑے دولتمند اور شوقین لوگوں کو یقین ہو کہ جیسا کھانا اُنھوں نے کھایا اور جیسا کپڑا اُنھوں نے پہنا اس زمانے میں بہت کم کسی کو نصیب ہو سکا۔ ہمارے ایک مہر و معزود دست فرماتے ہیں کہ ہمارے



خاندان سے حکیم صاحب موصوف سے بہت ربط و ضبط تھا۔ ایک دن حکیم صاحب نے ہمارے والد اور چچا کو بلا بھیجا کہ ایک پہلوان کی دعوت ہے۔ آپ بھی آکے لطفت دیکھیے۔ والد تشریف لے گئے اور میں بھی اُن کے ساتھ گیا۔ وہاں جا کے معلوم ہوا کہ وہ پہلوان روز صبح کو بس سیر و دودھ پیتا ہے۔ اُس پر ڈھائی تین سیر میوہ یعنی بادام اور پستے کھاتا ہے اور دوپہر اور شام کو ڈھائی سیر اٹے کی روٹیاں اور ایک متوسط درجے کا کیرا کھا جاتا ہے۔ اور اسی غذا کے مناسب اُس کا تن و توش بھی تھا۔ وہ ناشتے کے لیے بیاب تھا۔ اور بار بار تقاضا کر رہا تھا کہ کھانا جلدی منگوائیے۔ مگر حکیم صاحب جان بوجھ کے ٹالی رہے تھے۔ یہاں تک کہ بھوک کی شدت نے اُسے بیٹاب کر دیا۔ اور اب وہ ناراض ہو کر اُسٹھ لگا۔ تب حکیم صاحب کھانا بھیجنے کا وعدہ کر کے اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر اور ٹالنا۔ اور جب دیکھا کہ اب وہ بھوک کو بالکل برداشت نہیں کر سکتا تو ہماری تہری کے ہاتھ ایک خان بھیجا۔ جس کی صورت دیکھتے ہی پہلوان صاحب کی جان میں جان آئی۔ مگر جب اُسے کھولا تو ایک چھوٹی مٹھری میں تھوڑا سا پلاؤ تھا۔ جس کی مقدار چھانک بھر سے زیادہ نہ ہوگی۔ پُر خوراکان کو یہ چاقول دیکھ کے بڑا طیش آیا جو اُس کے ایک لٹھے کے لیے بھی کافی نہ تھے۔ قصد کیا کہ اٹھ کے چلا جائے مگر لوگوں نے سمجھا بچہ کے روکا۔ اور اُس نے مجبوراً وہ مٹھری اٹھا کے منہ میں انڈیل لی۔ اور بغیر منہ چلائے نگل گیا۔ پانچ منٹ کے بعد اُس نے پانی مانگا۔ اور اُس کے پانچ منٹ بعد پھر پانی پیا اور ڈکار لی۔ اب اندر سے کھانے کے خان آئے۔ دسترخوان بھیجا۔ خود حکیم صاحب بھی آئے۔ کھانا چننا گیا اور وہی پلاؤ جس میں سے ایک لقمہ پہلے بھیجا گیا تھا اُس کی لپیٹ جس میں کوئی ڈیڑھ پاؤ چاقول ہونے حکیم صاحب کے سامنے لگائی گئی۔ حکیم صاحب نے اُس لپیٹ کو اُس پہلوان کے سامنے پیش کیا اور کہا دیکھیے یہ مٹی پلاؤ ہے یا کوئی اور؟ اُس نے قبول کیا کہ وہی ہے۔ حکیم صاحب نے کھانا تو اب کھائیے۔ بٹھے افسوس ہے کہ اسکی تیاری میں دیر ہوئی۔ اور آپ کو تکلیف اُٹھانا پڑی۔ پہلوان نے کہا ”مگر اب مجھے معاف فرمائیے۔ میں اُسی پہلے لٹھے سے سیر ہو گیا۔ اور اب

ایک چانول بھی نہیں کھا سکتا۔ ہزار اصرار کیا گیا مگر اُس نے قطعاً ہاتھ روک لیا۔ اور کہا "کھاؤں کیونکر؟ جب پیٹ میں جگہ بھی ہو" حکیم صاحب نے وہ چانول لے کے سب کھالیے۔ اور اُس سے کہا "بیس بیس سیر اور تیس تیس سیر کھا جانا انسان کی غذا نہیں۔ یہ تو گائے بھینس کی غذا ہوئی۔ انسان کی غذا یہ ہے کہ چند لقمے کھائے۔ مگر اُن سے قوت و توانائی وہ آئے جو بیس تیس سیر غلہ کھانے میں بھی نہ آسکے۔ آپ اس ایک لقمے میں سیر ہو گئے ہیں۔ کل پھر آپ کی مدد ہے۔ کل آکے بتائیے گا کہ اس ایک لقمے سے آپ کو ایسی ہی قوت و توانائی محسوس ہوئی جیسی کہ ۲۰ سیر دودھ اور سیر دن میوے اور گوشت اور غلے سے حاصل ہوتی تھی یا اُس سے کم؟" اور ہم سب کو بھی حکیم صاحب نے دوسرے دن مدعو کر دیا۔ دوسرے دن اُس پہلوان نے آکے بیان کیا کہ "مجھے زندگی پھر ایسی توانائی اور چوپالی نہیں نصیب ہوئی تھی جیسی کہ کل سے آج تک رہی۔"

شاہی خاندان کے لوگوں میں سے آخر عہد میں نواب محسن الدولہ اور نواب مختار الدولہ دسترخوان اور باورچی خانے کے شوق اندر کمال میں پہنچے نظیر ملے جاتے۔ اور اُنھیں کا باورچی تھا جو حکیم بندہ ہدی صاحب کے سہیلے یہ پلا و تیار کیا کرتا تھا۔ اُنھیں دنوں ملکہ زمانہ کی ایک بڑی سرکار قائم تھی اور اُن کا باورچی خانہ مشہور تھا۔ جس میں روزانہ تین سو روپے کی پخت ہوتی۔ اسی عہد میں شاہزادہ سیدی علی خان کی سرکار میں قائم علی امام ایک باورچی نوکر تھا وہ مسلم ٹھیلی اسی بے مثل پکا تا تھا کہ تمام رئیسوں میں مشہور تھی۔ اور دوسری سرکاروں کے باورچیوں نے ہزار کوشش کی مگر وہ بات نہ پیدا کر سکے۔ نصیر الدین حیدر کے زمانے میں محمد و نام ایک ولایتی شخص نے آکے فرنگی محل میں باورچی کی دوکان کھولی۔ اور اُس کی ہزاری کی ایسی شہرت ہوئی کہ پٹے پٹے رئیس اور شاہزادے تک اُس کی ہماری کی قدر کرتے۔ قدر دانی نے اُس کا جو صلہ بڑھایا۔ اور اُس نے شیر مال اسیا دکی جو آج تک لکھنؤ کا سرمایہ نا نہیں۔ روٹیوں کی بہت سی قسمیں مشہور اور مختلف شہروں میں مروج

ہیں۔ ایران سے مسلمان خمیری روٹیاں کھاتے اور ہندوستان کی سرزمین میں  
تورگاڑتے ہوئے آئے تھے۔ مگر اس وقت تک سادی روٹیاں یقیناً جن میں  
گھی کا لگاؤ نہ ہوتا۔ ہندوؤں کو پوریاں ملتے دیکھ کے مسلمانوں نے تو سے کی  
روٹیوں میں گھی کا جذبے کے پراسٹے ایجاد کیے۔ اور پھر ان میں متعدد پتھرین  
اور تھین دینا شروع کیں۔ پھر اسی پراسٹے میں پہلی ترقی یہ ہوئی کہ باقر خانی  
کا رواج ہوا جو ابتدائے امرائے دسترخوان کی بہت تکلفی روٹی تھی۔ لکھنؤ میں  
محمد حسن نے باقر خانی پر بہت ترقی دے کے شیر مال پکائی جو مرے۔ بوباس۔  
نفاست اور لطافت میں باقر خانی اور تکلفی روٹیوں کے تمام اصناف سے  
پرخص گئی۔ شیر مال آج تک سو لکھنؤ کے اور کہیں نہیں پکتی۔ اور پکتی بھی ہے تو  
ایسی نہیں پک سکتی۔ چند ہی روز میں شیر مال کو ایسی عام مقبولیت حاصل  
ہوئی کہ وہ لکھنؤ کی نیشنل روٹی قرار پا گئی۔ یہاں تک کہ جس دعوت میں شیر مال  
نہ ہو وہ مکمل نہیں سمجھی جاتی۔

شیر مال کی ایجاد نے محمد کو اس قدر قدر پڑھائی کہ شاہی مجالس اور تقریبات  
کے لیے اُسے بعض اوقات ایک ایک لاکھ شیر مالوں کا آرڈر ایک دن میں ملا۔  
اور اُس نے بھی ایسا کافی انتظام کر رکھا تھا کہ جتنی شیر مالیں مانگی جاتیں حیا  
کر دیتا۔ محمد کو جاننا نہیں ان دنوں علی حسین تھا جو کئی سبب سے مر گیا۔ مگر کسی  
دکان سے آج بھی جیسی اعلیٰ درجے کی شیر مالیں مل سکتی ہیں اور کہیں نہیں  
مل سکتیں۔

شیر مال سے بھی زیادہ مزہ دار نان جلیبی ہوتی ہے جو خاص اہتمام سے  
پکوائی جاتی ہے۔ اور وہی رکابدار اُسے مل کر سکتے ہیں جو واقعہ ہیں۔ اور  
باورچیوں کو دعوت ہے کہ لکھنؤ کے باورچیوں سے اچھی نان جلیبی کوئی نہیں پکا  
سکتا۔ پراٹھوں میں لکھنؤ اسی درجے پر ہے جو دوسرے شہروں کو حاصل ہے۔  
اس میں بظاہر کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ دہلی کے اچھے  
نان پائی بہت اعلیٰ درجے کے پراسٹے پکاتے ہیں۔ اور سیر بھرائے میں پورا  
سیر بھر گھی کھپا دیتے ہیں۔ مگر میں نے اپنے زمانہ قیام دہلی میں کئی بار مشہور

انسان بایون سے پر اسٹھ پکواسٹے۔ بیشک اُنھوں نے کبھی بہت خرچ کر دیا۔ مگر چونکہ آٹے کے اندر کبھی نہیں دیا تھا اس لیے وہ اُسی وقت تک کھاتے کے قابل تھے جب تک کہ تازے کھالے جائیں۔ ٹکڑے ہوتے ہی چرٹ ہو گئے۔ روٹی کو توڑ کے اور اُس میں گھی شکر ملا کے کل دینا ایک عام اور معمولی غذا ہے جس کا اکثر فاتحون اور نیا زون میں زیادہ رواج ہے۔ مگر شاہی باورچی خانے کے یہاں کے باورچی ایسا لطیف عمدہ تیار کرتے جو بعض فرمان رواؤں کو نہایت ہی مرغوب تھا۔ اور تعریف یہ تھی کہ منہ میں لقمہ لیتے ہی شربت بن جاتے اور معلوم ہو کہ چائے یا منہ چلانے کی مطلق ضرورت نہیں۔

اسی روٹی کے سلسلے میں یہاں تک ترقی ہوئی کہ صرف دودھ کی پوریان پکائی جاتے لیکن جن میں آٹے کا بالکل جز نہ ہوتا۔ صرف دودھ کے چین میں گندھے ہوئے میدے کی شان پیدا کر لی۔ اور آخر میں یہاں تک ترقی ہوئی کہ دودھ کی گوریان اور دیگر اقسام کی چیزیں تیار ہونے لگیں۔ اسی طرح خالص دودھ کی پیگیری دسترخوانوں پر آتی جو بہت ہی نفیس لطیف غذا اور امر کو بہت پسند تھی۔

لیکن مسلمانوں کی تیشیل ڈش یعنی قومی غذا پلاؤ اور قورمہ ہے۔ لہذا سب زیادہ نزاکت و لطافت اُنھیں چیزوں میں دکھائی گئی۔ پلاؤ کے متعلق ہم بہت کچھ بیان کر چکے ہیں۔ پھر بھی بعض باتیں باقی رہ گئیں۔ دو ٹمذ اور شوقین امیروں کے لیے مرغ مشک و زعفران کی گولیاں کھلا کھلا کے تیار کیے جاتے۔ یہاں تک کہ اُن کے گوشت میں ان دونوں چیزوں کی خوشبو سرایت کر جاتی۔ اور ہر رگ و ریشہ معطر ہو جاتا۔ پھر اُن کی سخی دکالی جاتی۔ اور اُس سخی میں چاؤل دم دے دیے جاتے۔

موتی پلاؤ کی یہ شان تھی کہ معلوم ہوتا چاؤلون میں آبدار موتی لے ہوئے ہیں۔ اُس کے لیے موتیوں کے تیار کرنے کی یہ ترکیب تھی کہ تولہ بھر چاندی کے ورق اور ماشہ بھر سونے کے ورق انڈے کی زردی میں خوب حل کیے جاتے۔

پھر اس محل شدہ مرکب کو مرغ کے ترخسے میں بھر کے ترخسے کے ہر ہر چوڑے پر  
 ایک دھاکا کس کے باندھ دیا جاتا۔ اور اسے خفیف سا جوش دے کے  
 چاقو سے ترخسے کی کھال چاک کر دی جاتی اور سوڈول آجہار موقی نکل آتے  
 جو پلاؤ میں گوشت کے ساتھ دم کر دیے جاتے۔ بعض رکابدار پیر کے موقی  
 بناتے اور اس پر چاندی کا ورق چڑھا دیتے۔ ہر حال ایسی ہی بدترین عمل  
 میں آئیں کہ اور کہیں لوگوں کے خیال میں بھی نہ آئی ہو تین بعض رکابداروں  
 نے پلاؤ کی تیاری میں یہ صنعت دکھائی کہ گوشت کی چھوٹی چھوٹی چڑیاں بنا کے  
 اور خوب اغیاط سے اس طرح پکا کے کہ صورت نہ بگڑنے پائے پلیٹ میں  
 بچھا دیں۔ چاقوؤں کی صورت دالنے کی کر دی۔ اور معلوم ہوتا کہ ہر مکان کے  
 سامنے پلیٹ میں چڑیاں بٹھی دائر چل رہی ہیں۔ پھولے ہوئے سمو جس میں  
 سے توڑتے ہی لال نکل کے اڑ جاتے۔ حیدر آباد دکن میں غالباً لکھنؤ کے رکابدار  
 پیر علی نے آکر تیار کیے جو سرکاری ڈنوں میں میز پر آئے اور معزز انگریزوں  
 اور لیڈیوں کو بہت منظور کیا۔ اس کی ایجاد سب سے پہلے نصیر الدین حیدر  
 کے دسترخوان پر ہوئی تھی۔ مگر چڑیوں والا مذکورہ بالا پلاؤ اس سے بدرجہا زیادہ  
 دلچسپ صنعت تھا۔

ایک رکابدار نے یہ صنعت دکھائی کہ دسترخوان بد بڑے بڑے سیر سپر بھر  
 کے انڈے اُبلے اور تلے ہوئے پیش کیے۔ جن میں سفیدی اور زردی اسی نسبت  
 اور وضع سے قائم تھی جو سمولی انڈوں میں ہوا کرتی ہے۔ بعض رکابداروں  
 نے بادام کا سالن پکایا جو بے بیہ سیم کے بچوں کے مثل اور مرغے اور لطافت  
 میں اس سے بڑھا ہوا تھا۔ وزیر سلطنت روشن الدولہ کے باورچی نے کچے  
 بھٹوں کے پچھے اس نفاست سے کائے کہ کہیں ٹوٹے نہ پالے۔ اور ان کا  
 راتنا ایسا اعلیٰ درجے کا بنایا کہ جس نے چکھا عشق کر گیا۔

ہمارے میز پر خوشنویس منشی شاہ علی صاحب نے چاقوؤں پر قلم ہوا سند  
 لکھ کے بے مثل کمال دکھایا ہے مگر بہان کے ایک باورچی نے شاہی بن منشا  
 کے دافون میں چاقو اور طہت کھٹل کے سے خارج پیدا کیے۔ اور اسے خاص

ترکیب سے پکا کے دسترخوان پر پیش کیا تھا۔

پیر علی لکھنؤ کا مشہور رکابدار جو حضور نظام کے باورچی خانے میں ملازم تھا ایک نہایت قیمتی اور لذیذ اہر کی دال پکا یا کرتا جو اگلے فرمانروایان لکھنؤ کے باورچی خانوں میں پکا کرتی تھی۔ اور سلطانی دال کے نام سے مشہور تھی۔

بعض رکابدار مسلم کر لیے ایسی نفاست اور صفائی سے پکاتے کہ دیکھے تو معلوم ہوتا کہ اُنھیں بھاپ بھی نہیں لگی ہے۔ ویسے ہی ہرے اور کچے رکھے ہیں۔ مگر کاٹ کے کھائے تو نہایت ہی پُر لطف اور لذیذ ہوتے ہیں۔ اسی قسم کا ایک واقعہ آج ہی کل کے زمانے میں ہمارے مکرم دوست سید علی اوسط صاحب کو پیش آیا۔ اُن کا بیان ہے کہ موجودہ خاندانی دوسلے لکھنؤ میں سے نواب علی نقی خان نے ایک دن مجھ سے کہا کہ رات کا کھانا ذرا انتظار کر کے کھائے گا میں کچھ بھیجوں گا۔ رات کو حسب وعدہ کھانے کے وقت اُن کا آدمی ایک خوان لے کے آیا۔ میں نے وہ خوشق سے خوان اپنے سامنے لگوا کے کھلوایا تو اُس میں صرف ایک پلیٹ تھی اور اُس پر ایک کچا کدور کھا ہوا تھا دیکھ کے طبیعت نہایت منفص ہوئی۔ اتھارے یا س سے میں نے ماما سے کہا اسے لیجا کے رکھو۔ کل پکا لینا۔ مگر شاہزادے صاحب کے آدمی نے ہنس کے کہا اُسے کاٹ کے یوں ہی کھائے۔ پکانے کی ضرورت نہیں۔ اب میں نے جو اُسے کاٹا تو عجیب لذیذ اور مزے کی چیز نظر آئی۔ اور ایسا کبھی نہیں کھایا تھا رکابداروں نے سچ یہ ہے کہ اس قسم کی صنعتوں میں یہاں عجیب عجیب کمال دکھائے تھے۔ پیر علی رکابدار ٹھکانی کا انار بتاتا تھا۔ جس میں ادپر کا پھلکا اندر کے دانے۔ اُن کی ترتیب۔ اور اُنکے بیج کے پردے سب اصلی معلوم ہوتے۔ دانوں کی گھٹلیاں بادام کی ہوتیں۔ ناشپاتی کے عرق کے دانے ہوتے۔ دانوں کے بیج کے پردے اور ادپر کا پھلکا دونوں ٹکرے ہوتے۔

علی العموم رکابدار مرے اور اچار وغیرہ اور طرح طرح کی مٹھائیاں تیار کرتے۔ رجن میں صد ہا قسم کی ترکیبیں اور عجیب عجیب منتین اور نفاستیں دکھائی

جاتین۔ آم کا مرتبہ سب نے کھایا ہے مگر بیان رکا ہوا رسم ہری کیرون کا مرتبہ تیار کرتے۔ اور ان میں ویسے ہی سبز چھلکے اپنی اصلیت پر قائم رہتے ہیں یہ معلوم ہوتا کہ تازی کیریان ابھی توڑ کے لائی اور شیرے میں ڈال دی گئی ہیں۔

(۳۰)

مذکورہ تمام شکلات نے دعوتوں اور حصوں کے لیے جو کھانے علی المومنتین کو دیے تھے اُنکے مجموعے کا نام قور تھا۔ جس میں لازمی طور پر حسب ذیل غذا میں ہوتین (۱)، پلاؤ (۲)، مرغ (۳)، متجن (۴)، شیر مال (۵)، سفیدہ (۶) دیکھ چاول جن میں زعفران کا رنگ نہ دیا گیا ہو (۷) بورانی کے پیالے (۸) شیر برنج کے خواجے (۹) قورمہ (۱۰) تلی ہوئی ارویان گوشت میں (۱۱) شامی کہا یا والاہر یہ (۱۲) اچار یا چٹنی۔ اکثر جگہ قورے میں ان میں سے بعض چیزیں کم و بیش بھی کر دی جاتیں۔ مگر لکھنؤ میں علی المومنتین ہی کھانے مقبول تھے اور دعوتوں اور حصوں میں ان کے سوا اور کوئی چیز کم ہوتی تھی۔ دعوتوں میں یہ چیزیں دسترخوان پر ہر شخص کے سامنے جدا جدا پلیٹوں میں چنی جاتیں اور کہیں بھیجا ہوتا تو یہی قورہ لکڑی کے خوانوں میں رکھ کے اہتمام سے بھیجا جاتا۔

انگریزوں میں رواج ہے کہ میز چھوٹوں گلدستوں اور طرح طرح کی ذیتوں سے آراستہ کی جاتی ہے۔ اس کا اس قدر نمونہ یہاں بھی تھا کہ امیروں و نوابوں اور شاہزادوں میں جو قورے تقسیم ہوتے اُن میں کھانوں کے درمیان میں کاغذ کے پھولوں کا ایک گلدستہ بھی رکھ دیا جاتا۔ جس کو عوام اور اوسط درجے کے لوگوں نے نفول سمجھ کے ترک کر دیا۔

جن معزز سرکاروں اور اعلیٰ درجے کی ڈیوڑھیوں میں کھانا جاتا اُنکے رتبے اور درجے کے مطابق قورے میں الوان نعمت کا شمار بھی بڑھ جاتا۔ بادشاہ کے محل میں خاص جا پناہ کے لیے ایک سو ایک خوانوں کا قورہ جاتا۔ جس کی لاگت کا اندازہ پانچ سو روپیہ کا تھا۔ فرمان روایان اور دعوتین و جد علی شاہ کے والد امجد علی شاہ بڑے ثقہ اور متقی و پرہیزگار فرمان روا تھے۔ سنا ہی ہے

سمجھتے - اور امر شریعت کی پوری پابندی کرتے - اور کوئی کام بغیر حجاب قبلہ کو مکہ کی اجازت کے نہ کرتے - انھوں نے جوش اتقا میں ملک کا روپیہ اپنی ذات پر صرف کرنا حرام تصور کیا - اور اپنے تمام اعراسے خواہش کی کہ ہمیں دعوت میں بجاے کھانے کے تم لوگ نقد روپیہ بھیج دیا کرو - نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ پانچ سو روپیہ بھیج دیا کرتے - مگر ان کے ساتھ خوشنودی مزاج کے لیے ایک تورا بھی ضرور بھیجا جاتا - جس کے لیے اس کی پابندی نہ تھی کہ ایک سو ایک خوان ہوں -

خوانوں کی شان عام سوسائٹیوں میں یہ تھی کہ لکڑی کے خوان اُن پر رنگین تیلیوں کا گنبد نما جھانپہ - اُس پر ایک سفید کپڑے کا کسنا جو چوٹی کے اوپر باندھ دیا جاتا - اور شاہی باورچی خانے اور معزز امرا میں دستور تھا کہ اُس بندن پر لاکھ لگا کے ٹبر بھی کر دی جاتی - تاکہ درمیان میں کسی کو تصرف کا موقع نہ ملے پھر اُس کسے کے اوپر نہایت پر تکلف رنگین اور کمریشی خوان پوش ہوتا - یہ خوان پوش بڑی سرکاروں میں لازمی طور پر اٹلس اور کتھاب یا زینبت کے ہوتے - اور کبھی فقط لچکا ٹانگ دیا جاتا یا کارچوب کا کام ہوتا -

مکن ہے کہ یہ طریقہ دربار منلیہ میں بھی جاری ہو - اور وہیں سے لکھنؤ میں آیا ہو مگر ہم نے ان تکلفات کو جس اعلیٰ پائے پر لکھنؤ میں دیکھا دہلی میں نہیں دیکھا - یہاں کھانے پینے کے ادلے ادسلے مسائل میں یہ تکلفات لازمی اور طبیعت ثانیہ ہو گئے ہین - کسی معمولی شخص کے لیے بھی فقط پانی مانگا جائے تو مذہکار نہایت نفاست کے ساتھ گلاس کو تھالی میں رکھ کے اور اس پر بٹھرا ڈھانک کے لائے گا اور ادب سے پیش کرے گا -

اس شوق - اس نفاست - اور ان تکلفات نے سو ہی برس کے اندر لکھنؤ میں ایسے باکمال باورچی پیدا کر دیے جن کی ہندوستان کے ہر شہر اور ہر دربار میں شہرت اور قدر تھی - اور میں نے ہندوستان کے تمام مسلمان درباروں اور راجستھان میں جہاں گیا لکھنؤ ہی کے باورچیوں کو پایا - جن کو خاص امرا اور اولیاء ملک کے مزاج میں دخل تھا اور اُن کی بڑی قدر ہوتی تھی - اس سے انکار



نہیں کیا جاسکتا کہ اب حیدر آباد وکن - بھوپال - اور راپور میں بڑے بڑے مساجد  
کمان یا ورچی موجود ہیں۔ لیکن اگر آپ اُن کی اصلیت کا پتہ لگائیں اُن کے  
خاندان کا پتہ لگائیں اور اُن کی ترقی کی تاریخ پر غور کریں تو یہی ثابت ہوگا کہ اورچی  
یا تو وہ لکھنؤ کے ہیں یا لکھنؤ سے آئے ہوئے یا ورچیوں کی نسل سے ہیں یا کسی  
لکھنؤی یا ورچی کے شاگرد ہیں۔

ہم یا ورچی خانے کا حصہ ختم کر چکے مگر ابھی مٹھائیوں کا ذکر باقی ہے۔ مٹھائیوں  
کا بنانا ہندو طوائفوں کا کام ہے۔ اور انھیں کی مٹھائیوں سے عام پبلک آشنا  
ہوتی ہے۔ لیکن مٹھائیائیں تیار کرنے میں مسلمان رکابداروں کا درجہ بڑھا ہوا ہے۔  
رکابدار عوام کی ضرورتوں کو نہیں پورا کر سکتے۔ اس لیے کہ یہ ہندو طوائفوں کا  
حصہ ہے۔ رکابدار خاص امیروں اور شوقین اور نقاست پسند امیروں کے لیے  
مٹھائیائیں تیار کرتے ہیں جو بے نظیر اور بہت ہی لذیذ ہوتی ہیں۔

حلوائی لکھنؤ میں دو طرح کے ہیں۔ مسلمان حلوائی اور ہندو حلوائی۔ مسلمان  
حلوائیوں کی شان یہ ہے کہ اگر عام قسم کی مٹھائی لی جائے تو اُن کی دکان کی  
چیز ہندو حلوائیوں کی دکانوں سے اچھی نہیں ہوتی۔ لیکن اگر فرمائش کر کے اُن  
سے خاص قسم کی تکلفی مٹھائی بنوائیے تو ہندو حلوائیوں کی مٹھائی سے بہت زیادہ اچھی  
اور بہت ہی نفیس و لذیذ ہوتی ہے۔ لیکن علی العموم لکھنؤ میں حلیبیان - اترتیاں اور  
پالوشا ہی بہت اچھی بنتی ہیں۔

مٹھائیوں میں یہ امتیاز کرنا دشوار ہے کہ کون اصلی ہندو دکن کی ہے اور کون  
مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان میں آئی۔ لیکن ناموں اور مذاق پر قیاس کرنے  
سے معلوم ہوتا ہے کہ حلواء خالص عربی چیز ہے۔ جو عرب سے ایران ہوتا ہوا ہندوستان  
میں آیا اور اپنا نام بھی ساتھ لیتا آیا۔ لیکن بظاہر یہ عام فضیلہ نہیں ہو سکتا۔ اس  
میں تفریق ہے۔ ترخلوہ جو عموماً حلوائیوں کے دکان میں ملتا ہے اور پوریوں کے ساتھ  
کھایا جاتا ہے وہ خالص ہندو چیز ہے۔ جسے وہ موہن بھوگ بھی کہتے ہیں۔ مگر  
حلواء میں کی چار قسمیں پیمیزی - جو ذی - حبشی - اور دو دھویا۔ یہ خالص مسلمانوں کی  
مسلوم ہوتی ہیں۔ جدید عربی مذاق کے حلوے جو جنوبی ہند خصوصاً مدراس میں مروج

ہین۔ اُن کا پتہ نہیں۔ وہ واقعی خالص عربی حلوے ہین جو براہ راست عرب سے ہندوستان میں آ گئے۔

مگر ہندو حلوایوں کی اکثر مٹھالیان بھی مسلمانوں ہی کے زمانے کی ایجاد معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً برہمنی کا نام بتا رہا ہے کہ اُسے فارسی و بھجی مذاق نے ایجاد کیا۔ بالو شاہی خرے۔ نکلیان۔ گلاب جامن۔ درہشت۔ وغیرہ بھی عہد اسلام کی ایجاد دین ہیں۔ جلیبی کو عربی میں زلابیہ کہتے ہیں۔ اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ زلابیہ ہی سے بگر کے جلیبی کا لفظ بنا ہے۔ اس لیے یہ بھی انھیں عربی و فارسی مٹھالیوں میں شامل کرنے کے قابل ہے۔ پیرا خالص ہندی مٹھالی ہے اور امرتیاں بھی ہندی ہیں۔ مگر مجھے بتایا گیا ہے کہ امرتی خاص لکھنؤ میں ایجاد ہوئی۔ فی الحال ان مٹھالیوں کے اعتبار سے لکھنؤ کی کوئی خصوصیت نہیں۔ جو درجہ بلند ہندی ہند کے تمام ممتاز شہروں کو حاصل ہے وہی لکھنؤ کو بھی حاصل ہے۔ بلکہ یہ عجیب تا شافظراً آتا ہے کہ لکھنؤ میں تو آگرتے اور پنجاب کے حلوائی زیادہ مشہور ہیں۔ اور دوسرے شہروں میں مجھے یہ نظر آیا کہ لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ کے حلوایوں کو زیادہ نمود حاصل ہے۔ دراصل اس کو کسی دکان کے چل جانے سے تعلق ہے۔ اس لیے کہ جس حلوائی کی دکان جس قدر زیادہ چل جاتی ہے اُسی قدر اُسے مٹھالیوں میں ترقی کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ حلوایوں کی نسبت اصلی فیصلہ یہ ہے کہ ہندو حلوایوں کا درجہ بہت بڑھا ہوا ہے مٹھالیوں کے جتنے قدر دان ہندو ہیں مسلمان نہیں۔ مسلمانوں کو شاید گوشت خوری کی وجہ سے علی العموم نکلیں کہاؤں کا زیادہ شوق ہے۔ بخلاف اُن کے ہندو مٹھالیوں کے زیادہ شوقین ہیں۔ وہ فقط مٹھالیوں سے پیٹ بھر لیتے ہیں جو مسلمانوں سے غیر ممکن ہے۔ اور ہندوؤں کی رغبت کی وجہ سے مٹھرا۔ بنارس اور آجودھیا جو ہندوؤں کے مذہبی مرکز ہیں مٹھالیوں کے اقسام اور حرے کے اعتبار سے دوسرے شہروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔

مگر حلواسوہن کے بنانے میں مسلمان رکابداروں کے علاوہ اور بہت سے لوگوں نے بھی شہرت حاصل کی۔ آخر زمانے میں یہاں کے مشہور خوشنویس نشی باد علی صاحب نے پڑھی حلواسوہن میں خاص ناموری حاصل کی۔ وہ سیر پھر سنگ میں پچیس تیس

سیرگھی کھپا دیتے۔ اور اُس کی ٹکیوں پر عجیب عجیب قسم کے خوبصورت طعنے بناتے جن سے علو اسوہن بنائے کے ساتھ خوشنویسی اور نقاشی کے کمالات بھی ظاہر ہوتے اسکے بعد مین نے ٹیٹا برج (کلکتہ) میں منشی السلطان بہادر کو جو لکھنؤ کے ایک رئیس زادے تھے اپنی آنکھوں سے بارہا دیکھا کہ چھٹا تک بھر سنسک مین دو دھائی سیرگھی کھپا دیتے۔ جو فی سیر چالیس سیر کے قریب پڑا۔ ان کا پٹری علو اسوہن بجا زرد کے دھوئے کپڑے کے مانند اجلا اور سفید ہوتا۔

(۳۱)

باورچی خانے اور کھانوں کی ایجاد و ترقی کے متعلق ہم کافی درجے تک لکھ چکے ہیں۔ لیکن اتنا اور کہنا چاہتے ہیں کہ یہاں اور عموماً ایشیائی ممالک میں خوش مزگی پیدا کرنے کے ساتھ اس بات کی بھی کوشش اہمیت کے ساتھ کی جاتی تھی کہ لذت ذوق کے ساتھ غذاؤں میں اعلیٰ درجے کی روح افزا خوشبوئیں پیدا ہوں۔ رنگ نفیس اور دلکش رہے۔ صورت نظر فریب اور شوق دلانے والی ہو۔ اگرچہ ہندوستان کے تمام شہروں میں جہاں لوگوں کو اچھا کھانے کا شوق ہے ان تمام امور کی کوشش کی جاتی ہے مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ لکھنؤ سب جگہ سے زیادہ کامیاب رہا ہے۔ کسی جگہ کھانے کا سچا ذوق چند اسیروں اور مخصوص لوگوں تک محدود رہا ہے۔ مگر یہاں قریب قریب ہر شخص میں ایک صحیح ذوق پیدا ہو گیا۔ اچھے باورچی ہی نہیں پیدا ہوئے بلکہ معرزا اور شریعت کھانوں کی عورتوں میں رکابداروں سے زیادہ نفاست مزاجی اور ذوق کی خوش سلیقگی پیدا ہو گئی۔ کوئی معرزا خاں نہیں ہے جس کی محترم بیگم میں سے ہر ایک کھانا پکاتے میں اچھا سلیقہ نہ رکھتی ہو۔ اور اُسے کسی اچھی غذا کے تیار کرنے میں دعوے نہ ہو۔

دودھ دہی کا ہر جگہ رواج ہے۔ لکھنؤ میں ان دونوں چیزوں کے علاوہ بالائی کی تیاری میں زیادہ توجہ ہوئی۔ اس لیے کہ دودھ کا لطیف ترین حصہ اُس میں آ جاتا ہے۔ انگریزی میں اسی کو ”کریم“ کہتے ہیں۔ جبکہ رواج یورپ میں کثرت سے ہے۔ مگر وہاں کریم اس کا نام ہے کہ دودھ تقوڑی دیر دکھا ہے اور جب دہنیت کا سفید اور لطیف حصہ اوپر آ جائے تو کاجیہ کے الگ کر لیا جائے

بیان دودھ کا یہ لطیف حصہ ہلکی آگ پر رکھ کے اور جھکے الگ کیا جاتا ہے۔ اور بڑی نقاست سے اُس کی توپرت جادی جاتی ہے۔ بالائی کی تون کو نقاست اور خوشنائی سے جانا ایسا کام ہے جو لکھنؤ کے سوا شاذ و نادر ہی کسی اور شہر کے لوگوں کو آتا ہوگا۔

اس کو پُرانی زبان میں ملائی کہتے ہیں۔ آصف الدولہ بہادر نواب اودھ کو یہ اس قدر پسند تھی کہ خاص اہتمام سے اُن کے لیے تیار کی جاتی۔ انھوں نے اس کا نام ملائی کے عوض بالائی رکھ دیا۔ اس لیے کہ یہ دودھ کے اوپر کی چیز ہے۔ اہل لکھنؤ کو اپنے فرمان روا کا یہ تصرف بہت پسند آیا۔ اور بالائی کا لفظ زبانوں پر اس قدر چڑھ گیا کہ اب لکھنؤ میں سواد بہا تینوں یا ہندو ہمسائے سب اسے بالائی ہی کہتے ہیں اور ملائی کا لفظ کسی ہندو شخص کی زبان پر باقی نہیں رہا۔ اس پر مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم نے آپ حیات میں اعتراض کر دیا اور انصاف کو ذوق سلیم پر محول فرمایا۔ جس معیار سے اُن کے مذاق میں ”ملائی“ کا لفظ بالائی سے زیادہ لطیف و فصیح ہے۔ کسی لفظ کو محض اپنے مذاق کے اعتبار سے غیر فصیح کہہ دینا میرے نزدیک ایک بے معنی سی چیز ہے۔ اس لیے کہ ہر جماعت کو وہی الفاظ اپنے ذوق میں اچھے معلوم ہوتے ہیں جو اُن لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوں اور اُن کے لیے اور محاورے سے مانوس ہو گئے ہوں۔ جن شہروں کے لوگ ملائی کہتے ہیں انکو بے شک بالائی کا لفظ گراں گذرتا ہوگا۔ اور اُن کی زبان سے نا آشنا ہوگا۔ مگر جس شہر میں لوگ بالائی کہتے ہیں اور وہی لفظ اُن کے محاورے میں شامل ہو گیا ہے اُن کو جو فصاحت بالائی میں نظر آتی ہے ملائی میں ممکن نہیں۔ اُن کو ملائی چاہوں اور گواروں کا لفظ معلوم ہوتا ہے۔ فصاحت و لطافت زبان کا اندازہ کسی خاص ذوق یا کسی منطق سے نہیں ہوتا بلکہ جو لوگ اہل زبان مان لیے جاتے ہیں فقط اُن کا ذوق اور محاورہ معیار قرار پاتا ہے اور سب کو بغیر کسی منطقی دلیل کے اُن کی پیروی کرنا پڑتی ہے۔ اردو کے لیے اب دہلی و لکھنؤ دونوں اہل زبان کے مستند اسکول سمجھے جاتے ہیں۔ لہذا دونوں مسلم البتہ معیار سخن ہیں۔ چاہے ایک کا لفظ دوسرے کو

غیر مانوس ہی کیوں نہ ہو۔ یہ اور بات ہے کہ لکھنؤ کی زبان کو سچا اور مستند معیار رہی نہ تسلیم کیا جائے۔ لیکن اس جھگڑے میں ہم پڑنا نہیں چاہتے۔ اور غالباً یہ جھگڑا سٹے بھی ہو چکا ہے۔ بہر حال اگر دونوں شہر معیار مانے جائیں تو ملائی اور بالائی بجائے خود دونوں فصیح ہیں۔ ملائی اہل دہلی کے نزدیک اور بالائی اہل لکھنؤ کے نزدیک۔ کسی کو کسی پر اعتراض کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

کھانے کے پکانے سے زیادہ یا اُسی کے برابر ضرورت کھانوں کے نکالنے میں اچھا سلیقہ دکھانے۔ اور نکالنے کے بعد اُسکے آراستہ کرنے اور سچے کی ہے۔ یورپ کا موجودہ مذاق یہ ہے کہ میز خوب آراستہ کی جاتی ہے۔ اُسپر چائیا گلہستے لگائے جاتے ہیں اور بعض جگہ تکلف کے لیے کچے چادرون کو مختلف رنگوں میں رنگ کے اُن سے میز پر حروف اور نقش و نگار بنا دیے جاتے ہیں۔ ظروف بھی نہایت صاف ستھرے قیمتی اور اکثر چاندی کے کام میں لائے جاتے ہیں۔ مگر خاص کھانے کی مچاؤ کا انگریزی باورچیوں یا خاندان ماؤن کو چنڈان خیال نہیں ہوتا۔ بجز شادیوں کے لیک کے جو امرا اور لارڈوں کے عروسی دُندون میں عجیب تعلقات سے بروجون یا خوبصورت عمارتوں کی وضع میں بنا کے دعوت و لمیہ کی میز پر لگا دیے جاتے ہیں۔

اسکے خلاف ہندوستان میں دسترخوان کی آراستگی کی طرف تو کم توجہ کی جاتی ہے مگر خود کھانے اعلیٰ درجے کی نفاست سے نکال کے سجے جاتے ہیں۔ اُن پر چاندی سونے کے ورق لگائے جاتے ہیں۔ بستہ اور بادام کی ہوائیوں سے نقش و نگار اور رنگ رنگ کے پھول بنائے جاتے ہیں۔ کھوپرے کے ورق کاٹ کاٹ کے نہایت ہی موزوں ترتیب سے اُن پر آراستہ کیے جاتے ہیں۔ اس فن میں رکابداروں کو خاص کمال حاصل ہے۔ بلکہ اُن کا کام یہی ہے کہ جس خوبی سے غذاؤں کو تیار کریں اُس سے زیادہ خوشنمائی سے انکو سچیں۔ اور ہر لپٹ کو ایک گلہستہ بنا دیں۔

لکھنؤ میں یہ تعلقات اہل پیشہ باورچیوں اور رکابداروں سے شروع ہو کے شرفاء کے عام گھروں میں پھیل گئے۔ اور خاتونوں اور بیگمیں کو اس میں ایسا

اچھا سلیقہ ہو گیا کہ جو خوبی پلیٹون اور قابون کے سجھنے میں اکثر وہ دکھاتی ہیں خود رکابداروں سے بھی ممکن نہیں۔ اگرچہ یہ خاص اُتھین کا ہنر ہے۔ یورپ کے محققین نے سٹے کر دیا ہے کہ عورتیں فنون لطیفہ سے خاص مناسبت رکھتی ہیں۔ خصوصاً کسی چیز کے سجھنے اور آراستہ کرنے میں ان کو بالطبع مردوں پر فوقیت حاصل ہوتی ہے اس کا ثبوت ہندوستان میں لکھنؤ کی اُن عورتوں کی طبیعت داری سے مل سکتا ہے جو کھانوں کے سجھنے میں کمال دکھا دیا کرتی ہیں۔

ہندوستان کے عروسی کے کلیک جن کا ابھی ذکر ہو چکا ہے جیسے ہیں۔ جو عموماً رسم کے طریق سے شادیوں میں دولہا دو لھٹون کے سامنے لٹکائے جاتے ہیں اُن کو اکثر گھروں کی خاتونیں ایسی نفیست مزاجی اور ذہانت و طباعی سے آراستہ کرتی ہیں کہ جی چاہتا ہے بیٹھے اُتھین دیکھ لیں۔

کھانے کے ساتھ ہی آبدار خانے کی ترقیوں کو بھی بیان کر دینا لطفت سے خالی نہ ہوگا۔ آبدار خانہ بادشاہوں اور امیروں کے پانی کے انتظام کا نام ہے۔ اگلے دنوں برت نہ تھی۔ اور بعض موسموں میں ٹھنڈا پانی ملنا نہایت ہی دشوار ہوتا تھا۔ اسکے لیے اُن دنوں خاص قسم کے انتظام کیے جاتے تھے۔ پانی کو رے گھڑوں میں بھر کے رکھا جاتا۔ تازک اور نفیس آبِ بخور سپینے کے لیے موجود رہتے۔ گھڑوں اور آبِ بخور پر سرخ کپڑا چڑھا دیا جاتا۔ اور وہ تر رکھا جاتا۔ اس لیے کہ ہوا لگنے سے بھیگنا کپڑا خوب ٹھنڈا ہو جائے اور قدیم ملک کہ گرم ہوا اور تھوہ بھی جتنی زیادہ گرم ہوتی اُتنا ہی زیادہ ہوتا ہے کہ ٹھنڈا کر دیتی۔ اور کپڑے کی ٹھنڈک اندر کے پانی کو ٹھنڈا کر دیتا تھا۔ عورت اور اندر صراحیوں بلکہ گھڑے بھی منہ پر کپڑا باندھ کے کسی درخت کی یون سے بدن ڈھانکتے لٹکا دیے جاتے۔ ہوا کا اندر نفوذ نہ ہونے کی وجہ سے نہ ہونچ گئے تھے اُنھوں ٹھنڈا ہو جاتا۔ برسات میں جب یہ تدبیر بھی کامیاب نہ قریب کے اندر دنی علاقوں کنوؤں کے اندر لٹکا دیے جاتے جہاں اُن میں خوب

اس کے علاوہ سب سے بڑا انتظام یہ تھا کہ تھمت۔ اور عبا میں پہننے

مرد و عورتیں۔ اور وہ تاروں میں شورا اور با

جائیں۔ اس تدبیر سے ٹھوڑی دیر میں پانی میں برف کی سی خشکی پیدا ہو جاتی۔ اور اُس کی ٹھنڈک نہایت ہی لطیف و خوشگوار ہوتی۔ اس تدبیر کو صراحون کا جھلنا کہتے تھے۔

بعد کے زمانے میں برف کے فراہم کرنے کی بھی ایک مستقل اور دیر پا تدبیر نکال لی گئی تھی۔ چٹون کے جاڑوں میں جب سردی خوب شدت پر ہوتی کھیتوں اور کھلے میدانوں میں رات کو بگلی رکا۔ یوں اور پیا لون میں گرم گرم پانی بھر کے رکھ دیا جاتا جو صبح کو چا ہوا ملتا۔ اس برف کو اُسی وقت فوراً زمین کے اندر گرس کھتوں میں جو پہلے سے کھدے تیار رہتے دفن کر دیتے اور ان میں وہ برف جب تک دبی رہتی اپنی حالت پر قائم رہتی۔ ہر حال اس طریقے سے اتنی برف بنا کے کھتوں میں بھر دی جاتی کہ سال بھر کے لیے کافی ہوتی۔ اور اُسی میں سے ہر روز نکال لی جاتی۔ مگر یہ برف اس قدر مستحضر نہ ہوتی کہ پانی میں ملائی جاسے۔ بلکہ شورے کی طرح اُس میں نمک اور شور مار کے صراحون جھلی جائیں۔ پابرف کی قفلان چائی جائیں۔

مگر یہ انتظام خاص بادشاہوں یا اُن کے ہمراہ امیرون تک محدود رہتا۔ غریب لوگ اس سے فائدہ نہ اُٹھا سکتے۔ غریب اور متوسط درجے کے لوگ انھیں اول الذکر تدبیروں سے کام لے کے پانی ٹھنڈا کرتے۔ اور یہ انتظام اس قدر اچھا تھا کہ ٹھوڑا بہت ہر گھر میں رہتا۔

لکھنؤ میں پانی کے لیے یہ انتظام اُن دفون ہوا کرتا۔ اور لغات فمات پیدا کر دیے تھے کہ مٹی اور جست کی صراحون اور ایسے اکثر سرخ شالبات (ٹول) کا کپڑا چڑھا ہوتا۔ اور ٹول پر اسے پلیٹ کے اُن پر ڈھکیا لٹھ پیدا کر دیا جاتا کہ کہہ کے آنکھوں میں خشکی پیدا ہو جاتی۔

۱۔ اس نے یہ انتظام جو میں نے بیان کیا ہے پورا  
۲۔ غالباً وہاں ضرور ہو گا۔ اور وہیں سے یہ سب  
گھر میں اس انتظام اور سلمان کو جس تکمیل کے

ساتھ اور جس معیم سے لکھنؤ کے لوگوں میں دیکھا تھا وہی میں نہیں دیکھا۔ مگر ہرے کہ وہاں بھی ایسا ہی ہو۔ لیکن اس میں شک نہیں کیا جاسکتا کہ لکھنؤ میں آکے مٹی کے ظروف آب کی لطافت و نفاست اور نزاکت بہت بڑھ گئی۔ اس لیے کہ یہاں کی مٹی کی عمدگی کی وجہ سے جیسے نازک و خوشا اور خوش قطع ظروف نگلی لکھنؤ میں بن سکتے ہیں اور کہیں نہیں بن سکتے۔ وہی والوں کے پاس جست کی صراحیوں ایسی ہی ہونگی مگر ایسی مٹی کی صراحیوں وہاں کسی کو نصیب نہیں ہو سکیں۔ ان ظروف نگلی کا حال ہم آئندہ مناسب موقع پر بیان کریں گے۔ بادشاہوں کے ساتھ جہان وہ جائیں یا ورچی خانہ اور آبدار خانہ بھی جایا کرتا تھا۔ لیکن یہاں آبدار خانے کا انتظام دوسرے امرا کے وہاں بھی اس قدر بڑھ گیا تھا کہ بہت سے امرا تھے جو اپنا آب و آبدار خانہ اپنے ساتھ رکھتے۔ چنانچہ مرزا حیدر صاحب کا آبدار خانہ اور بھٹی خانہ اس فیاضی کے اصول پر قائم تھا کہ وہ جس شادی کی محفل میں جاتے ساری محفل کو پانی اور صحت پلانے کا انتظام اُنھیں کے سپرد ہو جاتا۔ اور اُن کی شرکت محفل بہت سے لوگوں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ اور رحمت الہی بن جاتی۔

(۳۳)

اب ہم اس دربار اور لکھنؤ کے لباس پر بحث کرنا چاہتے ہیں جو دراصل نہایت ہی دلچسپ بحث ہے۔ ہندوستان کے لباس کی تاریخ نہایت تاریکی میں ہے۔ مسلمانوں کے آتے سے پیشتر ہندوستان میں جہاں تک پتہ لگایا جائے اور قدیم عورتوں اور آلوؤ وغیرہ کی تصویروں پر غور کیا جائے یہی ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے آتے سے پہلے یہاں سے ہوسے کپڑے کا رواج نہ تھا۔ عورت اور مرد دونوں بے سلی ہوئی چادروں۔ ساریوں۔ اور دھوتیوں سے بدن ڈھانکتے تھے۔ عرب سیاح جو فاتحان اسلام سے پہلے ہی یہاں پہنچ گئے تھے اُنھوں نے سندھ سے لے کے بنگالے تک ہر ساحلی شہر اور قریب کے اندرونی علاقوں میں یہاں کے لوگوں کو اسی وضع میں پایا۔ پہلے عرب مسلمان جو یہاں پہنچے وہ اگرچہ کرتے۔ تھمت۔ اور عبا میں پہنتے



تھے مگر لباس و وضع میں اُنھیں یہاں کے لوگوں پر کچھ زیادہ فطرت نہیں حاصل تھی۔ لباس میں ترقی اُس وقت سے شروع ہوئی جب ساسانی سامشتر اختیار کر کے بغداد کے عباسی دربار نے شرفاً عرب کے لیے پائے بنائے۔ عبا و قبا اور خوش قطع عمامے ایجاد کیے۔ جو لباس کہ کلیتہً یا زیادہ تر ساسانی و ربار کے اُمراء و اعیان کی وضع سے ماخوذ تھا۔ چند ہی روز میں یہی لباس اُن تمام مسلمانوں کا ہو گیا جو مصر سے دریائے سندھ کے کنارے تک پھیلے ہوئے تھے اور آخر وہ اس لباس کو لیے ہوئے ہندوستان میں آئے۔ تصویروں میں جو لباس عہد اولین کے مسلمان تاجداران ہند کا نظر آتا ہے وہ قریب قریب وہی ہے جو عجی و عباسی امراء و فرمان رواؤں کا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں کے مسلمان ہند و راجاؤں کی تقلید میں جواہرات بہت زیادہ پہنا کرتے تھے۔

دہلی میں دربار منسلک کا آخری لباس جو ہمیں معلوم ہو سکا یہ تھا کہ سر پر گڑی۔ بدن میں نیمہ جامة۔ مٹا رنگوں میں ٹخنوں سے اونچا بنگ ٹھری کا پائجامة۔ پائون میں اونچی اڑی کا کفش نہا جاتا۔ اور کمر میں جانے کے اوپر ٹیکا۔ بس یہی دہلی کے قدیم شرفا کی وضع تھی۔ جس میں محمد شاہ رنیلے کے زمانے تک کسی قسم کا رد و بدل نہیں ہوا تھا۔ اور اگر ہوا بھی ہو تو اتنا نہ تھا کہ ہم کو نظر آ سکے۔

اس لباس میں پتے سے مراد کہنیں تک کی آدھی آستینوں کا شاو کا تھا۔ اور سینے پر سلتے اُس میں گھنڈیاں لگائی جاتیں۔ اسکو نیچے پہن کے اس کے اوپر جامہ پہنا جاتا۔ جو عجی قبا میں ترمیم کر کے بنایا گیا تھا۔ اُس میں گریبان نہ ہوتا۔ بلکہ دونوں جانب کے کنارے جو ”پردہ“ کہلاتے۔ ترچھے ایک دوسرے پر آکے سینے کو ڈھانک لیتے۔ سینے کا بالائی حصہ جو گلے کے نیچے ہوتا ہے اُسی طرح کھلا رہتا جیسے آجکل انگریزی ٹوٹوں میں کھلا رہتا ہے۔ اور جس طرح فی الحال قمیص سینے کے اوپر دالے حصے کو چھپاتا ہے اُسی طرح اُن دونوں نیمہ اسکو ڈھانکے رکھتا۔ سینے پر جانے کا وہ پردہ جو بائیں طرف سے آتا نیچے رہتا اور

داہنے پہلو پر بندون سے باندھ دیا جاتا۔ اور اس پر داہنی طرف کا پردہ رہتا۔ جو اوپر بائیں پہلو میں باندھا جاتا۔ پھر اُس میں کمر کے پاس سے دامون کی طرف ایک اسکرٹ سی جوڑ دی جاتی جو ٹخنوں کے اوپر تک لگتی رہتی۔ اُس میں بہت سی چٹٹ دی جاتی۔ اور اُس کا گھیر بہت بڑا ہوتا۔ جسے کی آستینیں آدھی کلائی تک پہنچتی اور کھلی رہتیں۔ اور دونوں جانب لٹکا کر تین۔ اُس کے نیچے سیدھی سادھی تنگ ٹریوں کا پانچا پہننا جو امرا میں مشروع اور گلبدن کا ہوا کرتا۔ پھر جانے کے اوپر کمر میں پٹکا باندھ لیا جاتا۔

دو تین صدی پیشتر ہمارے بزرگوں اور ہندوستان کے امیروں اور تمام شریفوں کا یہی لباس تھا۔ ڈپچون۔ پگڑیون۔ اور پانچامون میں جو ترمیم ہوئی اُن کا مفصل و مشرح حال ہم بعد بیان کریں گے۔ سردست ہم درمیانی حصہ جسم کے لباس کا ذکر کرتے ہیں جو سچ پوچھتے تو اصلی لباس ہے اور اسی سے انسان کی وضع قطع شخص و معین ہوتی ہے۔ یہی اُس دور کا درباری لباس تھا اور یہی لباس پہننے ہوئے نواب برہان الملک منصور شاہ اور شجاع الدولہ دہلی سے اودھ میں آئے تھے۔ جاہ عموماً باریک ٹیل کا ہوتا جو ہندوستان کے مختلف شہروں میں نہایت نفیس۔ باریک۔ اور سبک بنا کرتی اور ساری دنیا میں مشہور تھی۔ ڈھاکے کی ٹیل اور جامدانی عالمی مرتبہ امیروں اور بادشاہوں کے لیے مخصوص تھی۔

اس کے بعد ایرانی قبائلی ماخوذ کر کے بالابراجا ہوا۔ جس میں گولی گریبان بالکل کھلا رہتا۔ اس لیے کہ سینے کے ڈھانکنے کے لیے نیمہ کافی تھا جو اُس کے نیچے بھی پہنا جاتا۔ وہ چٹٹ اور گھیر اس میں سے نکال دیا گیا۔ اور اس ضرورت سے کہ دامن آگے کی طرف نہ کھلے۔ داہنے دامن میں ایک چوڑی کلی لگا دی جاتی یہی کلی اُس کلی کا نقش اولین ہے جو فی الحال شرادینوں میں بائیں جانب نیچے لہجہ کے بند سے باندھی یا ہاک سے اٹکائی جاتی ہے۔ بالابراجی دہلی ہی کی ایجاد ہے۔

اسی بالابراجی پر ترقی کر کے دہلی ہی میں انگرکھا ایجاد کیا گیا جس میں دراصل

جائے اور بالآخر دونوں کو ملا کے ایک نئی قطع پیدا کی گئی۔ اس میں سینے پر چولی  
تیا سے لی گئی۔ مگر سینہ کھلا رکھنے کی جگہ ایک گول اور لمبوتر اگر میان بڑھایا گیا۔  
جس کے اوپر گلے کے نیچے ایک ہلال نما کنٹھا لگایا جاتا اور وہ بائیں طرف گردن  
کے پاس گھنڈی کے سے اٹکا دیا جاتا۔ چولی نیچے رہتی جس میں پہلے داہنی  
طرف کا پردہ نیچے بغل میں بندوں سے باندھا جاتا اور پھر اوپر بند ہوتا۔  
جس سے دونوں طرف کے پردے سینے کے نیچے بچھو بیچ میں لاس کے باندھ  
دیئے جاتے۔ اس میں بائیں جانب قھوڑا سا سینہ کھلا رہتا۔ چولی نیچے رہتی۔  
اور نیچے دامن اگر چہ قبائے سے ہوتے مگر پرانے جاسے کی باؤگاریں دونوں  
پہنوں پر بٹکون کے نیچے چٹٹ ضرور رکھی جاتی۔

یہ بڑا بڑا اگر کہا تھا جو دہلی کے آخری دور میں رواج پا چکا تھا اور وہاں  
سے سرحد ہندوستان میں پھیل گیا۔ لکھنؤ میں آنے کے بعد اس انگر کے میں  
زیادہ جستی اور قطع داری پیدا کی گئی۔ چولی خوب گول اونچی اور کھنچی ہوئی  
جست ہو گئی۔ بٹکون کی چٹٹ بالکل نکل گئی۔ دامنوں میں بجاس موڑ کے ٹانگ  
دینے کی سبھا جی گوٹ لگائی گئی۔ پھر اس کے بعد نواب زادوں اور شوقین مندوں  
نے ایک کمر توڑی کے عوض چوچلی کے نیچے بند لکائے کی جگہ پر بوتلی پلٹوں کی وضع  
سے تین تین کمر توڑیاں لگائیں۔ جا بجا گوٹ اور کمر توڑیوں کے پاس کٹاؤ  
کا کام بنایا۔

دہلی میں انگر کے کے ایجاد ہونے کے بعد نیمہ چھوٹ گیا تھا۔ اور بائیں جانب  
سینے کا کھلا رہنا محبوب نہ تھا بلکہ ومنہ اری خیالی کیا جاتا۔ لکھنؤ میں اس کے  
نیچے نیچے کے عوض شلو کا ایجاد ہوا جس میں آگے کی طرف بوتام لگائے جاتے۔  
اس لیے کہ اب یورپ کے بوتام دیان پہن گئے تھے۔ شلو کون میں خاص  
ومنہ اریان دکھائی جاتیں۔ نازک مزاج لوگ جالی یا بارلیٹ کے جست  
شلو کے نیچے جن میں کچھ سوٹ، نقش و نگار کاڑھے جاتے۔ بعض لوگ  
رنگین شلو کے پینے اس لئے کہ اس کے بل بوتے اور اس کا رنگ تن زیب کے  
پسید انگر کے کے نیچے سے اپنی جھلک دکھا کے خاص لطافت اور خاص نکات

پیدا کر رکھے۔

دوسری ترمیم بالابریمن دربار کے لکھنؤ آنے کے بعد ہوئی کہ چپکن کے نام سے ایک چست قبائلیا دی ہوئی۔ اس میں ویسا ہی گولی گریبان رکھا گیا۔ اور اس میں انگریز کے طرح سینے پر پردہ بھی لگایا گیا مگر وہ پردہ داہنی جانب قوس نما صورت میں بوتاموں سے اٹکایا جاتا۔ اس میں داہنی جانب گلے کے پاس سے بوتاموں کی ایک خوشنما قوس گولائی لیتی ہوئی کوڑی تک آتی اور اس کے مقابل دوسری جانب کی قوس میں اصلی قبائلیں سی دیا جاتا۔ اس میں بھی بالابری طرح چوڑی کلی اوپر لگائی جاتی جو نبل کے نیچے بائیں طرف بوتام یا گھنڈی سے اٹکادی جاتی۔ یہ چپکن جو شاہی یا کسی اور بھاری کپڑے کی ہوتی اور جاڑوں کے موسم کے لیے زیادہ موڈوں تھی۔ ایک ڈانسلے میں پہنا اہل دربار اور خاصہ اہل کار بار یا بان دربار کا مرتزدا اس تھی۔ اسے انگریزوں نے بھی بہت پسند کیا۔ اور اپنے ملازموں کو ایک مدت تک وہی پہناتے رہے۔ سب کے بعد لکھنؤ کے بالکل آخری عہد میں چپکن اور انگریز کے دونوں کے ترکیب دینے سے ایک ایسا دی ہوئی۔ اس میں انگریز کے اور چپکن کا سا گریبان قائم رکھا گیا۔ جو بیچ سے سیدھا کاٹ کے آدھا آدھا دو تون چائے ہی دیا جاتا۔ اور سلاخی کی جگہ پر سنجائی کوٹ کے ذریعہ سے گریبان کی گولائی اور قطع پر قرار رکھی جاتی۔ بیچ کے چاک میں جو گلے سے لے کے سیدھا کوڑی تک آتا ہو تمام لگا دیے جاتے۔ وہ بالابری کی کلی چ اوپر لگائی جاتی تھی اس میں نیچے کردی گئی تاکہ درمیں بھی نہ کھلیں اور بالابری کی کلی کے اوپر کی طرف لگاتے سے جو پندھاتی ظاہر ہوتی تھی دور ہو جائے۔ چپکن کا بیچ کا حصہ بالکل چپکن اور انگریز کے کا سا ہوتا۔ شوقین لوگ اس میں بھی ویسی ہی درہ اس کوٹ اور اسی طرح کی تین تین کمر توئیاں لگاتے۔ اور کمر کا کامر بناتے۔

یہ آخری ایجاد چپکن لوگوں کو بہت پسند آئی۔ اس کا رواج نہایت گدڑہ کے دیہاتوں میں بھی شروع ہوا۔ اور کچھ عرصہ بعد ہی ہندوستان میں پھیل گیا۔

یہی اچکن حیدر آیا و پورنج کے ٹھوڑی سی ترمیم کے بعد شروانی بن گئی۔ وہاں اس کی آستینیں انگریزی کوٹ کی سی کر دی گئیں۔ گریبان جو کوٹ لگا کے بیٹنے پر نمایاں کیا جاتا تھا نکال ڈالا گیا۔ قلع و خربہ میں انگریزی کوٹ کی وضع دامنوں وغیرہ میں بھی اختیار کی گئی اور وہ لباس ایجاد ہو گیا جو آج کل ہندوستان کے ہندو مسلمان تمام لوگوں کا قومی لباس کہے جانے کے قابل ہے۔ لکھنؤ والوں نے بھی چند روز بعد جب اپنی پڑائی ایجاد میں حیدر آباد کی مناسبت اصلاح دیکھی تو اُسے بہت ہی پسند کیا۔ اور تھوڑے ہی زمانے میں شروانی کا رواج ہر شہر اور قریے کی طرح لکھنؤ میں بھی ہو گیا۔

انگریزوں کے نیچے جو شلوکا پہنا جاتا تھا اُس کے عوض پہلے ڈھیلا اور اونچا کرتا اختیار کیا گیا۔ اور چند روز بعد مغربی اثر پڑنے کرتا پھڑا کے انگریزی قمیص کو رواج دیا جس میں کٹ اور کالر ہوتے ہیں۔ قمیص اور کالر کے رواج نے شروانی کے تکلفات اور بڑھائے۔ یعنی لازمی ہو گیا کہ سفید کالر اور نکلا رہے۔ اور شروانی کا اوپر کا سرا سگے پر گہب سے اٹکا کے قمیص کے اُس بالائی بوتام کے نیچے رہے جس میں کالر لگایا جاتا ہے۔ آستینیں اتنی رہیں کہ کھون کا کسی قدر حصہ نکلا رہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں اور متوسط طبقے والوں کا لباس دوسرے شہروں کی طرح فی الحال لکھنؤ میں بھی ہی شروانی ہے۔ مگر اسکو لکھنؤ کی خصوصیت نہیں۔ لکھنؤ کی ایجاد و اختراع کا خاتمہ اچکن پر ہو گیا۔ جو اب قریب قریب بالکل متروک ہو گئی ہے۔

(۳۳)

درمیان میں حصہ جسم کے لباس کا حال ہم بیان کر چکے ہیں۔ لہذا اب اس جزو لباس کی طرف توجہ کرتے ہیں جو سر کے لیے مخصوص ہے۔ اور اسی لباس کی ہندوستان میں زیادہ عزت و حرمت کی جاتی ہے۔ اس لیے کہ جس طرح سراسر جسم میں ممتاز ہے اُسی طرح اُس کے لباس کو بھی زیادہ ممتاز ہونا چاہیے۔ قدیم الایام میں ہندوستان میں پگڑی باندھنے کا رواج چلا آتا ہے۔ اگرچہ عربی و عجمی بھی عمامے باندھتے ہوئے یہاں آئے اور انکی حکومت قائم ہو جانے کی وجہ سے یہاں کی

پگڑیوں میں بہت کچھ تغیر ہو گیا لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ مسلمانوں کے آنے سے پہلے یہاں پگڑی نہ تھی۔

ابتدائی دور کے مسلمان فرمان رواؤں کے عمامے بڑے بڑے تھے۔ اور اسی لحاظ سے ان دنوں تمام معززین و امرا اور دولتمندوں کی پگڑیاں بھی غالباً بڑی بڑی ہوں گی۔ جن کے نیچے قدیم ترکی وضع کی نوکدار مخروطی ٹوپیوں ہوتی ہیں جو افغانستان میں آج تک مروج اور موجود ہیں۔ اور انھیں سے لے کے ہماری ہندوستانی فوج کی وردیوں میں شامل کی گئیں ہیں۔

سلطنت مغلیہ کے عہد میں پگڑیاں روز بروز چھوٹی ہونے لگیں۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ سرد ممالک میں جس طرح سردی کی مضرت سے بچنے کے لیے جو جو زمانہ گذرتا ہے لباس وزنی اور گندہ ہوتا جاتا ہے ویسے ہی گرم ملکوں میں سبک ہلکا اور مختصر ہوتا رہتا ہے۔ اگلے مسلمان فاتح جیسے بھاروی اور موٹے کپڑے پہنے ہوئے یہاں آئے ہوں گے انکے وزنی ہونے کا اندازہ تو ہم فقط قیاس سے کر سکتے ہیں مگر انگریزوں کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں کہ ان کا اور ان کی عورتوں کا لباس روز بروز کس قدر سبک۔ ہلکا۔ اور مختصر ہوتا جاتا ہے۔ اسی اصول کے مطابق یہاں پگڑیاں روز بروز ہلکی اور چھوٹی ہوتی گئیں۔

اور ملک کا یہ درجہ دربار کی وضع پر بھی اثر کرتا گیا۔ دربار مغلیہ کے آخر عہد میں امرا اور مضبوطی اور ان کی پگڑیاں بہت ہلکی ہو گئی تھیں۔ اور اسی اختصار پسندی نے یہ بات پیدا کی کہ پگڑیوں کی مدد با قطعین ہو گئیں۔ اور اکثر امرا نے اپنے لیے خاص بندشیں اور خاص وضع کی چھوٹی چھوٹی پگڑیاں ایجاد کر لیں۔ پگڑیوں کے اختصار نے ترکی کلاہ کو ترک کر دیا۔ اور یہ حالت ہو گئی کہ کسی کی پگڑی کے نیچے ٹوپی ہوتی ہی نہ تھی۔ اور بعض پہنتے بھی تھے تو کسی بہت ہی باریک کپڑے کی ذرا سی ٹوپی جو چھونک میں اڑ جائے۔ ان ٹوپیوں کی نسبت ہمیں وثوق کے ساتھ نہیں معلوم ہے کہ کس وضع کی ہوتی تھیں۔ غالباً ان ٹوپیوں کی قطع ان ٹوپیوں کی نسل سے ملتی ہوتی ہوگی جو آب مشاخ اور قفرا کے سروں پر ہوتی ہیں۔ یعنی ایک چھ سات انگلی کی چوڑی پٹی کا سر کے

برابر ایک حلقہ بنایا جائے اور اوپر کی جانب چنٹ دس کے وہ سمیٹ دیا جائے۔ لیکن چند روز میں ضرورت محسوس ہوئی کہ گھر میں اور بہتے کھنٹی کی صحبتوں میں پگڑی اُتار کے رکھ دی جا یا کرے۔ لیکن ننگے سر پہنا چونکہ میوب ہے اس لیے کسی قسم کی ٹوپی سر پر ضرور ہے۔ اس ضرورت کے پورا کرنے کے لیے دہلی میں تاج کی وضع سے لے کے ایک کمرخی ٹوپی ایجاد ہوئی۔ جس میں اُس گول حلقے کے اوپر جو سر میں پہنا جاتا تھا چار کوٹے نکلے رہتے۔ اس وضع کی ٹوپی اب بھی بعض معضی امرا و شاہزادگان دہلی کے سروں پر نظر آ جا یا کرتی ہے۔ یہ ٹوپی صبح سویرے میں چوگوشیہ کہلاتی تھی۔ چند روز کے اندر اس ٹوپی میں بھی ترمیم و تہجیح کا عمل شروع ہوا۔ اور دہلی ہی میں وہ کمرخی کوٹے نکال کے ایک گول قبہ نما ٹوپی ایجاد ہو گئی۔ جس میں چار پان ایسی قطع سے کاٹ کے جوڑے جاتے کہ ایک لمبو ٹرا قبہ سر پر نظر آتا۔ یہی ٹوپی پہنے ہوئے لوگ لکھنؤ میں آئے۔ اور اُس وقت سے اُس میں دربار لکھنؤ کا اثر پڑنا شروع ہوا۔ یہاں پہلی ترمیم یہ ہوئی کہ پاؤں کے جوڑوں پر لمبی صراحیان بنائی گئیں۔ اور اُن صراحیوں کے درمیان خوشنما چاند قائم کیے گئے۔ یہ چاند اور صراحیان اس طرح بنائی جاتیں کہ باریک تزیین کے پاؤں میں نین سکھ کی صراحیان اور چاند کاٹ کے اندر کی طرف ٹانگہ دیے جاتے جو اوپر نمایاں ہو کے ٹوپی میں ایک اچھی نفاست۔ صفائی۔ اور سادگی پیدا کرتے۔ یہ ٹوپی یہاں بہت پسند کی گئی۔ عام لوگوں نے یکایک پگڑی باندھنا چھوڑ دیا۔ اور ہر مہذب و شائستہ آدمی کے سر پر بھی ٹوپی نظر آنے لگی۔

عام مقبولیت نے اُسکی قطع اور درست کی۔ لمبو ٹرا پن موقوف ہو کے نہایت مناسب گولانی پیدا کی گئی۔ اور لکڑی اور تانبے کے قالب ایجاد ہوئے تاکہ اُن پر کھینچ کے یہ چوگوشیہ ٹوپیاں (جو دہلی والی پُرانی کمرخی ٹوپوں کا نام اپنے ساتھ لیتی آئی تھیں) خوب قبہ دار اور گول کر لی جائیں۔

اتنے میں نصیر الدین حیدر کا زمانہ آیا جبکہ لکھنؤ میں مذہب شیعہ کو خوب فروغ تھا۔ اور مذہب۔ سیاست۔ تمدن۔ اور معاشرت ہر چیز میں اپنے مذاق کے مطابق اصلا میں کر رہا تھا۔ خلفائے اربعہ کی مخالفت اور بختن کی محبت نے

لکھنؤ کی درباری معاشرت نے چار کے عدد کو بُرا اور پانچ کے عدد کو محبوب بنا دیا تھا۔ جس کا اثر ٹوپی پر یہ پڑا کہ برجناسے بعض مستند روایات خود چہان پناہ کی ہدایت کے مطابق اس چوگوشیہ ٹوپی میں چار کے عوض پانچ پان کر دیے گئے۔ جس کی وجہ سے اُس میں پانچ سر احیان اور پانچ پان ہو گئے۔ اور نام بھی سجائے چوگوشیہ کے پنجگوشیہ قرار دیا گیا۔ لیکن اصل ٹوپی میں جو ترمیم ہوئی تھی وہ تو اس قدر مستقل ہو گئی۔ چار پانوں کی ٹوپیاں بالکل فنا ہو گئیں۔ اور کسی کو یاد بھی نہ رہا کہ کبھی اُن میں فقط چار پان ہوا کرتے تھے۔ مگر چوگوشیہ کا نام نہ مٹ سکا۔ راج تک باقی ہے اور زبانوں پر وہی ہے اگرچہ بعض لوگ پنجگوشیہ بھی کہتے ہیں مگر زیادہ لوگ ایسے ہی ہیں جو اس پانچ پانوں والی ٹوپی کو آج تک چوگوشیہ کہتے ہیں۔

نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ نے یہ پانچ پانوں والی ٹوپی ابتداً خاص اپنے لیے ایجاد کی تھی۔ اور اُنکی زندگی میں رعایا میں سے کسی کی مجال نہ تھی کہ اُس ٹوپی کو پہنے۔ مگر اہل شہر کو یہ وضع اس قدر پسند آ گئی تھی کہ اُن کی آنکھ بند ہوتے ہی ہر ادنیٰ و اعلیٰ نے اسی کو اختیار کر لیا۔ اور لکھنؤ کے تمام ہندو شایستہ لوگوں کے سروں پر یہی گول قبہ نما ٹوپی نظر آتی تھی۔

چند روز بعد جاڑوں کی ضرورت سے اسی قسم کی نہایت نفیس کا م دار ٹوپیاں ایجاد ہو گئیں۔ جن میں پانچوں پانوں میں زربفت یا زری بوٹی کی زمین پر دوسرے رنگ کی ریشمی زمین دے کے قیتوں سے چاند اور سر احیان بنائی جاتی تھیں۔ اور تمام وضع دار لوگوں کے سروں پر جاڑوں کے موسم میں اُن کے سوا اور کوئی ٹوپی نہ ہوتی۔ اس کے بعد جب چکن کا رواج ہوا تو موسم گرما کے لیے اسی کام کی چوگوشیہ ٹوپیاں ایسی اعلیٰ درجے کی نفیس و خوشنہ بننے لگیں جو سال بھر کی محنت میں تیار ہوتیں اور دس دس بارہ بارہ روپے تک اُن کی قیمت پہنچ گئی۔

اُسی زمانے میں دہلی کے ایک شاہزادے وارد لکھنؤ ہوئے۔ جن کی دربار اور سوسائٹی نے بڑی عزت کی۔ وہ دو پلڑی ٹوپی پہنا کرتے تھے جس میں سر کے



لباس کے مناسب دو لمبے پٹے بیضاوی صورت میں کاٹ کے جوڑ دیے جاتے تھے۔ اُن کی یہ سادی ٹوپی اکثر لوگوں کو پسند آئی۔ اس لیے کہ وہ نسبتاً زیادہ سادی اور تیاری کے اعتبار سے آسان تھی۔ بہت سے لوگوں نے یہ ٹوپی اختیار کر لی۔ اور عوام میں اس کا اس قدر رواج ہوا کہ آج بھی دو پلڑی ہندوستان کی قومی ٹوپی ہے۔ وہ شاہزادے بیان کے لوگوں میں دو پلڑی ٹوپی والے شاہزادے مشہور ہو گئے۔ اور کھڑوں غفلت کے سرائیکی ایجاد اور تراش کے آج تک زیر بار ہیں۔ بیان تک کہ شاہی کے آخری دور میں اسی دو پلڑی سے لے کے بیان ایک بہت چھوٹی تیلی ٹوپی ایجاد ہوئی جس میں آگے پیچھے دونوں طرف دونوں نکلے ہوئے تھے۔ یہ نکلے دار ٹوپی کہلاتی تھی۔ اور اس قسم کے بھاری کام کی ٹوپیاں خاص شاہزادوں۔ صاحب دولت مسیون اعزائے شاہی اور اعلیٰ درجے کے نواب زادوں کے ساتھ مخصوص تھیں۔

الحاصل غدر کے زمانے تک اہل لکھنؤ میں دو ہی طرح کی ٹوپیاں کا رواج تھا۔ اول چوکشیہ جو ہند اور ثقہ لوگوں کے ساتھ مخصوص تھی۔ اور دوسری دو پلڑی جو شاہزادوں سے لے کے ادنیٰ طبقہ والوں تک تھوڑے تھوڑے تغیر وضع کے ساتھ مروج تھی۔ اور آج عام لباس ہے۔

غالباً غازی الدین حیدر یا نصیر الدین حیدر کے زمانے ہی سے ایک گول ٹوپی کا بھی خاص خاص لوگوں میں رواج ہو گیا جو تبدیل کہلاتی۔ اس کی قطع ڈھلی کی سی ہوتی۔ اور اکثر کارچوب کے کام کی پسند کی جاتی۔ دو لمبہ دونوں اور بعض نواب زادوں نے اسکو زیادہ موقر و شہین تصور کر کے اختیار کیا۔ اور اسے یہ خصوصیت دی گئی کہ بادشاہ اور شاہزادوں کے سامنے بغیر پگڑی یا دھڑے یا کارچوب کی تبدیل پہنے کوئی شخص نہ جاسکتا تھا۔ غرض تبدیل کو دربار میں جگہ دے دی گئی۔ اسی تبدیل سے ماخوذ وہ گول ٹوپی تھی جس کے اوپر کے کونے ذرا گولائی لیے ہوتے اور جزیلی ٹوپی کہلاتی۔ یہ عموماً سیاہ بھل کی ہوتی اور اسپر سچے سنہرے کلابتون کا سجا کام ہوتا۔ اصل میں یہ ٹوپی سرکار انگریزی کی فوج میں گوردن کو دی گئی تھی۔ اور بظاہر اُس میں وہی کی شان بھی تھی

مگر انگریزوں کی تقلید کا غالباً پہلا نمونہ یہ تھا کہ یہ فوجی اور جہزی ٹوپی شاہزادوں اور خاندانی امیروں کے لباس میں داخل ہو گئی۔

آخری شاہ اودھ واجد علی شاہ نے اپنے دربار کے خطاب یافتہ معززین کے لیے ایک نئی اور عجیب قسم کی درباری ٹوپی ایجاد کی۔ اس میں کاغذ کا مقوا دیکے ایک گول حلقہ سادے اٹلس یا کارچوئی کام کا بنایا جاتا جو پیشانی پر زیادہ اونچا ہوتا۔ اس میں اوپر کی طرف تنزیب گرنٹ یا جانی کی ایک بڑی سی جھولی بنا کے جوڑ دی جاتی۔ اور پہننے میں وہ جھولی پیچھے گڑھی تک لگتی اور سر کے پھیلے حصے پر بڑی رہتی۔ اس درباری ٹوپی کا نام بادشاہ نے ”عالم پسند“ رکھا تھا۔ اور اکثر عوام اُسے ”بھولا“ کہتے۔ مگر یہ اس قدر غیر مقبول اور ناپسندیدہ وضع تھی کہ واجد علی شاہ کی زندگی میں بھی اُنکے دربار کے باہر اُن لوگوں کے سر پر بھی نظر نہ آ سکتی جن کو وہ عطا ہوئی تھی۔ اور اُنکے بعد تو اس قدر مٹ گئی کہ آج کل کے لوگوں نے شاید اُسے کبھی دیکھا بھی نہ ہوگا۔

عند کے بعد لکھنؤ میں یکا یک ٹوپوں کی دنیا میں ایک انقلاب عظیم شروع ہو گیا۔ چند روز تک تو چو گو شہ - دوپٹری - اور مندیوں یا پگڑیوں کے سوا سر کا کوئی لباس نہ تھا۔ اسکے بعد یکا یک چو گو شہ ٹوپی کا رواج چھوٹنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ اب اس کے لیے صرف چند پراسے وضع اور سرہ گئے ہیں۔ ان ٹوپوں سے جو سر خالی ہو گئے اُن میں سے اکثر نے دوپٹری اختیار کی۔ لیکن بعض بدترین تلاش کرنے لگے۔ چند روز تک میرٹھ کی سوزن کار مندیوں یا ٹوپوں کا دور رہا۔ اسکے بعد انگریزوں کی نائٹ کیپ یا کشمیر کی اونٹنی جیسی چند وے دار ٹوپیاں مروج ہوئیں۔ پھر اُن کی وضع سے ماخوذ کر کے گرنٹ یا شیٹن کی پتلی تیلی ٹوپیاں اختیار کی گئیں جو مختصر ہوتے ہوتے دوپٹری کے قریب پہنچ گئی تھیں۔ اب انگریزی عہد کی وضع دریاں شروع ہوئیں۔ اور سر کے لیے اُن کے لباس سے ملتا جلتا لباس ڈھونڈھا جانے لگا۔ بعض بزرگوں نے تو ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے بالاتامل ہیٹ یا انگریزوں کی نائٹ کیپ پہنتا شروع کر دی۔ لیکن اب تر کی ٹوپی کا دور شروع ہو گیا تھا۔ اس ٹوپی کو سید احمد خان

مروج نے اختیار کیا تھا۔ اور مسلمان جہلمین کے لیے کوٹ پتلون میں اُس کا جوڑ لگایا تھا۔ اس وجہ سے ابتداءً یہ ٹوپی نہایت ہی نفرت کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ بھریون کی ٹوپی اُس کا نام پڑ گیا۔ اخباروں میں اسپر ہزاروں پھبتیاں لکھی گئیں۔ مگر سرسید کے استقلال نے اُسے مروج کر ہی کے چھوڑا۔ انکی زندگی ہی میں لاکھ آدمی اُسے پہنتے لگے۔ یہاں تک کہ لکھنؤ میں بھی آپو بچی۔ بہون نے علی غم لکھنؤ میں یہاں بھی اسے پہننا شروع کر دیا۔ لیکن اندر ہی اندر اسکی طرف لوگوں کا رجحان اس قدر بڑھا کہ اب سارے ہندوستان میں اکثر تعلیم یافتہ اور ہندو مسلم اس کی ٹوپی کا استعمال کر رہے ہیں۔

لکھنؤ میں سرز تعلیم یافتہ اور شائستہ شیعہ ہندوستان کے تمام شہروں سے شاہد زیادہ ہیں۔ اور ان میں اس بات کی تحریک بمقابل سنیوں کے بڑھی ہوئی ہے کہ ہر بات میں اپنے آپ کو متاثر نہ کریں۔ اور اپنے شان وادب کا جہد اگانہ قرار دیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جس طرح اہل سنت و ملت عثمانیہ کے طرفدار ہیں شیعہ و کتبہ کا چارہ ایران کے پیرو و جانبدار ہیں۔ لہذا جب لکھنؤ میں ترکی ٹوپی کا رواج بڑھنا شروع ہوا جو ترکوں کی ٹوپی ہے تو متعدد شیعوں کو خیال ہوا کہ بجائے ترکی ٹوپی کے دربار عجم کی کلاہ پاپاخ کو اپنے لیے اختیار کریں۔ یہ تحریک پورا کام کر گئی۔ اور اب یہ حالت ہے کہ جو مسلمان اپنی برائی ٹوپیوں کو چھوڑ کے نئی ٹوپی اختیار کرتے ہیں وہ اگر سنی ہیں تو ترکی ٹوپی پہنتے گتے ہیں اور اگر شیعہ ہیں تو ایران کی پرشین کیپ کو اختیار کرتے ہیں۔ اگرچہ دونوں فریقوں میں بعض ایسے روشن خیال بھی موجود ہیں جو مسلمانوں کی اس اندرونی اعتقادی تفریق کو مٹانا چاہتے ہیں۔ اور باوجود فتنی ہونے کے ایرانی یا باوجود شیعہ ہونے کے ترکی ٹوپی پہنتے ہیں۔ مگر ایسے لوگ کم ہیں۔ مسلمانان شہر کے جہل انداز لوگوں کی عام وضع یہی ہے کہ شیعہ ایرانی اور سنی ترکی ٹوپی پہنتے ہیں۔

مسلمانوں کی یہ باہمی تفریق دیکھ کے ہندو تعلیم یافتہ لوگوں نے علی العموم گول منڈیل کا فٹ کیپ اختیار کر لی۔ جس کو بعض مسلمان بھی پہنتے ہیں۔ مگر ہندو انگریزی قانون کی وضع میں کثرت داخل ہو جانے کی وجہ سے انگریزوں نے اُس کا نام

بابوزکیپ" رکھ دیا ہے مگر عوام ہندو ہوں یا مسلمان شیعہ ہوں یا سنی دوپڑی ہی پہنتے ہیں۔

عذر کے بعد جو زمانہ گذرا یہ لکھنؤ کی سوسائٹی کے لیے عظیم الشان کون و فساد کا زمانہ تھا۔ معاشرت اور اخلاق و عادات کے ساتھ لوگوں کے لباس اور وضع میں بھی تغیر ہوئے لگا۔ اور تعلیم یافتہ جماعت میں کثرت سے ایسے لوگ پیدا ہو گئے جنہوں نے اپنی معاشرت کے ساتھ اپنی وضع بھی بالکل چھوڑ دی۔ ان کی ٹانگوں میں پانچاہد رہا نہ پنڈے پر انگرکھا۔ نہ پائون میں چڑھواں جو تار رہا نہ سر پر ٹوپی یا پگڑی۔ بلکہ ایک ہی جست میں وہ ساتون سمندر بھانڈ کے ہندوستان سے انگلستان میں کود پڑے۔ اور کوٹ۔ پتلون۔ بوت۔ اور ہیٹ ان کا لباس ہو گیا۔ لیکن آبادی کے غالب گروہ نے اپنی وضع برقرار رکھنا چاہی۔ تاہم بغیر اس کے کہ وہ محسوس کریں ان میں بھی تغیر ہوا۔ اور انگریزوں کے عوض شروانی ان کا قومی لباس بن گئی۔ لیکن سر کے لیے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ابھی تک کوئی ایسی ٹوپی نہیں منتخب ہو سکی جس کو سب بلا تامل اختیار کر لیں۔

اس کون و فساد اور رد و بدل کے زمانے میں لکھنؤ میں بیسیوں ٹوپیاں پیدا ہوئیں جو یا خود بین کی ایسا دھتکین یا کسی اور قوم یا مقام سے ماخوذ تھیں۔ ان میں سے جو چند روز تک ٹھہر سکیں ان پر لکھنؤ کے اصلی مذاق نے بہت کچھ تصرف بھی کیا مگر آخر کو ترک ہو گئیں۔ اہل لکھنؤ کا طبعی رجحان اس جانب ہے کہ ہر چیز حتی الامکان نازک۔ نفیس۔ چھوٹی۔ چست۔ اور سبک ہو۔ ہر وضع و لباس میں ان لوگوں نے اسی مذاق کا تصرف کیا۔ اور اکثر ٹوپیاں میں بھی اس قسم کا تصرف ہوا۔ مگر ترکی ٹوپی۔ ایرانی ٹوپی۔ اور ہیٹ میں یہ لوگ مطلق تصرف نہ کر سکے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ٹوپیاں دوسری قوموں سے بنی بنائی لیجاتی ہیں اور باہر سے آتی ہیں۔ اور اسی تصرف نہ ہو سکنے کی وجہ سے ہمارا خیالی ہوتا ہے کہ ان ٹوپیاں میں سے ایک بھی باوجود یکہ کثرت مروج ہو گئی ہیں لکھنؤ کے مذاق سے جدا ہونے کے باعث یہاں کا قومی لباس نہ بن سکے گی۔ اور ٹوپی کا

مسکے تا حال موجد ان لباس کی مجلس میں زیر غور و تجویز ہے۔

(۳۴)

اگرچہ ہندوستان خصوصاً لکھنؤ میں سرکار قومی لباس ٹوپی ہے مگر یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہاں کی نزاکت پسندی نے پگڑی کو فنا کر دیا۔ دربار میں علی العموم پگڑیوں کا رواج تھا۔ وہ دہلی کی باوقعت امیرانہ دستارین تو بیشک یہاں نہیں باقی رہیں۔ اور امرا و اعزاسے شاہی کے سردن پر فقط ٹوپیاں نہ لگائیں۔ مگر دبار کے لیے پگڑیاں آخر عہد تک مخصوص تھیں۔ اور عام ملازمین کا اخلاقی فرمن تھا اور اب بھی بڑی وسیع حد تک ہے کہ آقا کے سامنے جائین تو سر پر پگڑی باندھ کے جائیں۔

خود حکمرانوں کے سردن پر پرائی دستار نواب سعادت علی خان کے زمانے تک رہی۔ نواب برہان الملک - نواب شجاع الدولہ اور نواب آصف الدولہ کے سردن پر وہی۔ دہلی کے عہدہ داران سلطنت کی سی سفید دستار ہوا کرتی جس پر بڑے دیاروں کے موقوف پر جواہرات کی گلنیاں - مرصعہ تھیں اور سترچ لگائیے جاتے۔ مگر فی نفسہ وہ دستارین سادی اور سفید ہوتی تھیں۔ مگر نواب سعادت علی خان کے سر پر ہمیں ایک نئی قسم کی پگڑی نظر آتی ہے جس کو اہل لکھنؤ اپنی زبان میں شملہ کہتے تھے۔ یہ شملہ یہاں اس طرح بنایا جاتا کہ بھراؤ میت کپڑے کا ایک چوڑا اور تپلا گگردار حلقہ سر کی ٹاپ کے برابر بنایا جاتا جو پنج میں خالی اور کھلا رہتا۔ پھر کسی نفیس ریشمی یا شالی کپڑے کی پٹی تیلی بہت لمبی پٹی بنا کے اُس کے میسین پیچ اُس کپڑے کے حلقے پر نیچے اور اوپر برابر برابر لپیٹ کے ٹانگہ دیے جاتے۔ اس حلقے میں اوپر کی جانب ایک چوڑی پٹی دیے ہی ریشمی یا شالی کپڑے کی جوڑ دی جاتی۔ تاکہ وہ اس حلقے کو نیچے اُترنے سے روکے رہے۔ مگر اُس سے پوری چند یا ڈھنگ نہ سکتی تھی۔ اس لیے اُس کے نیچے کوئی معمولی دو پلڑی یا چوگوشیہ ٹوپی ضرور ہوتی۔ یہ تھا لکھنؤ کا اُن شملہ جس کو پہلے پہل نواب سعادت علی خان بنے پہنا۔ اور غالباً وہ وسط ہند کے ہندو اور مسلمان دیاروں کی اُن پگڑیوں سے ماخوذ تھا جو کسی باریک نگین کپڑے

کی مدد ہاگز کی بیویوں کو خاص خاص ترقیوں سے پیسٹ کے بنائی جاتی تھیں۔  
نواب سعادت علی خان نے اس شغلے کو خود ہی نہیں پہنا بلکہ معززین دربار اور  
عمائد سلطنت اور وزرا کو بھی وہی عطا ہوا۔

غازی الدین حیدر کو دولت انگلشیہ نے بادشاہ بنا کے تاج پہنا دیا۔ جو  
در اصل ہندوستان اور ایشیا کا تاج شاہی تھا بلکہ ایک قسم کا یورپ کا  
تاج تھا۔ اُس وقت سے فرمان روایان لکھنؤ نے شغلے یا دستار کو بالکل چھوڑ دیا  
اور اُنکے ساتھ تمام شاہزادوں۔ نواب زادوں اور عمائد شہر نے بھی گپڑی  
کو خیر باد کہہ دی۔ شاہزادے خاص موقوفوں پر تو تاج مگر علی العموم سالے  
دار بھاری کام کی کنگے دار ٹو پیاں پہنتے اور اُنہیں کی تقلید شہر کے دیگر معززین  
بھی کرتے۔

لیکن عہدہ داران سلطنت وزرا اور اہل کار دن کو حکم تھا کہ شعلہ پہن کے  
سلاطین و وزرا کے دربار میں آئیں۔ غازی الدین حیدر کے زمانے سے احمد علی  
شاہ کے عہد تک تمام عہدہ داروں کے سر پر وہی شعلہ رہا کرتا تھا جس کی تصویر  
اپنے ناظرین کو ہم نے لفظوں میں دکھا دی ہے۔ واجد علی شاہ نے جب اپنے  
دربار کی مخصوص ٹوپی عالم پسند (جھولا) ایجاد کی تو معمول ہو گیا کہ جن لوگوں کو  
زیادہ تقرب حاصل ہوتا اور ”دولہ“ کے خطاب سے سرفراز ہوتے اُن کو  
عالم پسند بھی عطا ہوتی۔ اُن کا فرض تھا کہ عالم پسند پہن کے دربار میں آئیں۔  
اُن سے کم درجے کے باریابان حضور جو کسی کارخانے یا محکمے کے داروغہ ہوتے  
اُن کو دارونگی کے خطاب کے ساتھ شعلہ عطا ہوتا۔ اور وہ وہی پرانا شعلہ  
پہن کے حاضر ہوتے جو پہلے پہل نواب سعادت علی خان کے سر پر لوگوں  
کو نظر آیا تھا۔ باقی تمام لوگوں کو حکم تھا کہ کسی قسم کی گپڑی یا دم کے دربار میں  
آئیں۔ اور گپڑی نہ ہو تو ٹوپی اُتار لیں۔ اہلکاروں کے جس شعلے کا ہم نے  
ذکر کیا ہے اُسی قسم کا شعلہ غالباً مرشد آباد کے دربار میں بھی تھا۔ اور اُسی کا  
اثر تھا کہ آج سے پچاس برس پہلے ہم کلکتہ ہائی کورٹ نے جنگالی و کیلون کو  
اسی طرح کا شعلہ پہنتے دیکھتے تھے لیکن وہ شعلہ دربارِ اودھ کے شعلوں سے

سیک اور ہماری نظر میں ذرا اوجھا ہوتا۔

اب پگڑی کو سوا عہدہ داروں کے تمام خوش باش لوگوں اور معززین شہر نے مطلقاً ترک کر دیا تھا لیکن اسپر بھی دربارین اور نیز عوام میں پگڑی کی جو عزت و لون میں قائم تھی اور ہے اُس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ شادیوں کے موقع پر ہراوئی و اعلیٰ طبقے میں دولہا کے سر پر پگڑی ہی ہوا کرتی ہے۔ اور لکھنؤ کے شرفا میں تو عموماً بھاری کجواب کے شعلے کا رواج ہے۔

یہاں کے دربار سے مذکورہ پگڑیوں کے علاوہ ملازمین کے مختلف طبقوں کے لیے جدا جدا وضعوں کی پگڑیاں بھی مخصوص کر دی تھیں۔ اہل قلم یعنی محرروں کے لیے اسی مذکورہ شعلے کی سی سفید لٹل کی پگڑی مخصوص تھی۔ دربار کے ہر کار سے اور چوہدری بھی اسی قطع کی پگڑیاں پہنتے۔ (اس لیے کہ وہ پگڑیاں یا ندھی نہیں بلکہ ٹوپی کی طرح پہنی جاتی تھیں) فرق یہ تھا کہ ہر کاروں کی پگڑیاں سرخ ہوتیں اور چوہدریوں کی سفید برآقی۔ جن پر آگے داہنی جانب مقیش کا ایک پھول بھی ٹٹکا ہوتا۔ ہر کاروں کی پگڑیوں سے ملتی جلتی پگڑیاں کماروں کی ہوتیں۔ اُن کی پگڑیوں میں داہنی جانب کی کور پر چاندی کی پھلیاں لٹکی ہوتیں۔ اور جسم پر سرخ بانات کے ڈھیلے ڈھالے پہنے ہوتے۔

ان کے علاوہ تمام فوجی اور معزز لوگوں کے خدمتگاروں میں بھی پگڑیوں کا رواج تھا جو اپنی وضع پر جدا اور خود رسی ہوتیں۔

سب سے زیادہ معزز و محترم علمائے ملکا کے تھے۔ اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر پگڑیوں کے سلسلے میں ہم علمائے کرام و مقتدا یاں اُمت کے علمائے کرام کے ساتھ پورے علمی علمائے بحث کریں۔ لکھنؤ میں مسلمانوں کے دو فرقوں کے علمائے اہل سنت۔ اول علمائے اہل سنت۔ دوسرے مجتہدین و اخلاقی شیعہ۔ ان دونوں کی وضع جدا لگانا ہے۔ شیعوں کو نقدس اور ثقاہت کی شان اہل عرب کے لباس میں نظر آتی ہے اور شیعوں کو علمائے فارس و عجم کی وضع میں۔ اسی مذاق و رجحان کے مطابق دونوں گروہوں کے علمائے کرام لباس بھی ہے۔ آنحضرت مسلم کے عہد مبارک میں عربوں کا عامہ صرف اس قدر تھا کہ

کوئی مختصر سا کپڑا سر پر لپیٹ لیا جائے جس کو نہ کسی قطعہ اسی سے علاقہ تھا اور نہ  
 و صنداری سے۔ مگر جب خلفائے عباسیہ کے عہد میں عراقی مستقر خلافت قرار پایا  
 تو عجمی و ساسانی لباس عمائد و اکابر عرب کی وضع میں داخل ہو گیا۔ بہر حال  
 جو بڑے بڑے شاندار عمامے اور طیلیان وغیرہ عہد خلافت کے علمائے عرب  
 نے اختیار کیے اُن کو عربی لباس شکل سے کہا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کے علمائے  
 اہل سنت نے اگلے دنوں وہ عربی لباس چھوڑ کے دہلی کی درباری وضع اختیار  
 کر لی تھی اور اس و صنداری کے ساتھ اُس لباس کو نبایا کہ آج ہندوستان  
 کی سارے ابنائے وطن نے اُسے چھوڑ دیا مگر وہ ابھی تک اُس پر قائم ہیں۔  
 چنانچہ آج تک علمائے فرنگی محل کی اصلی وضع یہ ہے کہ ایک سیدھا گول  
 عمامہ باندھتے ہیں جس کی بندش میں بالکل اس کی کوشش نہیں کی جاتی کہ  
 پیشانی پر محراب کی قطع پیدا ہو۔ جسم میں اگلے زمانے کا جامہ ہوتا ہے جو ب  
 جگہ بالکل خواب و خیال ہو گیا۔ پانوں میں چوڑے اور عرض کے پانچون کا  
 ٹخنوں سے اونچا پانچامہ ہوتا ہے اور گلے میں ایک پتلا سادو پیٹہ پڑا ہوتا ہے۔  
 اس وضع میں ہمارے دو ایک بزرگان فرنگی محل آج بھی جمعے کی نماز پڑھانے  
 کو آتے ہیں۔ مگر گھروں میں وہ معمولی سادی دو پلڑی یا چوگوشیہ ٹوپی۔ لمبا  
 کرتا جس میں گریبان کا چاک نیچ میں ہو یا انگوٹھا اور عرض کے پانچون کا  
 پانچامہ پہنتے ہیں۔ فی الحال حدیث العمر علمائے فرنگی محل نے اب اس وضع  
 کو چھوڑ کے علمائے حرمین اور مقتدایان شام و مصر کی وضع اختیار کرنا شروع  
 کر دی ہے۔ جسے آخر میں مولانا شبلی نعمانی نے بھی قومی اور سرکاری درباروں  
 کے لیے منتخب کیا تھا۔ ان بزرگوں کا جو تا بھی اگلے دنوں گھیتلا تھا مگر اب یا تو  
 زیر پائیان ہیں اور یا لکھنؤ یا دہلی کا چڑھتو ان جوتا۔

علمائے شیعہ کی وضع اس سے بالکل جدا ہے۔ وہ اول تو سر پر دو پلڑی  
 ٹوپی پہنتے ہیں مگر عام لوگوں کے خلاف اُس کی سیون بجائے آگے سے پیچھے کی  
 طرف رہنے کے آڑی بینی ایک کان سے دوسرے کان تک رہتی ہے۔ اسپر بند  
 اونچے بُنے کا عمامہ اہل عجم کے علمائے کی بندش سے ملتا ہوتا ہے۔ بدن میں لمبا



گرتا۔ مگر اُس کے گریبان کا چاک سجاے اس کے کہ سینے کے بیچ میں ہو بائیں شانے کے پاس ہوتا ہے۔ اگلے دونوں علائقے شید کے کروتون میں گریبان کی جگہ دونوں شانوں پر ہوا کرتی تھی۔ مگر یہ وضع اب متروک ہو گئی ہے۔ جو علماء ایران و کربلا ہو آئے ہیں وہ کُرتے کے اوپر اگلی طلیسان پہنتے ہیں جو ہان تھا کہلاتی ہے۔ پانوں میں چوڑے پانچوں کا پانچا ہوتا ہے۔ اور علی العموم کمشن پہنتے ہیں جین کا ذکر جو کون کے بیان میں آئے گا۔

(۳۵)

سر اور درمیانی حصہ جسم کے لباس کا حال تفصیل و وضاحت سے ہم بیان کر چکے اب اہل جسم کے لباس کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد دیگر زوائد لباس اور مختلف گروہوں کی خاص خاص وضعوں کا اور اُن کے بعد عورتوں کے لباس کا تذکرہ کریں گے۔

نیشی حصہ جسم کے لیے عربوں میں سواتھمت کے کچھ نہ تھا۔ عربی تہمت اور ہندوؤں کی دھوئی دونوں بے سی ہوئی پتلی چادرین ہوتی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ تہمت صرف کمر میں لپیٹ کے اٹکا لیا جاتا ہے۔ دھوئی ہندوستان کی مختلف قوموں میں خاص خاص بندشوں سے باندھی جاتی ہے۔ اُس کا ایک سرا نیچے سے پھیر دے کے پیٹھ کے نیچے گھس لیا جاتا ہے اور دوسرے کو بعض لوگ کمر میں لپیٹ لیتے ہیں۔ بعض جپٹ دے کے اور اوپر سے ناف کے پاس گھس کے آگے لٹکا لیتے ہیں۔ عربوں کے تہمت نے ابد کے زمانے میں یہ ترقی کی کہ اُس کے دونوں سرے ہی کے ایک حلقہ بنا لیا جاتا ہے۔ اور اُس میں دونوں پانوں ڈال کے اور کمر کے پاس اُسے سمیٹ کے بندش کر دیا جاتا ہے۔

خوہر اسلام کے وقت اور اُس سے بدقون پیشتر عربوں کا قومی لباس زیرین یہی تھا۔ امیر و غریب بادشاہ و وزیر سب تہمت باندھتے۔ فرق اس قدر تھا کہ امرا و متبکرین عرب اپنی تخت اور اپنے غور کا اظہار اس طرح کرتے کہ یہ تہمت بہت نیچا اور زمین سے ملا ہوا ہوتا۔ جس میں سارے پانوں چھپ جاتے۔ اور اُس کے دونوں سرے زمین پر لوٹے اور گرٹے ہوئے چلتے۔ چونکہ

اس وضع میں کبر و نخوت کی بو آتی اور جو شخص ایسا نیچا تہمت باندھ کے نکلتا دوسروں کو اپنے سامنے ذلیل و حقیر خیال کرتا۔ اس وجہ سے اسلام نے اس وضع کی سخت ممانعت کی۔ حکم دے دیا کہ ازار (تہمت) ٹخنوں سے نیچی نہ ہے علماء اسی حکم کی بنا پر فی الحال یہ قتلے دس رکھا ہے کہ پانجامہ یا نانگوں کا کوئی لباس ٹخنوں سے نیچا نہ ہو۔ حالانکہ پانجامہ نہ اُن دونوں تھا اور نہ اس حکم میں شامل ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ نیچی اور زمین پر لوٹتی ہوئی ازار باندھنے سے جو کبر و نخوت کا خیال امرے عرب میں پیدا ہوتا تھا ہندوستان کے نیچے پانجامہ پہننے والوں میں ہرگز نہیں ہوتا۔

حضرت رسول خدا صلعم کے زمانے ہی میں پانجامہ دیگر مالک و اقوام سے عرب میں پہنچ گیا تھا۔ اور بعد کے زمانے میں بغداد کے دیبار کا اور بن عربوں کا جو عرب سے نکل کے دیگر مالک میں موطن ہو گئے تھے قومی لباس بن گیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں سے پہلے دھوتی کے سوا پانجامہ نہ تھا۔ مسلمان فاتح اسے اپنے ساتھ ہندوستان میں لائے۔ جن میں ملے ہوئے چند ایسے عابد و زاہد اور مقتدا ایمان وین تھے جو سنت نبوی کی پیروی میں تہمت ہی باندھے ہوئے اس سرزمین پر آ گئے۔ تہمت چوتھ سنت ہونے کی وجہ سے ایک خالص دینی لباس تھا۔ اس لیے بے نفس اور دیندار مسلمانوں یا طالب علموں ہی کے ساتھ مخصوص رہا مگر پانجامہ یہاں کی موسائٹی میں اس قدر عام ہو گیا کہ مسلمان درکنار ہندوؤں اور یہاں کی دوسری قوموں میں اس کا رواج ہو گیا۔ لیکن غور طلب یہ امر ہے کہ مسلمانوں کا پہلا اور اصلی پانجامہ کس وضع کا تھا؟ غالباً وہ تنگ ہٹری کا اٹنگا پانجامہ جو شرعی پانجامہ کہلاتا ہے اور تہمت اہل سنت میں مروج ہے مسلمانوں کا پہلا پانجامہ ہے۔ یہی بغداد میں مروج تھا۔ اسی کا رواج ایران و ترکستان میں ہوا۔ اور اسی کو پہنے ہوئے مسلمان ہندوستان میں آ گئے۔

ہندوستان کے آخر عہد میں اس کی قطع میں اتنا تغیر ہوا کہ پانچے یا ہٹری ہٹڈلی سے لپٹی رہتی۔ مگر اوپر کا گھیر قریب قریب اتنا ہی ہوتا جتنا کہ پُرانے

شرعی پانچائے کا تھا۔ چند روز بعد مہری کسی قدر لمبی اونچی ہو گئی مگر ٹخنوں سے آگے نہیں بڑھی۔ دہلی کے آخر عہد تک وہاں اور سارے ہندوستان میں مسلمانوں کا یہی پانچامہ تھا۔ اگرچہ ادنیٰ طبقے کے مسلمان ہندو عوام کی آمیزش سے دھوتیاں باندھتے تھے۔ اور معزز درجہ کے ہندو اپنے گھروں میں چاہے دھوتیاں باندھے رہیں مگر ہندو معیتوں میں آتے تو پانچامہ پہن کے آتے۔

انھیں دونوں کا بل وقتِ عمارت میں دو متفاو قسموں کے پانچائے مروج تھے کابل والوں کا پانچامہ نیچے مہری کے پاس تنگ اور اوپر گھیر کے پاس آٹا دھیلا ہوتا کہ نیچے کا جسم ایک بہت بڑے جھولدار غبارے میں غائب ہو جاتا۔ اور ایک ایک پانچائے میں ایک ایک اور دو دو تھان خرب ہو جاتے۔ یہ آج بھی افغانیوں کی ٹانگوں میں نظر آ سکتا ہے۔ بخلاف اسکے قندھار والے ایسا پانچامہ پہنتے جس کا اوپر کا گھیر تو زیادہ نہ ہوتا مگر دونوں پانچے کلیان جوڑ جوڑ کے اتنے بڑے اور اتنے گھیر کے بنا دیے جاتے کہ جب تک انسان اس کو گھڑس نہ لے پا باقعد سے سنبھالے نہ رہے چلنا دشوار تھا۔

دریادہلی میں بکثرت قندھاری آ آ کے فوج میں نوکر ہوے۔ وہ لوگ چونکہ بڑے بہادر سمجھے جاتے اس لیے بیان کے عام پہگروں میں اُنکے وضع لباس اور عادات و خصائل رواج پائے گئے۔ اور یہ انھیں کی برکت اور انھیں کی صحبت کا اثر تھا کہ دہلی میں بانٹے بڑے بڑے کلیوں دار پانچون کے پانچائے پہنتے۔ دہلی کے آخر عہد میں بانکون کی دھنداری و شجاعت اس قدر پسندیدہ ہو گئی کہ مدہا شریف زادوں نے بانکون میں داخل ہونے کی وضع اختیار کر لی۔ اور شرفا جن میں اکثر اپنی اصلی وضع پر تھے۔ اور بہت سے بانٹے بنے ہوئے تھے لکھنؤ میں آئے۔

لکھنؤ میں آ کے یک یک ایک ڈھیلا عرض کے پانچون کا پانچامہ پیدا ہو گیا۔ شجاع الدولہ۔ آصف الدولہ اور مسعود علی خان کے زمانے تک تو اس کا پتہ نہیں چلتا۔ مگر معلوم ہوتا ہے غازی الدین حیدر یا اُنکے فرزند نصیر الدین حیدر کے زمانوں میں جب کہ بیان لباس و معاشرت میں تغیر ہو رہا تھا اُسی بانکون کے

کلیون دار پانچامے سے مختصر کر کے یہ پانچامہ بنا لیا گیا۔ جو نہ اتنا ڈھیلی تھا کہ ایک ایک پانچامے میں ایک ایک تھان صرف ہو جائے اور نہ تنگ اور چست مہری والے پڑانے پانچامے کی طرح اتنا تنگ کہ پانچے اوپر چڑھانا غیر ممکن ہو۔ یہ نیا پانچامہ ہلکا پھلکا اور ہندوستان کی گرمیوں میں نہایت آرام دہ تھا۔ چند ہی روز میں امر اور ہند لوگوں میں اس قدر مقبول ہو گیا کہ سو اُن لوگوں کے جو بائپن کا دعوے رکھتے تھے تمام اہل فضل و علم زہاد و اتقیا اور سارے شرفا و امرا کی وضع میں یہی پانچامہ داخل تھا۔

اب لکھنؤ میں صرف دو پانچامے تھے۔ ایک تو وہی بائپن کا کلیون دار پانچامہ۔ دوسرا عرض کے پانچون کا پانچامہ جو سارے شہر کے ہند لوگوں کی وضع میں داخل ہو گیا تھا۔ اور اس شان کے ساتھ کہ اکثر ہند تعلیم یافتہ لوگ بھی گلبدن اور مشروع کا سلواتے۔ اور اُسکے پانچون میں چوڑی کوٹ لگائی جاتی۔ بائپن والے اول الذکر پانچامے کو خود نصیر الدین حیدر نے اپنی وضع میں داخل کر لیا۔ اُنکو انگریزی لباس کا بھی شوق تھا۔ اس لیے یا کوٹ پتلون پہنتے یا کلیون دار پانچامہ۔ جس کو فی الحال پنجاب والے غرابے دار پانچامہ کہتے ہیں۔ نصیر الدین حیدر کو یہ پانچامہ اس قدر عزیز تھا کہ انگریزوں کی گون کے مشابہہ دیکھ کے اُنھوں نے اُسے اپنے محل کی بیگن کو بھی پھانا شروع کیا۔ اور محل کی وضع میں داخل ہو جانے کا یہ اثر ہوا کہ شہر کی تمام عورتیں اسی کو پہنتے لگیں جس کا ذکر عورتوں کے لباس کے بیان میں آئے گا۔

شاہی میں اودھ کی فوج فتح پنجاب کے موقع پر انگریزوں کے ساتھ جانے سکھوں سے لڑی تھی۔ سکھ لوگ ایک نئی قسم کا اور یہی پہنتے تھے کاٹ کا تنگ اور چست پانچامہ پہنتے تھے جو گھٹنا کو ملتا ہے۔ بہت سے پنجاب جانے والوں نے اس وضع کو بہت پسند کیا۔ اور گھروں میں واپس آئے تو وہی آڑی کاٹ کے گھٹنے پہنتے تھے۔ یہاں کے اکثر لوگوں نے یہ پانچامہ بہت پسند کیا۔ اور یکایک ایسا رواج ہوا کہ لکھنؤ کے تمام بانیے ترچھے شوقین اور امیر زادے گھٹنا پہنتے لگے جو خوب چست اور خوب لکھنچا ہوتا۔ اور گھٹے

پر اُس کی شکون کی بہت سی چوڑیاں رکھی جاتیں۔  
 لکھنؤ میں بھی تین پانچاے تھے کہ انگریزی ہو گئی۔ بڑے پانچون کا کلیون دار  
 پانچامہ تو بانکون اور اسلم کے ساتھ سارے مردون میں سے فنا ہو گیا۔ تعمیرات  
 حیدر کی عنایت سے فقط عورتوں میں باقی ہے۔ مردون میں فقط دو پانچاے  
 تھے۔ یعنی عرض کا پانچامہ اور کھٹا۔ یا سنی اہل تقا میں سے بعض بعض پرانا  
 شرعی پانچامہ پہن لیا کرتے۔ انگریزی دور نے پہلا اثر یہ کیا کہ پانچاموں کی  
 وضع قطع تو یہی رہی مگر اٹلس گلہن۔ اور مشرع کے پارٹیکن سہتی پانچاے  
 مردون سے بالکل چھوٹ گئے۔ چند روز بعد علی گڑھ کالج کے سوشل اسکول  
 سے انگریزی پتلون کی نعل کے پانچاے ایجاد ہوئے جو اتنے تنگ ہوتے  
 ہیں کہ پنڈلی سے پلٹے رہیں اور اتنے ڈھیلے کہ پانچہ اوپر تک پڑھا لیا جاسکے  
 انگریزی تعلیم پانے والوں اور سارے ہندوستان کے اکثر شریف زادوں میں  
 اب اسی پانچاے کا رواج بڑھتا جاتا ہے۔ اگرچہ اکثر تعلیم یافتہ جو تہذیب جدید  
 کے ملاو اعلیٰ تک پہنچ گئے ہیں اپنا سارا لباس چھوڑ کے کوٹ پتلون پہننے لگے  
 ہیں۔ لیکن لکھنؤ میں آج بھی بعض گنتی کے ایسے ثقہ لوگ نظر آسکتے ہیں جو  
 پرانی قطع کے عرض کے پانچاے پہنتے ہیں اور اپنی وضع نہیں چھوڑتے۔

(۳۶)

انگریز کے یا چکن وغیرہ کے اوپر اگلے دنون ووشالے کا رواج زیادہ نظر  
 آتا ہے۔ اور یہی شاہی درباروں سے خلعت میں عطا ہو اکر تا تھا۔ اسکے ساتھ  
 شالی رومال اورٹھنے کا بھی ایک معمولی حد تک رواج تھا۔ یہی دنون چیزیں  
 وہلی سے لکھنؤ میں آئیں۔ مگر لکھنؤ میں زیادہ رواج رومال اورٹھنے کا تھا۔  
 جاڑون میں اکثر شالی رومال اور سردی کے اوقات میں دوشالہ اورٹھا جاتا۔  
 لکھنؤ میں دربار قائم ہونے کے بعد جب گرمیوں کے لیے لباس میں نفاست و لطافت  
 اور ٹیکہ کو ترقی ہونے لگی تو بابر لیٹ اور چکن کے رومال ایجاد ہوئے۔ اور تمام  
 سفید پوش شریفوں کا یہ لباس ہو گیا کہ سر پر قالب چڑھی چکن کی چو گوشہ ٹوپی۔  
 بدن میں انگریز کا پانٹون میں عرض کے پانچون کا پانچامہ اور کندھے پر ہکا چکن یا

جانی کا رومال۔ شرفائے لکھنؤ کی یہ پہلی عام وضع تھی جس کو میراٹیس مرحوم کا خاندان  
اٹھین اگلے لکھنؤ کے ساتھ آج تک بنا رہا ہے۔

لباس میں سب سے آخری اور بڑی اہم چیز جو تیار ہے۔ مسلمانوں کے آسنے  
سے پہلے ہندوستان میں جوتے کا مطلق رواج نہ تھا۔ اس لیے کہ چڑے کے ہتھال  
سے ہندو لوگ مذہباً احتراز کرتے تھے۔ بلکہ جوتے کے عوض یہاں لکڑی کے کھڑائیں  
پہنی جاتیں جو آج کل کے بعض فقیروں اور تراض شیوں کے علاوہ قدیم راجاؤں  
میں بھی مروج تھیں۔ مسلمان اپنے ساتھ ہندوستان محیط لباس کے ساتھ چڑے  
کے جوتے بھی لائے۔

مسلمانوں کا پہلا جوتا عربوں میں فقط ایک چڑے کا تھا جو پٹے یا بندھنوں  
کے ذریعے سے پاؤں میں لٹکا لیا جاتا۔ عجیون اور رومیوں کا چڑے کا سودہ  
جو تھے سے پہلے عرب میں پونچ گیا تھا۔ پھر جب عربی دربار شام و عراق میں  
روم کے آغوش میں قائم ہوئے تو چڑے کے جوتوں کا رواج شروع ہوا۔ مگر  
وہ پہلے جوتے بظاہر سیدھی سادی زیر پائیاں تھے۔ اٹھین کو پہنے ہوئے  
مسلمان ہندوستان میں آئے۔

دہلی کے امرا اور بادشاہ اگلے دنوں اپنی تصویروں میں اونچی اڑتی  
کی کفش کا جوتیاں پہنے نظر آتے ہیں۔ دہلی کے آخری عہد میں چڑھواں جوتا  
ایجاد ہوا۔ جس کی ابتدائی وضع یہ تھی کہ آدھا پنجہ اور گئے سے نیچے تک  
پاؤں اُس میں چھپ جاتا۔ اُسکے سرے پر چوڑی نوک پہنچے ہر جھکا کے  
بٹھا دی جاتی۔ یہ پہلا دلی وال جوتا تھا۔ جس کا پچاس سال پیش زیا دہ  
رواج تھا۔ اس کے بعد سلیم شاہی جوتا نکلا۔ جو غالباً چٹا لکیر کے زمانے میں  
ایجاد ہوا۔ اسکی نوک آگے نکلی اور اٹھی ہوئی ہوتی۔ اور نوک کا تھوڑا سا  
باریک سرا اوپر موڑ دیا جاتا۔ ایجاد کے بعد اُس پر کلا جوتوں کا مضبوط کام بننے  
لگا۔ جو بالکل سچا اور قیمتی ہوتا۔ اگرچہ یہ کام دلی وال اور سلیم شاہی دونوں  
وضع کے جوتوں پر بنایا جاتا مگر سلیم شاہی جوتے کا بہت زیادہ رواج ہوا۔  
اور اُس نے چند روز میں پُرائے دلی وال کو مٹا دیا۔ اور اُس کی سب سے

بڑی خوبی یہ ہے کہ اب جبکہ انگریزی وضع و قطع نے ہمارے سارے لباس اور ہماری تمام چیزوں کو متا دیا وہ آج تک باقی اور مقبول عام ہے۔ اور اکثر ہندوستانی وضع پسند کرنے والے و مندر بھاری سے بھاری لباس پر اُسی کو پسندتے ہیں اور فی الحال لکھنؤ میں بھی بہت سے لوگ اُس کو پسندتے ہیں۔

مگر لکھنؤ میں بعد شاہی ایک نئی قطع کا خورد نو کا جوتا ایسا دہوا جس کو بیان کے و مندر اون نے ابتداء بہت پسند کیا تھا۔ اُس میں نوک بالکل نہ ہوتی۔ بلکہ جو نوک دئی وال اور سلیم شاہی میں اوپر نکالی جاتی۔ اُس میں سینے کے بعد اُلٹ کے اندر کر دی جاتی۔ نوک کے پاس فقط ایک ذرا سا اُبھار رہتا۔ جو تلال نری کے نہایت ہی ٹیک اور صاف بنائے جاتے اور نفاست و سیکھاری کے اگلے مذاق نے اس کو بیان تک سبک کیا کہ بعض سوچوں کے اتھ کا جوڑا چار پانچ پیسوں میں سے زیادہ نہ ہوتا۔ اگرچہ عوام اور دیہاتوں کے لیے اُسی وضع کے چمڑے جوتے اتنے بھاری ہوتے کہ سیر سیر ڈیڑھ ڈیڑھ سیر سے کم نہ ہوتے اور پھر کڑوا تیل پلا پلا کے اور بھاری کر لیے جاتے۔

تھوڑے دنوں بعد لکھنؤ میں اس خورد نو کے جوتے کی آرائش و زیبائی کی طرف توجہ ہوئی پہلے جاڑے گرمیوں کے خشک موسم کے لیے کاشانی نعل کے اور برسات کے لیے کیمخت کے بتنا شروع ہوئے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بامان کا جوتا نہایت ہی نفیس۔ سادہ۔ سبک۔ اور خوشنما ہوتا۔ کیمخت سبز رنگاری رنگ کا ہوتا جو گھوڑے یا گدھے کی کھال سے بتا اور اُس میں کٹھن کے خاروں کی طرح دانے اُبھار کے پیدا کیے جاتے۔ اور تعریف یہ تھی کہ برسات میں چاہے کتنا ہی بھیکے اُسے رنگ و روپ میں فرق نہ آتا۔ خود کیمخت کے بنانے کا فن اگرچہ باہر سے آیا تھا مگر لکھنؤ میں اُس کے بہت سے کارخانے جاری ہو گئے۔ اور سب جگہ سے اچھا بننے لگا۔

چند روز بعد جوتوں کی آرائش میں اور ترقی ہوئی۔ اور سلیے شامے کے کارچہ کی کام کے جوتے بننے شروع ہوئے۔ جن میں نقش کے چھندنے لگا کے عجیب چمک دمک اور تاب و تاب پیدا کر دی جاتی۔ اس کے بعد جب جھوٹا سلمہ اور کلکتوں آیا تو

چھوٹے کام کے چڑھویں جوتے بننے لگے جو بہت سستے داموں میں عجب بہار دکھا دیا کرتے۔

لیکن چڑھویں کے ساتھ ہی ساتھ یہاں ایک گھیتلا جوتا مروج تھا۔ جو دراصل پُرانے کفش نما جوتوں سے ماخوذ تھا۔ اور عالی مرتبہ امیرون اور اکثر اعلیٰ طبقے کے شریفوں میں علی العموم پہنا جاتا تھا۔ دراصل یہی ہندوستان کا پُرانا قومی جوتا تھا۔ اور اُس کی یادگار حیدر آباد کی پش اور دیگر مقامات کے دیسی جوتے ہیں۔ اور یہی اگلے اہل دربار اور وطنی بزرگان سلت کے پائون میں نظر آتا ہے۔ گھیتلے میں اتنی ترقی ہوئی کہ اُس کی نوک بجائے مختصر ہینے کے ہاتھی کی سونڈ کی طرح بہت بڑھانے اور پھیلانے کے پنجے کے اوپر ایک بڑے حلقے کی صورت میں لپیٹ دی گئی۔ یہ جوتا اودھ کے اگلے بادشاہوں اور وزرا و امرا سب کے پائون کی زینت ہوا کرتا۔ چڑھویں جوتے نے ایجا د ہونے کے بعد اُس کی جگہ لینا شروع کی۔ یہاں تک کہ عذر ہوتے ہوتے گھیتلا فقط عورتوں کے پائون میں رہ گیا۔ جن کے نازک پائون کا وہ عام لباس تھا۔ اور مردوں کی پوشاک سے وہ بالکل خارج ہو گیا۔ لیکن کفشتیں اپنی اصلی صورت پر آج تک بانی ہیں جو شیعیان علی کے اتقیا و علیا خصوصاً مجتہدین کے ساتھ مخصوص ہیں۔ گھیتلے جو تون کفشتوں اور اُن پر چوکار چوبی کام بنایا جاتا ہے اُس نے مسلمانان لکھنؤ میں دو خاص پیشے پیدا کر دیے جن پر بہت سے لوگوں کی معاش کا دار و مدار ہو گیا۔ پہلے تو مسلمان موچی جن کی یہاں ایک مستقل قوم اور برادری ہے۔ یہ لوگ سوا گھیتلے جوتے بنانے کے اور کسی قسم کا جوتا بنانا اپنی شرافت کے خلاف جانتے ہیں۔ لکھنؤ میں ان لوگوں کے بہت سے گھر تھے اور سب سچے مسلمان۔ سفید پوش۔ اور بمقابلہ دوسرے ادنیٰ طبقے والوں کے ممتاز تھے۔ اور اگلے دنوں نہایت فارغ البالی سے بسر کرتے تھے۔ لیکن اب قدیم وضع و لباس کے بدلنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ مردوں کے بعد عورتوں نے بھی گھیتلا جوتا بالکل چھوڑ دیا۔ اور بازار جو اعلیٰ درجے کے گھیتلے جوتوں سے بھرا ہوتا تھا اُس میں اب اگر کسی دوکان پر اُس وضع کا ایک اودھ جوڑا مل بھی جاتا ہے تو بہت ہی ذلیل و



وحقیر چڑانا۔ لاند۔ اور میلا ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان موچیوں کا گروہ بالکل تباہ ہو گیا۔ اُن کے بیسیوں گھراؤ بڑ گئے۔ اور جو باقی ہیں قعر فنا کے بالکل کنارے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کی وسعت داری کی داد دینا چاہیے کہ لٹ گئے اور تباہ ہو گئے مگر یہ نہ گوارا کیا کہ گھیتلے جو تون کے عوض سلیرین یا بوٹ بنائیں۔ اور روزانہ زنا کا ساتھ دے کے پہلے سے زیادہ ترقی کریں۔

دوسرا گروہ اہل حرفہ جو اُنکی جوتوں کے صدقے میں پیدا ہوا جو تون کی چھوٹی اوگھیاں بنانے والوں کا ہے۔ اوگھی کارچولی کام کے اُن مختلف قبیعے کے ٹکڑوں کو کہتے ہیں جو زناتے یا مردانے جو تون پر لگائے جاتے ہیں۔ اوگھیاں بیان بہت ہی نفیس زرق برق اعلیٰ درجے کی ایسی نفیس نبتی نقین جیسی کہین نہیں سکتی نقین۔ اور اُنکی مانگ اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ آبادی کا ایک معتمد حصہ اُن نقین کی تیاری پر زندگی بسر کر رہا تھا۔

پھر حال گھیتلے جو تون کے فنا ہونے سے ان دونوں گروہوں کو نقصان پہنچا۔ اب گھیتلے کے عوض عورتوں میں عموماً سلیرین کا اور خاص گھرانوں یا خاص جوتوں کے لیے تمام شریعت بیبیوں میں اعلیٰ درجے کے پرب شو کا رواج ہے۔ دو لہند گھرانوں میں گھیتلا جوتا چھوڑ کے ٹاٹ بانی (یعنی کارچولی کام کے) بوٹ پہننا شروع کیے تھے۔ اُن کے چند ہی روز بعد چھڑے کے بوٹ جو بغیر کھولے پاتوں سے اُتر سکیں پہنے جانے لگے۔ اور اب تو علی العموم پٹن اور جن لوگوں نے پوری انگریزی وضع اختیار کر لی ہے اُن کی بیگیں تو ہر قسم کے لیڈرز شو پہننے لگی ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی سلسلے میں عورتوں کے عام لباس کو بھی بیان کر کے ہم وضع و لباس کی بحث کو ختم کر دیں۔

ہندوستان میں عورتوں کا قدیم لباس صرف ایک بے سی ہوئی لمبی چادر تھی جو آدھی کمر سے لپیٹ کے باندھ لی جاتی۔ اور آدھی کندھے یا سر پر ڈال کے اوڑھ لی جاتی۔ اسکے ساتھ سینے کا ایک لباس بھی ہندوؤں کے پرانے زمانے سے چلا آتا ہے جو لمبڈی ہندوین ”انگیا“ اور جینوئی ہندوین ”چوئی“ کہلاتا ہے۔

یہ لباس سری کرشن جی کے زمانے میں بھی معلوم ہوتا ہے کہ موجود تھا۔ آخر زمانے میں چولی اور انگلیا کی تفریق یوں ہوئی کہ دکھن میں ایک جھول دار پٹی سے پیچھے سے آگے کی طرف لاکے دو نوں چھاتیوں کے درمیان میں گرہ دے کے یا تو نام لگا کے کس دی جاتی ہے۔ اور دو نوں چھاتیان اُس جھول میں کسی قدر اُبھار کے ساتھ دبی اور کسی رہتی ہیں۔ یہی دکھن کی چولی ہے۔ بخلاف اس کے بلندی ہند میں انگلیا یوں بنتی ہے کہ پستانوں کے مناسب ٹاپ کے کپڑے کی دو کٹریاں بنائی جاتی ہیں جو دو تین انگل تک باہم سی کے جوڑ دی جاتی ہیں اور اُن کے بالائی کو نوں پر جالی کی دو چھوٹی چھوٹی آستینیں لگا دی جاتی ہیں۔ اور اُن آستینوں کے نیچے دو نوں پہلوؤں پر دو دو بند لگا دیے جاتے ہیں۔ اس طرح طیار کر کے اور دو نوں ہاتھوں کو آستینوں میں ڈال کے یہ انگلیا بن لی جاتی ہے۔ آستینیں بہت ہی چھوٹی آدھے بازوؤں سے بھی کم رہتی ہیں۔ اور چھاتیوں کی کٹریوں میں ڈال کے پیٹ پر بند کھینچ کے نیچے اوپر دو بندشیں دے دی جاتی ہیں۔ بخلاف چولی کے انگلیا چھاتیوں کو اصل سے زیادہ اُبھار کے نمایاں کر دیتی ہے۔

بہر حال یہ پُرانا ہندو لباس ہے۔ اور ہم نہیں جانتے کہ مرور زمانہ سے اُس میں کیا اصلاحیں یا ترقیاں ہوئیں۔ بادی النظر میں انگلیا زیادہ ترقی یافتہ اور بعد کی اصلاح معلوم ہوتی ہے۔

اسلئے سوا ہندو زمانے میں عورتوں کا اور کوئی لباس نہیں معلوم ہوتا۔ یہ ہوسے کپڑے اور گرہتا پانچاہم مسلمان اپنے ساتھ لائے۔ مسلمانوں کی عورتیں ملک عجم سے عرس کے ڈھینے پانچون کے پانچاے پہنے ہوئے یہاں آئیں۔ جو شخصوں پر جیٹ دے کے باندھ دیے جاتے تھے۔ چند روز بعد وہ پانچاے تنگ نہری کے ٹھٹھے ہو گئے۔ جن کا گھیر اوپر سے ڈھیلٹا ڈھالا ہوتا۔ رفتہ رفتہ اُن میں کھنچاؤ کا شوق بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ اوپر کا گھیر بھی کم ہو گیا۔ اور پانچون کی ہریاں تو اس قدر تنگ ہو گئیں کہ پہننے کے بعد کس کے کسی لی جائیں۔ اور اُتارنے وقت نہری کے ٹانگے توڑنے کی ضرورت لاحق ہوتی جیسے پانچاے آج بھی بہت سے شہروں میں مروج ہیں۔

لکھنؤ میں مسلمان بلیوں کی وضع ابتداء تو یہی تنگ نہری کا کھنچا ہوا پانچا ہے۔ سینے پر چھوٹی اور تنگ آستینوں کی کھنچی ہوئی انگلیا۔ اور پیٹ اور پیٹھ چھپانے کے لیے ایک عجیب و غریب کرتی جو آگے کی طرف اُس حد تک کاٹ دی جاتی جہاں تک جسم پر انگلیا کا تصرف رہتا۔ اُس میں نہ آستینیں ہوتیں اور نہ سینے پر اُس کا کوئی حصہ رہتا۔ دو لمبے ہندون کے ذریعے سے جو شانوں پر سے ہو کے آتے پیٹ اور پیٹھ پر معلق ہوتی۔ اُس کے اوپر تین گز کا چٹا ہوا باریک دوپٹہ جو سر سے اوڑھا جاتا۔ لیکن آخر میں نقطہ شانوں پر پڑا رہنے لگا۔

ہندوستان کے موسم اور مزاجوں کی نزاکت نے محرم کرتی اور دوپٹے کو روز بروز سبک کرنا شروع کیا یہاں تک کہ لٹاہی کی انگلیا اور کرپ کے دوپٹے و صندوق امیر زادیوں کے فیشن میں داخل ہو گئے۔ نعیر الدین حیدر بادشاہ کے زمانے سے لکھنے رخصت ہو گئے اور اُن کی جگہ بڑے بڑے گھیر دار پانچوں کے کلیوں دار پانچاے جو کر کے پاس بہت ہی تنگ ہوتے اور چوڑی یعنی میانی خوب کھنچی رہتی۔ علی العموم رواج پا کے غورتوں کی خاص وضع قرار پائے۔ یہ پانچے آگے کی طرف ایک نفاست و خوشنمائی کے انداز سے ناف کے نیچے گھر لیے جاتے تاکہ چلنے پھرنے میں زمین پر لوٹ کے خراب اور سیلے نہ ہوں۔ غدر کے قریب زمانے یا شاہی کے عہد آخر میں باریک کپڑوں اور ادھی آستینوں کے تنگ شلوکوں کا رواج ہو گیا جو کرتی کے عوض پہلے تو محرم کے اوپر پہنے جانے لگے۔ اور چند روز بعد اُنھوں نے محرم کی ضرورت بھی اڑا دی۔ مگر اب بھی بہت ہی باریک کپڑوں کے استعمال کیے جانے کی وجہ سے یہ لباس تنگ معلوم ہوتا۔ خصوصاً اس لیے کہ باہر بالکل تنگی رہتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شلوکوں کے عوض کسی قدر ڈھیلا کرتوں کا رواج ہوئے لگا۔ لیکن اب یک بیک کرتوں کی جگہ انگریزی جاکٹ اور باڈس پہنے جانے لگے۔

اب ہر صوبے اور ہر شہر کی وضعوں کا مقابلہ اور اس کے ساتھ باہمی اختلاف سے ہونے لگا ہے۔ اور بعض مسلمانوں یا خود خاقانوں کو ساری زیادہ خوشنما نظر آئے گی۔ جس کی وجہ سے لکھنؤ کی عورتیں آدھے کے قریب پُرانی وضع چھوڑ کے ساریاں

باندھنے لگی ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ اُس میں زیادہ سادگی ہے۔ میں اگرچہ اسکے خلاف نہیں ہوں کہ عورتیں اپنے حسن میں جدت اور تازگی پیدا کرنے کے لیے مختلف لباسوں کو چنیں اور مصداقِ ع ہر لحظہ وضع و گراں یار برآمد پائی ہوئی دھون سے اپنے شوہروں کی دلدادہی کریں۔ لیکن میں اسکے سخت خلاف ہوں کہ اپنی قومی وضع بالکل چھوڑ دی جائے۔ اور اپنے معاشرتی خصائص بالکل فنا کر دیے جائیں۔ ساری ایک غیر محیط کپڑا اور تمدن انسانی کے بالکل ابتدائی اور غیر تمدن زمانے کی یادگار ہے۔ سادگی بیشک دلکش چیز ہے۔ مگر بہت سی قیدوں اور خصوصیتوں کے ساتھ۔ ورنہ پوری سادگی تو عریانی میں ہے۔ خود لباس فطرت انسانی کو اپنے تقاضا کا جامہ پہنانا ہے۔ اس لیے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ساری میں کیا خاص خوبی و خوبصورتی ہے۔

جس طرح مرد کی طبیعت کا خاصہ ہے کہ اپنی حسین ترین منگو جسے اُکتا کے دوسری جوان عورتوں کی طرف مائل ہوتا ہے اُسی طرح ہمارے فوجوان اپنی بیبیوں کی وضع سے سیر ہو کے دوسری قوموں کی عورتوں کے لباس پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ مگر خوب یاد رکھیے کہ جس طرح آپ اُن کے لباس پر فریفتہ ہیں اُسی طرح دوسری قوموں کے مرد آپ کی عورتوں کے ترقی یافتہ لباس میں زیادہ دلچسپی و رعنائی پاتے ہیں۔ نفسانی خواہشات کا ایک منالطہ ہے جو فی الحال آپ کی نظر میں اپنی عورتوں کے لباس کو مصیوب ثابت کر کے بار بار ملک میں یہ بحث پیدا کرتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی بیبیوں کے لیے مناسب کیا ہے۔

ہم اس مسئلے پر ابھی طرح بحث کرتے اگر ہمیں یقین ہوتا کہ خالص عورتوں کی اخلاقی و معاشرتی اصلاح کی غرض سے یہ مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ دراصل یہ مسئلہ اُسی تقاضا سے طبع سے پیدا ہوا ہے جس نے فوجوانوں کو کوٹ پتلون پہنایا۔ ہیٹ سے اُن کے سروں کو زینت دی۔ اور سوارنگٹ کے اُن میں کوئی چیز اپنی نہیں باقی رکھی۔ لہذا ہم کو یقین ہے کہ یہ مسئلہ فقط اس جوش میں پیدا ہوا ہے کہ مردوں کی طرح عورتیں بھی اگر بڑی لباس اختیار کریں۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ اس بارے میں لکھتا پڑھنا اور کہنا سنا سب بیکار ہے۔ اس لیے

کہ جب تک انگریزی سائے اور ہکٹ اور بانٹ (انگریزوں کی ٹوپی) پہننے کا فیصلہ نہ کر دیا جائے گا ہمارے مصلحان معاشرت اور نقالی موجدان فائین کو چین نہ لے سکے گا۔ اس کے سوا چاہے اور کیسی ہی اچھی اصلاح و ترمیم کی جائے گی انگلستان نہ ہوگا۔

غرض اس انجام کو سوچ کے اس بارے میں اخباروں اور رسالوں کے صفحے سیاہ کرنے کا کوئی نتیجہ نہیں۔

(۳۷)

لباس کے متعلق لکھنؤ میں تراش و تراش اور کپڑوں کی نوعیت میں روز بروز ترقی ہوتی رہی۔ گرم ملک ہونے کی وجہ سے ہندوستان کے ادنیٰ طبقے والے سواستریٹ کے اپنا سارا پنڈا باندھ رکھتے ہیں یہ صرت ان کے افلاس اور اہل ملک کی کم مانگی کے باعث نہیں بلکہ موسم اور آب ہوا کے تقاضے سے ہے۔ اس کا اثر دہلی میں بھی یہ تھا کہ بجائے گندہ اور گران کپڑوں کے ٹیک اور نازک کپڑے اختیار کیے گئے۔ یہاں اُس سے بھی زیادہ ترقی ہوئی۔ اور چونکہ اب سپہگری و جنگجوئی کی بہت ہی کم ضرورت باقی تھی۔ عیش پرستی اور عورتوں کی صحبت بہت بڑھتی جاتی تھی۔ اس لیے مردوں پر عورتوں کی وضع کا اثر پڑنے لگا۔ جو اعتدال سے باہر ہو گیا۔ اور جس قسم کی زینت و آرائش عورتوں کے لیے موزوں ہے مردوں نے اپنی وضع اور اپنے لباس میں اختیار کرنا شروع کر دی۔

خصوصاً اُس زمانے سے جبکہ یہاں کے حکمرانوں نے اپنے لیے ثواب کا لفظ چھوڑ کے بادشاہ کا لفظ اختیار کیا۔ نیشاپوری اور سالار جنگی خاندان کے لوگ جو مہذبہ و شیعہ اور نشینین پارتھ تھے بالکل خانہ نشین کر دیے گئے تو ان کو سوا عورتوں کے کسی کی صحبت ہی نہ نصیب ہوتی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ان کے وضع و لباس ہی میں زمانہ بین نہیں پیدا ہوا بلکہ ان کی زبان بھی عورتوں کی سی ہو گئی۔ اور چونکہ وہی شہر کے رئیس اور وزراء تصور کیے جاتے۔ لہذا اکثر عوام نے بھی اُنھیں کی پیروی شروع کر دی۔ اور بخلات و دیگر مقامات کے رئیسوں کے یہاں لکھنؤ میں یہ عام وضع ہو گئی کہ سر پر ٹانگ۔ اُسپر سائے کی

کا مدار ٹوپی۔ کاٹون تک بال جن کی کٹھی کرنے میں ماسقے پر دونوں جانب پٹیاں  
بٹائی جاتیں۔ منہ میں پان۔ ہونٹوں پر لاکھا۔ ہنڈے میں جن میں کھڑکیوں کا  
چست (مگر کھا۔ اُسکے نیچے گلبدن کا ریشمی کھنچا ہوا گھٹنا۔ ہاتھوں میں ہندی۔ پانوں  
میں ٹاٹ بافی یعنی کا مدار بوٹ۔ جاڑوں میں انگرکے کی جگہ نیلے۔ دزد یا سبز و  
سرخ اٹلس یا گرٹ کا روئی دار دکھا۔

جاڑوں میں یہاں کے بعض معزز لوگ عموماً شال کی قبائیں پہنتے مگر وہ شال  
اور شالی رومال کو سب پسند کرتے۔ اُسی کا نتیجہ تھا کہ جیسا شال لکھنؤ والوں  
میں اب بھی کہیں کہیں نکل آتا ہے ویسا شال ہندوستان کیا معنی شاید جو کشمیر  
میں بھی اب نسیم نہ ہوسکے گا۔

شال کا شوق یہاں تک بڑھا کہ بہت سے شال بننے والے اور ہزاروں روپے  
اور شال کے دھوسے والے کشمیری اپنا وطن چھوڑ کے لکھنؤ میں آئے جن کا  
گزشتہ پچاس سال میں اب نام و نشان بھی نہ باقی رہا۔ اُن میں سے کوئی بچا  
بھی تو اُس نے کوئی اور پیشہ اختیار کر لیا۔

محرم چونکہ لکھنؤ میں ایک بڑی اہم چیز اور عداوری کا زمانہ تھا اس لیے  
سوگواری اور نفاست و نزاکت کا لحاظ رکھ کے یہاں محرم کے لیے خاص لباس  
اور خاص زیور ایجاد ہو گیا۔ سیاہ اور نیلے رنگ غم و سوگواری کے رنگ سمجھے  
گئے۔ اور سبز رنگ اس لیے کہ بنی عباس کے عہد میں اُن کے سیاہ رنگ کے  
مقابل بنی فاطمہ کا رنگ سبز تھا۔ چنانچہ آج بھی ایران و ہند کے بعض فاطمی  
اپنے سبز عماموں سے سیدوں کی اس قدیم وضع کا ثبوت دے دیا کرتے ہیں۔ بہر  
تقدیر محرم میں سرخ رنگ ممنوع قرار پایا۔ تیز۔ نیلا۔ اور سیاہ رنگ اور  
انکے ساتھ دزد رنگ بھی اُس موسم کے لیے مناسب سمجھے گئے۔ چنانچہ یہاں  
محرم میں تمام عورتوں کا لباس انھیں مذکورہ رنگوں سے مناسب جوڑ لگا کے  
منتخب کیا جاتا۔ سارا زیور بڑھا دیا جاتا حتیٰ کہ چوڑیاں تک اُتار ڈالی  
جاتیں۔ جن کے خوش کلائیوں کے لیے ریشم کی سیاہ و سبز پونچیاں اور کافوں  
کے لیے سیاہ و دزد ریشم کے کرن پھول ایجاد ہوئے جو سونے چاندی کے زیور سے

بھی زیادہ نفاست کے ساتھ ان کی زیبائی و رعنائی بڑھا دیا کرتے ہیں۔

محرم تو نہایت ہی اہم ہینہ تھا۔ یہاں ہر موسم اور ہر زمانے کے مناسب ایسی ایسی ایجادیں عورتوں کے لباس میں روز ہوتی رہتی تھیں جن کو سارا سنہ جبرت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ اور سچ یہ ہے کہ آج سے پچاس سال پیشتر لکھنؤ میں عورتوں کے لباس کی تراش و خراش اور روز بروز کی تازہ جدتوں کو جو دیکھتا وہ فرانس اور لندن کے فیشن بدلنے کو بھول جاتا۔ اور اسی بنا پر اکثر زبانوں پر جاری ہو گیا کہ لکھنؤ مشرق کا پیرس ہے۔ آج بہت سے سادگی پسند اور ترقی یافتہ معاشرت سے محروم رہنے والے ان تعلقات پر اعتراض کرتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ جن درباروں اور شہروں میں تمدن ترقی کرتا ہے وہاں معاشرت و صحیت کے ہر شعبے میں ایسی ہی باتیں پیدا ہو جایا کرتی ہیں۔ جو ایک فلسفی کی نظر میں چاہے لغو و فضول ہوں مگر دھنداروں کی صحیتیں اور شائستہ لوگوں کی محفلین انکو نہایت ہی اہم اور ضروری تصور کرتی ہیں۔

مردوں پر عورتوں کی وضع کے غالب آنے کا اثر اگر کپڑوں کی نزاکت اور تیز اور بھڑکیلے رنگوں تک محدود رہتا تو بہت غنیمت ہوتا یہاں تو بہت سے لوگوں کی یہ حالت ہو گئی کہ میان بوی کے دگلون۔ دو پٹون۔ دولائیون۔ وٹائیون اور پانچائیون میں کسی قسم کا فرق ہی نہیں رہا۔ جز اس کے کہ گوتھا پٹھا اور زور عورتوں کے ساتھ مخصوص تھا۔ مرد شوخ رنگوں کے تازک ریشمی کپڑے بغیر گوتے پٹھے کے پہنتے۔ مگر یہ مذاق غدر کے بعد انگریزی اثر سے گھٹنے لگا۔ اور اب صرف چند گنتی کے لوگوں کے سوا کسی میں نہیں باقی رہا۔

مرد و خاتون اور ان کے مختلف طبقات کی طرح یہاں عورتوں کے مختلف طبقوں کی بھی خاص خاص وضعیں قرار پا گئیں۔ انگریزوں کے خاندان کو پچھلے اور سائیس مختلف درجوں میں رہتے ہیں۔ مگر وہ ویدیان ان کا اصلی لباس نہیں قرار پا سکے کہ اپنے گھروں میں بھی وہ انکو پہنا کرتے ہوں۔ بنگلات اسکے لکھنؤ میں زمانے اور مردانے نوکروں اور انارباہر کے کام ملازموں کے لیے جو خاص خاص لباس مقرر ہو گئے تھے وہی انکی اصلی وضع قرار پائے۔ مثلاً بیسے

ڈیوڑھیوں کے پہرے والے سپاہیوں - اور چوہدریوں - ہر کاروں وغیرہ کی خاص اور جدا جدا وضعیں تھیں ویسے ہی زمانی مجلسراون میں محلداروں - مغلائیوں اور کھاریوں کی وضعیں اس قدر ممتاز تھیں کہ دوسرے دیکھتے ہی انہیں سمجھ جائے گا کہ یہ عورت محلدار ہے - یہ خواص ہے - یہ مغلائی ہے - اور یہ کھاری ہے - اور پھر لطف یہ کہ ان کے لباس میں وردی کی شان نہیں پیدا ہونے پائی -

خدمتگاروں اور انھیں کی طرح پیش خدمتوں کا البتہ وہی لباس تھا جو خود میان بیویوں کا لباس تھا - جس کی وجہ یہ تھی کہ یہ دونوں گروہ اپنے مالک یا مالک کا آثار میں نئی آنکے اترے ہوئے کپڑے پہنا کرتے ہیں -

لباس کے بعد عورتوں کے لیے سب سے اہم چیز زیور ہے - اور عورتیں اکثر اپنی مخصوص دولت و جائداد اپنے زیور کو سمجھتی ہیں - جس کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ اکثر مصوبات ہند میں بھدے اور بھاری زیور کا زیادہ رواج ہے - تاکہ وہ قیمت میں زیادہ ہوں - زیور کے بھاری ہونے کا شوق اور دھمکے دیہات میں اور عموماً ہندوستان کے تمام شہروں میں روز بروز بڑھتا جاتا ہے - مگر لکھنؤ میں دہلی کے شریف خانہ انوں کی معزز خاتونیں آئین تو ابتداء ہی زیور جس کا سارے ہندوستان اور خود دہلی میں رواج تھا پہنے ہوئے تھیں - مگر یہاں آنے کے چند روز بعد جب یہاں کی ترمیم شدہ مخصوص معاشرت قائم ہوئی تو زیور میں فقط زینت و آرائش کا خیال باقی رہ گیا - اور ہر قسم کا زیور روز بروز سبک - ہلکا - نازک - اور خوشنما ہوتا گیا - یہاں تک کہ آخر ہند میں امرا اور دولتمند گھرانوں کی بیویوں کی یہ وضع ہو گئی کہ سادے بغیر سسلے اور گوسٹے پیٹھے کے کپڑے پہنتیں اور زیور کی قسم کی وہی ایک چیزوں پر جو بہت ہی نازک - سبک - اور قیمتی ہوتی ہیں کھاتیت کرتی ہیں - اور اگر گلے اور ناک کاں میں متعدد چیزیں پہنتیں بھی تو وہ بہت ہی ہلکی ہوتی ہیں - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیسا سبک اور ہلکا زیور لکھنؤ میں پہنے لگا کہیں نہ بن سکتا تھا -

ناک میں تھم ہندوؤں کے عہد سے نہایت ہی ضروری زیور اور سہاگ



کی نشانی کبھی جاتی تھی جو خیال باہمی میل جول سے مسلمانوں میں بھی پیدا ہو گیا۔ چنانچہ وہاں والیان آج بھی اُس کے بھاری کرنے میں یہاں تک سہانہ کرتی ہیں کہ چار چار پانچ پانچ ٹولے کی تھیں ہیں لیتی ہیں جن سے اکثر تھکے پھٹ جاتے ہیں گرد و بارہ ناک چھدوائی جاتی ہے تاکہ ناک نچھ سے خالی نہ رہے۔ لکھنؤ کی بیویوں نے نچھ کو اڑا ہی دیا۔ اور اُس کی جگہ سونے کی مرصع کین پہنے لگیں جو بہت ہی نفیس اور خوبصورت زیورات ہیں ہوتی۔ اور نراکت پسندی سے ان کیلون کو بھی اتنا مختصر اور سبک کر دیا کہ سبک ناک کی کیلین لکھنؤ کے سٹاروں اور سادہ کاروں کے سوا اور کہیں کے کاریگر نہیں بنا سکتے۔

اب ادھر پچیس تیس سال سے بلاق کا رواج بہت زیادہ بڑھ گیا ہے اگرچہ یہ کوئی پسندیدہ مذاق نہیں مگر زیور کے اختصار اور عام پسندی نے اس قدر ترقی دی ہے کہ اب بہت کم عورتیں ہیں جو بلاق نہ پہنتی ہوں۔ فی الحال مختلف شہروں کے باہمی میل جول سے زیور بنانے کے فن میں ہرگز ترقی ہو رہی ہے۔ اور خاص خاص زیوروں کے لیے خاص خاص شہر مشہور ہو گئے ہیں۔ مگر مذہب سے بیشتر جب ریلوے نے بلاد ہند میں یہ باہمی مواصلت دیکر لگی نہیں پیدا کی تھی لکھنؤ سے اچھے سارا اور کاریگر کہیں نہ مل سکتے تھے۔ لیکن اب بہت سے شہر اس فن میں لکھنؤ سے بڑھتے جاتے ہیں خصوصاً شہر دہلی منشوش چاندی کے سبک زیور بنانے میں ہندوستان کے تمام شہروں سے سبقت لے گیا ہے۔ مگر پھر بھی اکثر مقامات کے نفیس مزاج گھرانے لکھنؤ کے بنے ہوئے زیور اور یہاں کے چاندی کے ظروف کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ یہ سب لکھنؤ کی صنعتوں میں ہیں یا رہا چھوٹا پڑے گی۔ اس لیے یہاں اسے ہی پرستی کرتے ہیں۔

(۳۸)

لکھائے پہننے اور پہننے اور ڈھنے کی بحث ختم کر کے اب ہم ان چیزوں کی طرف توجہ کرتے ہیں جن کو سوانٹی اور میل جول سے خصوصیت ہے۔ اور جن پر مشاء اور اپنے مذاق کا تصرف کر کے لکھنؤ نے انھیں اپنا بنا لیا۔

دنیا کے ہر ملک میں میل جول اور معاشرت کا ایک تمدن قائم ہو جاتا ہے۔ جس میں زیادہ تر تعلق و تعلق قطع۔ اخلاق و عادات۔ نشست برخواست۔ طرز کار طریقہ مذاق۔ مکان اور فریج وغیرہ کو ہوتا ہے۔ اور ان باتوں کے بعد اس سامان زندگی کو جس کی اس سوسائٹی کو ضرورت ہو۔ فطری طور پر یہ چیزیں ہر گروہ ہر طبقہ اور ہر شہر و قریے میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور آج بھی دنیا میں پھر کے دیکھیے تو ہر جگہ سوسائٹی کی خاص نوعیت اور اس کے خصوصیات نظر آ جاتی ہیں گے۔ مگر جن مقاموں میں کوئی معزز و بابر قائم ہو جاتا ہے اور علم و ادب کو ترقی دیتی ہے وہاں کی سوسائٹی ایک بڑے حصہ ملک کو اپنا نام بنانے کے اُسکے ہر شہر و قریے کی معاشرت کا مزج اور اصول تہذیب کا مرکز بن جاتی ہے۔

ہندوستان میں تہذیب و تمدن اور آداب سوسائٹی کا اصلی مرکز یقینی طور پر دہلی تھی۔ اس لیے کہ بہت سی صدیوں تک وہ ہندوستان میں حکومت کا مرکز اور علم و فضل کا منشا و مستقر رہ چکی ہے۔ سارا ہندوستان اُسکے زیر نگین تھا۔ اور وہاں کی صحبت کے تربیت یافتہ تمام صوبوں کے حاکم اور ادب آموز ہوا کرتے تھے۔ لکھنؤ کے لیے اُس کے مقابل میں نہ کوئی خصوصیت ہے اور نہ اُسے کوئی امتیاز حاصل ہو سکتا ہے۔ مگر اس محل پر لکھنؤ کا نام لیا جانے کی اگر کوئی وجہ ہو سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ زمانے کے اتفاق سے پچھلی صدی میں وہی دہلی کی معاشرت پوری پوری لکھنؤ میں منتقل ہو آئی۔ اور وہیں کے اُمرا و شرفاء۔ علماء و شعرا۔ اتقیا و صلحا۔ سب کے سب لکھنؤ میں چلے آئے۔ اور جو دربار دہلی میں اُجڑتا تھا لکھنؤ میں آکے جمع ہوتا۔ اس لیے کہ وہاں کے تمام و صنعتدار لوگ ایک ایک کر کے یہیں چلے آئے۔ اور یہاں اطمینان حاصل ہو جانے کی وجہ سے اپنی ترقی یافتہ معاشرت پر اور ترقیان کرنے لگے۔ اور پھر لطف یہ کہ دہلی والوں کی جو معاشرت اودھ میں آکے قائم ہوئی تھی اُس میں سوا دہلی والوں کے کوئی غیر شخص نہ تھا۔ حتیٰ کہ لکھنؤ کے پرانے معزز باشندوں کو بھی اُس میں بالکل جگہ نہیں ملی۔

لہذا لکھنؤ کی معاشرت دراصل دہلی کی معاشرت اور وہیں کی ترقی یافتہ سوسائٹی کا آخری نمونہ ہے۔ اس پچھلی صدی میں دہلی کے پُراٹے مہن کے دو اسکول ہو گئے تھے۔ ایک وہ جو خاص دہلی میں موجود تھا اور دوسرا وہ جو لکھنؤ میں منتقل ہو آیا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ زوال سے پیشتر کی آخری صدی میں اُس اسکول کے لیے جو دہلی میں تھا دربار منلیہ کے کمزور پڑ جائے اور دو ہمتی کے مٹ جانے کی وجہ سے میدان ترقی میں آگے قدم بڑھانے کا ویسا موقع نہیں نصیب تھا جیسا لکھنؤ والے دہلی کے اسکول کو حاصل تھا اور یہی وجہ ہوئی کہ اس زمانے میں لکھنؤ کا مہن ترقی کر رہا تھا۔ اور دہلی کے قدیم مہن کی ترقی رک گئی تھی۔ الغرض یہی ترقیات لکھنؤ کی سوسائٹی کے خصوصیات ہیں۔ بلکہ غور کرنے سے یہ نظر آتا ہے کہ دہلی میں مہن و معاشرت کو قدیم شناسا ہی دربار کی برکتوں سے جو ترقی حاصل ہوئی تھی پچھلے دور میں تجارت پیشہ جاہل قوموں کے غلبے اور قدیم خاندانی شرف کے دیگر بلاؤں میں منتشر ہوئے۔ یا خاندان نشین ہو جانے کے باعث وہ بھی تشریف لے گئی۔ اور یہ سچ ہے کہ اودھ کے شاہی دربار کے ٹوٹ جانے کے بعد سے بیرونی لوگوں کے میل جول اور پُراٹے مہذب خاندانوں اور اُن کے اثر کے مٹ جانے کی وجہ سے جو تہذیب لکھنؤ میں پیدا ہوئی تھی وہ بھی روز بروز رخصت ہوتی جاتی ہے۔

مگر ہمیں اُس بد تیزی کی سوسائٹی اور اُن متمدنہ اخلاق و آداب سے بحث نہیں جو عذر کے بعد سے لکھنؤ میں پیدا ہونا شروع ہوئے اور ترقی کرتے جاتے ہیں۔ ہماری غرض محض اُس تہذیب کو بتانا ہے جو لکھنؤ کے شاہی دربار کے آغوش میں پرورش پاکہ بیان کی صحبتوں میں پیدا ہو گئی تھی۔ بیان کی معاشرت کے متعلق اپنے اس مضمون کے سلسلے میں ہم مندرجہ ذیل امور کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔ (۱) سلاطین (۲) فرخچہ (۳) و بیعت قطع (۴) اطلاق و عادات (۵) نشست برخاست (۶) صاحب سلامت و مزاج پرستی (۷) طرز کلام (۸) طریقہ مذاق (۹) شادی و غمی کی محفلیں (۱۰) مجلسین (۱۱) مولدین کی محفلیں۔ پھر اُن کے بعد ہم اُن چیزوں کو بیان کریں گے جو لازم صحبت اور

سامان معاشرت ہیں۔

(۱) مکان۔ دہلی اور لکھنؤ میں مکانوں کے متعلق پُرانا مذاق یہ تھا کہ ظاہری نمائش اور شاندار ہی صرف شاہی قصروں اور ایوانوں کے لیے مخصوص تھی۔ امرا و تجار اپنے رہنے کے لیے جو مکان تعمیر کراتے وہ اندر اندر سے چاہے کیسے ہی وسیع اور نفیس ہوں مگر ان کی ظاہری حالت بالکل معمولی مکان کی سی ہوتی۔ اور اس میں مصلحت یہ تھی کہ جو مکان ظاہر میں شاندار ہوتے اکثر بادشاہوں کو پسند آ جاتے۔ اور بنواسنے والوں کو ان میں رہنا بہت کم نصیب ہوتا۔ ساتھ ہی یہ بھی تھا کہ رعایا میں سے کسی کا تعمیر مکان میں شاہانہ اُلُو العزمی دکھانا قردوسرکشی پر محمول کیا جاتا۔ اور اُسے سلامتی کے ساتھ زندگی بسر کرنا دشوار ہو جاتا۔

اسی وجہ سے آپ کو دہلی میں مقبروں کے سوا قدیم الایام کی ایک بھلی سی عمارت نہ نظر آئے گی جو عالیشان ہو اور رعایا میں سے کسی عالی مرتبہ امیر یا دولت مند تاجر کی بنوائی ہوئی ہو۔ لکھنؤ میں بھی ابتداء ہی حال تھا۔ نواب آصف الدولہ اور نواب سعادت علی خان کے زمانوں میں دولت مند فرامیسی تاجر سیواٹن سے لے کر دو ایک عالیشان عمارتیں تعمیر کیں مگر ان کی تعمیر میں اصلی نشانہ یہ تھا کہ فرات رو اس شہر کو پسند آئیں اور اُسکے ہاتھ فروخت کر ڈالی جائیں۔ اُنھیں عمالتوں میں لانا زمینیں کاج ہے جس پر نواب سعادت علی خان کی جزیسی کی وجہ سے اسٹیٹ کا قبضہ نہ ہو سکا۔ یہ وہی کوٹھی ہے جو فی الحال عوام میں تارکین صاحب کی کوٹھی کے نام سے مشہور ہے۔

اس کے بعد یہاں کے ایک وزیر روشن الدولہ نے اپنے رہنے کے لیے ایک عمدہ عمارت بنوائی تھی جس کا انجام یہ ہوا کہ سلطنت کے حکم سے ضبط کر لی گئی۔ اور انتراع سلطنت کے وقت اُس کا شمار مقبوضات شاہی میں تھا چنانچہ انگریزی دور میں وہ سرکاری جائیداد ہونے کے باعث گورنمنٹ کے قبضے میں آ گئی اور روشن الدولہ کے ورثا کو نہیں دی گئی۔ مگر آج تک وہ روشن الدولہ ہی کی کوٹھی کہلاتی ہے گوکہ اُس میں صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر اور اُنکے اسسٹنٹ

اجلاس کرتے ہیں۔

رعایا کے عام مکانون کی وضع یہاں یورپ کے کوٹھی نما مکانون سے بالکل جداگانہ ہوتی ہے۔ یورپ میں مکان کے اندر صحن کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ مردوں کی طرح عورتیں بھی پردہ نہ کرتے کی وجہ سے باہر جا کے کھلی فضا میں ہوا کھاتی ہیں۔ لہذا وہاں کے غلات یہاں ضرورت ہے کہ مکان کے اندر صحن ہوا کرے۔ تاکہ عورتیں گھر کے اندر ہی کھلی فضا کا لطف اٹھا سکیں۔

اس ضرورت اور یہاں کی معاشرت کے دیگر تقاضوں سے یہاں کے مکانون کی عام قطع یہ گردی ہے کہ بیچ میں صحن اُس کے گرد عمارت۔ اس عمارت میں ایک رخ صدر قرار دے دیا جاتا ہے۔ اور اُدھر اینٹ چونے کے ستونوں پر کم از کم تین اور کبھی اس سے زیادہ محراب دار دروازے کیے جاتے ہیں۔ محرابوں پر علو نما شاہجہانی محرابوں کے نمونے کی ہوتی ہیں۔ یعنی ان میں چھوٹی چھوٹی قوسوں کو خوشگامی سے جوڑ کے بڑی محراب بنائی جاتی ہے۔ صدر میں اکثر ایسی محرابوں کے دوہرے تہرے ہال ہوا کرتے ہیں۔ پچھلا ہال کبھی دروازے لگا کے ایک بڑا کمرہ بنا دیا جاتا ہے۔ اور اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ تقریباً کمرہ تک اُس کی کمری لپیڈ کر کے وہ شہ نشین بنا دیا جاتا ہے۔

ان بڑے ہالوں کے دونوں پہلوؤں پر کمرے ہوتے ہیں۔ اور ہال کی چھت اتنی اونچی ہوتی ہے کہ پہلو میں تلے اوپر دو کمرے ہال کی ایک چھت کے اندر آ جاتے ہیں۔

اب صحن کے دونوں پہلوؤں پر اُس کے طول کے مناسب دالان۔ کمرے اور کوٹھریاں بنادی جاتی ہیں۔ جن میں باورچی خانہ۔ پانچخانہ۔ مودی خانہ۔ زینہ کنواں۔ اور ماما اسیلوں کے رہنے کے مقامات ہوتے ہیں۔ صدر دالان کے مقابل جانب بھی اگر ضرورت معلوم ہوئی یا استطاعت ہوئی تو ویسے ہی عالیشان دالان اُدھر بھی بنا دیے جاتے ہیں جیسے کہ صدر جانب ہوتے ہیں۔ دروازہ اکثر پہلو میں یعنی ان سمتوں میں ہوتا ہے جدھر باورچی خانہ اور شاگرد پیشہ کے رہنے کے کمرے ہوتے ہیں۔ جس کے سامنے اندر کے رخ پر مقابل او۔ ایک پہلو میں قدوم

سے ذرا بلند ایک دیوار قائم کر دی جاتی ہے تاکہ دروازے سے اندر کا سامنا نہ ہو۔  
غریبوں اور اوسط درجے والوں کے مکانات میں اکثر پختہ محرابوں کے عوض  
اُسی وضع کے چوبلی سے درے قائم کر کے دالان بنادے جاتے ہیں جن میں  
صدر میں اور کبھی اُس کے مقابل چائیب بھی دالان دروازے ہوتے ہیں۔  
اس قسم کے جو مکان زیادہ مکمل ہوتے ہیں اُن میں چاروں طرف سے درے  
اور دالان ہوتے ہیں۔ اور اُن کے پہلوؤں میں ایک ایک دروازے کی کھڑکیاں  
مکملتی ہیں جو مختلف ضروریات کا کام دیتی ہیں۔ اور انھیں میں سے کسی میں باہر  
کا دروازہ ہوتا ہے۔

یہ بیان کے مکانات کا ایک عام خاکہ تھا۔ مگر اسی مجموعی وضع کو قائم رکھ  
کے اکثر مکانات میں نیچے اور ہر جگہ ایسی حکمت اور خوش اسلوبی سے یکدرے۔ کمرے  
اور کھڑکیاں نکالی جاتی ہیں کہ تعجب معلوم ہوتا ہے اتنی تھوڑی سی جگہ میں اتنی  
مکانیت کیونکر آگئی۔

فن عمارت کی تاریخ پر نظر ڈالیے تو نظر آنے لگا کہ ابتداً سپت عمارتیں بنی  
تھیں۔ پھر بلند اور مضبوط مگر سادی عمارتیں بننے لگیں۔ اسکے بعد زیبائیت  
کے لیے اُن پر نقش و نگار بننے لگے۔ پچی کاری کی ایجاد ہوئی۔ اور عجیب و غریب  
طریقے سے رنگ آمیزیاں کی جانے لگیں۔ لیکن باوجود ان سب مکانات کے  
اب تک بڑے بڑے چوڑے آٹاروں کی دیواریں ہوئیں۔ اور اُن میں بڑے  
بڑے ہال۔ اور دیوان خانے بنادے جاتے۔

سب سے بعد کمال ہندوستانی عمارت میں یہ تھا کہ درزی کی سی کتر بڑی  
کر کے تھوڑی سی زمین میں بہت زیادہ مکانیت نکال دی جائے۔ عمارت کا  
یہ کمال خاص دہلی سے شروع ہوا۔ وہیں اُس نے بڑے اعلیٰ درجے تک  
ترقی کر لی۔ وہاں سے سب جگہ پھیلے۔ اور لکھنؤ میں اُس نے سب مقامات سے  
زیادہ ترقی کی۔

آج کل بڑے بڑے استاد انجینئرز موجود ہیں۔ جنہوں نے بڑی بڑی عمارتیں  
عمارتیں بنوائی ہیں۔ وہ نائشی طور پر عمارت کی ایک نہایت ہی خوبصورت

اور شاندار شکل قائم کر دیں گے۔ لیکن یہ کام فقط پُرانے کاریگروں کا حصہ ہے۔ کہ زمین کے ایک چھوٹے ٹکڑے پر عالیشان عمارت بنانے کے کھڑی کر دیں۔ اور اُس میں ہندو سانسہ کمال سے اتنے دالان کمرے کوٹھریاں اور صنیچیان نکالیں کہ دیکھنے والے کی عقل چکر میں آ جائے۔ اندرونی پردے کی دیواریں اتنی تیلی نازک سبک اور اُس کے ساتھ مضبوط ہوں کہ معلوم ہو اینٹ چونے کی دیواریں نہیں لکڑی کی اسکرینیں ہیں۔

عمارت میں لکھنؤ کی یہی خصوصیت تھی جس کو اگلے دربار نے نشوونما دیا۔ مگر اب انگریزی عہد میں یہ کمال ناقدری کی وجہ سے مٹا جاتا ہے۔ پُرانے کاریگروں ہو گئے اور جو دو ایک باقی ہیں اُن کی قدر نہیں

مگر پُرانے ہی زمانے سے ہندو مسلمانوں کے مکانات میں ایک بہن فرق چلا آتا ہے جو آج تک موجود ہے۔ ہندو اپنے مکانات میں صحن بہت چھوٹا اور تنگ رکھتے ہیں۔ اور بلا لحاظ اسکے کہ ہوا اور روشنی کا گزر ہو گا یا نہیں مکانات بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ بخلاف اس کے مسلمان گھلے ہوا دار مکان چاہتے ہیں۔ اور مکانات اُسی درجے تک بڑھاتے ہیں جہاں تک کہ ہوا داری اور روشنی رہنے میں فرق نہ آئے۔ لیکن باوجود مسلمانوں کے اس مذاق کے اگلے کاریگروں نے اُنکے ہوا دار مکانات میں بھی اس قدر مکانات نکالی ہے کہ دیکھنے والے عیش عش کر جاتے ہیں۔

اسکے علاوہ اُس زمانے کے بالکل ہمارے دروازوں کمروں کی تحریکوں اور دالانوں اور کمروں کی دیواروں پر مختلف رنگوں سے ایسے نقیص اور اعلیٰ درجے کے نقش و نگار بناتے تھے جیسے اب شکل سے بن سکتے ہیں۔ اور آج کل مصوری کا فن بیشک ترقی کر گیا ہے۔ مگر ہمارے نقاشی و دیوار پر کیا کرتے تھے وہ مٹ گئی اور عہد جدید کی سادگی پسندی کی وجہ سے روز بروز مٹتی جاتی ہے۔ تاہم اب بھی یہاں اس کام کے بعض اُستاد ہمارے ایسے پڑے ہیں کہ اُنکی سی نقاشی شاید کسی شہر کے ہمارے نہ کر سکیں گے۔ نقش و نگار ہی نہیں وہ چھتوں اور دیواروں پر اعلیٰ درجے کی تصویریں بھی بنا سکتے ہیں۔

معاہدوں ہی پر منحصر نہیں اُس وقت کے بڑھتیوں کو بھی یہی کمال حاصل تھا۔ وہ چاہے اعلیٰ درجے کی میزین کرسیاں اور الماریاں یا ریلوے ٹرین کی گاڑیاں نہ بنا سکیں۔ مگر ستون مہرابوں اور دروازوں کے چوکھٹ بازوؤں پر ایسے نفیس و نازک نقش و نگار کھدو کے بنا دیا کرتے تھے۔ جیسے آج شکل سے بن سکیں گے۔

(۳۹)

معاشرت میں دوسری چیز مکانون کا فریجیر یعنی وہ سامان ہے جس سے مکان آراستہ کیے جاتے ہیں۔ اُن دنوں آج کل کی میز کرسیاں نہ تھیں بلکہ خاص ہندوستانی اور اسلامی مذاق کا سامان تھا۔ مکانون میں تختوں کے چوکے ہوتے۔ پلنگ ہوتے۔ یا تختوں کے اوپر بچھانے کے لیے نازک اور خوشنما پلنگریاں ہوتیں۔ غریبوں اور متوسط حیثیت والوں کے یہاں بانوں کے پلنگ ہوتے اور امرا کے گھروں میں علی العموم نواڑ کے پلنگ ہوا کرتے۔

نفیس طبع لوگوں کے گھروں کی یہ شان ہوتی کہ جھاڑو دی ہوئی ہے۔ دیواروں پر سفیدی پھری ہے۔ چھت پر اُجلی سفید چھت گیری کھینچی ہوئی ہے جسکے چاروں طرف چُنٹ دی ہوئی جھالر لٹک رہی ہے۔ دالان کمرے یا صحن میں تختوں کا چوکا ہے اُس پر درمی ہے اور درمی پر سفید براق چاندنی۔ جو اس نفاست سے یکھنے کے سچائی گئی ہے کہ شکن کا کہیں نام نہیں۔ چاروں کونوں پر سنگ مرمر کے گنبد نما میرفرش فرش کے کونوں کو دبائے ہوئے ہیں تاکہ ہوا میں چاندنی اڑنے نہ پائے یا اُس میں شکنیں نہ پڑیں۔

اوپر اُچلا فرش پیگھا ہے۔ اُس کا بھی بعد کے زمانے میں رواج ہوا ورنہ دراصل ان مکانون کی زینت دستی پنکھوں سے ہوتی جو حسب مرتبہ اور درجہ رتبہ بڑے نکلت و اجہام سے بنائے جاتے۔ اور اُن کا حال ہم آئینہ کسی صوف پر بیان کریں گے۔ اُس چوکے اور فرش پر خواہ کمرے کے اندر ہو یا باہر ایک جاب جو صدر مقام قرار پانا نواڑ کا نفیس اور خوبصورت پلنگ بچھا ہوتا۔ پلنگ کے اوپر گرمیوں میں درمی اور جاڑوں میں توشک ہوتی۔ اور اُس کے اوپر



ایک اُجلی چادر کھچی رہتی۔ پٹنگ کی چادر میں شاہی ٹکڑوں یا اُنکے ہم رتبہ محسروں میں ایک نیچی زمین کے قریب تک کی چٹ دار چھال چاروں طرف ٹنگی ہوتی جو پٹنگ میں ایک خاص شان پیدا کر دیتی۔ چاروں پاؤں پر کھوسنے کے چاروں کونوں پر ریشم کی رنگین ڈوریوں سے ایک خوشامبش سے بانڈ دے دیے جاتے تاکہ لپٹنے اور کروٹین بدلنے میں بچھوٹا نہ لپٹنے اور اپنی جگہ سے سرکے اور ہلنے نہ پائے۔

سربانے پٹنگ کے عرض کے برابر مربع مستطیل قلع کے چلے پتے چار ہوا سیتھی نرم ٹکے ہوتے۔ یہ ٹکے اکثر شالیاوت (ٹول) کے ہوتے اور ان پر تزیین یا پتیلیں نہیں ٹکے کے سفید خلاف چڑھے ہوتے۔ جن میں تول کی سرخی اپنی جھلک دکھاتی اور وہ پراٹھے کی برقوں کی طرح تلے اوپر رکھے جاتے۔ پھر اُنکے اوپر ادھر ادھر اُسی پٹے کے دوختے نئے نرم گل ٹکے ہوتے تاکہ کروٹ سے لپٹنے میں گالوں کے نیچے رہیں۔ یہ گل ٹکے ہاتھ کی پھیلی سے زیادہ بڑے ہوتے۔ اسکے بعد گچھوٹے پر دو نوں جانب دو نوں پیوں کی جانب دو گول تکیاں رہتیں جن کو کروٹ لپٹنے وقت رافوں کے نیچے دبائے میں آرام ملتا۔ پانچویں دولائی رہنمائی یا لحاظ موسم کے مناسب لگا دیے جاتے۔ دوروں کو جب کوئی لپٹنے والا نہ ہوتا سارے پٹنگ پر ایک پٹنگ پوش پڑا رہتا۔

چو کے پر پٹنگ کے آگے صدر نشینی کے لیے فرش کے اوپر ایک قالین سونکی وضع میں بچھا دیا جاتا۔ اور قالین پر پٹنگ سے ملا ہوا کاد ہوتا جس پر روز کے استعمال کے لیے تو سفید غلات رہتا مگر اعلیٰ تقریبوں کے موقعوں پر نہایت قیمتی ریشمی اور اکثر کارچولی کام کے غلات چڑھا دیے جاتے۔ اور اگر چو کے پر پٹنگ نہ ہوتا تو اُس کے کسی ایک رخ پر جو مناسب معلوم ہوندا ٹکیہ ہوتا اور اُس پر نشست ہوتی۔

دیواروں پر اگرچہ کبھی کبھی تصویریں ہوتیں مگر تصویروں کا جس قدر اب رواج ہے اُن دنوں نہ تھا۔ بلکہ تصویروں کے عوض عمدہ قطعات جن پر بڑی نفاست سے نقش و نگار بنائے جاتے فریم میں جرے کے دیواروں پر لگا دیے جاتے

ان قطعات کا اُس زمانے میں رؤسا کو اس قدر شوق تھا کہ اُنہیں کے لکھنے اور تیار کرنے پر خوشنویسوں کی زندگی بسر ہوتی۔ اور سچ یہ ہے کہ اسی شوق نے اُس زمانے میں وہ نامور و اکمال خوشنویس پیدا کر دیے جو سو قطعات لکھنے کے کما بت کو اپنے لیے تنگ اور اپنے مہولی شاگردوں کا کام سمجھتے۔

تختون کے علاوہ صحن ڈیوڑھی اور دروازے کی باہر کی نشست کے لیے مونڈھے ہوتے جو اگرچہ اب بھی کہیں کہیں نظر آ جاتے ہیں۔ مگر ان دنوں شریفوں کا کوئی گھر اُن سے خالی نہ تھا۔ یہ سینٹھے اور بازو سے بنائے جاتے اور جن گھر دن میں اُن کا زیادہ اہتمام ہوتا اُن میں ان مونڈھوں پر کبھی کی خشک کھال جس میں بال موجود ہوتے چڑھا دی جاتی۔ یا مضبوطی کے لیے وہی بالدار چٹرا فقط اُن کے کناروں پر چڑھا ہوتا۔ یہ مونڈھے اُن دنوں بڑی بیکار آمد چیز تھے۔

امرا کے سوا جو زمانے اور مردانے دو مکان رکھتے تھے۔ عوام اور اکثر متوسط طبقے والے فقط ایک ہی مکان پر زندگی بسر کرتے۔ اب ملی الموم کوٹ کی جاتی ہے کہ ہر مکان میں دروازے کے پاس کوئی بیرونی کمرہ ضرور موجود ہو اُن دنوں اس کا حیدان خیال نہ تھا۔ بلکہ ڈیوڑھی میں اور اُس میں گنجائش نہ ہوتی تو دروازے کے باہر ہی مونڈھے ڈال کے لوگ اجاب سے ملتے۔ اور اُس میں کوئی مصالحت نہ سمجھا جاتا۔

مکرون اور دالانوں کے اندر اکثر طاقتور پر خوشنامی و زیبائش کے لیے کاغذ کے گلہ سٹے رکھ دیے جاتے۔

دالانوں کی محرابوں کے لیے عموماً پردے ضروری سمجھے جاتے مگر آج کل سینٹھوں سرکیوں یا ٹائٹ کے پردوں کا جو رواج ہے اُن دنوں نہ تھا بلکہ اس قسم کے پردے میوب سمجھے جاتے۔ اور اُن کی جگہ قول یا جاحم کے روئی دار پردے تیار کرائے جاتے۔ جو اکثر بندھے رہتے۔ فقط ضرورت کے اوقات میں کھول کے لٹکا دیے جاتے۔ ذاتی مجلس اوائن کے بیرونی دروازوں پر بھی اسی قسم کے پردے ہوتے۔ جس کے پاس کوئی ماما یا کھاری اکثر کھڑی نظر آتی۔

(۳) وضع قطع۔ اس کا ذکر لباس کے سلسلے میں آچکا ہے۔ گراں کی تح پر ہمیں یہ بتانا ہے کہ اُن دونوں شرفا کے مذاق میں اپنے گھر پر اندریا باہر پورے کپڑے پہننے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ بلکہ سر سے پاؤں تک ہر ہنہ رہتا اور فقط ایک تول کی غرق یعنی مختصر سی نکلی ہانڈر سے رہتا معیوب نہ تھا۔ یہ غرق اس قطع کی ہوتی کہ جاکھیا کی طرح بیڑستر پوشی کے ٹائلین بھی نکلی رہتیں۔ فی الحال ہمارے شرفا اپنے گھر پر بھی اندریا باہر بنیائیں کرتے۔ اور پانچواں پہن رہنا لازمی سمجھتے ہیں۔ مگر جس عہد کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُن دونوں بظاہر ہر گھر میں اتنے کپڑے پہن رہنا و مندرسی کے خلاف تھا۔ اسوقت بہت سے ایسے لوگ تھے جو فقط گھر سے نکلنے وقت انکر کھا پانچواں پہن لیتے۔ اور اس طریقے سے ایک شوب کو مہینوں تک نباہ لے جاتے۔ اور کپڑوں کی یہ حالت ہوتی کہ معلوم ہوتا کہ آج ہی دھوکے آئے ہیں۔ معمول تھا کہ دھوئی کے وہاں سے آیا ہوا انکر کھا پہنا جاتا تو اس کی دامن۔ گوٹ۔ اور آستینیں چنی جاتیں۔ اس چناؤٹ کے نشان مہینوں اُسی طرح برقرار رہتے۔

ان عورتوں کے لباس میں البتہ کوئی فرق نہ آتا۔ وہ اپنے گھر میں اتنے ہی کپڑے پہن رہتیں جتنے کہیں مہمان جاتے ہیں پھرتیں۔ یہ اور بات ہے کہ آتے جاتے کا جوڑا بھاری اور قیمتی ہوتا۔ اور گھر میں پہننے کا معمولی۔ کسی کے وہاں مہمان جانے کی صورت میں مرد اور عورت دونوں عہدہ نفیس اور بھاری پوشاکیں پہن کے جاتے۔ اور لباس کی عمدگی کی وجہ سے مردانی و زنانی دونوں معجزتیں بہت صاف ستھری اور بارونق رہتیں۔

(۴۰)

مردوں کی وضع مسلمانوں میں قدیم الایام سے یہ چلی آتی تھی کہ سر پر بال۔ کتری ہوئی موچھیں۔ اور ڈاڑھی گول اور مقطع۔ ذرا ہی لوگ علما و زہاد ڈاڑھی کو حسب سنت نبوی بالکل چھوڑ دیا کرتے تھے۔ اور موچھوں کے قصر میں کبھی اتنا مبالغہ کرتے کہ منڈا ڈالتے۔ لیکن امرا و شرفا کی وضع یہ تھی کہ ڈاڑھی کے لیے نیچے گلے کے پاس اور اوپر گالوں پر مدین قائم کی جاتیں۔ اور جو بال زیادہ

برطو جاتے اُن کو کاٹ کے ڈاڑھی میں گولا ٹی پیدا کر کے اسکی درازی کی ایک حد مقرر کر دی جاتی - سب سے پہلے شہنشاہ اکبر نے ڈاڑھی کو خیزا دیکھی - اور اُسکے بعد جہانگیر کے منہ پر بھی ڈاڑھی نہ تھی - اکبر و جہانگیر کے درباریوں پر اس کا چاہے کسی حد تک اثر پڑ گیا ہو مگر امرے اسلام کی عام وضع ہی تھی جو چیلے سے چلی آتی تھی -

لکھنؤ میں دربار قائم ہونے کے بعد ڈاڑھی میں قصر شروع ہوا - اور ہوتے ہوتے اکثر کے منہوں پر سے ڈاڑھیان غائب ہو گئیں - غالباً اس کا یہ اثر ہوا کہ ہم مذہبی کی وجہ سے یہاں کے دربار پر ایرانیوں کا اثر پڑ رہا تھا - اور وہاں شاہان صفویہ کے عہد سے بادشاہوں اور امیروں میں ڈاڑھی کی وہ اہمیت نہیں باقی رہی تھی جو آغاز اسلام سے چلی آتی تھی - یا تو مسلمانوں میں کسی کی ڈاڑھی مونڈ دینا سزا دینے یا اسکی تذلیل و تحقیر کرنے کے لیے تھا یا ایران میں ڈاڑھی نہ لکھنا شان امارت و حکومت میں داخل ہو گیا - لکھنؤ کے خاندان نیشاپوری کے پہلے باقی نواب برہان الملک کے منہ پر مقطع ڈاڑھی تھی شجاع الدولہ نے ڈاڑھی منڈائی - اور اُسکے بعد سے یہاں کے تمام امرا اور بادشاہ ڈاڑھیان منڈاتے رہے - اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عام شیعوں سے ڈاڑھی کا رواج اُٹھ گیا - پھر بعد کے زمانے میں بہت سے سنیوں نے بھی ڈاڑھیان کتر دائیں یا منڈا ڈالیں - ڈاڑھی منڈانے کا شوق پیدا ہونے کے بعد طرح طرح کی وضعیں نکلنے لگیں - کسی نے کانوں کے نیچے چھوٹی چھوٹی قلین نکالیں - کسی نے ٹھیکے رکھوائے - کسی نے بڑے بڑے گچھے رکھے - اطراف و جوانب لکھنؤ کے قصبہ تھون اور بعض شہر کے سنیوں نے بھی یہ وضع اختیار کی کہ ڈاڑھی رکھتے مگر راجپوتوں اور ہندی پٹھانوں کے مذاق کے مطابق ڈاڑھی کے بیچ میں ٹھڈی کے پاس مانگ نکال کے دونوں طرف کے بالوں کو کانوں کی طرف چڑھاتے - اور اس وضع پر ڈاڑھی کے قائم رکھنے کے لیے گھنٹوں ڈھاٹہ باندھ رہتے - پھر اُس چڑھی ہوئی ڈاڑھی کے ساتھ مونچھیں بھی کنگھی کر کے اور باندھ باندھ کے اوپر کے رخ پر چڑھائی جاتیں -

چنانچہ یہی وضع بیان اور سارے ہندوستان میں پہلگئی اور شجاعت کی علامت تصور کی جاتی۔

سر کے متعلق حضرت سرور کائنات معلم کے مبارک عہد میں عام مذاق تھا کہ سر پر بڑے بڑے بال ہوتے جو حج کے زمانے میں منڈا یا کٹوا دیے جاتے۔ مگر عرب ہی میں ظہور اسلام کے چند روز بعد سر منڈانے کا عام رواج ہو گیا اور یہی رواج ایران میں معلوم ہوتا ہے۔ اور مسلمان ابتداً جب ہندوستان میں آئے ہیں اُس وقت اُن کی وضع عموماً یہی تھی کہ منڈے ہوئے سر اور اُن پر جمائے۔ ہندوؤں میں مسلمانوں کے آنے کے وقت سر پر بال رکھنے کا رواج تھا۔ یہی وضع بیان کے مسلمانوں کو پسند آئی۔ چنانچہ آخر عہد میں ملادوالقیا اور مشائخ و صوفیہ کے سادہ بی کے شریعت و وضع کی عام وضع یہ تھی کہ سر پر بال ہوتے جو کانوں تک رہا کرتے۔ سوا بالوں کے جو نئی نئی مہجین لگانا کرتے۔

اسی وضع میں شرفاے دہلی لکھنؤ میں آئے۔ بیان آ کے تاؤک مزاجیان بڑھیں۔ خود آرائی کے شوق میں ترقی ہوئی۔ اور نہایت نزاکت اور صفائی سے کنگھی کر کے ماتھے پر عورتوں کی طرح پٹیاں جمانی جانے لگیں۔ اور ایسی دھب پیدا ہو گئی کہ تو خیر لڑکوں میں عورتوں کی سی دلکشی پیدا ہو گئی۔ پھر چند روز کے بعد جب انگریزوں سے سیکھ کے عورتوں نے ماتھا خوب کھول کے بال اُٹھانا شروع کیے تو یہ وضع بھی بعض بعض مردوں نے اختیار کر لی۔

اب قدر کے بعد جب انگریزی وضع قطع اختیار کی جانے لگی تو سارے ہندوستان کے لوگوں کی طرح بیان بھی بال کٹ کے انگریزی فیشنوں کے ہو گئے۔ اور بقیے سنوں پر دائر معیان باقی رہ گئی تھیں وہ بھی تشریف لے گئیں۔

عورتوں کے بالوں کی وضع غالباً لکھنؤ میں وہی ہو گئی جو دہلی میں تھی۔ لیکن بیان شاہی میں دو لکھنؤ اور بنارس چٹاؤ کرنے والی عورتوں کی چوٹیوں میں بڑے بڑے رنگین دھڑن کے سوا بت ہوتے جو خوب بچ دے کے مؤخر دماغ سے کمر تک بٹ کے لٹکا دیے جاتے۔ اور زیادہ تکلف کے وقت اُن میں چوڑا لچکا

پلیٹ دیا جاتا اور معلوم ہوتا کہ بڑی بھاری موٹی چوٹی سرپا چاندی کی ہے۔  
ماٹھے پر خراب دار پٹیاں جھائی جاتیں۔ اور اُنکے بیچ میں چاندی ٹپکی کے گرد  
سنہری یا دھلی انشان اور ستاروں سے نقش و نگار بنائے جاتے۔

اٹھوٹن پائون میں ہندی عورتوں کے لیے لازمی تھی۔ مگر اُن کے ساتھ  
رنگین مزاج مردوں نے بھی کثرت سے ہندی اگانا شروع کر دی تھی۔ جسکو  
دیکھ کے باہر والے لکھنؤ کے مردوں میں زنانہ پن پاتے اور اُن کا نام رکھتے۔

(۲) معاشرت میں جو تھی چیز اخلاق و عادات ہیں۔ اس بات میں لکھنؤ والوں  
نے خصوصیت کے ساتھ نمونہ حاصل کی۔ یہی چیز لکھنؤ میں خاص طور پر قابل لحاظ  
ہے۔ اور اس پر بحث کرنا سب سے زیادہ اہم ہے۔ دراصل لکھنؤ میں ایشیائی  
تہذیب کو انتہائی ترقی ہو گئی۔ اور کسی مقام کے لوگوں میں معاشرت کے وہ  
قواعد نہیں ملحوظ خاطر رہتے جن کے اہل لکھنؤ عادی ہو گئے ہیں۔

تہذیب دراصل اُن اخلاقی تعلقات کا نام ہے جن کو کوئی قوم تھا مناس  
شرافت سمجھنے لگے۔ آج کل ہم اکثر لوگوں کو یہ کہتے دیکھتے ہیں کہ ملنے جلنے میں  
چٹان و چین اور معاشرت کے تعلقات ایک قسم کی فضول ریاکاری ہیں۔ مگر  
یہ اُن کی غلطی ہے۔ یوں تو فضول ریاکاری لباس اور بود و باش کا انتظام  
بھی ہے اور بہیمیت کی زندگی کو چھوڑ کے انسانیت کی زندگی اختیار کرنے کے  
تمام امور فضول ریاکاری کہے جاسکتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ جن لوگوں کو  
انسانی تہذیب نہیں آتی اور ہند لوگوں سے ملنے کا سلیقہ نہیں ہوتا اُنھوں  
نے اپنے لیے عذر درسی کا جہانہ اس بات کو قرار دے لیا ہے کہ ہمیں شہر والوں  
یا ہند لوگوں کی ایسی دکھاوے کی باتیں نہیں آتیں۔ مگر غور کرو تو انسانیت  
ہی دکھاوا ہے۔ اچھا پنہا۔ اچھا سامان معیشت رکھنا۔ اچھا کھانا۔ اور ہر  
کام میں صفائی کا خیال کرنا۔ سب دکھاوا ہے۔

تہذیب اخلاق کا پہلا اصول یہ ہے کہ میل جول میں دوسرے کو ہر  
لطف اور نفع کی بات میں اپنے اوپر فوقیت دی جائے۔ اور آپ کو  
اُس کے پیچھے اور اُس سے ادنیٰ درجے پر رکھا جائے۔ کسی کی تعظیم کے لیے

اٹھ کھڑا ہونا۔ اُس کے لیے صدر کی جگہ کو خالی کرنا۔ اور اُسے صدر میں بٹھانا۔ اُس کے سامنے ادب سے دوڑا نو بیٹھنا۔ اُس کی باتوں کو تو جسے سنا اور عاجزی کے لہجے میں جواب دینا۔ یہ سب باتیں دوسرے کو اپنے اوپر فوقیت دینے کی ہیں۔ اور یہ جس درجے تک دستدار شرفاس لکھنؤ میں مروج تھیں لکھنؤ کے عہد شباب کے زمانے میں اور کہیں نہ تھیں۔

یہ تو وہ باتیں ہیں جن کو سٹلے جیلے کے طرز عمل سے قلمبند ہے۔ مگر یہی چیزیں جب اخلاق و عادات میں پوری طرح پیدا ہو جاتی ہیں تو انسان میں ایتھار نفس کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ مادہ ہو جاتا ہے کہ دوستوں کے ساتھ ہر طرح کی رفاقت اور ہر بات میں اُن کی اعانت کرے۔ عہد شباب ہی میں یہ چیزیں اہل لکھنؤ میں پورے کمال کے ساتھ پیدا ہو گئی تھیں۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں کثرت سے ایسے لوگ پیدا ہو گئے۔ تھے جن کا بظاہر کوئی ذریعہ معیشت نہ تھا۔ اُن کے احباب ایسے مخفی طریقوں سے اُن کی کفالت کرتے کہ کسی کو کبھی پتہ بھی نہ چل سکتا۔ اور ذرائع معاش کے مخفی رہنے کے باعث وہ سفید پوشی اور امیرانہ وضع کے ساتھ بڑے بڑے امیروں کی صحبتوں میں شریک ہوتے اور کسی کے سامنے اُن کی آنکھ نیچی نہ ہوتی۔ لکھنؤ ایسے لوگوں سے بھرا ہوا تھا کہ انقلاب سلطنت ہو گیا۔ اور یک بیک اُن کے بسر کرنے کے ذریعے منقود ہو گئے۔ امرائے ایتھار کی اس شان نے یہاں شرافت کا یہی معیار قرار دے دیا تھا کہ دوسروں کے ساتھ ایسے اخلاق سے پیش آئیں اور اُن کی خاطر داشت میں ایسی فیاضی دکھائیں جس میں احسان رکھنے کا نام کو بھی شایہ نہ ہو۔ دنیا کے تمام بڑے شہروں میں بڑے بڑے تاجروں اور دولت مند موجود ہیں۔ جو لکھنؤ کے دوپیر مستحقوں کو دے ڈالتے ہیں۔ مگر اُن کے طرز عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک پیسہ بھی اُنھوں نے بے غرضی سے نہیں صرف کیا۔ سبکدوش اس کے لکھنؤ والوں کی دوست پروری اور شریف فوادی ایسی تھی کہ دنیا کو دینے اور لینے والے میں کوئی فرق نہ نظر آتا۔

اس میں شک نہیں کہ جب بعد انقلاب سلطنت بڑے بڑے امرائے مفلس

نادر ہو گئے۔ اور وہ گروہ جو مخفی ذرائع معاش پر بسر کر رہا تھا ناستے کرنے لگا تو امرا فیاضی و ایشیا نفس کا جوہر دکھانے سے معذور ہو گئے۔ مگر ظاہری اخلاق جو سرشت میں داخل ہو گیا تھا۔ یسا ہی باقی رہا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگوں کی یہ حالت ہو گئی کہ اپنی باتوں سے تو اعلیٰ درجے کی مہمان نوازی کی اُمید دلاتے ہیں۔ مگر اُن کے دھان ہو جیتے تو اُسکے خلاف ظاہر ہوتا ہے۔ اسی کو اکثر لوگوں نے ریاکاری و لغاطی سمجھ رکھا ہے۔ مگر افسوس یہ ریاکاری نہیں بلکہ حوصلہ مندی ہے جس کی استطاعت نہیں۔ ایسے لوگوں پر اعتراض نہ کیجیے بلکہ اُن کی حالت پر ترس کھائیے۔

لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دولتمندی کے زمانے میں چونکہ شہر کی آبادی کا زیادہ حصہ امرا و شرفا اور احباب کی مخفی دستگیری پر بسر کر رہا تھا اُس کی وجہ سے محنت۔ جفاکشی۔ اور وقت کی قدر و قیمت جاننے کا مادہ علی الملوم اہل لکھنؤ میں قنما ہو گیا۔ اور جو مشاغل اُنھوں نے اختیار کیے وہ اُن کو ترقی قومی کی شاہراہ سے روز بروز دور کرتے گئے۔ اُنکے مشتے لہو و لعب کے سوا کچھ نہ تھے۔ بفکری اور فکر معاش سے سبکدوش ہونے نے اُنھیں کبوتر بازی۔ بٹیر بازی۔ مرغ بازی۔ چوہ سر۔ گھنٹے۔ اور شرط خج کا شائق بنایا۔ جن کاموں پر وہ آمدنی کا زیادہ ٹرخھہ صرف کرنے لگے۔ اور اندیشہ فردا کے لفظ سے ساری آبادی نا آشنا تھی۔ کوئی امیر نہ تھا جو ان مزخرف کاموں میں سے کسی ایک کا دلدادہ نہ ہو۔ اور اُسکے شوق نے اور بہتوں کو بھی اس کام میں نہ لگایا ہو۔

عیاشی اور تماشینی سے دنیا کا کوئی شہر خالی نہیں۔ خصوصاً یورپ کی سی بدتمیزی اور بد سلوکی کی عیاشی خدا نہ کرے کہ ہمارے شہروں میں پیدا ہو۔ لیکن لکھنؤ میں شجاع الدولہ کے زمانے میں ریڈیو سے تعلقات پیدا کرنے کی جو بنیاد پڑی تو روز بروز اسے ترقی ہی ہوتی گئی۔ امیر و ان کی وضع میں داخل ہو گیا کہ اپنا شوق پورا کرنے یا اپنی شان دکھانے کے لیے کسی نہ کسی بازاری حسن فروش سے ضرورت تعلق رکھتے۔ حکیم ہندی کا سا قابل نہ ہو شیادہ ہند بٹ



و شائستہ شخص جو وزیر اعظم کے رستے تک پہنچ گیا تھا اُس کی ترقی کی بنیاد پانڈو نام ایک رنڈی سے پڑی۔ جس نے دھڑوٹ کی رقم اپنے پاس سے ادا کر کے اُسے ایک محبوبے کی نظامت کا عہدہ دلوا دیا تھا۔ ان بے اعتدالیوں کا ایک ادنیٰ کرشمہ یہ تھا کہ لکھنؤ میں مشہور تھا کہ ”حبیب تک انسان کو رنڈیوں کی صحبت نہ نصیب ہو آدمی نہیں بنتا“ آخر لوگوں کی اخلاقی حالت بگڑ گئی۔ اور ہمارے زمانے تک لکھنؤ میں بعض ایسی رنڈیاں موجود تھیں جن کے گھر میں علانیہ اور بیا کی سے چلا جاتا۔ اور اُن کی صحبت میں رہنا محبوب نہ سمجھا جاتا۔ ہر تقدیر اس چیز نے ایک بڑی حد تک اُن کے عادات و خصائل بگاڑ دیے۔ گو کہ اس کے نتیجے میں اُنھیں نشست و برخاست کا سلیقہ بھی آ گیا۔

رہے عورتوں کے اخلاق و عادات۔ اس بارے میں ہمارا عام دعویٰ ہے کہ جن لوگوں میں ذہنا کاری کا شوق ہو اُن کی عورتیں پارسا نہیں ہو سکتیں۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ لکھنؤ میں عورتوں کے اخلاق اتنے خراب نہیں ہو سکتے جتنے کہ مردوں کے خراب ہو سکتے ہوں۔ ہمارے دور اپنی لئے والیوں کے ساتھ ادب و تعظیم سے ملنا عورتوں میں بھی ویسا ہی تھا جیسا کہ مردوں میں تھا۔ کسی زمانے میں چرخہ کا تنا شریعت عورتوں کا شرفیہ نہ مشغلہ سمجھا جاتا تھا۔ اب اگرچہ سوئٹ کی کلون نے اس مشغلے کو بالکل بیکار اور بے نتیجہ کر دیا۔ مگر شوقینی و امارت نے اس سے پہلے ہی یہ مشغلہ بیان کی عورتوں سے چھڑا دیا تھا۔ یہاں اُس کے غرض عورتوں کو سینے پر دے۔ کاڑھنے۔ گھرنے کی صفائی کا انتظام کرنے ماماؤن لونڈیوں اور پیش خدمتوں سے کام لینے اور بننے سنورنے کا زیادہ شوق تھا۔ اور بیویوں کو گھر کے کاموں اور شوہر اور بچوں کے کپڑوں سے اتنی فرست نہ ملتی تھی کہ جن لہو و لب کے کاموں میں مرد مبتلا ہو گئے تھے اُن میں وہ بھی مبتلا ہوں۔ درحقیقت اُس دور میں مرد گھروں میں بیٹھے کھیلا کرتے تھے۔ گھر بار اور دنیا کا سارا کارخانہ فقط عورتوں کے دم سے چل رہا تھا۔

مگر امیروں کے محلوں میں جب سارا کاروبار ماماؤن۔ منلا نیوں پیش خدمتوں

اور آٹاؤن کے ہاتھ میں ہو گیا تو عالی مرتبہ بیگم کے سامنے بھرا کرنے کے لیے ڈومنینوں کے طائفے ملازم ہوئے۔ اور جن محلوں میں مستقل طور پر ڈومنیناں ڈکرنہ تھیں وہاں شہر کی عام ڈومنینوں کی جلد جلد آمد و رفت رہتی اور آٹے دن وہ طلبہ سارنگی لیے ڈیوڈھی پر کھڑی ہی رہتیں۔ اس لیے اُن کے سیکڑوں طائفے شہر میں وجود تھے۔ ڈومنینوں کا مذاق جہاں تک مجھے معلوم ہے نہایت فحش اور بیہودہ ہوا کرتا ہے۔ اور اُن کی صحبت عورتوں پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈال سکتی ہے چنانچہ جس طرح مردوں کی بد اخلاقی کی باعث رنڈیاں تھیں عورتوں کا اخلاق بگاڑنے کی باعث ڈومنیناں ہو گئیں۔

لیکن شرفا کے خاندان ڈومنینوں کی صحبت سے بچے ہوئے تھے اور اس لیے اُن کی عورتیں اس مصرت سے بچی رہیں جو عمدہ خصائل و اخلاق کا بہترین نمونہ ہیں۔ لکھنؤ کی عورتوں کا لکیر کٹے کہ وہ شوہر پر اپنی ہر چیز کو قربان کرنے کو تیار رہتی ہیں۔ اپنی بہتی کو شوہر کی بہتی کا ایک ضمیمہ تصور کرتی ہیں۔ اور بعض اور شہروں کی عورتوں کی طرح جو خاندان داری کے سلیقے میں لکھنؤ والیوں سے پرہیز بڑھی ہوئی ہیں یہاں کی عورتوں کو کبھی یہ خیال نہیں پیدا ہوا کہ اپنا رویہ شوہر سے چھپا کے الگ جمع کریں اور شوہر کی بیماری میں بھی اپنی دولت صرف کرنے میں تامل کریں۔ لکھنؤ کی عورتیں وہاں کی عورتوں کی سی ہنرمندانہ اور گھر گہری کے کام میں اُن کے مقابل پھوٹ رہیں۔ حد درجے کی مسرت میں چٹوری ہیں۔ مگر شوہر کا ساتھ دینے اور اُس پر اپنی جان قربان کر دینے میں سب سے اول ہیں۔

(۴۱)

(۵) معاشرت میں پانچویں چیز نشست و برخاست ہے۔ ہر متمدن قوم میں نشست و برخاست کے مختص قوانین اور اصول موضوعہ ہوا کرتے ہیں۔ اور انہیں سے اُس قوم کی ترقی و تہذیب کا درجہ قائم ہوا کرتا ہے۔ اگر آپ عیسائیوں کے متمدن شہروں پیرس۔ لندن اور برلن میں یا مسلمانوں کے مہذب بلاد قسطنطنیہ۔ طہران اور شیراز میں جائیے اور وہاں کے مہذب لوگوں کی

صحبت میں شریک ہوئیے تو نظر آئے گا کہ ان میں نشست و برخاست کے اخلاقی قوانین کس قدر سخت ہیں۔ مگر ہندوستان کے بڑے تاجرانہ شہروں میں آپ جائین اور وہاں کے امرا و معززین سے ملین تو آپ کو اخلاقی قوانین تہذیب کا بالکل پتہ نہ چلے گا۔ مگر ان شہروں میں جہاں کوئی خاص دربار قائم ہے یا راجہ چکا ہے۔ مثلاً حیدر آباد وکن بھوپال اور رام پور وغیرہ معزز و وطنی درباروں کے قائم ہونے کی برکت سے عوام و خواص سب میں حفظ مراتب کے قواعد نظر آئیں گے۔ بخلاف تاجرانہ شہروں کے جہاں تمیز داری ادب اور حفظ مراتب کا نام و نشان بھی نہ ہوگا۔

دہلی میں اگلے دنوں یہ اخلاقی اصول یقیناً سب جگہ سے زیادہ بڑھے ہوئے ہوں گے۔ اس لیے کہ وہاں کا دربار سب سے بڑا تھا اور مسد یوں سے قائم چلا آتا تھا۔ مگر وہاں تجارت پیشہ اقوام کے سوسائٹی پر غالب آنے کی وجہ سے اگلی ساری تہذیب خاک میں مل گئی۔ نشست و برخاست کی بنیاد امارت ریاست اور حکومت سے پڑتی ہے۔ حکومت و ریاست بتاتی ہے کہ چھوٹوں کو بڑوں سے اور بڑوں کو چھوٹوں سے کب کھڑا کرنا چاہیے۔ اور برابر والوں سے کیسا برابر کرنا چاہیے۔ مگر تجارت کو ان امارت کے چوہلوں اور اخلاقی تکلیفوں سے دشمنی ہے۔ وہ معاملت اور خود غرضی کے آغوش میں پلٹی ہے۔ اور سلت سیکری فاکسر یعنی اپنے وقت اور اپنے روپے اپنے ہنر اور اپنی دولت کو بے وجہ کسی پر قربان کر دینے کو حماقت اور لغویت بتاتی ہے بخلاف اس کے ریاست کا جو ہر یہ ہے کہ بے غرضی کے ساتھ اپنے طرفداروں یا قابل لوگوں سے مراعات کیجائے اور اس کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ جہاں تجارت کو فروغ ہوگا اور تاجروں کی معاشر خوش باش امیروں اور شریفوں کی معاشرت پر غالب آجائے گی وہاں کوئی اخلاقی قانون نہیں باقی رہ سکتا۔ چنانچہ اس چیز نے دہلی کے اگلے عظیم الشان درباروں کی ساری آن بان مٹا کے رکھ دی۔ اور وہ بات نہیں باقی رہی جو اس کی ناموری کی تاریخ کے شایان تھی۔

دہلی کی تہذیب کو جب تاجروں کا ہجوم تباہ کرنے لگا تو اس نے اپنے قدیم

وطن سے بھاگ کے لکھنؤ کے چھوٹے دربار میں پناہ لی جو اگرچہ چھوٹا تھا مگر اسکی  
 سواد میں داخل ہوئے ہر کسی کو نہ نظر آ سکتا تھا کہ دنیا میں یہاں سے بڑا  
 کوئی اور دربار بھی ہے۔ پھر جہاں آزادی سے بیٹھ کے شرفاء دہلی سے  
 اپنے قوانین نشست و برخاست کو برتنا شروع کیا تو چند ہی روز میں یہ  
 حالت ہو گئی کہ اکیلا لکھنؤ ہی سارے ہندوستان میں تہذیب و نشانی اور  
 آداب نشست و برخاست کا سر کر تھا۔ اور تمام شہروں کے مہذب لوگ اہل  
 لکھنؤ کی تقلید اور پیروی کر رہے تھے۔ ان مراتب کا قائم کرنا کہ کس شخص کا استقبال  
 و روانہ تک آگے کرنا چاہیے۔ کس کے لیے فقط کھڑے ہو جانے کی ضرورت  
 ہے۔ کس کے لیے نیم خیز ہو کے اور کس کے لیے اپنی جگہ پر بیٹھے ہی بیٹھے آئیے۔  
 تشریف لائے "کہ دنیا کافی ہے۔ زیادہ تر اپنے دلی فیصلے اور اجتہاد پر موقوف نہ ہو  
 اور اس اجتہاد کا جیسا ملکہ لکھنؤ کے مہذب شرفاء کو حاصل ہے کسی کو نہیں۔  
 یہاں کوئی برابر والا آئے گا تو کھڑے ہو کے تقسیم دین گے۔ اُس کے لیے  
 بہترین جگہ خالی کریں گے۔ اور جب تک وہ بیٹھ نہ جائے گا خود نہ بیٹھیں گے۔  
 اُس کے سامنے ادب اور تمیز داری سے بیٹھیں گے۔ چہرہ بنائش رکھیں گے۔  
 "ا کہ اُسکو کسی قسم کا تنقص نہ ہو۔ جب وہ کوئی چیز دے گا تو ادب سے تسلیم کر کے  
 لیں گے۔ اس کا پورا خیال رکھیں گے کہ ہماری کوئی حرکت اُسے ناگوار نہ ہو۔  
 اور اُس کی صحبت میں کسی اور ضروری کام کی طرف توجہ کریں گے تو اُس سے  
 معذرت خواہ ہو کے اور معافی مانگ کے توجہ کریں گے۔ کہیں اُٹھ کے جانے کی  
 ضرورت پیش آئے گی تو اُس سے اجازت مانگے جائیں گے۔ اگر اُس کے  
 ساتھ جانے کی نوبت آئے تو راستے میں اُس کے پیچھے رہیں گے۔ اور اُس سے آگے  
 بڑھائیں گے۔ اصول تہذیب کی پابندی میں وہ بھی اصرار کریگا کہ "بچنے آپ  
 تشریف لے چلیں۔" لیکن ادھر سے بار بار یہی کہا جائیگا کہ جناب آگے تشریف  
 لے چلیں۔ میں کس قابل ہوں۔" اور اگر وہ کسی طرح نہ مانے اور مجبور رہی  
 کہ دے تو شکر گزاری میں ادب سجا کے آگے قدم بڑھائیں گے بھی تو اس انداز  
 سے کہ اُس کی طرف بیٹھ نہ ہو۔

اکثر لوگ ان آداب کا مضحکہ اڑاتے ہیں اور مرتبہ ایش ہو گیا ہے کہ چنے لکھنؤ والے پہلے آپ پہلے آپ کہتے رہے اور ریل چھوٹ گئی۔ چنانچہ دو فون ایشین پر پڑے رہ گئے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر چیز کا اعتدال سے گزر جانا بد نما اور مضربو جاتا ہے۔ مگر کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آداب معاشرت کی نگہداشت اہل لکھنؤ کے اخلاق میں اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ اُنکے برتنے میں اُنھیں مزہ پہنچ جانے کا بھی خیال نہیں رہتا؟ جو لوگ تہذیب و شائستگی سے نفرتی ہیں جو اعتراض چاہیں لیکن ایک ہندو و شائستہ آدمی ان باتوں کو بجاے عیب کے اخلاقی جوہر تسلیم کرے گا۔

اب تو سب شہروں کی طرح یہاں بھی میزکریسیون اور انگریزی فرنیچر کا رواج ہو گیا ہے مگر پہلے نشست فرش کی تھی جو حسب حیثیت و دولت مہیتی اور بڑے تکلف ہوا کرتا۔ اگر کوئی ہمتیہ غیر یا بزرگ اور واجب التحلیم شخص آجاتا تو اسے گاؤں کے آگے بٹھا کے سب لوگ حاضرین صحبت کی تعداد کے مطابق چھوٹا یا بڑا حلقہ باندھ کے سوپ اور دوزانو بیٹھ جلتے۔ جس کسی سے وہ بات کرتا وہ شخص ہاتھ جوڑ کے نہایت ہی فروتنی سے جواب دیتا۔ اور اُسکے سامنے زیادہ باتیں کرنا یا اپنی آواز کو اُس کی آواز پر بلند کرنا اخلاقی جرم خیال کرتا۔

لیکن اگر سب برابر والے حرفیان صحبت اور یاران ہم مذاق ہوتے تو نشست میں بے تکلفی رہتی۔ اور باوجود ہمتیہ و ہم سن ہونے کے بے تکلفی پر بھی سب ایک دوسرے کا ادب کرتے۔ اس کا خیال رہتا کہ کسی کی طرف پیٹھ نہ ہو۔ اور کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جس سے کسی کی سبکی یا اُس کی عزت کرنے سے بے پروائی ثابت ہو۔ نوکر اور خدمتگار پاس یا اُس فرش پر نہ بیٹھ سکے جس پر یاران صحبت بیٹھے ہوتے۔ وہ تعمیل احکام کے لیے سامنے ادب سے کھڑے ہوتے یا نظر سے غائب کسی قریب ہی ایسے مقام پر ٹھہرتے جہاں تک آواز پہنچ جائے اور اُن کا ہر وقت کھڑا رہنا یا زیادہ باتیں کرنا، تمیزی سمجھا جاتا۔

وہ خاصہ دان یا حقہ لاکے لگاتے تو صاحب خانہ اپنے ہاتھ سے دوستوں کے سامنے بڑھاتا اور وہ اُٹھ کے اور تسلیم کر کے لیتے۔ بے تکلفی کی صحبتوں میں

خودوں کا بے ضرورت آنا نامناسب تھا۔ اگر کبھی ضرورت سے وہ آجاتے تو باب کے آگے دوستوں کو نہایت ہی ادب سے جھک کے آداب بجالاتے۔ اور اُنکے آتے ہی بزرگوں کی صحبت سے گفت سے جذب بن جاتی۔ اور جس طرح وہ خود سب کی بزرگی کا ادب کرتا اُسی طرح بزرگ اُس کی خودی کا پاس کر کے اپنی بے تکلفیاں چھوڑ دیتے۔

یہاں کی صحبت میں روز کے ملنے والوں سے مصافحے یا معانقے کا رواج نہ تھا۔ مصافحہ مقتدایان قوم کی دست پوسی تک محدود تھا۔ اور معانقہ صرف اُن دوستوں کے لیے تھا جو کسی سفر سے واپس آئین یا مدت کے بعد ملین۔ اُن کے ملنے میں مرد جاتے تو عورتوں کا احترام کرتے۔ اُنکے سامنے ممکن نہ تھا کہ وہ زیادہ بے تکلفی برتیں یا اُن میں زیادہ نشست رکھیں۔ بیان بیوی میں بے تکلفی لازمی تھی۔ لیکن گھر کی بزرگ عورتوں کے سامنے وہ بھی ہرگز بے تکلف نہ ہوتے۔ وہات کے شرفا میں بھول تھا کہ نئی دھن جب تک چارپائے بچوں کی مان نہ ہو جائے گھر کی تمام عورتوں کے سامنے شوہر سے پردہ کرتی۔ اور مجال نہ تھی کہ کوئی عزیز مرد یا عورت اُسے شوہر کے پاس یا شوہر کو اُس کے پاس جلتے دیکھ لے۔ یہ سختی شہر کے شرفا میں نہ تھی۔ شہر کے خاندانوں میں میان بیوی ابتدا ہی سے ایک دوسرے کو پرکھنا نہ لگاتے۔ مگر یہ میوب تھا کہ بااؤن اور پیش خدمتوں کے سامنے بھی باہم بے تکلفی اختیار کریں۔ عورتوں کی باہمی صحبت سوا بڑے بڑے امیروں کے گھرانے کے نسبت بے تکلف رہتی۔ اُن میں ہمارے آئے والی بیویوں کے ساتھ ایک معتدل درجے تک تکلف رہتا۔ مگر اُس تکلف کے ساتھ خلوص اور یکجہتی کا اظہار زیادہ ہوتا۔

(۴۲)

نشست برخواست ہی کے سلسلے میں ہمیں یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ یورپ یا عرب و عجم کی طرح ہندوستان میں باہم ملنے جلتے اور لطف صحبت اُٹھانے کے لیے کلبوں اور سوسائٹیوں کا رواج نہ تھا۔ یورپ میں ہر جگہ ایسے کلب یا ایسی سوسائٹیاں قائم ہیں جن میں جا کے لوگ احباب اور ہم مذاق لوگوں سے

ملنے اور ان کی صحبت سے لطف اٹھاتے ہیں۔ عربوں۔ ایرانیوں اور ترکوں میں چاء خانے یا قہوہ خانے میل جول اور مہاد لہ خیالات کا ذریعہ بن گئے ہیں جس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ جس جگہ دو چار انگریز ہوتے ہیں وہاں اپنا ایک کلب قائم کر لیتے ہیں اور فرصت کے اوقات میں وہاں جا کے اخبار پڑھتے اور احباب سے ملتے ہیں۔ اُسی طرح جس شہر میں ایرانیوں اور عربوں کی کافی تعداد ہوتی ہے وہاں انکا کوئی چاء خانہ یا قہوہ خانہ کھل جاتا ہے۔ اور اس میں جس وقت دیکھیے اُن کا کوئی نہ کوئی گروہ ضرور موجود ہوتا ہے جو وہاں چاء اور سقے پیتے۔ کھانے کھاتے اور ساتھ بیٹھ کے غپین اُڑاتے ہیں۔

۔ سبلاٹ اسکے ہندوستان میں کبھی اس قسم کے کلبوں یا چاء خانوں کا رواج نہ تھا اور نہ آج تک ہے۔ سرکار انگریزی نے چابجا شہر دن میں اس مذاق کے پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بڑے بڑے مصارف کا بار اٹھانے کا چاء خانے کھلوائے۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آج سے تین بیس سال پیشتر خاص لکھنؤ کے چنگ میں میر محمد حسین صاحب مرحوم ڈاکٹر ذراعت و تجارت ریاست نظام نے حیدر آباد جانے سے پہلے گورنمنٹ کی اعانت سے ایک چاء خانہ کھلوا یا تھا جس میں فریج بھی اچھا تھا۔ اور سوانا جائز چیزوں کے ہر قسم کے مشروبات تیار رہتے تھے۔ مگر کسی نے توجہ نہ کی۔ اور آخر میر صاحب کو نقصان اٹھانے کے اسے بند کر دینا پڑا۔

یہاں کا پیرانا مذاق صحبت یہ ہے کہ ہر محلے میں یا آبادی کے ہر حلقے میں کوئی خوشحال یا دو لختہ شخص اپنے گھر میں لوگوں کے آنے اور اُٹھنے بیٹھنے کا سامان کرتا ہے۔ احباب کی تواضع و خاطر داشت کے لیے حقے پان وغیرہ ضروری چیزوں کو وہ اپنے ذاتی صرف سے دیا کرتا ہے۔ اور اس کے ہم مذاق بلاناغہ اور باندی سے آتے ہیں۔ دیر تک صحبت رہتی ہے۔ بذلہ سخیاں اور لطیفہ گوئیاں ہوتی ہیں۔ اور جب تک صحبت قائم رہے حقے پان سے تواضع ہوتی رہتی ہے، اور پھر نہ بیان صحبت کے مذاق کے اعتبار سے اُن کی محفلوں کا رنگ بھی بدلتا جاتا ہے۔ ارکان محفل اگر ادب اور شعر و سخن کا مذاق رکھتے ہیں تو شاعری۔ نثری۔ اور سخن فری و سخن نجی کا چرچا رہتا ہے۔ اگر وہ علما و فضلا ہیں تو عالمانہ مذاق کے ساتھ علمی

مباحث چھڑتے ہیں۔ اگر مہذب امریکی صحبت ہے تو وضع و لباس۔ سامان عیش  
کھانے پینے۔ اور ہر چیز کے برتنے اور ہر مذاق کے اختیار کرنے میں اتنا ورع  
کی نفاست و شائستگی اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ تہذیبی ظاہر کی جاتی ہے۔ اگر  
انگلین مزاج عیاشوں کی صحبت ہے تو اس میں بازاری مہ نقائیں بھی شریک  
ہوتی ہیں اور ناز و فریب و ناز برداری کی ادائیں نظر آتی ہیں۔ یہ خیال رکھنا  
چاہیے کہ یورپ کی طرح یہاں مردوں کی کسی صحبت میں شریف و پاکہ دل میں  
عورتیں نہیں شریک ہو سکتیں۔ اور احباب کی محفل میں جب کوئی عورت نظر آجائے  
تو یقیناً جان لیجیے کہ وہ عصمت فروش بازاری زبڈی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ  
یورپ کی صحبتوں میں شریف و شایستہ عورتوں کے شریک ہونے کی وجہ سے بازاری  
عورتوں کا درجہ اور مرتبہ سوسائٹی میں اس قدر گر گیا کہ کسی شریف خاندان کا  
دروازہ ان کے لیے نہیں کھل سکتا۔ اور نہ شرفاء کے گھروں اور سوسائٹیوں میں  
وہ قدم رکھ سکتی ہیں۔ بخلاف اسکے ایک حد تک سارے ہندوستان میں اور  
اسی طرح لکھنؤ میں بازاری عورتوں کو یہ رتبہ حاصل ہو گیا کہ مہذب و شایستہ  
امرا کی محفلوں میں ان کے پہلو پہ پہلو بیٹھیں۔ اور یہاں اس مذاق میں یہاں تک  
ترقی ہوئی کہ بعض معزز زبڈیوں نے بھی اپنے گھروں میں ایسی ہی نشست و برخاست  
کی صحبتیں قائم کر دیں۔ جن میں جاتے بہت سے مہذب لوگوں کو بھی شرم نہیں آتی۔  
لکھنؤ میں جو دھڑائیں۔ بی حیدر جان اور اسی پائے کی چند اور زبڈیوں کے مکان  
اچھے خاصے شرفاء کے گلاب تھے۔ جن میں صاحب محفل یعنی ان بی صاحب کی  
طرف سے حقے پان کی بخوبی خاطر کیجاتی۔ انگریزی مذاق نے اب اتنی اصلاح  
منور کی ہے کہ اگرچہ طرح طرح کی نئی بد اخلاقیان پیدا ہو گئی ہیں مگر زبڈیوں  
کے گھروں میں علانیہ بیٹھ کے لطف صحبت اٹھانا ذرا میوہ سمجھا جانے لگا ہے۔  
بہر حال لکھنؤ کے گلاب خوش باش لوگوں اور امیروں کے گھر تھے۔ یہاں یہ  
طریقہ نہایت ہی میوہ تھا اور اب تک ہے کہ ساجھے کی ہانڈی پکائی جائے۔ یا  
حاضرین محفل چندہ دے کے اور اپنے اپنے داموں کا حقہ پان یا کھانا پانی ایک  
ساتھ بیٹھ کے کھائیں پئیں۔ یہاں چندے کے ذریعہ قوم کے لیے مایہ شرم اور خلاف



شرافت تھے۔ اور یہاں کی تمام دعوتیں عام اس سے کہ خوشی کی تقریب میں ہوں یا محض دوستانہ ہم صحبتی کے لیے فقط ایک شخص کی طرف سے ہوا کرتی تھیں۔ دوسرا اگر استطاعت رکھتا ہو تو اپنی طرف سے پوری دعوت دے سکتا ہے۔ یہ نہیں کر سکتا کہ اپنی دعوت میں چھ سے کھانے کے پانچ روپے لے کے مجھے بھی شریک کر لیجے۔

دہلی کے تاجروں میں تچی پڑنے کا رواج ہے۔ یعنی بہت سے تاجر مل کے چنڈہ جمع کرتے ہیں اور اس رقم سے کوئی دعوت یا قص و سرود کی صحبت کسی گھر میں یا باہر کی تفریح گاہوں میں کی جاتی ہے۔ مگر بہن یقین ہے کہ یہ طریقہ وہاں کی تجارت نے ذوال سلطنت کے بعد نکال لیا ہے۔ شرفاے دہلی کا یہ مذاق اگرگز نہ تھا۔ اس لیے کہ وہاں کے شرفا میں ہوتا تو لکھنؤ میں بھی ہوتا۔ جو معاشرت میں دہلی کا شاگرد اور اسی کے اگلے گھرے مذاق کا نام لیا ہے۔

(۶) صاحب سلامت اور مزاج پُرسی۔ آداب معاشرت میں چھٹی چیز خوب باتوں سے زیادہ اہم اور ضروری ہے سلام کرنا اور جس سے ملین اُس کا مزاج پوچھنا ہے۔ اسلام کا قدیم مذہبی اور سیدھا سادہ سلام اسلام علیک۔ اور بہت سے لوگ ہوں تو ”استلام علیکم“ ہے۔ اسکے ساتھ ہی وہ لوگ اس سلام کے بعد ہر لے والے سے صبح کو ملین تو ”صبحکم اللہ بالبحیر“ یعنی اللہ تمہاری صبح خیریت سے گذرے۔ اور شام کو ملین تو ”مساکم اللہ بالبحیر“ کہا کرتے تھے۔ یہی سلام اور مزاج پُرسی عربوں کی تھی جسے تعلیم دیتے ہوئے وہ مغرب میں اُنس تک چلے گئے۔ اور مشرق میں ہندوستان تک چلے آئے۔ یورپ میں بھی طریقہ مساکم سلامت اُن سے اہل فرنگ نے سیکھا۔ اور مشرق میں ایرانیوں۔ تورانیوں۔ اور ہندوستانیوں نے سیکھا۔ چنانچہ یورپ میں اصلی سلام جو اسلام کا خصیصہ تھا وہ وقائب ہو گیا۔ فقط سلام کے بعد والی دعا یعنی ”صبحکم اللہ بالبحیر“ اور ”مساکم اللہ بالبحیر“ باقی رہ گئیں۔ اُنھیں کا ترجمہ ”گڈ مارنگ“ اور ”گڈ ایوننگ“ آج تک ہم صاحب سلامت میں انگریزوں کی زبان سے سنتے ہیں۔ فرانسیسی میں ”بون مٹین“ ”بون ژور“ اور ”بون سوار“ یعنی تمہاری صبح۔ دن۔ اور شام اچھی ہوں کہا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان مغربی قوموں کو صاحب سلامت کا یہ

سینک اندلس کے عرب فاتحین سے ملے۔

ہندوستان اور ایران میں چونکہ بزرگوں کی پرستش کا رواج تھا اور یہ چیز ان مشرقی لوگوں کے لوگوں کے رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی اس لیے خالی خالی "السلام علیکم" کے الفاظ جو افراد قوم کی مسادات کو قائم کرتے تھے دو لاکھوں کو اپنے تخت اور اپنی تخت کے جوش میں بہت پھیلے اور اپنی شان سے کم نظر آئے۔ خصوصاً جب یہاں شاہنشاہی دربار قائم ہوا اور تاجداروں نے اپنی تعظیم و تکریم کرنے میں سارے اسلامی آداب کو شامل کیا۔ درباریوں کو اپنے سامنے اُسی طرح ہاتھ باندھ کے کھڑے ہونے اور اپنی تعظیم میں جھکے کا حکم دیا جس طرح کہ ہندو خدا کے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑے ہوتے اور رگ و سجدہ کرتے ہیں تو شاہی دیاروں کی پیر دیہین عام امرا اور دولتمداروں نے بھی بجائے "السلام علیکم" کے دیگر تعظیمی الفاظ سلام کے لیے مقرر کیے۔ مثلاً "تسلیم" "گورنش" "آداب" "بندگی" اور خود پرست و خدا پرستوں اور اسلام کی حرکت سے فی الحال یہ سب الفاظ ہمارے سلام ہیں۔ عرب میں "السلام علیکم" کہنے کے ساتھ سوا خندہ جبینی کے اور کوئی حرکت نہیں کی جاتی تھی۔ فقط سلام کے بعد ایک ہاتھ سے مصافحہ کیا جاتا۔ مصافحے میں ہاتھ کو حرکت دی جاتی اور اُسی کے ساتھ "بیکم اللہ بالخیر" یا "تساکم اللہ بالخیر" کہا جاتا۔ اس عربی طرز صاحب سلامت کی یادگار میں اب یورپ میں سر کی ایک خفیف حرکت کے ساتھ "گڈ مائننگ" وغیرہ کہتے اور ہاتھ کو ملا کے جھٹکا دیتے ہیں۔ بخلاف اسکے ہندوستان میں اب پورا سلام یہ ہے کہ ذکرہ بالا الفاظ کہنے کے ساتھ ہاتھ کو سر یا پیشانی پر رکھتے اور رکوع کے درجے تک یا اس سے کسی قدر کم جھکے ہیں یہ جھکنا اور پیشانی پر ہاتھ رکھنا خالص ہندو اثر اور مشرکانہ جذبات کی یادگار ہے ان دونوں باتوں میں اشارہ ہے کہ ہم آپ کے تھمون پر سر جھکاتے اور آپ کے سامنے زمین بوس ہوتے ہیں۔

اسی قدر نہیں بادشاہوں اور امیروں کے درباروں میں سلاموں کی تعداد مقرر تھی۔ کہیں سات سلام کیے جاتے اور کہیں تین۔ عام بزرگوں اور دوستوں

سے ملتے ہیں ایک سلام کافی تھا۔ لکھنؤ میں چونکہ آداب و حفظ مراتب کا زیادہ خیال تھا اس لیے کہ خردون کا سلام بزرگوں سے اور نیز متوسط درجے والوں کا معزز لوگوں سے یہ ہے کہ الفاظ مذکورہ میں سے کسی ایک کو زبان سے ادا کرنے کے ساتھ داہنے ہاتھ کو سینے یا چہرے کے سامنے تک اٹھانے کی بار حرکت دیجائے۔ خردون کے لیے آج تک یہ نہایت ہی پسندیدہ اور سادہ و تمدانہ سلام ہے۔ یہ ہاتھ کو کئی بار حرکت دینا متعدد سلاموں کا اشارہ ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اکثر لوگ تسلیم اور کورنش کو جمع کے صیغوں میں استعمال کر کے کہتے ہیں "تسلیمات" اور "کورنشات" یہ بھی سلام کے تقد و کی یادگار ہے۔

اب ہم مذکورہ بالا مروجہ الفاظ سلام کے معنی اور انکی شان و اصلیت جدا جدا بیان کرتے ہیں۔ تسلیم کے معنی عربی میں سلام کرنا ہیں۔ بطور جدا "سلام علیکم" کو چھوڑ کے فعل کا صیغہ استعمال کرنا لغو معلوم ہوتا ہے مگر بیان سوسائٹی میں یہ سمجھا گیا کہ بجائے سلام کرنے کے "میں سلام کر رہا ہوں" کہنے میں زیادہ اظہار تعظیم ہوتا ہے۔ کورنش ترکی زبان کا لفظ ہے جو ترکی فاتحان ہند کے ساتھ بیان آیا۔ اس کے معنی سلام کے لیے جھکنے کے ہیں۔ لہذا اس میں بھی جھک کے تین بوس اور قد مبوس ہونے کا خیال موجود ہے۔ آداب فقط ادب کی جمع ہے سلام کے محل پر ڈسکے زبان پر لانے کا نسیا یہ ہے کہ ادب و تعظیم کے جتنے طریقے ہیں ان سب کو سجالانا ہوں۔ جتنے کی۔ یہ تمام الفاظ سلام سے زیادہ ذلیل اور شرمناک سمجھے جاتے ہیں۔ جتنے کی کے معنی پوجنے اور عبادت کرنے کے ہیں۔ سلام میں اس کا استعمال سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ میں حق عبودیت سجالاتا ہوں۔ جو مسلمانوں کے خلاف ان ہندوستانی سلاموں کے عرب میں جو الفاظ "السلام علیکم" کے معنی ہیں ان کا لغوی ترجمہ یہ ہے کہ "تم پر سلامتی" یا صاف اُردو میں یوں کہیے کہ "تم سلامت رہو" یعنی سلام کرنا دراصل ہر ملنے والے کو سلامتی کی دعا دینا ہے۔ اسلام نے اس پر ترقی یہ کی کہ "سلام" خدا کا پیام ہے جو رسول خدا صلعم نے مسلمانوں کو پہنچایا۔ اور قیامت تک آپ کا یہ پیام ہر مسلمان دوسرے مسلمان

کو پوچھا تا رہے گا۔ السلام علیکم میں سلام پر جو الف لام لگا ہوا ہے اُس میں صاف اسی جانب اشارہ ہے کہ وہی سلام جو حضرت رسالت کا پیام ہے تم کو پہونچے۔

اسلام کی اصلی سلام کے ان معنوں اور اسکے مقصد کو سمجھ کے ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ سلام قومی مساوات کا خیال دلاتے اور تمام پیروان رسالت محمدی میں قومیت و اخوت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ مگر افسوس مسلمانوں نے اسکو چھوڑ دیا۔ اور ہمارا فضول تخراب ہمیں یہ خیال دلاتا ہے کہ کسی سموی مسلمان کا ہم سے ملنے وقت السلام علیکم کہنا ہماری توہین کرنا ہے۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ شیعہ سُنی کے اختلاف نے چونکہ یہ شان پیدا کر دی ہے کہ دونوں بجائے ایک قوم بننے اور ایک جماعت ثابت ہونے کے ایک دوسرے سے جدا اور ممتاز رہنا چاہتے ہیں۔ عوام ہی ہمیں دونوں فریقوں کے متاثر علماء مصنفین ہمیں اپنے اپنے فریق کو دوسرے کے عادات و اطوار سے نفرت کرنے کا سبق دیا ہے۔ اس رجحان کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب و عجم تک میں تو شیعہ و سُنی دونوں کا سلام "سلام علیکم" تھا مگر ہندوستان خصوصاً لکھنؤ کے شیعوں نے اسلام علیکم کو سنہیوں کے سرمایہ کے اپنے لیے "سلام علیکم" کے الفاظ مخصوص کر لیے ہیں۔ وہ زیارت ائمہ پڑھتے ہیں تو وہی پڑانے الفاظ مثلاً "السلام علیک یا ابا عبد اللہ علیہ السلام" کہتے ہیں مگر ملے جلنے والوں سے حیب صاحب سلامت کرتے ہیں تو کہتے ہیں "سلام علیکم"۔ اس لیے کہ "السلام علیکم" سنہیوں کا سلام ہے۔

تاہم زیادہ تر یہ انکار عربی سلام سُنی اور شیعہ دونوں میں مذہبی لوگوں کے لیے مخصوص ہو گیا ہے یا مذہبی شان و وضع میں داخل ہے۔ ورنہ امریکی سوسائٹی میں "آداب" و "تسلیم" کا عام رواج ہے۔ بندگی بھی اکثر لوگ کہتے ہیں مگر یہ لفظ عورتوں میں زیادہ مروج ہے۔

لکھنؤ میں بڑا نا مذہب اور شائستہ لوگوں کا سلام یہ تھا کہ چھوٹا بڑے سے یا غریب امیر سے نہایت جھک کے تسلیم یا آداب کہے۔ جو اب میں بزرگ خوردن سے کہیں "بھئیے رہو" "بڑے ہو" "صاحب اقبال ہو"۔ امرایہوں کے لیے

بغیر کچھ قطع ہاتھ اٹھا دین یا ہاتھ اٹھانے کے ساتھ اُنھیں الفاظ تسلیم و آداب و تسلیم کا اعادہ کر دین یا بندگی کہہ دین۔ مگر اگر والدین کا طریقہ جواب دینے میں یہ تھا کہ راہِ جلتے میں صاحب سلامت ہو تو اُسی طرح جھک کے تسلیم یا آداب کہیں۔ اور اگر کسی محفل میں بیٹھے ہوں تو پوری طرح اُٹھ کھڑے ہوں اور جھک کے جواب دین۔

سلام کے بعد ایک دوسرے سے کئے "مزاج شریف" یا "مزاج اقدس" یا "مزاج عالی" یا "مزاج مبارک" یا "مزاج سلف" اور دوسرا ہاتھ جوڑ کے کئے "دعا کرتا ہوں" تقریباً سارے ہندوستان میں ہندو و شائستہ لوگوں کا طریقہ سلام و مزاج پُرسی یہی ہے۔ مگر لکھنؤ میں اور چند شہروں میں جہاں ہندوستانی ریاست قائم ہے اور کوئی دربار موجود ہے اُن طریقوں کے ادا کرنے میں زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے۔ اور اس میں کمی ہونا بد تیزی خیال کی جاتی ہے۔

مگر اب چند روز سے خصوصاً لکھنؤ میں عوام اہل حرفہ اور ادبے طبقے والدین میں اسلگے دربار اور اُسکے آداب کے مٹ جانے سے "السلام علیکم" کہنے کا بہت رواج ہو گیا ہے۔ خدا کرتا امر ابھی اسکی پردی کرتے اور ادبے واسطے کا اختیار بالکل اُٹھ جاتا۔

(۴۳)

(د) طرز کلام۔ آداب معاشرت میں ساتوین اہم چیز گفتگو اور طرز کلام ہے۔ دنیا میں ہر شخص کی شائستگی اور ادبی قابلیت کا پہلا اندازہ اُسکے الفاظ اور اُسکے انداز گفتگو سے ہوتا ہے۔ دنیا کی ہر اقبال مند قوم سب سے پہلے اپنی زبان کی اصلاح کرتی اور اُسے ترقی دیتی ہے۔

تہذیب و شائستگی کا تقاضا یہ ہے کہ زبان پر کردہ و نمش الفاظ نہ آئیں۔ جو الفاظ و خیالات مخاطب کو ناگوار گذارین اُس کے سامنے زبان سے نہ نکلیں۔ اور اگر کبھی ناگوار مضامین کے ظاہر کرنے کی ضرورت پیش بھی آئے تو وہ ایسے الفاظ اور ایسے عنوان سے ادا کیے جائیں کہ مخاطب کو گران نہ گذرین اور اگر گران گذرین بھی تو اُن کی گرائی میں ایک گو نہ گرائی و لطف پیدا ہو جائے

س مارہ خاص میں اہل زبان لکھنؤ اور یہاں کے شایستہ لوگوں کو جو کمال حاصل ہے ہندوستان کے اور کسی شہر والوں میں نہ نظر آئے گا۔ اگرچہ موجودہ تعلیم و تہذیب نے ایک جانب یہ خوبی ہر جگہ انا از لکھنؤ میں پیدا کر دی ہے مگر انگریزی اثر سے معرٹے کر کے دیکھیے تو بالذات یہ شایستگی و شستگی زبان اہل لکھنؤ ہی کا حصہ نظر آئے گی۔

باہر کے لوگ اس کا یہاں تک لوہا مانے ہوئے ہیں کہ لکھنؤ والوں کے سامنے گفتگو کرتے جھپٹے اور جس قدر شایستگی اُن میں ہے اُسکو بھی بھول جاتے ہیں۔ اور اسکے بعد جب اپنی صحبتوں میں بیٹھتے ہیں تو یہ کہنے لگتے اپنی کمزوری کا الزام دُور کرتے ہیں کہ ”ہم سادگی سے صاف صاف بات باتیں کرتے ہیں اور ہم لکھنؤ والوں کی سی چٹان چٹین نہیں آتی۔“ مگر دراصل یہ عذر بدتر از گناہ ہے۔ میں نے ایرانیوں کو دیکھا کہ اُن کے سامنے ہندوستانی بات کرنا بھول جاتے ہیں۔ انگلستان میں دیکھا کہ فرانسیسیوں کے سامنے انگریزوں کی زبان سے ایک لفظ نکلتا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عربوں کی طلاقت لسانی کی کبھی یہ حالت تھی کہ اُنکے سامنے غیر ملک والوں کی زبان نہ کھل سکتی تھی۔ اور عرب لوگوں کا خیال ہو گیا تھا کہ ”زبان خدا نے فقط ہم کو دی ہے۔ اور ساری دُنیا ہمارے مقابل گونگی ہے۔“ اسی خیال کا نتیجہ تھا کہ ماسوا عرب کے تمام دُنیا کے لوگوں کو وہ ”عجم“ کہتے۔ جس کے معنی گونگے کے ہیں۔ بعینہ ہی حال ہندوستان میں ہر شہر کے لوگوں کے مقابل لکھنؤ والوں کا ہے کہ وہ فصاحت و بزدلی سخی میں سب کو دبا کے صحبت پر بچھا جاتے ہیں۔ اور اپنے سامنے کسی اور کو زبان بہین کھولنے دیتے۔

شایستگی زبان میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ مخاطب کو کن ضمائر سے یاد کیا جائے۔ اور سب زبانوں میں مخاطب کے لیے دو ضمیر ہیں۔ ایک واحد کی اور ایک جمع کی۔ اور مرز مخاطب کے لیے واحد کی جگہ ہر زبان میں تعظیم کی ضمیر استعمال کی جاتی ہے۔ فارسی میں واحد مخاطب کی ضمیر ”تُو“ ہے اور جمع کی ”شما“ عربی میں واحد کی ”ک“ اور ”انت“ اور جمع کی ”کم“ اور ”انتم“ انگریزی

میں ”یو“ کے لفظ سے معزز شخص مخاطب کیا جاتا ہے۔ سچاوت ان سب زبانوں کے اردو میں مخاطب کے لیے واحد کی تو ایک ہی ضمیر ”تو“ ہے مگر جمع کی دو ضمیر ہیں ”تم“ اور ”آپ“۔ اور ان تینوں ضمیروں کے لیے مخاطب کا درجہ اور مرتبہ مقرر ہے۔ ایک جہت اولیٰ شخص کو ”تو“ کہیں گے۔ دوسرے درجے کے لوگوں میں جو فوراً امتیاز رکھتا ہو اُسے اور اپنے خردوں کو ”تم“ کہیں گے۔ اور جو ہر تہ معزز و تعلیم یافتہ شریف ہو اُسے ”آپ“ کہیں گے۔ اگرچہ معزز درجے کے لوگ کبھی بے تکلفی میں اپنے اقربان و امثال اور اپنے ہم سینوں کو بھی ”تم“ کہنے لگتے ہیں مگر جن لوگوں سے بے تکلفی نہ ہو اُن کو تم کہنا اردو میں خصوصاً اہل لکھنؤ میں اخلاقی و ادبی جرم ہے۔

اردو زبان میں اور خاص لکھنؤ والوں میں مخاطب کے اتنے ہی درجے نہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کے بہت سے الفاظ ہیں جن کا شرف و معززین کے مقابل میں استعمال کرنا لازمی ہے۔ جناب۔ جناب والا۔ جناب عالی۔ حضرت۔ حضرت والا۔ حضور۔ حضور والا۔ حضور عالی۔ قبلہ۔ قبلہ و کعبہ۔ مبارک۔ اور اسی قسم کے چند اور الفاظ اردو میں معزز مخاطب کی نسبت حسب درجہ استعمال کیے جاتے ہیں۔ جو لکھنؤ والوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں اور اُن کا صحیح استعمال جس قدر اہل لکھنؤ جانتے ہیں اور کسی دوسرے شہر کے لوگ نہیں جانتے۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ اتنے تعلیمی الفاظ خطاب و دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہیں۔ ہندوستان میں وہ زمانہ گزر گیا جب اردو بیان کی تمام زبانوں کی ادب آموز تھی۔ اور اب ادب اردو کی شاگردی سے آزاد ہو کے سب زبانیں کو سہولت ملی سچا رہی ہیں۔ بنگالی۔ پنجابی۔ گجراتی۔ سندھی۔ مرہٹی۔ کشمیری۔ سرائیکی وغیرہ سب کو اپنی ادبی ترقی و فصاحت کا دعویٰ ہے۔ مگر ہم مذکورہ ہندوستانی زبانوں کو اور اُن کے ساتھ ساری دنیا کی مشہور زبانوں فارسی۔ عربی۔ انگریزی اور فرانسیسی کو بھی چیلنج دیتے ہیں کہ اگر ان کو اردو سے زیادہ ادبی وسعت و فصاحت کا دعویٰ ہے تو مخاطب کے لیے اپنی لغتوں میں

اتنے لفظ نکال دین جتنے کہ اردو میں موجود ہیں۔ یہ ہے کہ باوجود اپنی کم عمری اور اپنے محدود درجہ تصرف کے اردو چند ہی روز میں شائستگی۔ لطافت۔ اور مناسبات علم مجلس کے اعتبار سے اس درجہ کمال کو پہنچ گئی تھی جو دنیا کی کسی زبان کو نہیں حاصل ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اردو کسی ملک کسی صوبے کسی گروہ کسی مذہب کی زبان نہ تھی۔ بلکہ یہ وہ زبان تھی جو شاہی دربار سے شروع ہو کے ہندوستان کے ہر شہر میں ہندو و شائستہ لوگوں۔ کھری صحبت والوں۔ صاحبان علم و فضل۔ شاعروں اور ادب و اخلاق کے شیداؤں کی زبانوں پر جاری ہو گئی تھی۔ لہذا اس کی بنیاد ہی تہذیب و شائستگی کے ہاتھوں سے پڑی۔ اور آخر تک کھمرے مذاق والوں اور شیدا پان سخن کے ساتھ مخصوص رہی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اردو بولنے والوں کی مجارٹی کسی صوبے میں نہیں۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ہر جگہ کے مذہب و شائستہ لوگ اُس کے بولنے والے ہیں۔ یہ پیدا اسی لیے ہوئی تھی کہ ہندوستان میں ایک اعلیٰ درجے کی اور ساری دنیا سے زیادہ شائستہ سوانحی پیدا کر دے۔ مگر بد نصیبی سے انگریزی دور میں جب مغربی معاشرت و ادب نے جگہ پکڑ لی تو ہندوستانیوں کے باہمی اور قدیم فطری تعصبات نے یہ رنگ دکھایا کہ مسلمان اس پر ناز کرنے لگے کہ ہماری زبان ہے اور ہندوؤں نے یہ خیال کر کے کہ اس زبان میں ہم مسلمانوں کا مقابلہ نہ کر سکیں گے اُسے مسلمانوں ہی کے سر مارا اور دامن جھٹاک کے ملحدہ ہو گئے۔ اس سے اردو کو نقصان پہنچا۔ اور روز بروز زیادہ نقصان پہنچے گا۔ مگر باوجود اس کے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جو رسیلا ہیں۔ جو ادبی خوبیاں اس میں ہیں نہ نئی پیدا کی ہوئی ہندی زبان میں ہیں اور نہ ہندوستان کی کسی اور زبان میں۔

انگریز ہوں یا عرب۔ افغانی ہوں یا ایرانی جب اردو بولتے ہیں تو خطاب کے لیے سوا "تم" کے اور کوئی لفظ ان کے خیال میں نہیں آتا۔ اس لیے کہ اس قسم کا اور کوئی لفظ جو "تم" سے زیادہ شائستہ و ترقی یافتہ ہو ان کی زبان میں موجود ہی نہیں ہے۔

انگریزی میں خطاب کے اور الفاظ ہیں مثلاً یو آر آنر۔ یو آر کلسنس۔ یو آر



یو تجبٹی وغیرہ - مگر وہ اعلیٰ درجے کے امرا اور بادشاہوں کے لیے خاص ہیں۔ اُن کے سوا اور کسی کی نسبت نہیں استعمال کیے جا سکتے۔ اس قسم کے مختص الأشخاص الفاظ اُردو میں بھی ہیں۔ مثلاً جہان پناہ - صاحب عالم - مرشد زادہ - نواب صاحب - نواب زادہ - صاحب جزاؤں - یہ خاص اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے خطابات ہیں۔ جن کے ساتھ جناب یا حضور کے الفاظ ملا کے خطاب کیا جا سکتا ہے۔ اور غالباً اس قسم کے مخصوص خطابات ہر زبان میں موجود ہوں گے۔ مگر مذکورہ بالا تفصیلی الفاظ جو اُردو زبان میں ہر معزز و شایستہ انسان کی نسبت استعمال کیے جا سکتے ہیں اُردو کے سوا کسی اور زبان میں نہیں نظر آتے۔

مزاج پسندی کو دیکھیے - ہر زبان میں اس کے لیے معمولی الفاظ ہیں مگر اُردو میں ادب و احترام کی نگہداشت کے لیے - مزاج عالی - مزاج مبارک - مزاج اقدس - مزاج مقدس - مزاج معنی وغیرہ کئی معزز مخاطب کی نسبت درجہ کرتے ہیں۔ یہ الفاظ اگرچہ اب ترقی اُردو کے ساتھ ہر جگہ اور ہر شہر میں پھیل رہے ہیں مگر اُن کے استعمال میں جو اجتہادی ملکہ شرفاء لکھنؤ کو حاصل ہے اور کسی جگہ کے لوگوں کو نہیں نصیب ہو سکتا۔

شرفاء لکھنؤ میں ایک خاص بات یہ ہے کہ "ش" "ق" درست رہ سکا۔ اور تمام عربی حرفوں کو حتی الامکان اُن کے اصلی خراج سے ادا کریں گے۔ فارسی ترکیبوں میں امانت نمایان طور پر ادا کی جائے گی۔ علماء اور ذی علم لوگوں سے باتیں کریں گے تو عربی و فارسی الفاظ کو زیادہ استعمال کریں گے۔ اور اُن کے صحیح تلفظ سے ادا کریں گے۔ اطباق سے گفتگو ہوگی تو عربی کے طبی مصطلحات کو کام میں لائیں گے۔ جاہل نوکروں اور عوام سے بات کریں گے تو عربی الفاظ سے بچیں گے۔ عورتوں سے بات چیت ہوگی تو اُن کے مذاق کے محاوروں اور مثلوں کو گفتگو میں صرف کریں گے۔

خرد بزرگ سے - ادنیٰ اعلیٰ سے - یا عامی عالم سے گفتگو کرے گا تو ہر لفظ اور ہر فقرے میں ادب و تعظیم کا خیال رکھے گا۔ آواز مناسب درجہ تک ہست اور نیچی رہے گی۔ اسی طرح بزرگ خردوں سے - اعلیٰ طبقے والے ادنیٰ لوگوں

سے۔ علماء عوام سے بات کرین گے تو ان کے لیے۔ اُنکے انداز اور اُنکے الفاظ میں شفقت و محبت کے جذبات مضمر ہوں گے۔

ان باتوں کا لحاظ رکھنے اور مذکورہ بالا ادب و تعظیم کے الفاظ و ضابطہ استعمال کرنے سے اہل لکھنؤ کی زبان اس قدر شائستہ اور شستہ و رفته ہو گئی ہے کہ یہاں کے عوام اور جہلا دوسرے شہروں کے اکثر شعرا و قصدا سے زیادہ اچھی اُردو بولتے ہیں۔ اور جو شائستگی و تمیز داری اُن سے ظاہر ہو جاتی ہے کسی اور مقام کے قابل و ذی علم لوگوں سے بھی نہیں ظاہر ہو سکتی۔ مگر افسوس لکھنؤ ٹٹتا جاتا ہے۔ اب یہاں بیرونی لوگوں کا ایسا طوفان بے تمیزی بہا ہے۔ یہاں کے شائستہ لوگ اس طرح بیکار ہو کے کوئے میں بیٹھ گئے ہیں۔ اور قانونی آواز دی نے جہلا و عوام کو اس درجہ میاں و بد تمیز بنا دیا ہے کہ یہ تمام ادبی قوانین خاک میں مل رہی ہیں اور چند روز بعد شاید اُن کا پتہ بھی نہ ہو۔

(۱۲۴)

(۸) آداب معاشرت میں آٹھویں چیز طریقیہ مذاق ہے۔ عرب کا پُرانا قول ملکہ مشہور حدیث نبویؐ ہے کہ: کلام میں ظرافت ویسی ہی ہے جیسے کھانے میں نمک۔ سچ یہ ہے کہ شوخی و ظرافت کے بغیر نہ کلام میں مزہ پیدا ہوتا ہے اور نہ صحبت میں جان پڑتی ہے۔ مگر اُسی ظرافت میں اگر بے احتیاطی ہو جائے تو وہی سخت فتنہ و فساد کا باعث ہو جاتی ہے ظرافت نے باتوں باتوں میں اکثر تلوار چلوا دی ہے۔ اور پُراٹے جانی دوستوں کو گھڑی پھر میں دشمن بنا دیا ہے۔ غور سے دیکھو تو صاف نظر آجائے گا کہ ان خرایوں کا باعث ظرافت نہیں بلکہ ظرافت میں بے احتیاطی کرنا یا اعتدال سے یاہر ہو جانا ہوا کرتا ہے۔

جو زبان جتنی زیادہ ترقی کرتی ہے اُسی قدر اُس میں مذاق و ظرافت کے پہلو بڑھتے جاتے ہیں۔ کلام میں ظرافت جن طریقوں سے پیدا ہو جاتی ہے اُن کا محصور کرنا بہت دشوار ہے۔ ہمدرد طریقے ہیں جن سے ایک نصیح البیان شخص اجتہادی طور پر قائم دُٹھایا کرتا ہے۔ اور اُن کے متعلق تفصیلی بحث کرنے کے لیے ایک مستقل کتاب چاہیے۔ بہین اس موقع پر فقط اس قدر کہنا ہے کہ زیادہ تر مبالغہ و ظرافت ایسے

الفاظ ہوا کرتے ہیں جو مختلف معنی رکھتے ہوں۔ اور بعض معنوں سے کسی پر تعریف ہوتی ہو۔ اور کبھی ظرافت میں ایسے الفاظ سے بھی کام نہیں لیا جاتا بلکہ کسی انسان یا چیز کو کسی ایسی شے سے تشبیہ دی جاتی ہے جو باوجود غیر مناسب ہونے کے مشابہ ہو۔ پھر اُس تشبیہ کو ایسے عنوان اور پہلو سے ادا کرنا کہ اُس میں بوضوح تشبیہ کے استعارے کی شان پیدا ہو جائے۔ علیٰ ہذا القیاس کبھی اپنے آپ کو یا کسی اور کو اس قدر بڑھانا یا اتنا گھٹانا کہ اصلی درجے سے بہت دور ہو جائے۔ ان سب باتوں کے لیے سلیقہ کی ضرورت ہے۔ اچھا سلیقہ رکھنے والا سخت سے سخت تعریف کر جاتا ہے اور ناگوار سے ناگوار تشبیہ دے دیتا ہے مگر کسی کا دل نیلا نہیں ہوتا۔ یا کسی کو اظہار ناگواری کی گنجائش نہیں ملتی۔ بخلاف اسکے اگر کسی کا سلیقہ شخص نے یہ کام کرنا چاہا تو لوگ بگڑ کھڑے ہوتے ہیں اور عداوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس کا جیسا اچھا سلیقہ لکھنؤ کے عوام الناس کو ہے اور جگہ کے خاص لوگوں میں بھی نہیں نظر آتا۔

ایک جنگالی عالم ڈاکٹر اگھوڑا تھیں جو بڑے عالم و فاضل۔ فلسفے میں کیا ہے روزگار۔ لٹریچر کے ڈاکٹر اور اردو کے اچھے ماہر تھے زبان اردو پر اعتراض کرنے کے عنوان سے مجھ سے کہا ”صاحب یہ کون سی زبان کی خوبی ہے کہ ایک فقہ میں نے ایک صحبت میں کہا۔ ہم آج کل دودھ پیا کرتے ہیں۔ اس پر سب لوگ بیساختہ ہنس پڑے۔ میں نے کہا اردو کا بھی اعلیٰ درجے کا حسن ہے۔ آپ چونکہ اس زبان میں ناقص ہیں اس لیے آپ کو بجائے اپنے عیب کے یہ زبان کا عیب نظر آیا۔ ہر زبان میں ذومعنی لفظ ہوا کرتے ہیں۔ اور زبان دونوں کا کام یہ ہے کہ تمام ذم کے پہلوؤں کو سچائے لفظوں کو استعمال کیا کریں۔ انگریزی میں لفظ ”کنسیو“ کے معنی خیال کرنے کے بھی ہیں اور حاملہ ہونے کے بھی۔ ایک مشہور لاٹ صاحب نے پارلیمنٹ میں تین بار کہا ”آئی کنسیو“ اور آگے سوچنے لگے۔ کسی نے پکار کے کہہ دیا جناب نے تین بار آئی کنسیو کہا اور ہوا کچھ نہیں۔ یعنی تین بار عمل ہوا اور پید ا کچھ نہ ہوا۔ اسپر سب نے تھوہہ لگا یا اور وہ لاٹ صاحب جھپک گئے۔ اسی طرح اردو میں ہزاروں الفاظ ہیں جن میں مختلف پہلو نکلتے ہیں۔ بولنے والا اُنکے استعمال کا صحیح سلیقہ نہ رکھتا

ہوگا تو بات بات پر ہنسا جائے گا۔

یہی مذکورہ بالا "دودھ پینے" کا جملہ ہے۔ ہندوستان میں "دودھ پینا" شیرخوار بچوں کا کام ہے۔ اور کسی عاقل بالغ کے لیے کہنا کہ "یہ دودھ پیتے ہیں" عیب ہونے کے علاوہ ان معنوں میں مستعمل ہوتا ہے کہ یہ ابھی ناشیجہ اور نادان ہیں اس پہلو کے بچانے کے خیال سے اہل لکھنؤ یہ بھی نہ کہیں گے کہ "میں دودھ پیتا ہوں" بلکہ اس معنوں کو یہ عیب کا پہلو بچا کے مختلف عنوانوں سے ادا کریں گے کہیں گے کہ "میں آج کل دودھ کو استعمال کرتا ہوں" "آج کل میری غذا دودھ ہے" "دودھ چاؤں کھاتا ہوں"۔ لکھنؤ والوں کی ان احتیاطوں کو دیکھ کے آگے کے ایک قابل و زباندار شاغر کو دھوکا ہوا کہ لکھنؤ کی زبان دودھ کھانا ہے دودھ پینا نہیں۔ لکھنؤ کے ایک صاحب سے اُن سے اس بارے میں اختلاف ہوا۔ اور حکم کے طور پر مجھ سے دریافت کیا گیا۔ میں نے کہا "دودھ پینے کی چیر ہے۔ کوئی ماسکی نسبت کھانے کا لفظ کیسے استعمال کر سکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ذم کا پہلو بچانے کے لیے اہل لکھنؤ "دودھ پینے" کا لفظ اپنی نسبت استعمال نہ کریں گے۔

ایک اسی محاورے پر مختصر نہیں اُردو میں صدا الفاظ میں مختلف محاوروں اور معنوں کی وجہ سے ذم کے پہلو پیدا ہو گئے ہیں۔ اور ہر اہل زبان کا کام ہے کہ اُن سے بچے۔ یا کوئی شخص کسی کی نسبت مذاقاً استعمال کر جائے تو اُس کا فرض ہے کہ سمجھے اور جواب دے۔ ورنہ سمجھ لیا جائے گا کہ وہ زبان سے ناواقف ہے۔

اہل لکھنؤ میں شوخی و ظرافت بہت ہے۔ وہ اپنے کلام میں صدا عنوان سے ظرافت پیدا کر دیا کرتے ہیں۔ اور جو اس فن میں جتنا زیادہ کمال رکھتا ہے اتنا ہی زیادہ اہل سخن کی محفلوں میں چلنا اور ممتاز ثابت ہوتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اور مقامات کے لوگوں میں یہ ملکہ نہیں ہے اور کثرت سے ہے۔ اور اب اُردو زبان سارے ہندوستان میں اس طرح ترقی کر رہی ہے کہ ہر جگہ اعلیٰ درجے کے ظریف پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ اور سخن دانی و سخن فہمی کا شعور بڑھ رہا ہے مگر لکھنؤ والوں میں یہ ملکہ طبیعت ثنائیہ بن کے اُن کی فطرت و جبلت

بن گیا ہے۔ اور لطافت کلام کے ساتھ بذلہ سخی و طرافت میں جیسا بے تکلف اور ستھرا مذاق اُن کا نظر آئے گا اور وہ کانہیں ہو سکتا۔

(۹) آداب معاشرت میں نوین چیز شادی اور غمی کی محفلیں ہیں۔ مسلمانوں کی اگلی دو ہمتدی و حکومت نے اُن کی خورتوں کی امانتیں بمقابلہ اکثر مقامات کے یہاں بہت بڑھادی ہیں۔ ولادت سے لے کے شادی تک لڑکے کی ہر خوشی و کامیابی ایک تقریب بن جاتی ہے۔ پیدائش کے بعد ہی تھپی چلتی اور درمیان کے مہمان۔ حقیقہ۔ کھیر چٹائی۔ دودھ بڑھائی۔ بسم اللہ۔ تختہ۔ اور سب سے بڑھ کے عقد نکاح۔ یہ سب بجائے خود شادی کی تقریبیں ہیں۔ اکثر بچوں کی سال گرہ ہوا کرتی ہے۔ مذکورہ تقریبوں کے علاوہ غسلِ صحت یا کسی خاص کے پورے ہونے پر بھی خوشی کی غیر معمولی تقریبیں ہو جاتی ہیں۔

ان سب تقریبوں میں قرابت والی بیویاں اور پاس پڑوس کی بہت سی شناسا عورتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ زمانہ محفلیں مرتب ہوتی ہیں جن میں تختوں کے چوکوں پر اور زیادہ ہمان ہوسے تو زمین پر درسی چاندنی کا اُجلا فرش بچھتا ہے۔ دو ہمتدی گھروں میں چاندنی پر تین طرف یا فقط صدر میں پر تکلف قیمتی قالین بچھتے ہیں۔ کنول اور مردنگین روشن ہوتی ہیں۔ اور ڈومینوں کا طائفہ سانسے بیٹھ کے بچرا کرتا ہے۔ ناچنے والی ڈومنی گھونگھروں کے ناچتی اور بھابھاتی ہے۔ بچرے کے درمیان میں وقتاً فوقتاً ڈومنیان ہنسنے والی نقلیں کرتی ہیں۔ بہر حال مسرت کے ولے اور خوشی کے چہچہہ ہوتے ہیں۔ اور ڈومنیان اگرچہ بچرے میں اکثر بے اعتدالیان کرنے لگتی ہیں اور صحبت میں بیجا فی دے شرمی کو بڑھادی ہیں۔ گزشتہ برخاست کے سلیقے۔ بیویوں کے باہمی ربط و ضبط۔ اور اُسکے ساتھ حفظ مراتب میں کوئی فرق نہیں آئے پاتا۔ ہر تقریب کے متعلق صد ہار تین ہیں جن کا انجام پاتا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ان رسموں کی محافظ اور برقرار رکھنے والی پری پوری عورتیں اور اُسکے ساتھ ڈومنیان ہوا کرتی ہیں۔ جن کو اُن رسموں کے پہلے بہت کچھ مل جاتا ہے۔

اکثر تقریبوں میں رت جگا ضرور ہوا کرتا ہے۔ اور یہی ایک چیز ہے جو ہندوستانی

عورتوں کے اعتقاد میں خالہ لہو لہو ہے۔ اور جس میں ڈو میتیان اللہ میاں کی سلامتی کا نغمہ گاتی ہیں۔ شب زندہ داری ہوتی ہے۔ مگر عبادت کے لیے نہیں بلکہ گائے بچانے رات بھر دھوا چوکڑی مچانے اور صبح ہوئے مسجد میں جا کے اللہ میاں کا طاق بھرنے کے لیے۔ جن کی نذر کے لیے گنگے اور خدا رحم مخصوص چیزیں ہیں۔ ان تقریبات میں ہی کارروائی دہات میں بھی ہوا کرتی ہے مگر وہاں بد قیڑی و بد سلیقگی ہوتی ہے تو شہر والیوں میں نفاست۔ صفائی خوش ترمیمی۔ اور شائستگی۔

(۳۵)

جن شادی کی تقریبات کا ہم ذکر کر چکے ہیں اور ان کی زمانہ محفون کی ایک عام تصویر گذشتہ موقع پر دکھا دی ہے ان کی تفصیل تشریح ہے کہ چھٹی اس تقریب کا نام ہے دیکھ زچگی کے بعد ان اور بچے کو پہلی دفعہ نہلایا جاتا ہے۔ زچہ کو تیر گرم پانی سے نہلانا ایک طبی علاج ہے۔ مگر یہ غسل ولادت چونکہ ایک خوشی کے موقع پر ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو نہایت اہمیت دی جاتی ہے۔ اور چونکہ عموماً زچگی کے چھڑے روز یہ چلا نہان ہوتا ہے اس لیے اس کا نام ہی چھٹی پڑ گیا۔ اور اس میں زچہ بڑے اہتمام سے نہلایا جاتی ہے۔ پھر بچہ نہلایا جاتا ہے۔ اور اُنکے بعد تمام عورتیں جو نہان ہوتی ہیں یکے بعد دیگرے سب نہاتی ہیں۔ زچہ اور بچے کے لیے نئے بھاری جوڑے حسب حیثیت تیار کیے جاتے ہیں۔ اور ساتھ ہی سب عورتیں کپڑے بدلتی ہیں۔ اس نہان میں جو طرح طرح کی رسمیں برتی جاتی ہیں وہ بے حد بے شمار ہیں۔ اور غالباً ہر شہر و قریے بلکہ ہر خاندان میں مکئیہ یکساں اور جزو مختلف اور نئی ہیں۔

دولہن کے میکے یا دیگر اعزاء کی طرف سے اس موقع پر زچہ اور بچے کے جوڑے طوق۔ ہتھلی اور کڑے۔ تھپتھپے کے قابل کھلونے بٹھکھنچے۔ چوڑے۔ ان کے ساتھ مرغیان اور خدا جاتے کیا کیا چیزیں بڑی دھوم دھام جلوس اور باجون کے ساتھ آتی ہیں۔ زمانے میں نقص و سرود کی محفلیں گرم ہوتی ہیں۔ اور اسی انتہا نہ ہو تو خود گھر والی عورتیں ڈھول ساٹنے لگ کر گایا جاتی ہیں۔

یہی شان بد کے، دو ہاؤن لین بیسویں اور چٹے کے ہاؤن کی ہوتی ہے۔ اگر خدا نے اطمینان دیا ہے تو دو ہاؤن موقوفہ پر محفل عیش و نشاط گرم ہوتی ہے۔ ورنہ فقط چٹے کے ہاؤن میں زیادہ دھوم دھام ہوتی ہے۔ اور بیسویں کے ہاؤن کی تقریب معمولی ہوتی ہے۔

عقبتہ مسلمانوں کی خالص مذہبی رسم ہے جس کا آغاز بنی اسرائیل کے زمانے سے آل ابراہیم میں چلا آتا ہے۔ یہودیہ پیدائش کے آٹھویں دن بچے کو مسجد قطعی میں لے جاکے اُس کا سر منڈاتے اور قربانی کرتے تھے۔ اور اُن کا عقدہ ان خاص طریقوں سے اُس کے لیے برکت کی دعا کیا کرتا تھا۔ یہی طریقہ مسلمانوں میں بھی رسم ابراہیمی اور سنت محمدی کی حیثیت سے آج تک جاری چلا آتا ہے۔ اگرچہ اب ولادت کے بعد آٹھویں دن عقیدے کی قید اٹھ گئی ہے مگر اکثر بچے کی عمر کے پہلے ہی سال میں ہو جایا کرتا ہے۔ اس میں بچے کو نہلا کے نئے کپڑے پہلائے جاتے ہیں۔ اور اسکے بعد اعزاء و احباب کے مجمع میں نائی اُس کا سر منڈاتا ہے۔ اور جیسے ہی وہ سر میں اُسترا لگاتا ہے بچہ اگر لڑکا ہے تو دوڑا اور لڑکی ہے تو ایک بکرا قربانی کیا جاتا ہے۔ منڈ جانے کے بعد سر میں منڈل لگایا جاتا ہے۔ اعزاء و اقارب حسب حیثیت بچے کو کچھ روٹیاں دیتے ہیں۔ قربانی کا گوشت غریب اور اعزاء میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اور گھر میں خوشی کا جلسہ ہوتا ہے۔ اور اُسی قسم کی محفل مرتب ہو جاتی ہے جیسی کہ اور تقریبات میں ہوتی ہے۔

کھیر چٹائی۔ اس تقریب سے بچے کو دودھ کے علاوہ اور غذاؤں کے دینے کا آغاز ہوتا ہے جو اکثر اس وقت ہوا کرتی ہے جب بچہ چار پانچ مہینے کا ہو چکا ہے۔ اکثر گھر دن میں غذا کا آغاز کھیر سے کیا جاتا ہے۔ جو خاص اہتمام سے پکائی جاتی ہے اور خاص طور پر قرابت دار خاتونوں کی موجودگی میں بچے کو چٹائی جاتی ہے۔ جبکہ وہ نئے کپڑے پہنے ہوتا ہے۔ اور سب بیویان ترقی عمر کی دعاؤں کے ساتھ اُسکے ہاتھ میں روپیے دیتی ہیں۔ اور وہی محفل طرب قائم ہو جاتی ہے جو ہر تقریب میں نظر آتی ہے۔

دودھ بڑھائی۔ یہ تقریب اُس موقع پر ہوتی ہے جب بچے کا دودھ پھر لایا جاتا

ہے۔ اس میں عموماً کھجورین پکائی جاتی ہیں تاکہ بچہ اگر دودھ کے لیے منہ کرے تو ہلکے کے طور پر اس کے ہاتھ میں دیدی جایا کریں۔ مگر عموماً رواج ہے کہ اتنی مقدار میں پکائی جاتی ہیں کہ جن جن گھروں سے حصہ داری ہے ان میں تقسیم بھی ہو سکیں۔ دودھ کے چھڑاتے کا عام طریقہ یہ ہے کہ مان یا مرنہ کی چھاتیوں میں پانی میں گھول کے ایلوایا اور کوئی کرٹوی چیز لگا دی جاتی ہے جس کی کرٹواہٹ سے گھبرا کے بچہ دودھ چھوڑ دیتا ہے۔ اور جب پینے کے لیے منہ کرتا اور ہلکے نہیں ہلتا تو پھر ہی کارروائی کی جاتی ہے۔ اور دو ایک دفعہ میں اسے دودھ سے نفرت ہو جاتی ہے۔ دودھ پڑھانی کا زمانہ علیٰ عموم اس وقت ہوتا ہے جب بچہ دو سال کا ہو جائے۔ حقیقت میں بہت رضاعت اڑھائی برس ہیں۔ یعنی اڑھائی برس کے بعد دودھ چھڑانا لازمی ہے لیکن رواج اس سے کم ہی زمانے کا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض عورتیں تین تین چار چار سال دودھ پلاتی رہتی ہیں۔ مگر یہ بات عموماً نفرت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ اس لیے کہ شرع کے خلاف ہے۔ اس تقریب میں بھی جن گھروں کو خدا نے استطاعت دی ہے ان میں بہت اچھی چہل پس ہو جاتی ہے۔ اور نقص و سرود کی محفل گرم ہوتی ہے۔

بسم اللہ۔ یہ تقریب اس دن ہوتی ہے جس روز لڑکے کو پہلے پہل پڑھنے کے لیے بٹھاتے ہیں۔ اور اس کا زمانہ اور دوسے رسوم مروجہ وہ خیال کیا گیا ہے جب بچہ چار سال چار مہینے اور چار دن کا ہو جائے۔ اور اس چار کے عدد سے اس تقریب میں اس قدر خصوصیت پیدا کر لی ہے کہ چار سال چار مہینے چار دن کے بعد چار گھنٹے اور چار منٹ کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے۔ وقت مقررہ پہنچنے کوئی محترم مولوی صاحب یا کوئی بزرگ خاندان لڑکے کو جو ننلا دھلا کے اور نئے کپڑے پہنا کے دولہا بنا دیا جاتا ہے۔ پڑھانے کے لیے لے کے بیٹھے ہیں۔ الٹ بے کی کتاب اس کے سامنے رکھتے ہیں۔ اور بسم اللہ دھلا کے عربی کے دعا ہے، الفاظ "رب شہداء لا تفسد قلوبنا بالخیر" کہلاتے ہیں۔ جن کے معنی یہ ہیں کہ "خداوند آسمان کن اور دشوار نہ کر۔ اور خیریت سے ختم کر۔" پھر الٹ بے کہلاتے بٹھائی تقسیم ہوتی ہے۔



عزیز و قریب لڑکے کو حسبِ توفیق دیتے ہیں۔ اور اُس دن سے اُس کی تعلیم شروع ہو جاتی ہے۔

ختہ۔ یہ بھی سنتِ ابراہیمی اور آلِ ابراہیم کی پرانی اور ضروری رسم ہے۔ اور چونکہ ہندوستان میں صرف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس کا ردِ دانی کے بعد سے لڑکا مسلمان ہو جاتا ہے اس لیے اس رسم کا عام نام ہی مسلمان "پڑ گیا ہے۔ اس میں بچے کے عضو مخصوص کے منہ پر کی کھال کاٹ لی جاتی ہے۔ جس کا کاٹنا طبی اور ڈاکٹری اصول سے بھی بعض امراض و شکایات سے بچنے کے لیے نہایت مفید ہے۔ یہ ایک قسم کا آپریشن ہے جس کو ہمارے قدیم سرجن (جراح) جو عموماً دانی ہوتے ہیں نہایت خوبی اور غیر معمولی پھرتی سے انجام دیتے ہیں۔ انکو اچھا معائنہ اور دعام دیا جاتا ہے۔ اور اس رسم کے انجام دیتے وقت مردانے میں اکثر اعزاء و احباب بلائے گئے ٹھہرائے جاتے ہیں اور زنانے میں ہمالیہ بچوں کا مجمع ہوتا ہے۔ ختہ ہوتے ہی ٹھکانی تقسیم ہوتی ہے۔ جن کو استطاعت ہوتی ہے دعوت کرتے ہیں۔ اور پھر اُس روز خوشی کی تقریب ہوتی ہے۔ جب زخم اچھا ہونے کے بعد لڑکا غسلِ صحت کرے۔ اکثر غانڈانوں اور دستِ مراد والے گھرانوں میں اس روز لڑکا دو لھانیاں لٹکا کر پوچھا یا جاتا ہے۔ اور برات بڑے جلوس اور دھوم و دھام کے ساتھ کسی درگاہ میں جاتی ہے جہاں چار اور سٹھائی چڑھا کے لڑکا اُسی خان سے گھر واپس آتا ہے۔ جہاں خوشی کے چیمے اور عیش و شادمانی کے جلسے نظر آتے ہیں اس رسم کے ادا ہونے کا زمانہ مختلف ہے۔ بعض لوگ چھٹی یا چھٹھ ہی میں بچے کا ختہ کرا دیتے ہیں۔ مگر عام رواج اُس وقت ہے جب لڑکا چھ سات برس کا ہو جائے۔

ایک اور تقریب روزہ کشائی کی بھی ہے۔ یہ اُس وقت ہوتی ہے جب لڑکا یا لڑکی نو دس برس کی عمر کو پہنچ جائے۔ اور اُسے پہلے پہل روزہ رکھوایا جائے۔ اس میں علی العموم بہت سے روزہ داروں کی دعوت کی جاتی ہے جن کے لیے کثرت سے افطار دیاں تیار کی جاتی ہیں۔ اور لڑکا اُن کے ساتھ بیٹھ کے افطار

کہتا ہے۔ اور لڑکی ہے تو زمانے میں جہان روزہ دار یونیون کے ساتھ روزہ کھوتی ہے۔ اس میں گانا سجانا کم ہوتا ہے۔ مگر شوقین اور نکلین مزاج لوگوں کے لیے یہ جہان بھی محفلِ رقص و سرود گرم کرنے کے واسطے کافی ہو جاتا ہے۔

اسی قسم کی کارروائیاں نسلِ صحت کی تقریبوں اور منتِ مراد پوری ہونے کے موقعوں پر ہوا کرتی ہیں۔ اور ہوا اُن خاص باتوں کے جو اُس تقریب سے تعلق رکھتی ہوں باقی سب باتیں اُن میں بھی وہی ہوتی ہیں جو اور تقریبوں میں بیان کی گئیں۔

سب سے بڑی اور اہم تقریب شادی یا عقد نکاح ہے۔ یہ وہ ضروری تقریب ہے جس کی بے اعتدالیوں کی بدولت سیکڑوں خاندان تباہ و برباد ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ خوشی کے جوش اور شاہد آرزو سے ہلکار ہونے کی محویت میں کسی کو نہ اپنی حالت و استطاعت کا خیال رہتا ہے نہ اپنے انجام و مال کا رکا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرض لے کے۔ جائیدادیں بیچ کے۔ دوستوں اور عزیزوں سے مانگ کے۔ یا جس طرح کوئی رقم مل سکے فراہم کر کے اراکین پوری کی جاتی ہیں۔ اور شادی کے ختم ہوتے ہی یہ حالت ہوتی ہے کہ اکثر گھروں میں فاقے کی نوبت آ جاتی ہے۔

شادی اور نکاح چونکہ انسانی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے اس لیے اسکو ہم ذرا زیادہ تفصیل و تشریح سے بیان کرنا چاہتے ہیں۔ شادی کی نسبت اکثر مشاطاؤں کے ذریعے سے ٹھہرتی ہے۔ ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں خصوصاً اُن میں جہاں اگلے دن سے ترقی کی تھی عورتوں کا ایک خاص پیشہ ہے مشاطہ گری۔ شعر کے کلام اور لغت میں مشاطہ اُس عورت سے مراد ہے جو مالی مرتبہ قاتون کے لنگھی چٹی کرتی۔ کپڑے اور زیور بھجاتی۔ اور اُنھیں بنا چُنّا کے سوار تھی اور راستہ کرتی ہے۔ مگر سوسائٹی میں مشاطہ اُن عورتوں کو کہتے ہیں جو شادی کے پیام لیجاتی۔ نسبتیں ٹھہراتی اور شادیوں کراتی ہیں۔ غالباً اس پیشے کی ابتدا اُنھیں عورتوں سے پڑی جو حسینوں کو بنایا سوار کرتی ہیں اور آخر میں شادی ٹھہرانے والی عورتوں کا نام مشاطہ پڑ گیا۔ یہ بڑی چالاک

اور مسکاح و عورتیں ہوا کرتی ہیں۔ ہر لڑکے کا پیام جب کسی گھر میں لیجاتی ہیں تو اسکی دوستدوستی، تعلیم، سعادتمندی، خوش اخلاقی اور خوبصورتی کی اس قدر نظر کرتی ہیں کہ لڑکی والوں کی نظر میں اُسے منوی میر حسن کا شاہزادہ بنے نظیر ثابت کیے بغیر دم نہیں لیتی ہیں۔ اسی طرح جب کسی لڑکی کی بات لڑکے والوں کے بیان لے جاتی ہیں تو اُسکے حسن و جمال، ناناؤ و انداز، اور خوبی و رعنائی کے بیان میں ایسے قلمیہ یا مذہب دیتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے جس لڑکی کا ذکر کر رہی ہیں وہ انسان نہیں کہ وہ قاف کی بری یا شاہزادی بدرمشیر ہے۔

مشاطہ کی پیام رسائوں نے بعد اگرچہ تحقیق و جستجو مرد ہی کرتے ہیں مگر نسبت ٹھہرنے میں زیادہ دخل و دونوں گھروں کی عورتوں ہی کو ہوا کرتا ہے۔ جو اپنا اطمینان کر کے مردوں کی رضا مندی حاصل کرتی ہیں۔ اور نسبت ٹھہر جاتی ہے۔ دونوں خاندانوں میں بچوں کے پیدا ہونے ہی اسان بھری مائیں نسبت ٹھہرا لیا کرتی ہیں اُن کے لیے مشاطہ کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ بلکہ دولہا کو بے غل و غمٹن ٹھیکے کی منگی دھن مل جاتی ہے۔ اور شادی سے پیشتر کی رہیں جن کو نسبت ٹھہرنے سے تعلق ہے اُن کی نسبت نہیں آتی۔ گویا پیدا ہونے ہی منگی ہو جاتی ہے۔

نئے گھروں میں جب پیام جاتا ہے تو اکثر لڑکا اپنے چند عزیزوں اور خصوص دوستوں کے ساتھ "بدو کھوآ" کے نام سے دولہن والوں کے وہاں بلایا اور ایسی جگہ بٹھایا جاتا ہے جہاں سے عورتیں بھی اُسے تاک جھانک کے دیکھ سکیں گھر والے مرد جمع ہو کے اُس سے ملتے اور حسبِ حیثیت خاطر مدارات کرتے ہیں۔ اسی طرح لڑکے کی ان بہنیں ایک مقررہ تاریخ پر دولہن کے گھر میں جاتی اور مٹھائی کھلاتے یا کسی اور پھانسی سے دولہن کا چہرہ دکھاتی ہیں جو عام طور پر اُن سے چھپائی اور پردے میں رکھی جاتی ہے۔ مگر بعض شریف گھروں میں دولہا نہیں بلایا جاتا بلکہ خاندان کے مرد کسی نہ کسی عنوان سے لڑکے کی لاطنی میں اُسے دیکھتے اور اُس کا حال دریافت کر لیتے ہیں۔ اور انہیں لڑکی کی حالت کا بھی پتہ لگایا جاتا ہے۔

ان طریقوں سے جب لڑکے والے لڑکی کو اور لڑکی والے لڑکے کو پسند کر لیتے ہیں میں میں صورت شکل - حالت و حیثیت کے علاوہ شرافت خاندان کو بھی بہت کچھ دخل ہوتا ہے تو سنگنی کی رسم گل میں آتی ہے - اُس میں دولہا کی طرف سے مٹھائی جاتی ہے - پھولوں کا گنا جاتا ہے اور ایک سوئے کی انگوٹھی جاتی ہے جسے بعض گھراؤں میں دولہا کی عزیز عورتیں خود جاکے پھیلاتی ہیں - سنگنی کی رسم ادا ہو جانے کے بعد سمجھا جاتا ہے کہ نسبت ٹھہر گئی - اور اُس وقت سے دونوں جانب ہنول ہو جاتا ہے کہ جب کوئی تقریب ہو تو سمدھیانے میں خاص اہتمام سے حصے ہائیں - اور جو حصہ لڑکے یا لڑکی کے لیے ہوتا ہے وہ بڑا ہوتا ہے اور خصوصیت کے ساتھ مشین و با وقت بنا دیا جاتا ہے - اسی اثنا میں اگر حرم آگیا تو دونوں جانب سے اہتمام اور تحفے کے ساتھ گولٹا - الائجیان - چکنی ڈولیان - اور اعلیٰ درجے کے کارچوی اور ریشمی بڑے سمدھیانے میں بھیجے جاتے ہیں -

رات یعنی نکاح کے دن سے چند روز پہلے دولہن مابچھے بیٹھا دی جاتی ہے جبکہ اُسے مابچھے کا زرد جوڑا پھایا جاتا ہے - اُس وقت سے روز اُس کے بیٹا لگتا ہے - اور بچہ خاص ضرورتوں کے وہ پردے سے باہر نہیں نکلتی جس دن وہ مابچھے بیٹھتی ہے اُسی روز رسم ہے کہ اُس کا جھوٹا بیٹا - اُسکی جھوٹی ہندو معری کا کوزہ - اور بہت سی پیٹیاں ایک شاندار جلوس اور باجے کے ساتھ دولہا کے گھر بھیجی جاتی ہیں - جو پیٹیاں خاص دولہا کے لیے ہوتی ہیں وہ جدا جدا خانوں میں ممتاز و مخصوص ہوتی - اُنہیں کے ساتھ دولہا کے لیے مابچھے کا زرد بھاری جوڑا - ایک رنگی ہوئی نقش چوکی - اور گولٹا - گولٹا بھی ہوتا ہے - گولٹا کٹورا چوکی پر ٹاڑے سے کس کے ہاتھ دیے جاتے ہیں - اور جلوس میں یہ چیزیں اس ترتیب سے ہوتی ہیں کہ باجے والوں اور جلوس کے بعد سب کے آگے چوکی ہوتی ہے - اُسکے بعد خانوں میں دولہا کی مخصوص چیزیں ہوتی ہیں جو عموماً کچے لمباؤں میں رکھی ہوتی ہیں - اور اُن کے بعد بہت سے خانوں میں عام قسم کی پیٹیاں ہوتی ہیں - دولہن کی چھوٹی بہنیں اور ڈومیاں فینس اور ڈولہوں پر

سوار ہو کے جاتی ہیں۔ جو دو لہا کے گھر پونچ کر ایک پینڈی اور مصری کے سات  
سات سات ٹکڑے کر کے وہ سب ٹکڑے دو لہا کو ڈھکا ڈھکا کے کھلاتی ہیں۔  
اس رسم کی نسبت قیاس کیا جاتا ہے کہ خالص ہندی رسم ہے جس کو نہ عربی  
تعلق ہے نہ عجم سے۔ اس لیے کہ مانجھے اور اُس کے ساتھ کنگنے کی ابتدا ہندوستان  
کے سواروں کی جگہ نہیں ثابت ہوتی۔

مانجھے کے دس بارہ روز سے زیادہ زمانہ گزرنے کے بعد اُسی شان و  
شوکت اور جلوس کے ساتھ دو لہا کے گھر سے دولہن کے یہاں سناپن جاتی ہے۔  
سناپن ترکی لفظ اور ترکی رسم ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ترک و نقل اس رسم  
کو اپنے ساتھ ہندوستان میں لائے۔ اس میں دو لہا کے یہاں سے دولہن کے  
لیے چڑھاوے کا جوڑا جاتا ہے جو عموماً بہت بھاری اور کار چوبی ہوتا ہے۔ اس کے  
ساتھ دولہن کے لیے سہری سفیش کا سہرا۔ چاندی کا پھلّا۔ سونے کی انگوٹھی۔  
دو ایک اور چیزیں ہوا کرتی ہیں۔ اور وہ زیور ہوتا ہے جس کو پٹھا کو چھت  
کی جائے گی۔ اور پھولوں کا گنا ہوتا ہے۔ جوڑے کے ساتھ شکر کے نقل شکر  
کے قرص۔ اور سیوہ جاتا ہے۔ سناپن کے لیے خاص اہتمام سے سفیش اور  
رنگین گھرے تیار کرائے جاتے ہیں۔ پھر بانس اور کاغذ کے رنگا رنگ تختوں  
میں چار چار گھرے لگا کے جو گھرے بنادے جاتے ہیں۔ اور دولہندی و امارت  
کی شان کے مناسب ان جو گھروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ اور اکثر سیوہ  
دو دو سو کے شمار کو پونچ جاتے ہیں۔ مگر اُن کے اندر چند گنتی کے نقلوں یا پاؤ  
آدھ سیر شکر کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اُن کے منہ گروں پر عموماً سوہے کا کپڑا ناڑے  
سے بندھا ہوتا ہے۔ اور جلوس میں اُن سب گھروں کے آگے چاندی کی ایک  
دہی کی منگی دہی ہے جس میں دہی بھرا ہوتا ہے۔ اور اُس کے منہ پر بھی سوہا  
ناڑے سے بانڈ دیا جاتا ہے۔ اور اُس کے گلے میں مبارک قالی کے لیے دو ایک  
چھلیاں بھی بندھی ہوتی ہیں۔ یہ چیزیں جب دولہن کے گھر پہنچتی ہیں تو اعزاء  
و اقارب میں تقسیم ہوتی ہیں۔

سآپنچ کے دوسرے ہی روز شب کو دولہن کے گھر سے بڑے جلوس اور روشنی کے ساتھ منہدی جاتی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ قالیبا یہ عربی الاصل رسم ہے۔ اس میں دراصل دولہن والوں کی طرف سے دولہا کے لیے وہ جوڑا جاتا ہے جسے پن کر وہ بیاہنے کو آئے گا۔ اس جوڑے میں علی الموم قدیم عہد مغلیہ کے درباری وضع کا خلعت۔ شلہ۔ جینہ۔ سرپچ اور مرہن کلتی ہوتی ہے۔ نصیب ہوا تو اس کے ساتھ موتیوں کا ہار بھی بھینچا جاتا ہے۔ مذکورہ چیزوں کے علاوہ دیشی پانچامہ اور جوتا وغیرہ معمولی چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ اکثر ایک طلانی انگوٹھی بھی جاتی ہے۔ اس جوڑے کے ساتھ دولہا کے لگانے کے لیے پسپی ہوئی تیار منہدی بھی بھینچی جاتی ہے۔ جس کو بہت سے طباقون میں پھیلا کے رکھتے ہیں۔ اور اس میں سبز و سرخ شمعوں کو نصب کر کے روشن کر دیتے ہیں۔ اس طرح کے منہدی کے بہت سے طباق روشن ہوتے ہیں جو منہدی کے جلوس میں ایک خاص شان اور آن بان پیدا کر دیتے ہیں۔ منہدی کے اُن روشن طباقون کے ساتھ سو پچاس طباقون میں لمبیدہ ہوتا ہے جو خرمون کو کوٹ کے بنایا جاتا ہے۔ اور جیسی حیثیت ہوتی ہے اُسی کے مناسب کثرت سے بھیجا جاتا ہے۔ اس موقع پر جوڑے کے ساتھ دولہا کے لیے سونے کا سہرا بھی بھینچا جاتا ہے۔

منہدی کے دوسرے دن دولہا کی طرف سے برات جاتی ہے۔ برات جانے کا اگلا ضروری وقت پہر رات ہے یعنی تین بجے شب کا تھا۔ لیکن اب یہ وقت اکثر چھوٹتا جاتا ہے۔ اور بجائے پہر رات رہنے کے پُردن چڑھے یعنی نو دس بجے صبح کو براتین جانے لگی ہیں۔ اس تاخیر کی ابتداء واجد علی شاہ آخری بادشاہ اودھ کے زمانے سے ہوئی۔ اُن کی برات جانے میں اتفاقاً تاخیر ہو گئی اور دن نکل آیا تھا۔ لوگوں نے آسانی اور روشنی کے سامان کی تحفیف کے خیال سے اُسی وقت کو اختیار کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اب عموماً ابتداء روز میں برات جاتی ہے اور دوپہر کو عقد ہو جاتا ہے۔

برات میں حتی الامکان پورا جلوس جمع کیا جاتا ہے۔ مروجہ تین باجے

یعنی پرانا ڈھول تاشے اور چھانچھین۔ روشن چوکی۔ اور ارگن باجا۔ ضرور ہو  
ہیں۔ اس سے ترقی ہوئی تو گھوڑوں پر غوثیت۔ نقارہ۔ جھنڈیاں۔ برقعے بردا  
ہاتھی۔ اونٹ۔ گھوڑے۔ اور اس سے بھی زیادہ حوصلہ ہوا تو انھیں باجون  
کے متددگر وہ بڑھادیے جاتے ہیں۔ دولہا وہی جوڑا ہیں کے جو منہدی کے  
ساتھ آیا تھا۔ اور سہرا باندھ کے علی العموم گھوڑے پر اور اعلیٰ طبقے کے امرا کے  
پہان ہاتھی پر سوار ہو کے سارے جلوس اور باجون کے پیچھے آہستہ آہستہ غوثیت  
دو قار سے روانہ ہوتا ہے۔ دولہا کو "نوشہ" یعنی نیا بادشاہ کہتے ہیں۔ اور خیال  
بھی یہی ہے کہ دولہا ایک دن کے لیے بادشاہ بنا دیا جاتا ہے۔ مگر غور طلب یہ امر  
ہے کہ جب دولہا کو بادشاہ بناتے ہیں تو اس کے سر پر شہد کیون ہوتا ہے؟ تاج  
کیون نہیں پہناتے؟ اس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ہندوستان میں  
مسلمان سربراہ تاج نہیں پہنتے تھے بلکہ سب کے سر دن پر کھنی دار شعلے ہوتے  
تھے۔ انگریزوں نے غازی الدین حیدر کے زمانے سے شاہان اودھ کو تاج  
پہنا دیا۔ مگر وطنی سوسائٹی نے اس تاج کو قبول نہیں کیا۔ اور اپنے بادشاہوں  
کی وضع وہی رکھی جو پرانی تھی۔ اور اسی نمونے کا بادشاہ اپنے نو شاہوں کو  
بناتے ہیں۔ دولہا کے پیچھے فیتھون اور ڈولون میں سوار دولہا کی ماں بہنیں  
اور عزیز و قریب عورتیں اور ڈولون میں ہوتی ہیں۔ چلتے وقت گھر میں جو صدیا  
رسمیں اور ٹوٹے ہوتے ہیں بہت ہیں۔ مختلف ہیں۔ اور لغو ہونے کی وجہ سے زیادہ  
قابل لحاظ بھی نہیں۔

اس شان سے جب رات دولہن کے گھر پہنچتی ہے تو عموماً اس وقت دولہن  
نہلائی جا چکی ہے۔ اور اس کے غسل کا پانی باہر لا کے دولہا کی سواری کے گھوڑے  
یا ہاتھی کے پانوں کے نیچے ڈال دیا جاتا ہے۔ دولہن کو غسل سات دن کے  
پاسی ٹھنڈے پانی سے دیا جاتا ہے۔ جو گھس کا پانی کہلاتا ہے اور جاڑوں کے  
موسم میں غریب دولہن کے لیے اس پانی میں نہانا قیامت سے کم نہیں ہوتا چوکی  
پر پان بچھا کے وہ نہلائی جاتی ہے۔ اور یہی پان اس کہیں پانوں والے بیڑے میں  
شامل ہوتے ہیں جو سب سے پہلے سسرال میں کھلایا جاتا ہے۔

اب دولہا سواری سے اتر کے زنانے میں جاتا ہے۔ وہاں رشتی ٹنگھائی جاتی ہے۔ اور طرح طرح کی میسیوں اور سین گل میں آتی ہیں جو ہر گروہ اور ہر خاندان میں جدا جدا اور عجیب و غریب ہوتی ہیں۔ یہ وقت علی العموم وہ ہوتا ہے جب دولہن نہا تو چلتی ہے مگر ابھی کپڑے نہیں پچھائے گئے ہوتے ہیں۔ وہ ایک چادر میں لپیٹی ہوتی ہے۔ اور اُس کے ہاتھ پر مصری رکھ کے دولہا کو کھلائی جاتی ہے۔ جس میں سالیان۔ زندہ دل عورتیں۔ اور ڈومنین قیدین بڑھا بڑھا کے دولہا کے لیے ہر کام مشکل کر دیتی ہیں۔

شادی کی یہ پہلی منگوائی ہے کہ دولہا باہر مردانے میں آتا ہے جہاں بزم نشاط مرتب ہوتی ہے۔ اور اوجا بپ پر تکلف کپڑے پہنے قرینے سے صاف ستھری درمی چاندنی اور قالینوں کے فرش پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ اور سامنے مردانہ یا زنانہ طاقتہ کھڑا کرتا ہوتا ہے۔ عین محفل کے درمیان میں اور صد مقام پر دولہا کے لیے زرنکار سند تکیہ ہوتا ہے جس پر دولہا کو اُس کے ہم عمر لڑکے لاکے بٹھا دیتے ہیں۔ اور اُس کے دونوں طرف خود بیٹھ جاتے ہیں۔ تاکہ دولہا اُن کے ساتھ آزادی سے باتیں کر سکے۔

دولہا کے لیے لازم ہے کہ اپنی ہر وضع۔ ہر حرکت سے شرمیلان ظاہر کرے۔ وہ بے تکلف باتیں کر سکتا ہے۔ نہ کوئی اُس کی آواز سن سکتا ہے۔ نہ کسی سے وہ بے تکلفی سے مل جاتا ہے۔ نہ پھر سہرا ہوتا ہے۔ اور پھر سونے کے سہرا پر پھولوں کا سہرا باندھ کے اس قابل نہیں رکھا جاتا کہ کوئی بغیر کوشش اور پورے ہمت کی محنت کے اُس کی صورت دیکھ سکے۔ محفل نشاط میں بیٹھنے بلکہ اکثر عقد ہوجانے کے بعد سہرا اٹھا کے شے میں لپیٹ دیا جاتا ہے تاکہ چہرہ کھل جائے۔ مگر اب بھی اُس کے لیے لازم ہے کہ ایک ہاتھ سے منہ پر رومال رکھے رہے جو اظہار شرم کی ایک علامت ہے۔ اور اب چہرہ کھلنے کے بعد بھی اس رومال کی وجہ سے اسکی صورت دیکھنے کے شایعین کو بغیر دیکھ سکے اس فکر میں لگے رہنے کے کامیابی نہیں ہو سکتی۔

دولہا کے باہر آکر تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد عقد نکاح کا اتمام ہوتا ہے



جس کے لیے پیسہ بھیڑا کیا گیا ہے۔ اگر شیعہ خاندان کی شادی ہے تو وہ مجتہد صاحب  
تشریف لاتے ہیں ایک لڑکے کے نائب و وکیل بن کے اور دوسرے لڑکی کے  
نائب و وکیل بن کے۔ لڑکی والے خود پردے کے پاس جا کے یا عادل شاہدوں  
سے تصدیق فرما کے لڑکی کی شرعی مختاری حاصل کرتے ہیں اور اس کے بعد  
دو دن دولہا کے سامنے بیٹھ کے دولہا دولہن کی جانب سے قرأت و صحبت  
مختار سے ایجاب و قبول کے بیٹھ ادا کرتے ہیں۔ اور اگر خاندان سنی ہے تو  
کوئی محترم مولوی صاحب اور اگر کوئی گھانڈن ہو تو وہاں کے مقررہ خاندانی قاضی  
صاحب اس کے نکاح پڑھاتے ہیں۔ جس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکی کے عزیز وں میں  
سے کوئی صاحب اس کے وکیل و مختار بن کے آتے ہیں اور وہ شاہدوں کو پیش  
کرتے ہیں کہ فلاں لڑکی نے مجھے اپنا وکیل بن دو دن شاہدوں کے سامنے مقرر  
کیا اور مجھے اپنے عقد کا اختیار دیا۔ قاضی صاحب ان شاہدوں پر اطمینان  
کر کے اور مقدار ہر کو ان وکیل صاحب سے دریافت کر کے دولہا کو کلمہ شہادت  
پڑھاتے مسلمان کے لیے جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے ان کا عربی میں  
اقرار کرتے۔ اور اسکے بعد تین بار اس سے یہ کہہ کے کہ فلاں لڑکی کے ساتھ  
اتنے ہر پرچہ میں نے تمہارا عقد نکاح کر دیا۔ دولہا سے اقرار کرتے ہیں کہ میں نے  
قبول کیا۔ اسکے بعد ایک دعا یہ خلیہ پڑھ کے لوگوں سے کہتے ہیں "مبارک"  
ساتھ ہی مبارک سلامت کا صلہ ہوتا ہے۔ نقل اور چھو ہارے جو سینہ بون میں  
بھروسے سامنے رکھے ہوتے ہیں انکو حاضرین میں لگا دیتے ہیں۔

مجتہد یا مولوی صاحب کے آنے کے وقت گانا بجانا موقوف ہو جاتا ہے  
اور بعد عقد مولوی صاحب چلے جاتے ہیں تو پھر رقص و سرود کی محفل گرم ہو جاتی  
ہے۔ اور اس کے بعد دولہا پھر اندر زمانے میں بٹایا جاتا ہے۔ عورتوں کی دنیا  
میں رسوم اور شرائط عقد کے اصلی لوازم کے بجالائے کا خاص ہی وقت ہے۔  
زمانے میں اس موقع پر رسوم نکاح کے ضمن میں دولہا کے ساتھ ہر قسم کا شہز  
کیا جاتا ہے۔ اور اس کے پریشان کرنے میں کوئی کارروائی اٹھانے کی جاتی  
ان تمام رسوم کی بجالائے والی سالیان اور ڈونیاں ہوتی ہیں۔ ذرا تعذیب ناگذا

نوجوانوں کے لیے شادی ایک بڑا سرا لاج (فرمان خانہ) ہے جس میں بیسویں  
ایسے مراحل پیش آتے ہیں جو اُسکے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ دولہن  
اور بھلپٹ کے ایک غیر متحرک گھڑی کی طرح اُسکے سامنے لاکے رکھ دیجاتی ہے۔  
ابھی تک اُسے رخصتی کا جوڑا نہیں پھایا گیا ہوتا۔ لاتے وقت کوشش کیجاتی ہے  
کہ پہلی آمد میں دولہن کی ایک لات دولہا کے پٹ چائے۔ پھر ٹھٹھنے لگے جاتے  
ہیں۔ دولہا سے بیوی کی غلامی۔ ذلیل ترین غلامی۔ اور خدا جانے کیسی  
خدایتیں بجالانے کا اقرار کرایا اور وعدہ لیا جاتا ہے۔ اسکے بعد آرسی مصحف کی  
رسم ادا ہوتی ہے۔ جس کے لیے دولہا دولہن کے درمیان محل پر قرآن شریف  
اور اس پر آئینہ رکھا جاتا ہے۔ اور اُس آئینے میں دولہا کو دولہن پہلا جلوہ  
دکھایا جاتا ہے۔ گمراہ زمہ کہ چہرہ دیکھنے سے پہلے دولہا سورہ اخلاص پڑھ لے۔  
اس جلوے میں دولہن آنکھیں بند کیے رہتی ہے۔ عورتیں دولہا سے آنکھیں  
کھولنے کے لیے طرح طرح کی التجائیں کرتی ہیں۔ اور اسی سلسلے میں ہر قسم کی  
اطاعت و غلامی کا اُس سے اقرار کرا لیتی ہیں۔ بڑی شکون اور خوشامدوں  
کے بعد دولہن آنکھیں کھول کے ایک نظر دیکھتی اور پھر آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ اور  
اسی پر رسوم کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اب دولہا باہر رخصت کر دیا جاتا ہے کہ دولہن کو کپڑے پھائے جائیں زیور  
پنھایا جائے۔ بنائی سواری اور سسرال جانے کے لیے تیار کی جائے۔ اس وقت  
ڈونیاں بابل یعنی رخصتی کا نغمہ جان گداڑ گاتی ہیں۔ اور خوشی کا گھڑا مقرر کردہ  
بجاتا ہے۔ جب دولہن بنا چٹنا کے تیار کر دی جاتی ہے اس وقت سبکے کے تمام  
عزیز دوست اور سب ملنے والے آتے۔ رورو کے دولہن کو رخصت کرتے۔ اور  
جو کچھ توفیق ہو روپیہ یا زیور اُسے دیتے ہیں۔

(۴۷)

اسی اثنا میں جینر کا سامان نکالا جاتا ہے۔ اُس کی فرد لاکے دولہا والوں  
کے سامنے پیش کر دی جاتی ہے۔ جس میں وہ تمام زیور۔ جوڑے۔ خروٹ۔  
پلنگ۔ اور چوکی اور جو کچھ چیزیں دی جائیں درج ہوتی ہیں۔ تمام چیزوں

کا فہرست سے مقابلہ کر لیا جاتلے۔ اور اب دولہن رخصت ہونے کے لیے بالکل تیار ہوتی ہے۔ اُس کا لباس کوئی بھاری کامدار جوڑا نہیں ہوتا ہے بلکہ ایک سوہنے یعنی ٹول پر کی تزیین کا کمرٹا اور سادہ ریشمی پانچامہ پہنے ہوتی ہے۔ اور امن میں بھی سادگی کا اس قدر لحاظ رہتا ہے کہ گوٹ تک نہیں لگائی جاتی۔ اور اڑے کا اڑا ہوا ہوتا ہے۔

اُس کے سنگار اور کپڑے پھانے کے وقت ڈومنیان "بابل" یعنی سیکا چھوٹے کا راگ لگاتی رہتی ہیں جو نہایت ہی پُر حسرت اور جگرگداز ہوتا ہے۔ ایک عجیب رنج و الم کا سامان بندھ جاتا ہے۔ ہر شخص لول و حزن ہوتا ہے۔ تمام اعزاء ملنے والے اور خاندان کے دوست احباب مل مل کے اور سوز و گداز کے الفاظ کے ساتھ لڑکی کو رخصت کرتے ہیں۔ وہ خود زار و قطار روتی ہوتی ہے۔ اور فینس ڈیوڑھی میں لگا دی جاتی ہے۔ اُس وقت دولہا پھر اندر بلایا جاتا ہے کہ آگے اپنی دولہن کو بے جائے۔ وہ آتا اور دولہن کو اپنی گود میں اٹھا کے فینس میں بٹھا دیتا ہے۔ رخصت سے پہلے زمانے میں دولہا کو سلام کرانی دی جاتی ہے۔ اور تمام

اعزاء و اقارب۔ دوست احباب بقدر حیثیت دیتے ہیں۔ اسی وقت باہر شربت پلائی ہوتی ہے۔ جس میں شربت کا کنٹر اور گلاس فقط رسم کے طور پر لایا جاتا ہے پتیا کوئی نہیں۔ مگر تمام حاضرین محض شربت کی حقانی میں سب حیثیت و توفیق روپیہ ڈالتے ہیں۔ اور اس طرح اندر باہر جو کچھ روپیہ سلام کرانی اور شربت پلائی میں جمع ہوتا ہے دولہا کو دے دیا جاتا ہے۔

اب برات اُسی دھوم دھام اور اُسی شان و شوکت سے دولہا کے گھر کی طرف واپس روانہ ہوتی ہے۔ واپسی کے اس جلوس میں جو اضافہ ہوتا ہے اُس میں سب سے پہلے تو دولہن کی فینس ہے جو دولہا کے گھوڑے کے آگے رہتی ہے۔ اور نہایت ہی ممتاز ہوتی ہے۔ پُر تحلف چھٹکا پڑا ہوتا ہے۔ دونوں جانب کھاریاں چھٹکے کو پکڑے ہوئے ساتھ رہتی ہیں۔ اور گرد دولہا کے لازمات یا مخصوص لوگوں کا ہجوم رہتا ہے۔ اور دولہا کے بعد پھراور سب ساتھ والی عورتوں کی فینسین رہتی ہیں۔

سب سے زیادہ نمایان چیز اس جلوس میں جھنڈ کا سامان ہوتا ہے۔ یہ سب سامان سارے جلوس اور بایجے والوں کے پیچھے اور دولہن کی فینٹ کے آگے اس ترتیب سے جاتا ہے کہ تانبے کا ایک ایک برتن ایک ایک چنگیر میں رکھا ہوتا ہے اور ایک مزدور کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ چینی اور شیشے کے ظروف کشتیوں میں لگے ہوتے ہیں۔

... .. ان کے بعد صندوق وغیرہ ہوتے ہیں جن میں دولہن کے چوڑے ہوتے ہیں۔ ان کے بعد پلنگ ہوتا ہے جس میں لٹھی تو شگ۔ لحاف تلجے۔ چار۔ سب سامان تیار موجود ہوتا ہے۔ اور کچھو نا لٹھی ڈوریوں سے پائیوں میں بندھا ہوتا ہے۔ اور ڈوریوں کے دونوں سروں پر خاص وضع کے نقرہ گتھے لگتے ہوتے ہیں۔ لڑکی کو معاشرت کا تمام سامان دیا جاتا ہے۔ آئینہ، کنگھی، سنگھار کی ضروری چیزیں تیل عطر۔ اور اگر استطاعت ہو تو چاندی کا پاندان۔ خامدان۔ لٹھا۔ کٹورا۔ اور بعض اور چیزیں دی جاتی ہیں۔ بہر حال یہ سب سامان باجون اور رات کے جلوس اور دولہا کے درمیان میں رہتا ہے اور سب کے پیچھے ڈولہن پر کھائے کی دینیں ہوتی ہیں۔ یہ ہونے کا کھانا کھاتا ہے جس کو عموماً لڑکی والے دولہا کو دیتے ہیں۔

اس شان سے جب رات دولہا کے گھر پہنچتی ہے تو خوشی کے شادیانے بجاتے ہیں۔ ڈولہن پہلے سے ہونچ کے بٹڑے کا ناشروع کرتی ہیں۔ جو خاص شادی کے گیت ہیں۔ اور اس مبارک سلامت کے زور و شور میں دولہن اتاری جاتی ہے۔ بعض خاندانوں میں یہاں بھی اسے دولہا ہی گو دین لے کے اتارتے ہیں اور بعض گھرانوں میں دولہا کی ان ہنہیں آ کے اتارتی ہیں۔ اندر سے لیچا کے بٹھاتے ہی دولہا سے اسکے دامن پر نماز شکرانہ پڑھائی جاتی ہے۔ دولہن کے پاؤں دھلا کے پانی مکان کے چاروں کونوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ روغنائی ہوتی ہے۔ جس میں تمام عورتیں اور عزیز مرد جی کھول کھول کے روپیہ یا زیور دیتے ہیں۔ اور منہ کھول کھول کے اسکی صورت دیکھتے ہیں۔

اس نئے گھر میں یہ پہلی رات دولہن کے لیے نہایت سخت پابندیوں اور

شریے پن سے بسر کرتے کی رات ہوتی ہے۔ نہ وہ کسی سے بول سکتی ہے نہ باتیں کر سکتی ہے۔ نہ کسی کو آنکھ بھر کے دیکھ سکتی ہے۔ سو اسٹیک کی ساتھ والیوں کے اور کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اور اسی عیبت سے بچانے کے لیے صبح ہوتے ہی اُس کا بھائی یا اور کوئی رشتہ دار چوتھی لینے کو آ پونچتا ہے۔ اور جہاں تک بتاتا ہے سویرے ہی سوار کرا لے جاتا ہے۔ اس مرتبہ بھی دولہن اگرچہ امتیاز اور شان سے جاتی ہے۔ مگر جلوس اور باجے کی ضرورت نہیں۔ دولہا بھی دولہن کے ساتھ جاتا ہے۔ اور اُس کے ساتھ سات طرح کی ترکاریاں اور سات قسم کی مٹھائیاں جاتی ہیں۔

دن گذر کے اُسی رات کو دولہن کے گھر میں چوتھی کھلی جاتی ہے۔ دولہن کو وہ ہر کا جوڑا اُتار کے چڑھا دے گا جوڑا پٹھایا جاتا ہے جو سب جوڑوں سے زیادہ بھاری کامدار اور نہایت ہی پر تکلف ہوتا ہے۔ یہ جوڑا پٹھانے کے اُس کا خوب بناؤ چٹاؤ کیا جاتا ہے۔ دولہا کی طرف سے اُسکی بہنیں اور رشتہ دار عورتیں بھی آ جاتی ہیں۔ اور اُس مجمع میں دولہا دولہن مٹھائی سے اور دولہا کی ساتھ والیاں اور دولہن والیاں ترکاری اور پھولوں کی چھڑیوں سے باہم لڑتی ہیں۔ یعنی مٹھائی اور ترکاریاں ایک دوسرے کے پھینچ پھینچ کے مارتی۔ اور چھڑیوں کے ہاتھ رسید کرتی ہیں۔ کبھی دگی دگی میں لڑائی تیز بھی ہو جاتی ہے۔ اور بعض عورتیں خفیت سی چوٹ بھی کھا جاتی ہیں۔

چوتھی کے دو چار روز بعد پھر دولہن دولہا کے گھر میں آتی ہے۔ اور اُسکے بعد علی العموم چار چالے ہوا کرتے ہیں۔ چالے کا لفظ چال اور چلنے سے نکلا ہے مطلب یہ ہے کہ دولہن اپنی سسرال سے بلائی جاتی ہے۔ مگر یہ بلانا خود اُسکے میکے میں نہیں بلکہ میکے والیوں میں ہوتا ہے۔ یعنی اُس کی خالائیں بھوپھیاں خالیاں بہت کر کے باری باری اُسے اپنے یہاں بلاتی ہیں۔ جہاں وہ مع دولہا کے جاتی ہے۔ اور اُس نے جوڑے کے رکھ رکھاؤ کے لیے خاص اہتمام اور انتظام کیا جاتا ہے۔ فقط ایک رات دن دولہا دولہن کھان دہتے ہیں۔ اور رخصت کرنے وقت اُنھیں جوڑا۔ سلام کرائی۔ اور زیور وغیرہ بقدر ہمت و

و استقامت دیے جاتے ہیں۔

یہ نقش لکھنؤ والوں کی شادی جس کی بہت سی رسموں کو چھوڑ کر اُس کا ایک اجمالی خاکہ ناظرین دیکھنا دیا گیا۔ دیہات والوں کی شادی کا طریقہ بجز عقد نکاح کے اور تمام باتوں میں بدلا ہوا ہے۔ وہاں بھی مانجھا ہوتا ہے مگر دو لکھا کے لیے مانجھے کا زرد جوڑا اسکی بہنیں اور عزیز عورتیں لاتی ہیں۔ دو لکھن کے گھر سے دھوم دھام اور جلوس اور باجے کے ساتھ مانجھا نہیں آتا۔ نہ دو لکھا کے بیان سے سانچن آتی ہے اور نہ دو لکھن کے گھر سے منہدی آتی ہے۔ بلکہ سانچن اور منہدی کا مقصد برات ہی کے دن ایک اور طریقے سے پورا ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ برات جب دو لکھن کے وہاں پہنچتی ہے تو اُسکے مکان سے ذرا فاصلے پر ٹھہر جاتی ہے۔ وہاں سے پہلے بجائے سانچن کے برتی کے نام سے دو لکھن کا جوڑا اور اُسکے ساتھ اور بہت سے جوڑے اور سہاگ کی چیزیں جو ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ کچھ شکر کچھ کھیلین خدانوں پر لگا کے باجے کے ساتھ دو لکھن کے دروازے پر بکھی جاتی ہیں۔ دو لکھا کے اعزاء و احباب ساتھ جاتے ہیں جو اُن سب چیزوں کو دو لکھن والوں کو علانیہ دکھاتے اور اُنکے سپرد کرتے شربت پینے کے بعد واپس آتے ہیں۔

اُسکے تھوڑی دیر بعد اسی طریقے سے دو لکھن کی طرف سے برتی آتی ہے۔ جس میں دو لکھا کا جوڑا ہوتا ہے۔ یہ برتی دیہاتیوں میں منہدی کی قائم مقام ہے۔ اس کے بعد وہ جوڑا بہن کے جس میں جامہ۔ نیمہ۔ پگڑی۔ منقش۔ سہرا۔ پھولوں کی بدھیاں اور جوڑا وغیرہ ہوتا ہے روانہ ہوتا ہے۔ اب برات دو لکھن کے دروازے پر جاتی اور اُس مقام میں ٹھہرتی ہے جو محفل نکاح کے لیے منتخب کیا گیا ہو۔ یہاں رات پھر نئے و سرود اور ناچ گانے کی محفل گرم رہتی ہے۔ بجز اسوقت کے جب قاضی صاحب آ کے نکاح پڑھائیں۔ نکاح کا وہی طریقہ ہے جو شہر والوں میں بیان کیا گیا۔ عقد کے بعد لڑکی والے برات کا کھانا دیتے ہیں۔ شہر میں بجز تھوڑے کے کھانے کے برات کو کھانا دینا لازمی نہیں ہے بلکہ دو لکھا خود کھانا پلا کے لے جاتا ہے۔ مگر دیہات میں لڑکی

والوں کا اہم ترین فرض برات کو کھانا ہے جس میں ذرا بھی کمی رہ جائے تو اس کے خیال میں برادری میں ناک کش جاتی ہے۔

یہ کھانا پورا قورا ہوتا ہے جس میں پلاؤ - ذروہ - قورسہ - خمیری روٹیاں شیریں لازم ہیں۔ اور ہر ادنیٰ و اعلیٰ کو بلا استثنا، و امتیاز پورا قورا دیا جاتا ہے۔ کھانا اپنے وقت طے کے والے نہایت بے محبتی اور بے شرمی سے چونٹی چونٹی کے لیے کھانا مانگتے ہیں۔ گھوڑوں اور بیٹوں کے لیے دانہ چارہ ضرورت سے بہت زیادہ طلب کرتے ہیں۔ اور لڑکی والوں پر فرض ہے کہ زبان سے نہیں نہ نکلے۔ کسی چیز کے لینے سے انکار کیا اور آبرو خاک میں مل گئی۔ اور سب کیا دھرا برباد ہو گیا۔

اس کے بعد خستہ اور دالہسی کا قریب قریب وہی طریقہ ہے جو شہر والوں میں ہے۔ ہاں ایک رواج یہ بھی ہے کہ دیہات میں برات کے ساتھ عورتیں نہیں جاتیں۔ اور نہ دو لہن کے ساتھ کوئی معزز خاتون آتی ہے۔ دالہ اور خادسہ کی حیثیت سے دو ایک ادنیٰ درجے کی عورتیں البتہ چلی آتی ہیں۔ اس واسطے دیہات میں دو لہن پر بھی ہمت زیادہ سختیاں ہوتی ہیں۔ اس کا فرض ہے کہ چوتھی میں ایسے آٹے کی گھڑی تک سسرال میں جس طرح رکھ دی جائے رکھی رہے۔ نہ کھائے نہ پیے۔ نہ پیشاب پاخانے کو جائے۔ نہ بولے نہ چالے۔ نہ چہرے پر سے ہاتھ ہٹائے۔ اور نہ آنکھیں کھولے۔ اس لیے کہ یہ سب باتیں بھائی و بے شرمی میں داخل ہیں۔ اور اس اندیشے سے کہ دو لہن کو سسرال میں جا کے پاشخانی پیشاب کی ضرورت نہ پیش آئے دو دو دن پہلے سے اس کا کھانا پانی بند کر دیا جاتا ہے۔ اور زیادہ مصیبت یہ ہے کہ دیہات کی دو لہن اکثر دوسرے گائون میں بیاہ جاتی ہے۔ اور آمد و رفت میں دو دو تین تین منزلیں طے کرنا ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں دو لہن بچاوی پر کسی سخت مصیبتیں گزرتی ہوں گی۔

دیہات میں سانچھ اور مہندی کے ترک ہو جانے اور برات کھلانے میں سختیاں ہونے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ زیادہ تر برات سفر کر کے ایک بچی سے دوسری بستی میں جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ ایک دن ایک جلوس یہاں سے جائے اور دوسرے دن دوسرا جلوس وہاں سے یہاں آئے۔ اور پھر تیسرے

روز برات روانہ ہو۔ علیٰ ہذا القیاس براتیوں کو گوکہ دو لکھا اکثر اپنے گھر سے کھلا کر  
لیجاتا ہے۔ مگر لڑکی والے کے گھر پونچتے پونچتے سارے براتی بھوکے بنگالی ہوتے  
ہیں اور کنگلون کی سی شان دکھانے لگتے ہیں۔

(۴۸)

خوشی کی تقریروں کو ہم بقدر ضرورت بنا چکے اب غمی کی صحبتوں کا بیان کر دیتا  
بھی ضروری ہے۔ مگر یہ سارے ہندوستان میں عام ہیں۔ جہاں تک میں نے  
غور کیا ان میں لکھنؤ کی کوئی خصوصیت نہیں نظر آتی۔ غمی کا باعث کسی کامرنا  
ہوتا ہے۔ لہذا مرنے کے دن اعزاء و احباب کو خبر کر دی جاتی ہے۔ اور جن لوگوں  
کو مجبوری مانع نہیں ہوتی ضرور آتے ہیں۔ عورتیں جو آتی ہیں اپنی ڈولی یا سواری  
کا کرایہ آپ دیتی ہیں۔ شادی کی تقریروں میں عام قسم کی آمد و رفت میں لازم ہے  
کہ مہمان آنے والیوں کا کرایہ دیا جائے مگر غمی کا گھر اس تکلیف سے مستثنیٰ کر دیا  
گیا ہے۔

اس کے بعد مردے کو نہلاتے ہیں۔ شیعوں کے یہاں معمول ہے کہ غسل کے  
لیے جنازہ پہلے غسل خاتے میں لے جایا جاتا ہے جہاں غسل جو نہلاتے ہیں  
نہایت مشاق مگر اس کے ساتھ قسی القلب مشہور ہیں مردے کو غسل دے کے  
کفن پھاتے ہیں۔ مگر سنیوں کے یہاں مردہ اپنے گھر ہی میں نہلایا جاتا ہے۔ او  
خود اعداد اقرار یا دوست احباب نہلاتے ہیں۔ اکثر مرد اور عورتیں جو زیادہ  
مشاق ہوں بلا لیے جاتے ہیں۔ اور اکثر جگہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی شرع دان مولوی  
صاحب یا اور کوئی پڑھے لکھے واقعہ کار بزرگ جہاتے جاتے ہیں کہ اس ترتیب  
سے نہلانا چاہیے۔ اور مسنون غسل میت کیا ہے۔

غسل کے بعد کفن پھایا جاتا ہے جس میں ایک ازار ایک کفن جو کرتے کے  
نام سے مشہور ہے پھانکے اوپر سے دو چادرین لپیٹ دی جاتی ہیں۔ اور سر اور  
پائون کے پاس اور کمر میں کپڑے کی چٹین پھاڑ کے بانڈھ دی جاتی ہیں تاکہ کھلنے  
نہ پائیں۔

اس کے بعد اگر شیعوں کا جنازہ ہے تو صندوق میں رکھ کے اسپر کوئی دو شالہ



ڈال کے جنازے کو شامیانے کے سائے میں لے جاتے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ کوئی شخص قرأت و اداسے خارج سے سورہ رحمان کی بعض آیتیں پڑھتا جاتا ہے صندوق شامیانے کے اٹھانے والے علی العموم شہدے ہوتے ہیں۔ جن کا مرتبہ دراز سے مُردے اٹھانا پیشہ ہو گیا ہے۔ مگر ان لوگوں کی بہو و گویوں اور بدتمیزوں سے شیعوں میں خیال پیدا ہوا ہے کہ جنازوں کو خود اٹھانا چاہیے۔ جسکے لیے متعدد کمیٹیاں شہر میں قائم ہو گئی ہیں۔ اور ان کے پرجوش اور دیندار ارکان تلاش میں رہتے ہیں کہ کوئی مر جائے تو اُس کے جنازے کو خود اپنے اہتمام میں لے کے مذہبی آداب اور احتیاطوں سے اٹھائیں۔

سُنیوں میں میت کو کسی ہلکی چارپائی پر لٹا کے اور اوپر سے چادر ڈال کے لیجاتے ہیں۔ اگر عورت کا جنازہ ہو تو چارپائی پر بانس کی کھپا چوں کو قوس نما صورت میں قائم کر کے اور ان کے سروں کو دونوں جانب چارپائی میں اٹکا کے اوپر سے چادر ڈالتے ہیں۔ اس کو گوارہ بنانا کہتے ہیں۔ اور اس کی ضرورت محض پردے کے خیال سے پیدا ہوئی ہے۔ سُنیوں میں جنازے کو خود اعزاء احباب اپنے کندھوں پر اٹھا کے آہستہ آہستہ کلمہ پڑھتے ہوئے لے جاتے ہیں اور نماز جنازہ پڑھائی جاتی ہے۔

قبرستان عموماً صندوقی کھودی جاتی ہے۔ جس میں انسان کے سینے تک ایک چوڑا حوض کھودا جاتا ہے۔ پھر اُس کے اندر دونوں جانب کنارے چھوڑ کے ایک دوسرا پتلا حوض کھودا جاتا ہے۔ وہ بھی انسان کی کمر سے کم گہرائی میں رہتا۔ جب قبر فوب صاف کر لی جاتی ہے تو مُردے کو اُس میں نہایت احتیاط سے اتارتے ہیں تاکہ ہاتھ سے گرنے اور چوٹ کھانے نہ پائے۔ قبر میں عموماً سر ہانا شمال کی طرف رکھا جاتا ہے۔ اور مُردے کا مُنہ ڈھیلون وغیرہ کی آڑ لگا کے قبلے کی طرف کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد بند کھول دیتے ہیں۔ اور اکثر اعزاء کو مُنہ کھول کے میت کی آخری صورت بھی دکھا دیا کرتے ہیں۔ اس موقع پر شیعوں کے وہاں تلقین پڑھی جاتی ہے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ کوئی فقہ اور متقی بزرگ قبر میں اُتر کے میت کا شانہ باندھتے جاتے ہیں، اور ایک عربی عبارت پڑھتے جاتے

ہین جس میں میت کی طرف خطاب کر کے بتایا جاتا ہے کہ وہاں کیرین آکے سوال کریں تو تم یہ جوابات دینا جس کے سلسلے میں تمام عقائد و نبیہ کی تعلیم کر دی جاتی ہے۔ اسکے بعد اندرونی حوض پر تختے چا دیے جاتے ہیں۔ اور اگر ان میں درز یا بھری ہو تو مٹی کے ڈھیلے رکھ رکھ کے اطمینان کیلئے ہین کہ مٹی اندر نہ جائے گی۔ قبر میں کا فوراً اور خوشبو تو کفن ہی میں موجود ہوتی ہے بعض لوگ کیوڑے کی بوتل بھی ڈال دیتے ہیں۔ اور اُسکے بعد اوپر سے مٹی ڈال کے قبر کا اوپر والا حوض بھر دیا جاتا اور قبر کی صورت بنادی جاتی ہے۔

مٹی دینے کو لوگ بڑا اہم اور ضروری کام تصور کرتے ہیں۔ اور جب قبر میں مٹی ڈالی جاتے لگتی ہے تو حاضرین میں سے ہر شخص عام اس سے کہ کوئی پو تین مرتبہ ہاتھ میں مٹی لے کے قبر میں ڈالتا ہے۔ اور قرآن کی تین آیتیں پڑھتا ہے جن کا ترجمہ یہ ہے کہ ”ہم نے تم کو اس سے (مٹی سے) پیدا کیا۔ ہم نے تم کو پھر اُسی میں جو پناہ یا۔ اور ہم پھر آئندہ (یہ روز قیامت) تم کو اس سے نکال کے کھڑا کریں گے۔“

ہر حال جب قبر میں کے تیار ہو جاتی ہے تو اُس پر وہی چادر جو جنازے پر پڑی تھی یا بھو لون کی چادر ڈال دی جاتی ہے۔ اور فاتحہ پڑھ کے اور دعا سے مغفرت کر کے لوگ واپس آتے ہیں۔

مرنے والے کے گھر میں اُس کی وفات کے دن چولہا نہیں جلتا بلکہ جنازے کے گھر سے نکلنے کے بعد کسی عزیز و قریب کے گھر سے پکا پکا یا کھانا آ جاتا ہے۔ جس کو لوگ دفن سے واپس آکے کھاتے ہیں۔ اور اُسی وقت تمام گھان اُس کھانے سے پیٹ بھرتے ہیں۔ تین دن تک معمولاً یہی ہوتا ہے کہ گھر میں کھانا نہیں پکا۔ یہ طریقہ اصل میں آغاز اسلام اور خود حضرت رسالت علیہ السلام سے شروع ہوا۔ جبکہ حضرت جعفر طیار کی شہادت کا حال سن کر اور اسکے گھر والوں کو روتا ہوا دیکھا آپ نے کھانا بھجوا دیا تھا۔ مگر لوگوں نے اس شایستہ بنیاد پر جو عمارت یہاں قائم کر لی ہے وہ نہایت نفوذ و شرمناک ہے۔ کسی کے مرنے ہی گھر میں جتنا کھانا تیار ہو چیکہ یا جاتا ہے۔ گھر دن مشکون کا پانی بہا دیا جاتا ہے۔ اور اس کا سبب

عورتیں بچوں سے یہ بیان کرتی ہیں کہ فرشتہ موت جس چھری سے جان لیتا ہے اُسکو کھاتے پینے کی چیزوں میں دھو ڈالتا ہے۔  
 مرنے کے تیسرے دن اور کبھی مناسب دن دیکھ کے چوتھے روز سوم ہوتا ہے  
 دراصل اس کا آغاز اس سے ہوا کہ یہ دن اس لیے مقرر تھا کہ لوگ اگر مراسم  
 تعزیت ادا کریں اور سپاندون کی تسلی و تسفی کریں۔ مگر یہ خیال کر کے کہ کس کس  
 کثیر کا خالی بیٹھا رہنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ یہ طرز عمل اختیار کیا گیا کہ جو لوگ  
 آئین ہیکہ قرآن مجید کی تلاوت کریں۔ اور وہ ایک پارے پڑھ کے اُن کا ذواب  
 مرحوم کی روح کو بخشیں۔ چند روز میں تعزیت کا خیال جاتا رہا۔ اور فقط یہ دیکھا  
 کہ اُس دن کتنے لوگ آئے اور کتنے قرآن مرغوالے کو بخشے گئے۔ ختمِ صحبت کے  
 وقت پہلے مختلف لوگ قرآن کے چند رکوع اور آخر کی چھوٹی سورتیں پڑھ کر فارغ  
 کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ اس میں ایک نیا لفظ طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ تھوڑا  
 گھسا ہوا سندل ایک پیالے میں تیل۔ اور تھوڑے پھول لاکے حاضرین میں سے  
 ہر ایک کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ ہر شخص ایک پھول اٹھا کے تیل میں ڈالتا  
 ہے۔ اور وہ سندل اور تیل اور پھول لے جا کے مرحوم کی تربت پر ڈول دیئے  
 جاتے ہیں۔

اسی روز شام کو پہلے بڑی فاتحہ خوانی ہوتی ہے۔ اور گھر میں پہلی بار گانا  
 پکاتا ہے۔ اگرچہ اب غربت نے ہمدون کی اس قدر کمی کر دی کہ میت کے گھر کھانا  
 بھیجنے والے بہت کم رہ گئے ہیں۔ اور اکثر غریب گھر والوں کو اس سے بچنے ہی  
 کھانا پکانے پر مجبور ہو جاتا پڑتا ہے۔ لیکن مردِ بد طریقہ یہی ہے کہ پیچھے یعنی سوم  
 سے پہلے ہر ہی کے کھانے پر سبر ہو۔

سوم اور چہلم کی فاتحہ خوانی نے عوام میں عجیب شان پیدا کر لی ہے۔ اصلیت  
 تو اسی قدر ہے کہ جہاں تک ہو سکے غریبوں اور محتاجوں کو کھانا کھلایا جائے اور اُسکا  
 قواب مرے والے کو چوٹیا دیا جائے۔ ہندوستان میں ہندوؤں میں مردوں  
 کی تیرہویں اور برہمنی ہوتے دیکھ کے مسلمانوں کا جی چاہا کہ ہم بھی اسی قسم کے کام  
 ناموری اور دھوم دھام سے کریں۔ اس شوق کے تقاضے نے پیچھے۔ دسویں

بیسویں - چہلم - اور دسویں کے نام سے غمی کی تقریبیں پیدا کر دیں۔ جن میں ہوتا ہی ایصالِ ثواب ہے مگر دکھائے۔ نام پیدا کرنے۔ اور برادری کو کھانا دینے کی شان سے۔ پھر اُس پر قیامت یہ ہوئی کہ عوام میں یہ عقیدہ پیدا ہوا کہ ان ہمارے مروجہ فاتحوں میں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ خدا کے حکم سے جیسے مردے کو پونجا دیا جاتا ہے۔ اس عقیدے نے فاتحوں میں یہ شان پیدا کر دی کہ گویا مردے کی دعوت کی جاتی ہے۔ وہ کھاتے زیادہ اہتمام سے دیے جاتے ہیں جو مرحوم کو مرغوب تھے۔ حالانکہ خیرات کا اصول یہ چاہتا ہے کہ جس غریب کو کھلایا جائے اُس کی پسند کا لحاظ رکھا جائے تاکہ اُس کے خوش کرنے سے ثواب میں ترقی ہو۔ اسی قدر نین فاتحوں میں ثواب یہ ہوتا ہے کہ چار چار پانچ پانچ جوڑ کھانے کے نکال کے ایک پاک و صاف مقام پر ترتیب سے چتے جاتے ہیں۔ آجورے میں پانی بھی لاکے رکھ دیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ کھانے میں مردے کو پانی پینے کی بھی ضرورت ہوگی۔ پھر اُس کے لیے کپڑوں کے نئے دو جتنی الامکان نفیس و قیمتی کپڑے اڈڑھنا بچھونا۔ جانا ز۔ نئی قلعی کیے ہوئے تانبے کے برتن۔ لوٹا۔ کٹوا۔ پیلی وغیرہ بھی کھانے کے برابر رکھ دیے جاتے ہیں۔ اور جب یہ سب سامان تیار ہو جاتا ہے تو کوئی ملا آکے فاتحہ کرتا۔ یعنی قرآن کی چند مخصوص آیتیں اور چھوٹی سورتیں پڑھ کر دعا کرتا ہے کہ خداوند ان چیزوں کا ثواب فلان شخص کو پہنچا۔ اس طریقے سے عوام کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ یہ چیزیں مردے کو پہنچ گئیں۔ اور وہ سب کھائے اور چیزیں کسی محتاج یا دیندار مسلمان کے گھر پہنچا دی جاتی ہیں۔

ان چیزوں سے خود مرحوم کے متمتع ہونے کے خیال نے دلوں میں جان نیک رسوخ پیدا کر لیا ہے کہ بعض ادنیٰ طبقے کی جاہل عورتیں ناشتے کی چیزوں کے پاس بن سونے کے خود بھی بیٹھ جاتی ہیں کہ مرحوم شوہران کھانوں اور کپڑوں سے لطف اٹھائے گا تو خود اُن کے حسن و جمال کی لذت سے کیون عروم رہ جائے۔ فاتحوں میں کھانا فاتحے کی ضرورت سے بہت زیادہ کھایا جاتا ہے۔ جو حسب توہینِ اعزاء و احباب میں جن سے حصہ داری ہے تقسیم ہوتا ہے۔ اور تمام

گھر کے بڑے بچوں - دھوبی - مائی - حلال خور وغیرہ کو دیا جاتا ہے - جنہوں نے قانون کے شاندار تقریبین بن جانے کی وجہ سے اپنے حقوق پیدا کر لیے ہیں -

گوکہ ہم نے یہ سب کارروائیاں فائقہ سوم کے ضمن میں بیان کر دی ہیں لیکن انکی تفصیل زیادہ اہمیت کے ساتھ چٹلم میں ہوتی ہے جو کہنے کو تو مرنے کے چالیسویں دن مگر آروے عمل درآمد چالیس سے دو چار روز کم ڈالنے میں ہوا کرتا ہے - اور فاسحے دسویں بیویوں کے بھی گواہ تیار سے ہوتے ہیں اور ہر جمعرات کا دن خاندان کے بزرگوں کے فاسحے کے لیے مقرر ہو گیا ہے - مگر علی الموم سوم اور چٹلم کے فاسحے غیر معمولی اہتمام سے ہوتے ہیں - اور حضرات امانیہ کے وہاں ہر غی کے فاسحے میں لزوم کے ساتھ مجلس عزائے آلِ مہدیہ سلام بھی ہوتی ہے -

غمی کی تقریبوں کے خصوصیات ہم نے بیان کر دیے - اب رہی محفلوں کی نشست کا طریقہ وہ وہی ہے جو دوسری تقریبوں میں عرض کر دیا گیا - یہ خوشی اور غمی کی وہ تقریبیں فقہین جو اخلاقی و معاشرتی طریقے سے مروج ہیں - مذہب نے جن محفلوں کو رواج دیا ہے ان کو ہم آئندہ بیان کریں گے -

(۴۹)

آدابِ محبت میں دسویں چیز مذہبی محبتیں یعنی عزاداری کی مجلسین اور مولد شریف کی محفلین ہیں - مجلسوں کا عام رواج شیعوں میں ہے اور مولد شریف کا شیعوں میں اگرچہ دو دنوں میں دو دن فریقوں کے لوگ شریک ہوتے ہیں - بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ کبھی بعض حب اہل بیت سنی مجلس عزاکرتے ہیں اور شیعہ حضرات کے یہاں مولد شریف کی محفل ہوتی ہے - مگر لکھنؤ کی خاص چیز جس نے لکھنؤ کی سوسائٹی پر اثر ڈالا اور نیز سوسائٹی اس سے متاثر ہوئی وہ مجلسین ہیں - مولد کی محفلوں میں کوئی خصوصیت نہیں - جیسی سارے ہندوستان میں ہوا کرتی ہیں بیان بھی ہوتی ہیں - گو اس میں شک نہیں کہ بعض امرا کے یہاں مولد میں بھی قریب قریب مذہبی شائستگی و تہذیب نظر آتی ہے جو شیعوں کی شائستگی کی وجہ سے مجالس میں ہوا کرتی ہے -

عزاداری کی مجلسین بہت کثرت سے ہوتی ہیں - اور اگر کوئی شخص چاہے

اور پتہ لگاتا ہے تو سال بھر بغیر محنت مزدوری کے محض مجالس کی شرکت سے اپنا پیٹ پال سکتا ہے۔ اور فقط فیاض و عقیدتمند شیون کی فیا منی پر بھی سکتا ہے۔ مجالس ہی کی برکت سے یہاں مختلف قسم کے ڈاکر پیدا ہو گئے جو جدا جدا عنوانوں سے مصائب سید الشہداء علیہ السلام کو بیان کر کے روتے رولتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے ملا و مجتہدین کا بیان ہے۔ ان کے بعد حدیث خوان ہیں جو احادیث کو سننا کر ایسے پُر درد اور سوز و گداز کی آواز میں فضائل ائمہ اطہار و مصائب آل رسول بیان کرتے ہیں کہ سامعین بے اختیار روٹنے لگتے ہیں۔ اور کیسا ہی سنگدل ہو ضبط کر یہ نہیں کر سکتا۔ انھیں سے ملتے جلتے واقعہ خوان ہیں جو واقعات مصائب اہل بیت کو ایسے الفاظ اور ایسی فصیح و بلیغ عبارت میں سناتے ہیں کہ جی چاہتا ہے سنتے رہے۔ اور روتے جائے۔ واقعہ خوانی کی فصاحت نے دراصل داستان گوئی کو بے مزہ کر دیا ہے۔ ان کے بعد مرثیہ خوان یا تحت اللفظ خوان ہیں جو مرثیوں کو شاعرانہ انداز سے سناتے ہیں۔ مگر اس ساوگی کے سناتے میں بھی چشم و ابرو اور ہاتھ پاؤں کے حرکات و سکنات سے واقعات کی ایسی سچی اور مکمل تصویر کھینچ دیتے ہیں کہ سامعین کو اگر رقت سے فرسبت ملی تو داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اسی مرثیہ خوانی کی ضرورت و قدر نے میر تقی اور مرزا و پیر پیدائگی جو کمال شاعری کے اعلیٰ ترین شہ نشین پر ہو چکے۔ یا تو یہ مثل مشہور تھی کہ بگرد شاعر مرثیہ گو۔ یا لکھنؤ کے کمال مرثیہ گوئی نے سارے ہندوستان سے مولیا کہ عالم شعر و سخن میں مرثیہ گوئی کا رتبہ دیگر اصناف سخن سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے۔ قدردانی نے بیسیوں مرثیہ گو اور صد ہا مرثیہ خوان پیدا کر دیے جو غم اور دیگر ایام عزاداری میں لکھنؤ سے نکل کے ہندوستان کے بلاد و دروازہ میں پھیل جاتے ہیں۔ اور وہاں کی محبتوں میں اپنے کمالات کا سکھانے کا سہ بٹھا کے واپس آتے ہیں۔ مرثیہ خوانوں کے بعد سوز خوان ہیں۔ یہ لوگ فوجوں اور مرثیوں کو اصول موسیقی کی پابندی میں گانے سناتے ہیں۔ ان میں علی العموم تین آدمیوں کا گروہ ہوتا ہے۔ ووسر دیتے ہیں جو بازو کھاتے ہیں اور تیسرا شخص جو بیچ میں بیٹھا ہے سوز سناتا ہے۔ ان لوگوں نے بھی اصول موسیقی

کے برتنے - اور راگوں اور - وٹھون کے ادا کرنے میں اس درجہ ترقی کی ہے کہ گویا  
کو پیچھے ڈال دیا - اور لکھنؤ میں بہت سے اس پائے کے سوز خان پیدا ہوئے  
کہ بڑے بڑے اُستاد گویے اُن کے آگے کان پکڑنے لگے - بہر حال جو درجہ کمال مرثیہ  
گوؤں نے شاعری میں حاصل کیا وہی سوز خانوں نے موسیقی میں -

یہ سب فن محض مجالس عزا کی بزرگت سے پیدا ہوئے - اور  
خاص لکھنؤ میں پیدا ہوئے - اور ان سب نے علاوہ ادب  
اور دو کو سبے انتہا ترقی دینے کے نظم و نثر اور دو کی دنیا میں یہ خاص شان پیدا  
کر دی کہ انسانی جذبات کو جس طرح چاہیں حرکت میں لائیں - اور جس قسم کے جذبات  
اور جیسے جوش کو چاہیں پیدا کر دیں - اس فن کو باضابطہ طور پر یونانیوں نے  
ترقی دی تھی - جنہوں نے اپنی تقریروں کے موثر بنانے کے لیے پتہ لگایا تھا کہ کن  
الفاظ کن حرکات - کیسے لہجے - اور کن آوازوں سے انسان کے دل میں خوشی  
یا غم یا رحم یا تر و غضب کا جوش پیدا کیا جاسکتا ہے - اس کے بعد کبھی اس فن  
کی طرف کسی قوم نے توجہ نہیں کی - یہاں تک کہ اب یورپ کے آرٹسٹوں اور  
اسپیکروں نے اس فن کو زندہ کرنا شروع کیا - مگر لکھنؤ میں محض ڈاکر کی نفیس  
میں اس فن کو فروغ بخود اس قدر ترقی ہو گئی کہ یورپ والے بھی شاید اس درجے سے  
اُس کے نہ بڑھ سکے ہوں گے -

مجلسوں میں ختم کے وقت شربت پلانا یا مٹھائی یا کھانا تقسیم کرنا لازم ہے مگر  
ہندو اور ولندیزی لوگوں نے اب یہ نہایت ہی شائستہ طریقہ اختیار کر لیا ہے  
کہ جن حضرات کو بلانا ہوتا ہے اُن کے پاس دعوت کے رقعوں کے ساتھ حصہ بھی  
بھیج دیا جاتا ہے - مجلس سے واپس آتے وقت ہاتھ میں حصہ لے کے چلنا بہت  
سے لہذب اور خوشحال لوگوں کو تہذیب کے خلاف اور نہایت مبتذل معلوم  
ہوتا تھا - گو کہ عوام اور بازاری لوگ اس میں معذرتہ نہیں سمجھتے مگر خوش حال  
اور وضعدار لوگوں کو یہ گران گذرتا تھا - اور اگر خدا شکار ہو جو دن ہوا تو بہت سے  
لوگوں کو مجبور ہونا پڑتا تھا کہ مجلس ہی میں کسی دوست یا غریب آدمی کو  
اپنا حصہ دے دیں -

مجلس کی نشست کی شان یہ ہے کہ لکڑی کا ایک ممبر جس میں سات آٹھ زینے ہوتے ہیں دالان یا کمرے کے ایک جانب رکھا ہوتا ہے۔ اور لوگ چاروں طرف دیوار کے برابر پر مختلف فرش پر بیٹھے ہیں۔ اور اگر جمع زیادہ ہوا تو بیچ کی جگہ بھی بھر جاتی ہے۔ جب کافی آدمی جمع ہو جاتے ہیں تو ذکر صاحب ممبر پر رونق افزوں ہو کر پہلے ہاتھ اٹھا کر کہتے ہیں ”فاتحہ“۔ ساتھ ہی تمام حاضرین ہاتھ اٹھا کر چپکے چپکے سورۃ فاتحہ پڑھ لیتے ہیں۔ اسکے بعد وہ اگر حدیث خوان یا واقعہ خوان ہو تو کتاب کھول کے بیان کرنا شروع کرتے ہیں۔ اور اگر مرثیہ خوان ہو تو مرثیے کے اوراق ہاتھ میں لے کے مرثیہ سناتے لگتے ہیں پھر وہ اور حدیث خوانوں کے بیان کو لوگ خاموشی و ادب سے سنتے اور وقت کے موقع پر ذرا وقفہ روکتے ہیں۔ مگر مرثیوں کے سنتے وقت مجمع حاضرین سے بجز وقت کے بندوں کے جبکہ رونے سے فرصت نہیں ملتی برابر صدا سے آفرین و سرجا بلند ہوتی رہتی ہے۔

سوز خوان ممبر پر نہیں بیٹھتے بلکہ لوگوں کے بیچ میں ایک جانب بیٹھ کر نوحے اور مرثیے سناتے ہیں۔ اور اکثر داد بھی پاتے ہیں۔

اکثر مجلسوں میں مختلف نوکر کیے بعد دیگرے پڑھتے ہیں۔ اور عموماً حدیث خوان کے بعد مرثیہ خوانی اور اسکے بعد سوز خوانی ہوتی ہے۔ سوز خوانی چونکہ ورل گانا ہے اس لیے اس کا رواج اگرچہ لکھنؤ ہی میں نہیں سارے ہندوستان میں کثرت سے ہو گیا ہے مگر مجتہدین اور فقہ اور پابند شرع بزرگوں کی مجلسوں میں سوز خوانی نہیں ہوتی۔ مجتہدین کے وہاں کی مجلسوں میں پابند عیال و بین کا بہت خیال رہتا ہے۔ خصوصاً یہاں غفران آباد کے امام باڑے میں نوین محرم کو جو مجلس ہوتی ہے وہ خاص شان اور امتیاز رکھتی ہے۔ اور اس کی شرکت کے شوق میں لوگ دُور دُور سے آتے ہیں۔ اس میں اتنا سے بیان میں اونٹ حاضرین کے سامنے لائے جاتے ہیں جن پر کجاوے یا مھلین ہوتی ہیں اور ان پر سیاہ پوشین پڑی ہوتی ہیں۔ اور موسیٰ کو یہ منظر نظر آ جاتا ہے کہ دشت کر بلا میں اہل بیت کا کھڑا مارا اور تباہ شدہ قافلہ کس مظلومی و مہم زدگی



کی شان سے شام کی طرف چلا جاتا تھا۔ حاضرین پر اس المناک منظر کا ایسا اثر پڑتا ہے کہ ہزار ہا حاضرین سے دس بیس کو غش منور آجاتا ہے جو بڑی مشکون سے اٹھا کر اپنے گھروں کو پھینچائے جاتے ہیں۔

خاندان اجتا سے مجالس میں اس ڈرامیک شان کی ابتدا ہونے کا یہ انجام ہوا کہ اکثر عقیدہ مند امر اجدت طرازیان کرنے لگے۔ اور بعض بزرگوں نے تو یہاں تک ترقی کی کہ مجلسوں کو بالکل ڈراما بنا دیا۔ چنانچہ مولوی عبدی حسین صاحب مرحوم کے یہاں مجلسوں میں وقتاً فوقتاً تھیٹر کے ایسے پردے کھلتے جن کے ذریعے سے واقعات کر بلا کے پرالم سین پیش نظر کر دیے جاتے۔ اور حاضرین پر عجیب رقت کا عالم طاری ہوتا۔ اس سے بھی زیادہ ترقی مرحوم کے یہاں کی زمانہ کی مجلسوں میں ہوتی۔ جن میں شہر کی ہزاروں عورتیں جمع ہو جاتیں۔ اور بجائے اسکے کہ ڈاکر حدیث خوانی کریں اسٹیج پر کر بلا کے سین زندہ الیکٹرون اور الیکٹرسون کے ذریعے سے دکھائے جاتے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے علما و مجتہدین نے ان بدعات کو پسند نہیں کیا۔ مگر عوام الناس کی دلچسپی ان میں روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ شیعوں کی مجلسوں نے لکھنؤ کی معاشرت پر بہت نمایاں اثر ڈالا ہے۔ اور اُن کے ذریعے سے آداب محبت اور تہذیب و شائستگی کو بہت زیادہ ترقی ہو گئی ہے۔ اور مرثیوں کے ذوق نے شاعری و موسیقی کو زندہ ہی نہیں کر دیا بلکہ اُن دونوں فنون کا سچا مذاق فردوں سے تجاوز کر کے پردہ نشین مرثیہ خاتون تک میں پیدا کر دیا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ چیز یورپ کے سوا جہاں رقص و سرود لڑکیوں کی تعلیم میں داخل ہے ایشیا کے کسی شہر میں نہ پیدا ہو سکی ہوگی۔

مجلسوں کے علاوہ ایک اور طرح کی تھلین بھی شیعوں میں ہوتی ہیں۔ جو ”محبت“ کے نام سے یاد کی جاتی ہیں۔ اُن کا زمانہ ۹۔ ربیع الاول سنہ ۱۱۱۱ ہجری کے دن سے شروع ہو کر چند روز تک باقی رہتا ہے۔ مجالس عزاس طرح اہل بیت کے مصائب پر رونے اور آنسو ہانے کے لیے ہیں۔ اسی طرح یہ محبتیں

اس عرض سے کی جاتی ہیں کہ ڈریٹیک طریقے سے دشمنان اہل سبت کی توہین و تذلیل کی جائے اور ان کو بے مکان گالیان دی جائیں۔ اور چونکہ شیعوں کے خیال میں اہلبیت کے سب سے بڑے دشمن ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عمر فاروق تھے اس لیے انھیں دونوں محترم ناموں کی توہین کرنا اور ان کے پتے بنا کے ذلت و نفرت کے ساتھ علاناً ان محبتوں کا مقصد اصلی ہو گیا ہے۔ ان میں کسی سنی کے جانے کی کوئی وجہ نہیں ہے اس لیے کہ وہ اپنے مقتداؤں کی توہین کو گوارا نہیں کر سکتے۔ مگر سنا جاتا ہے کہ یہ نہایت ہی بدتہذیب و فحاشی کی شرمناک محفلیں ہوتی ہیں۔ جن میں ابتذال اس درجے تک ترقی کر جاتا ہے کہ کوئی مذہب شیعہ بھی بغیر وحی تکلیف اٹھائے واپس نہیں آ سکتا۔ ان محبتوں نے بھی شیعوں کے مذاق پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ اور اسی اثر کا نتیجہ ہے کہ ذرا ذرا سی باتوں پر سنی شیعوں میں لڑائیاں ہو جاتی ہیں۔

شیعوں کی ان مجلسوں اور محبتوں کے بعد سنیوں کی مجالس مولد شریف ہیں۔ ان کی نشست اور شان وہی ہوتی ہے جو مجلسوں کی ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ سنیوں کے یہاں ممبر نہیں ہوتا بلکہ ایک ممتاز جگہ پر کوئی چوکی بچھا دی جاتی ہے اس پر تکلف کا فرش کر دیا جاتا ہے اور اسپر بیچ کے واعظ یا مولد خوان صاحب مولد سناتے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ تھا کہ کوئی مولوی صاحب حالات ولادت سرور عالم بیان کر دیتے۔ اور ذکر ولادت کے وقت سب لوگ کھڑے ہو جاتے۔ مولد خوان صاحب سرت ولادت میں کوئی نظم پڑھتے اور لوگوں پر گلاب پاش سے کیوڑہ چھڑکا جاتا۔ یا کوئی واعظ نہ ملتا تو کوئی بڑھا لکھا آدمی مولوی علام امام شہید کا مولد شریف پڑھ کے سنا دیتا۔ مگر عوام کے لیے مولد خوانی کا یہ طریقہ اطمینان بخش نہ ثابت ہوا۔ اور سوز خوانوں کی دیکھا دیکھی ایسے مولد خوان پیدا ہو گئے جن کے ساتھ دو سر ملانے والے ہوتے ہیں۔ اور ان کے بیچ میں وہ بیچہ کر ترخم کے خاص لہجہ میں واقعات ولادت بیان کرتے ہیں۔ اور درمیان درمیان میں ہمارا شمار و قصائد گائے جاتے ہیں

جن میں دو تون بازو اُن کا ساتھ دیتے ہیں۔ گر سوز خوان تون نے تو موسیقی کو زندہ کر دیا اور مولد خوان گائے والوں نے سچ یہ ہے کہ موسیقی کا گلا کھونٹے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

لیکن مولد خوانی کے اعتبار سے لکھنؤ کو کوئی خصوصیت نہیں حاصل ہے اس لیے کہ اُسی طرز سے اور اُسی شان کی مولد خوانی سارے ہندوستان کے مثنویوں میں جاری ہے۔ اور یہی حال سُنی صوفیوں کی صحبت حال و قال کا ہے۔ جو ہر جگہ کیساں ہے۔ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے زمانے ہی سے مجلس سماع کی بنیاد پر لگئی مگر اُس سے سوا اسکے کہ قولوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا جو رتے اور موسیقی دانی میں ڈھاڑ پون اور گویوں سے گرا ہوا سمجھا جاتا ہے فن موسیقی کو کوئی نمایاں نفع نہیں حاصل ہو سکا۔ حالانکہ سوز خوانی نے ایک صدی کے اندر ہی موسیقی کو اپنی لوندی بنا لیا۔ اور حاکمانہ شان سے اس پر تصرف کرنے لگی۔

(۵۰)

مجلسوں اور محفلوں کا حال ہم بیان کر چکے۔ اب ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ ہم کو ازم صحبت کو بھی شرح و بسط سے بتا دیں۔ اس لیے کہ وہ چیزیں ہیں جن سے معاشرت اور وضع صحبت کا حال آئینے کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔ کو ازم صحبت بہت زیادہ بلکہ بے شمار ہیں۔ جن کو ہم وقتاً فوقتاً بتائیں گے۔ مگر فی الحال سب سے مقدم چیزیں حقہ۔ قاصدان۔ لوتیا۔ اور اگال دان ہیں۔ یہ اس قدر ضروری اشیاء ہیں کہ رُوسا کے ہمراہی خدمتگاروں کے پاس لازمی طور پر موجود رہا کرتی ہیں۔ چند روز پیشتر اعلیٰ طبقے کے دولتمندوں کے ہمراہ ایک خدمتگار کے ہاتھ میں حقہ بھی رہا کرتا تھا۔ مگر اب یہ طریقہ چھوٹ گیا۔ حقہ درمیل دہلی کی ایجاد ہے۔ اور وہیں شاہی بھٹائی خانوں میں مختلف و متنوع کے حقے تیار ہو گئے تھے۔ لکھنؤ نے جو کچھ ترقی کی وہ سب سے پہلے بیچوانوں۔ چلون۔ اور چنبروں کی شکل اور قلع کی اصلاح سے متعلق ہے۔ مہلی کے حقے بھتے اور بد صورت تھے لکھنؤ میں نہایت موزوں و خوشتا بنا دیے گئے پھر تانبے پٹیل۔ پھول اور جست کے کے حقوں کے علاوہ مٹی کے حقے ایسے خوشتا بن گئے جو لوگوں کو اپنی نفارت و

نواکت کے لحاظ سے نہایت ہی پسند آئے۔ اور اکثر لوگوں کو سٹی کے نازک۔ بیک  
خوشنما اور سوندھے ٹپے پر نکتہ قیمتی حقون سے زیادہ اچھے معلوم ہوئے۔

حقون کی شکل میں اصلاح و ترقی ہونے کے بعد خود تنباکو میں عجیب عجیب  
دھاتیں اور خوبیاں پیدا کی گئیں۔ تنباکو کو گرگیا شیرے میں ملا کر کوٹ لینا غالباً  
دہلی ہی کی ایجاد ہے۔ جس کی وجہ سے پینے کی تنباکو کی اصلاح میں ہندوستان  
کو دنیا کے سارے ملکوں اور صفحہ زمین کی تمام قوموں پر فوقیت حاصل ہوئی تنباکو  
ساری دنیا میں پیا جاتا ہے۔ چرٹ۔ سگریٹ۔ اور پائپ کے لیے تنباکو کی اصلاح  
میں اگرچہ یورپ نے بے انتہا کوششیں کیں اور طرح طرح کی نفاستیں پیدا  
کر دیں مگر یہ تدبیر کسی کو نہ سوجھ سکی کہ شیرہ یا گرگیا ملا کر تنباکو کی تلخی اور گلو گیری  
مٹائی جائے اور دھوئیں میں لطف اور قیام پیدا کیا جائے۔ اس کے بعد لکھنؤ نے  
یہ ترقی کی کہ خمیر ملا کر اور خوشبوئیں شریک کر کے تنباکو سی بدبودار ناگو اور چیز کو  
اس قدر خوش آئندہ اور لطیف بنا لیا کہ علم بھر کے رکھتے ہی سارا کمرہ خوشبو  
سے مہک اُٹھتا ہے۔ اور جو حقہ نہ پیتے ہوں اُن کا بھی جی چاہنے لگتا ہے کہ دو ایک  
کش پکھن لیں۔ ہندوستان کے بعض خطوں کا تنباکو بہت اچھا ہوتا ہے اور اُن  
شہروں کے نام سے تنباکو مشہور بھی ہو گیا ہے۔ مگر وہ شہر کسی انسانی کوشش کا  
نتیجہ نہیں۔ کوشش اور تدبیر سے جو نفاست تنباکو میں لکھنؤ نے پیدا کی ہے اور  
کسی شہر کو نہیں نصیب ہوئی۔ اکثر شہروں کے لوگ خمیرے کو نہیں پسند کرتے۔ یا  
شاکی ہیں کہ اس سے نزلہ ہو جاتا ہے۔ مگر یہ محض اُن کے عادی نہ ہونے کی وجہ  
سے ہے۔ اور دیکھا ہی ہے جیسے انگریزوں کو قورمہ تا پسند ہے یا اُسے مضہم نہیں  
کر سکتے۔ تنباکو کے ساتھ حقے کے تمام لوازم میں ترقی ہوئی۔ چلین بھی پہلے سے  
زیادہ نازک و نفیس اور خوشنما ہو گئیں۔ چٹیروں میں بھی ترقی ہوتی رہی چٹیروں  
میں خوبصورت تہری نقرئی زنجیریں لگائی گئیں۔ طرح طرح کی ہنالین ایجاد  
ہوئیں۔ پھر پھولوں کے نفیس اور دلربا حقے ایجاد ہوئے۔ غرض یہاں کی سائٹ  
نے حقے کو سنوار کے اور آراستہ کر کے دولہن بنا دیا۔

حقے کے بعد نہیں بلکہ اُس سے بھی زیادہ اہم چیز لوازم صحبت میں خامدان

ہے جس کی بار بار ضرورت پیش آیا کرتی ہے۔ اور باہر آئے جانے میں ہندوستان کے پاس رہتا ہے۔ خاصہ ان وہ چیز ہے جس میں پانوں کی گلواریاں بنا کے بھی جاتی ہیں۔ پان ہندوستان کی قدیم چیز ہے۔ ہندوؤں کے زمانے سے اُس کی اہمیت چلی آتی ہے۔ اگلے دنوں را جاؤں اور بادشاہوں کو جب کوئی بڑی ہم پیش آتی یا کوئی ذمہ داری کا کام لینا ہوتا تو پان کا بیڑا (گلواری) ان کے سامنے رکھتے اور کہتے کہ کون سے اٹھائے گا۔ جس کا مطلب یہ ہوتا کہ اس ہم پر کون جائے گا؟ یا اُس ذمہ داری کے کام کو کون انجام دے گا؟ ارکان دولت۔ سرداروں۔ یا عام حاضرین دربار میں سے جو کوئی اُس بیڑے کو اٹھا لیتا وہ گویا وعدہ کرتا کہ اس کام کو میں انجام دوں گا۔ یا اس ہم کو میں سر کر دوں گا۔ یہ رسم تو مٹ گئی۔ مگر یہ کہادت آج تک زبان پر موجود ہے کہ "فلان شخص نے اس کام کا بیڑا اٹھا پایا ہے۔ یعنی اُس کو اپنے ذمے لیا ہے۔"

پورانے درباروں میں حاضرین کو انعام و اکرام کے ساتھ پان بھی مرحمت ہو کرتے۔ جس کا ذکر ابن بطوطہ نے بھی اپنے سفر نامے میں کیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ پان ہندوستان کی تاریخی چیز ہے۔ لہذا چاہیے تھا کہ مروجہ زمانہ سے پانوں اور پان کے سامان کو یونانیوں یا ترقی پزیر ممالک میں بالکل نہیں نظر آتا کہ پان جب تک دہلی میں تھا اُس کو کیا ترقی ہوئی۔ اُس کے مسائل کے جو اجزاء قدیم الایام سے چلے آتے ہیں آخر تک وہی قائم رہے۔ اور اُن کی بھی کسی قسم کی اصلاح نہیں ہوئی۔ اُس کے مسائل میں کتنا۔ چوتھا۔ ڈلیان۔ اور الایان۔ قدیم زمانے ہی میں منتخب ہو چکی تھیں۔ تنہا کو بھی لکھنؤ میں آنے سے پہلے ہی اُس کے اجزائیں شامل ہو چکا تھا۔ مگر اس کا بالکل پتہ نہیں لگتا کہ اگلی مہینوں صدیوں اور سیکڑوں گزشتہ درباروں اور سلطنتوں نے اُس کو کون سی خاص ترقی دی۔ لکھنؤ میں پان کا رواج دہلی کی بہ نسبت بہت زیادہ ہو گیا۔ اس کے لیے خاص قسم کے ظروف ایجاد ہوئے۔ اور اُس کی تمام چیزوں کو جدا جدا ترقی حاصل ہوئی۔ پہلے تو خود پانوں میں اُس کے پتوں کی اصلاح ہوئی۔ ہندوستان کے بعض شہروں مثلاً ہوبے وغیرہ کے پان قدرتی طور پر بہت اچھے اور اعلیٰ درجے کے ہوتے ہیں۔

اطراف لکھنؤ میں اگرچہ پان کثرت سے پیدا ہوتے ہیں مگر ان میں بالذات کوئی خاص خوبی و فوقیت نہیں ہوتی۔ مگر یہاں کے ترقی پسند اُمرا کی توجہ سے تنبلیوں، دپان، والون، اسے منستی اصول پر پانوں کو ترقی دینا شروع کی۔ اور اس درجے پر پہنچا دیا کہ یہاں کے پان سب جگہ سے بڑھ گئے۔ وہ پانوں کو حمیتوں زمین میں دفن کر کے رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کا کچا پن دُور ہو جاتا ہے۔ ہر اسند بالکل نہیں باقی رہتی ہے۔ رنگین نازک اور نرم ہو جاتی ہیں۔ رنگ میں سفیدی اور نیلگی آ جاتی ہے۔ کچے پان میں جو ایک طرح کی تیزی ہوتی ہے وہ بھی جاتی رہتی ہے۔ اور ایسا نرم اور نازک اور لطیف ہو جاتا ہے کہ کسی جگہ کا پان خمرے اور لطفت میں اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہی ہٹے ہوئے پان نیلگی پان کہلاتے ہیں جو دُور دُور کے شہروں میں جاتے اور نہایت ہی شوق اور بڑی قدر سے لیے جاتے ہیں۔

پان کے بچے کے بعد چُونا ہے۔ ہر جگہ اور ہر شہر میں معمولی چُونا استعمال ہوتا ہے جو اکثر چھٹا ہوا صاف بھی نہیں ہوتا۔ ماسوا اس کے چُونا نہایت ہی تیز اور اکال چیز ہے۔ نیا تازہ چُونا ہوا یا زیادہ ہو گیا تو منہ کٹ جاتا ہے۔ ان مضروں سے بچنے کے لیے یہاں یہ تدبیر کی جاتی ہے کہ اُسے خوب چھان کے اور صاف کر کے اُس میں تھوڑی سی بالائی یا تازے دی کا توڑ چھان کر لادیں۔ ہن۔ اس طریقے سے لکھنؤ کے نفیس مزاج لوگوں کے پانڈوں میں ایسا اچھا خوشگوار۔ لطیف اور بے ضرر چُونا ہوتا ہے کہ اور جگہ نہیں نصیب ہو سکتا۔

دوسری چیز پان کے لوازم میں سے کہتے ہیں۔ کھٹہ سجائے خود نہایت ہی بکھٹی۔ کڑوی۔ اور بد مزہ چیز ہے۔ پان میں وہ فقط چُونے کی اصلاح اور اچھا رنگ پیدا کرنے کی غرض سے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اُس کا بکھٹا پن بہت ناگوار گذرتا ہے جو عادت ہو جانے سے چاہے گوارا ہو جائے۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک بد مزہ چیز ہے۔ کھٹے کے بنانے کی یہ تدبیر تو سب جگہ عام ہے کہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے اُسے پانی میں پکاتے ہیں اور جب خوش کھا کر وہ سرخ شربت سا ہو جاتا ہے تو کپڑے میں چھان کر پانی میں رکھ کے

جھا لیتے ہیں۔ عام طور پر سب جگہ اتنا ہی ہوتا ہے مگر یہاں ایک طباق یا تو سے  
میں راکھ پھیر کے اُس پر ایک کپڑا ڈالتے ہیں۔ اور اُس کپڑے پر اُس جے ہوئے  
کچھ کو روٹی کی طرح پھیلا دیتے ہیں اور اُس پر بار بار پانی چھڑکے قبلے ہیں  
پانی اُس کی سرخی کو لے کر جس میں بکھڑا پن ہوتا ہے راکھ میں جذب ہو جاتا ہے  
اس طرح صاف کرتے کرتے کچھ کا فقط وہ لطیف ترین حصہ باقی رہ جاتا ہے  
جو دھوئے کپڑے کا سافید اور نہایت ہی نفیس ہوتا ہے۔ پھر اُس میں کوڑے  
کی خوشبودار کرایا کوڑے کے پھولوں میں راکھ کر خشک کر لیتے ہیں۔ اس تہ پر  
بعض اور مقامات میں بھی اب عمل ہونے لگا ہے۔ مگر یہ ایجاد لکھنؤ ہی کی ہے۔ اچھا  
جس تکمیل کے ساتھ یہاں اُس پر عمل ہوتا ہے اور کہیں ہو بھی نہیں سکتا۔ اب  
اس قسم کا کھانا اکثر تاجر لکھنؤ میں تیار کر کے فروخت بھی کرے لگے ہیں جن میں سے  
اگر سے کریم مہربان قاضی محمد یونس صاحب مقیم محمود لکھنؤ نے بہت شہرت  
حاصل کی ہے۔ مگر نفاست پسند امرا کے گھروں میں جو مفید۔ اچھا اور صاف  
کھانا خود ہی بنایا جاتا ہے۔ وہ اس قدر نفیس ہوتا ہے کہ اُس کی نفاست کو  
بازار والوں کا تیار کیا ہو کھانا چاہے کیسا ہی اچھا ہو نہیں چوچ سکتا۔ دکن کے  
شہروں پرانا وغیرہ میں ایک نئی طرح کا بنا ہوا خشک کھانا بازار میں ملتا ہے۔  
جو سوکھا ہی پان میں ڈالا جاتا ہے۔ وہاں کے لوگوں کو وہ کھانا پسند بھی ہے  
مگر ہم باوجود کوشش کے اُس کی خوبیوں کو نہ محسوس کر سکے اور نہ سمجھ سکے۔  
اس لیے کہ بظاہر وہ کرکیر بھی ہوا کرتا ہے اور کھانا بن اُس میں اصلی بے  
ہے کچھ سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

پان کے سالوں میں تیسری چیز ڈلیان ہیں جو سردی سے کاٹ کے اور چھوٹے  
چھوٹے ٹکڑے کر کے پان میں ڈالی جاتی ہیں۔ ان کا کاٹنا ایک مہوئی چیز تھا  
مگر لکھنؤ میں ڈلیوں کا کاٹنا بھی ایک صنعت بن گیا۔ اس لئے کہ اب اکثر خاتونین  
باجرے کے دانوں کے برابر باریک کاٹی ہیں جس میں سب دانے برابر اور  
کیساں ہوتے ہیں۔ اور پھر اس شرط کے ساتھ کہ چورا زیادہ نہ نکلے اور ڈلی  
کا کوئی حصہ ضائع نہ ہو جائے۔

الہا چچون میں کسی اصلاح کی گنجائش ابھی تک محسوس نہیں ہوئی اس لیے کہ جیسی آتی ہیں ویسی ہی استعمال ہوتی ہیں۔ مگر لکھنات نے اتنا ضرور کیا کہ خاص تقریبوں میں اور خاص موقعوں پر ان میں چاندی کا ورق لگا دیا جاتا ہے۔ اور جب خاص اداں یا فقہالی میں رکھی جاتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ چاندی کے چمکتے ہوئے ٹکڑے رکھے ہیں۔

اس کے بعد تنبا کو ہے۔ تنبا کو کا استعمال دھوبیوں کی صورت میں جس طرح عالمگیر ہے اسی طرح کھانے میں بھی اس کا رواج بڑھتا جاتا ہے۔ انگلستان میں میں نے بہت سے انگریزوں کو دیکھا جو تنبا کو کی خشک پتی مل کر پھانک لیا کرتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی مدت سے خشک تنبا کو کے کھانے کا رواج چلا آتا ہے۔ جس کو دہلی میں اس کی سنہری رنگت کے لحاظ سے زردہ کہتے ہیں۔ پہلے فقط غیر بد برا اور غیر اصلاح شدہ پتی کو پاں میں ڈال کر کھا یا کرتے تھے۔ مگر آگے ہی دنوں یہ بھی رواج تھا کہ بہت سے گھروں میں تنبا کو کی پتی میں اس کے ڈنٹھاروں کو بال کر اور اس کے عرق میں چند اعتدال پر لائے والے خوشبودار مسالے ملا کر تنبا کو کی کرواہٹ اپنے مذاق کے مطابق لکھنیا پر عادی جاتی۔ اور لطافت و خوشگوار سی کے ساتھ اس میں ایک چائیزا خوشبو بھی پیدا کر دی جاتی۔ مگر یہ تدبیر مخصوص گھروں اور خاندانوں تک محدود تھی۔ عام لوگ تنبا کو کی پتی ہی بغیر بنائے کھاتے۔ جو ہر پانڈان میں موجود رہا کرتی۔ لیکن اب تقریباً بیس برس ہوئے منشی سید حسین صاحب نے اپنی ایجا د سے ایک خاص قسم کا بنا ہوا تنبا کو جس کی صورت ٹریسے دار بازوت کی سی ہوتی ہے ملک کے سامنے پیش کیا۔ اور وہ ایسا مقبول ہوا کہ چند ہی سال کے اندر بے بنی پتی کے کھانے کا رواج قریب قریب اٹھ گیا۔

(۵۱)

تنبا کو میں پتی کی اصلاح سے پہلے جس کا سہرا ہمارے کرم دوست منشی سید احمد حسین صاحب کے سر ہے۔ اصلاح کی ایک اور کامیاب کوشش کی گئی۔ وہ یہ



کہ تبا کو کی پتی اور ڈھٹھلون کو خوب اچھی طرح اُبال کر اُس کا عرق نکال لیا جاتا ہے اور پکاتے پکاتے وہ اس قدر گاڑھا کر دیا جاتا ہے کہ لیٹی یا تازیانیوں کی سی شکل ہو جاتی ہے۔ پھر اُس میں مشک۔ کیوڑا۔ اور بہت سی مناسب خوشبوؤں میں ملا کے اس درجہ لطیف و معطر بنا دیا جاتا ہے کہ پان کے ساتھ۔ تی پر ابھر توام کھائیے تو تبا کو کا مزہ آنے کے ساتھ منہ میں دن بھر خوشبو آتی رہتی ہے۔ پھر تقاست فراہمی نے اس پر اور زیادہ ترقی کی۔ یعنی اُس توام کی بھی بھی گولیاں بنائی جاتی ہیں۔ اور ہر گولی ایک خوراک کی مقدار میں ہوتی ہے۔ پھر گولیوں پر چاندی یا سونے کے ورق چھپے کر اُن کو ایسا خوشنما اور دلچسپ بنا دیا جاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے موتی رکھے ہوئے ہیں۔ قوم اور گولیوں کو مفتی گنج کی ایک سلیم صاحب بے شل بناتی تھیں۔ خاص لکھنؤ والوں کو اُنکے ہاتھ کی بنی ہوئی گولیوں کے سوا کسی کا رخائے کی گولیاں نہیں پسند تھیں۔ مگر انھیں کے زمانے میں اصغر علی محمد علی کے کا رخائے نے ان دونوں پر دن کو تیار کر کے سارے ہندوستان کے سامنے پیش کر دیا۔ چند روز بعد ان سلیم صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اور ہر جگہ اصغر علی کے کا۔ خلت ہی کے توام اور گولیوں کا رواج ہو گیا۔ بعد ازاں اور بہت سے لوگوں اور متعدد کارخانوں نے ان چیزوں کو اپنے اہتمام سے تیار کیا۔ مگر ابھی تک کوئی بھی اصغر علی مرحوم کے کا رخائے سے سبقت نہیں لے جاسکا۔ لیکن توام اور کوئی بن ایک عیب تھا۔ وہ یہ کہ چاہے خوشبو دیر تک ٹھہر جائے مگر تبا کو کا مزہ اور اُس کا کڑواہٹ پر پہلی ہی پلک میں جاتا رہتا۔ اسی عیب کو مٹانے کے لیے منشی سید احمد حسین صاحب نے یہ جدید مدبہ معطر پتی ایجاد کی جس کی تلخی اور عطریات آخر تک پان کا ساتھ دے جاتی ہے۔ اور اسی خوبی کا نتیجہ ہے کہ یکایک دنیا کا رخ اس طرح پھر گیا۔ اور توام اور گولیاں گویا اب بھی تیار کی جاتی ہیں مگر تقویم پارینہ ہو گئیں۔ اور اُن کا مذاق اگھٹنے کی ہی رہتا رہی تو اُمید ہے کہ تھوڑے زمانے میں بالکل مٹ جائیں گی۔

پان ہی کے متعلق یا اُسکی مناسبت سے لکھنؤ میں چند اور ایجادیں ہوئیں مثلاً ایسی الائچیوں ایجاد کی گئیں کہ ایک الائچی کھائیے تو منہ پان سے زیادہ سرخ ہو جائے۔ ان کی تیاری میں اگرچہ پان ہی کے اجزاء سے کام لیا جاتا ہے جو رنگ ملا کر الائچی کے

چھلکون میں بھر دیے جاتے ہیں مگر بجز اسکے کہ رنگ چو کھا آتا ہے وہ پان کا بزیل نہیں ہو سکتیں۔ اور کسی کپان کھانے کی غرض اُن مصنوعی الائچیوں سے نہیں حاصل ہو سکتی۔ اسی طرح ایک اور قسم کی الائچیاں تیار کی گئیں جن میں سی بھر دی جاتی ہے۔ اور عورتیں بچاے اس کے کہ دیر تک بیٹھ کر مستی ملین اس قسم کی ایک الائچی پان میں ڈال کر کھالیں تو مستی خود بخود لگ جاتی ہے۔ اور گہری نیلوتی خوب اچھی طرح ریخون میں جم کر میٹھ جاتی ہے۔ مگر ان دونوں قسم کی الائچیوں سے وہ مقصد بخوبی نہ حاصل ہو سکا جس کے لیے ایجاد کی گئی ہیں۔ مثلاً سرخ الائچیاں پان کا بدل نہیں ہو سکتیں۔ اور سیاہ الائچیوں میں عمدہ معطر سی کی خوشبو نہیں ہوتی اس لیے عام پسند اور مقبول نہ ہو سکیں۔ اور آج تک اُن سے بجز مذاق اور دلگی کے کوئی ضروری کام نہیں لیا جاسکتا جو لازمہ معاشرت ہو۔

اسی سلسلے میں ہمیں چکنی ڈلی کو بھی بیان کر دینا چاہیے جو اگر پان کا جزو بالائیک نہیں تو اُس کے لواحق میں ضرور ہے۔ بعض لوگ معمولی ڈلیوں کے عوض اُسے پان میں کھاتے ہیں۔ اور پان میں نہ کھائیں تو بہت سے لوگ اسے تھما منہ میں رکھتے ہی جو الائچی کے ساتھ مل کر بہت لطف دیتی ہے۔ خصوصاً ہندو جاپا چونکہ مسلمانوں کے ہاتھ کی گھوری نہیں کھا سکتے اس لیے اُن کی خاطر و تواضع محض چکنی ڈلی اور الائچی ہی سے ہوتی ہے۔ لہذا وہ بھی معاشرت کا ایک ضروری سامان بن گئی ہے۔

چکنی ڈلی دراصل وہی ڈلی ہے جو پانوں میں ڈالی جاتی ہے۔ مگر دبر اور اصلاح شدہ۔ یہ لکھنؤ یا دہلی یا حیدرآباد یا دیگر متدن شہروں میں نہیں بنتی بلکہ جہاں پیدا ہوتی ہے وہیں سے بنی بنائی آتی ہے۔ کہنا جاتا ہے کہ اصلی ڈلی کو دودھ میں ڈال کے اُبلاتے اور پکاتے ہیں۔ غیر جس طرح بنتی ہو۔ اُس میں ایک لعاب پیدا ہو جاتا ہے خشکی دفع ہو کے دُھنیت آ جاتی ہے۔ اور بعض اوقات زیادہ ڈلی کھا جانے سے گلے میں جو پھندا پڑ جاتا ہے وہ عیب چکنی ڈلی میں بالکل نہیں باقی رہتا۔ اور سچ یہ ہے کہ معمولی ڈلی سے بزرگ زیادہ بامزہ۔ لطیف و نفیس ہو جاتی ہے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے چکنی ڈلی کا رواج حیدرآباد - دہلی اور دیگر شہروں میں لکھنؤ کے مقابل بہت زیادہ ہے۔ اور انھیں مقامات کے شوقینوں کا کام تھا کہ اُس میں کسی قسم کی اصلاح کرتے یا اُس کو اپنے مذاق میں ترقی دیتے۔ مگر تعجب ہے کہ کسی شہر میں اس جانب توجہ نہ کی گئی۔ اور چکنی ڈلی کی بھی اصلاح کی تو لکھنؤ والوں نے۔ چکنی ڈلی کا اصلی مغز نہایت لطیف - خوش مزہ و نازک ہوتا ہے اور جو حصہ قشر سے ملا ہوتا ہے کسی قدر بکھٹا رہ جاتا ہے۔ خصوصاً پمندی کی طرف کا حصہ بہت زیادہ ناقص ہوتا ہے۔ انھیں عیوب کے مٹانے اور ناقص حصے کے نکال ڈالنے کے خیال سے لکھنؤ میں کاٹ چھانٹ کر معمولی چکنی ڈلیاں کئی قسم کی تیار ہونے لگیں۔ سب سے اول تو دورخی کھلاتی ہیں۔ اُن کے بننے کی شان یہ ہے کہ نیچے اوپر سے زیادہ تر حصے کو اور تھوڑے تھوڑے کناروں کو گرد سے کاٹ کر خوش رنگ کٹوریاں سی بنادی جاتی ہیں جن میں نقطہ وہی نرم و لطیف مغز رہ جاتا ہے جو چکنی ڈلی کا بہترین حصہ ہے۔ دوسرے درجے کی چکنی ڈلیاں یکسورخی کھلاتی ہیں۔ اُن میں بھی اگرچہ چاروں طرف سے تھوڑی بہت کاٹ چھانٹ ہوتی ہے۔ مگر نیچے اوپر کے دونوں ناقص حصوں میں سے ایک طرف کا زیادہ تر حصہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ تیسری قسم یہ ہے کہ چکنی ڈلی کے مغز کے خوشگوار ہشت پہل ٹرے بنادیے جاتے ہیں۔ اس کاٹ چھانٹ میں جو چورہ نکلتا ہے وہ جدا گانہ فروخت ہوتا ہے۔ اور دراصل لکھنؤ میں وہ مدہ چکنی ڈلی کی پانچویں قسم بن گیا ہے۔ پھر اُس کی بھی دو تین قسمیں ہو گئی ہیں۔ اس لیے کہ دورخی اور یکسورخی ڈلیوں میں سے جو چورہ نکلتا ہے وہ الگ رہتا ہے۔ اور دونوں کی لطافت - نرمی - اور مرے میں نہایت فرق ہوتا ہے۔ اور اسی وجہ سے اُن کی قیمتوں میں بھی زمین و آسمان کا فرق پایا کرتا ہے۔ اگرچہ چکنی ڈلی اگرچہ اس قدر زیادہ لکھنؤ والوں کے شوق کی چیز نہیں ہے۔ مگر اسکی اصلاح بھی اُنھوں نے اس قدر کی جو کسی جگہ نہیں ہو سکی تھی۔

اب چونکہ پان کے اجزاء ختم ہو گئے لہذا ہم اُسکے ظروف و آلات کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ پانوں کا سامان رکھنے کی سب سے اہم چیز پانوں کی پانوں

کی گلواریوں میں جو قوت برقی کی سہی و خلاقی اور معشوقانہ کشش ہوتی ہے اسی بیٹری  
پاندان ہے۔ اگلے زمانے میں خصوصاً دہلی میں پٹاری ہو کر تھی جو کول اور مربع  
یا ہشت پہل سب قطعوں کی ہوتی ہیں۔ اور غالباً دہلی ہی سے حیدرآباد میں پٹاری کا  
پاندان گئے۔ جن کی نقل وہ ٹین اور شیشے کے مربع پاندان ہوتے ہیں جو حیدرآباد  
کی شاہیوں میں کمال فیاضی سے چونا لکھتا۔ ڈلیان۔ چکنی ڈلیان۔ لالچیان۔  
لوگین اور پان وغیرہ رکھ کر مکانوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ بہر حال پرانے پاندان  
ٹھیک پٹاریاں تھیں۔ اور انھیں پٹاریوں کو ساتھ لیے ہوئے دو ڈیڑھ صدیوں پیشتر کی  
محترم خاتونیں دہلی سے لکھنؤ میں آئی تھیں۔ یہاں جب تک دہلی کی تقلید رہی وہی  
پٹاریاں رہیں۔ مگر جس دن سے لکھنؤ والوں نے اپنی وضع۔ معاشرت اور زبان  
میں اپنی تراش خراش شروع کی اُس روز سے پاندانوں کا نقشہ بھی بدلنا شروع  
ہو گیا۔ پہلے تو پان رکھنے کے لیے فقط تانبے کی قلعی دار گول پٹاریاں اختیار کی گئیں۔  
پھر اُنکے ڈھکنے میں لمبائی اور گولائی پیدا ہونا شروع ہوئی۔ چند روز میں اُن کی  
قطع ایک چوڑے تقریبی قے کی سی ہو گئی۔ جس پر چونٹی کی جگہ گرفت کے لیے ایک  
لمبو تراکڑا لگا دیا جاتا ہے۔ کمرے کے درون سرے گدھڑوں میں بٹھا دیے جاتے  
ہیں۔ چنانچہ بجائے اوپر کی طرف قائم رہنے کے وہ ادھر اُدھر پڑا رہتا ہے۔  
اس پاندان کے اندر دو کٹے چوڑے کی کھیاں ہوتی ہیں۔ جن کی قطع بعینہ چھوٹی ٹیلیوں  
کی سی ہوتی ہے۔ انھیں کھپوں کے سلسلے میں تین برابر کی بڑی ڈلیان ہوتی ہیں۔  
جن میں سے بعض میں مسلم اور بعض میں کٹی ہوئی ڈلیان اور چکنی ڈلیان رکھی جاتی  
ہیں۔ یہ تینوں ڈلیان اور دونوں کھیاں برابر ایک حلقے میں جبی رہتی ہیں اور  
اُنکے بیچ میں بیٹی مرکز کے مقام پر جو جگہ چھوٹی ہے اُس میں ایک اور چھوٹی ڈلیا  
رکھ دی جاتی ہے۔ جس میں علی العموم لالچیان یا لوگین رکھی جاتی ہیں۔ ڈلیوں  
کے ڈھکنے کسے ہوئے ہوتے ہیں۔ خود بخود نہیں کھل سکتے بلکہ کھلنے میں بخوڑا بہت  
زور دینا پڑتا ہے۔ مگر کھپوں کے ڈھکنے بھالی نہ ہوتے ہیں جو اُن کے منہ پر رکھ دیے  
جاتے ہیں۔ کٹے چوڑے کی کھپوں میں کھنا چونا لگانے کی چھپان ہوتی ہیں جن کے  
سروں پر کبھی تو مور بنا دیا جاتا ہے اور کبھی ساوی رہتی ہیں۔ ان کھپوں کے اوپر

ایک بڑی پورے پاندان بھر کی تھالی ہوتی ہے جس میں پان کپڑے میں لپیٹ کر رکھ دیے جاتے ہیں۔ اگلے دن ایک اور پان کی قطع کا جداگانہ ڈھکنے دار ظرف ہوتا تھا۔ جس میں پان رکھے جاتے۔ وہ ناگردان کہلاتا تھا۔ مگر تجربے نے اُسکو غیر ضروری اور ناقص ثابت کیا۔ اس لیے کہ اُس میں بند کر دینے سے ہوا نہ لگتی اور پان خراب ہو جاتے۔ اسی وجہ سے ناگردان اگرچہ بعض بعض پرانے پاندانوں میں اب بھی نظر آ جاتا ہے مگر دراصل اُس کا رواج بالکل چھوٹ گیا۔ اور غریب عفا ہو جائے گا۔

چند روز میں پاندان عورتوں کو صندوق - خزانے - اور کیش بکس کا کام دینے لگا اور عورتوں کے لیے سچ یہ ہے کہ وہ ہندوستان میں عمر و عیار کی ذمیل تھا۔ اس ضرورت سے وہ دھند اور جسم میں بڑھتا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ دس دس سیر اور بیس بیس سیر کے پاندان بننے لگے۔ اور پھر سخت مزدوری تھا کہ کھان جاتے ہیں ہر جگہ وہ ساتھ رہے۔ اس لیے کہ مہدیق "شکھ بمقدار علم" جتنا بڑا پاندان ہوتا تھا اتنی ہی بڑی سلیم صاحب کی حیثیت و وجاہت سمجھی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈولی میں ساری جگہ پاندان لے لیا کرتا۔ اور یکم صاحب کو بڑی مشکوں سے دبے اور سمٹنے کے بعد بیٹھنے کو جگہ ملتی۔ ہر تقدیر پاندان وزن اور تارست میں روزانہ وزن ترقی کرتے جاتے تھے کہ بکایک اختصار پسندی نے نئی طرح کے چھوٹے۔ بلند۔ گنبد نما اور کلس دار پاندان ایجاد کیے جو پہلے تو آرام دان کہلاتے تھے مگر اب عموماً حسن و ان کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ان میں اندر تو وہی چیزیں ہوتی ہیں جو پاندان میں ہیں۔ مگر بیرونی قطع ایک کلس دار خوشنما گنبد کی سی ہوتی ہے۔ اور بجائے کپڑے کے اُسی کلس یا چوٹی کو پکڑ کے اٹھایا جاتا ہے۔ یہ حسن دان عموماً پسند کیے گئے۔ لکھنؤ میں بھی اور دیگر بلاد میں بھی ان کی مانگ بڑھی۔ لکھنؤ میں پہلے پہل ان کو مردوں نے اختیار کیا۔ یا ان لوگوں نے جو نائیش اور دکھاوے کو پسند نہیں کرتے ہیں۔ مگر چند روز میں عام ہو گیا۔ اور گوکہ اگلی وضع کے پاندان جن میں سے گراپ زیادہ رواج حسن دانوں ہی کا ہے۔ اور جن گھروں میں پاندان باقی بھی ہیں تو اتنے بڑے منین بلکہ چھوٹے۔ اب مراد آباد میں بھی ایسے ہی لکھنؤ کی وضع کے

حسن دان بننے لگے ہیں۔ مگر وہ زیادہ پھیلے ہوئے ہیں اور اس قدر خوبصورت نہیں ہوتے جیسے کہ لکھنؤ میں بنائے جاتے ہیں۔ لکھنؤ کے حسن دانوں کا تناسب ہی ایک چیز ہے جو یہاں کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور کسی جگہ کے کاریگروں سے اس تناسب کا قائم رہنا قریب قریب غیر ممکن ہے۔

پانڈان کے بعد خامدان ہے۔ یہ وہ ظرف ہے جس میں رکھ کے گوریان محفل یا صحبت احباب میں لائی جاتی ہیں۔ دہلی میں یہ کام ایک کھلی ہوئی تھالی دیتی ہے جس میں ایک طرف کتری ہوئی ڈلیاں رکھ دی جاتی ہیں۔ اور دوسری طرف آدھے آدھے پان چٹا کھٹا لگا کر اور دوسرا کے یعنی موڑ کر رکھ دیے جاتے ہیں۔ اور چونکہ اب بھی وہاں ہی تھالی مروج ہے اس لیے امید ہے کہ اگلے زمانے میں بھی پانوں کے صحبت میں لانے کا یہی طریقہ ہوگا۔ مگر لکھنؤ میں کم از کم دو پانوں کی گوریان بنائی جاتی ہیں۔ جو پہلے تو سنگھڑے کی وضع کی خوب گھٹی ہوئی ہوتی تھیں۔ اب عموماً پیرے ہوتے ہیں۔ اور ان کی قطع سی ہوتی ہے جیسی کہ بوتلوں میں لگانے کے لیے کاغذ کی ڈانٹ بنائی جاتی ہے۔ پھر اس کے قائم رکھنے کے لیے کیلین لگا دی جاتی ہیں۔ پہلے لونگین لگا دی جاتی تھیں۔ بعد ازاں زنجیروں کا ایک لچھا ایجاد ہوا۔ لچھے کی صورت یہ ہے کہ چاندی کی ایک چھوٹی ڈبیا یا کیری نما عطر دان میں چاروں طرف بہت سی زنجیریں لگا دی جاتی ہیں جن میں کیلین لگی ہوتی ہیں۔ یہ پورا لچھا پانوں کے خامدان میں رکھ دیا جاتا ہے۔ مگر اس کو قطوں خیال کر کے یہ رواج ہو گیا کہ گوریوں میں لوہے کی کیلین لگا دی جایا کریں۔ مگر اب سب سے اچھا طریقہ یہ ایجاد ہوا ہے کہ گوری کے اوپر پان ہی کا ایک غلاف پڑھا دیا جاتا ہے جو اس کو کھلنے نہیں دیتا۔

بہر حال ان گوریوں کے لیے صرف تھالی مناسب نہ تھی۔ اسی لیے اس تھالی پر ایک گنبد نما کلس دار ڈھکنا ایجاد کیا گیا جس کو تھالی پر لپکا کرتی۔ ڈھکے نے خامدان کی صورت بھی چھوٹے حسن دان کی سی کر دی۔

پانوں کی گوریوں رکھنے کے لیے اگرچہ خامدان میں بہت ترقی کی گئی۔ اسکی خوشنمائی و نظرقری میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا گیا۔ مگر جب یہ نظر آیا کہ گرمیوں کے موسم میں تھپے کے قلعے کیلے ہوسے خامدان جل اٹھتے ہیں۔ اور ان میں رکھنے سے پُر لکھت گوریوں کے خشک ہونے کے علاوہ وہ ایسی گرم ہو جاتی ہیں کہ کھانے میں بجائے تفریح کے تکلیف ہوتی ہے۔ اور بعض تسکین کے منہ خشک ہو جاتا ہے تو اس موسم میں اُنکے رکھنے کے لیے سٹی کی کوری ہانڈیاں اختیار کی گئیں جن میں پان ٹھنڈے رہتے ہیں۔ اُن کی تازگی و فرحت بخشی میں اور ترقی ہو جاتی ہے۔ اور اُن میں نہایت ہی سوندھاپن پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ کاغذی ہانڈیاں لکھنؤ میں ایسی سبک۔ خوشنما اور ورق کی سی باریک بنتی ہیں کہ اور کسی جگہ نہیں بن سکتیں جب اُن کو پانی میں بھگو کے اور اُن میں گوریوں رکھ کے سامنے لائی جاتی ہیں تو پان تو بے کھایا جائے گا اُن کی صورت دیکھتے ہی آنکھوں میں تازگی آ جاتی ہے۔

پھر اُمرا کے لکھت نے اس خیال سے کہ انکو باریا بھگوانا دشوار ہے اور جب تک پانی میں تر نہ ہوں اُن میں لکھت نہیں آ سکتا۔ اُن پر کپڑا منڈھا۔ تاکہ کپڑا انکو تر رکھے۔ اور معمولی سفید کپڑا چونکہ جلدی میلا ہو جاتا ہے اور گوریوں رکھنے کی وجہ سے اُن میں جا بجا سرخ دھبے پڑ جاتے ہیں اس لیے بجائے سفید کے اُن پر سرخ ٹول منڈھا گیا چونکہ جلدی میلا ہوتا ہے اور نہ پان کے دھبے اُسکو برنگ کر سکتے ہیں۔ زیادہ آراستگی کے لیے ان ہانڈیوں میں ٹول پر باریک دھبلی دھنک سے پھاٹکین سی بنا دی جاتی ہیں۔ جن چیزوں سے پان کی ہانڈیوں کو بنا سنوار کے دولہن بنا دیا۔

تاہے کے خامدان بھی عموماً غلاف میں بندھے رہتے ہیں۔ اور اسی طرح کے غلافوں کا رواج پانڈیوں اور سُن دانوں کے متعلق بھی ہے۔ جو بڑے اہتمام سے حسب درجہ و سالت پُر لکھت بنائے جاتے ہیں جن میں فقط حفاظت ہی نہیں آرائش بھی ملحوظ خاطر ہوتی ہے۔

ایسا ہی ٹول دھنک کے ساتھ مراحوں پر بھی منڈھا جاتا ہے۔ جسکی وجہ سے

سرا میون میں پانی خوب ٹھنڈا رہتا ہے۔ اور اُنکی صورت دیکھتے ہی بے پیاس کے پانی پی لینے کو جی چاہتا ہے۔

پان لکھانے والوں کو اکثر پیک تھوکنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ جس کے لیے بار بار اُٹھنا زحمت سے خالی نہیں۔ اور پھر جن کمرون میں پُر تکلف فرش بچھا ہو تھوکنے کو جگہ مشکل سے اور دُور جا کے ملتی ہے۔ اور جگہ ملے بھی تو پیک کے دھبوں سے مکان خراب ہوتا ہے۔ اس لیے پان ہی کے سلسلے میں ایک اونٹن کی ضرورت پیش آئی جو تھوکنے کے لیے ہو۔ یہ طرف اُگالداں کہلاتا ہے۔ اگالداں کوئی نئی چیز نہیں جس کو لکھنؤ کے ساتھ خصوصیت ہو۔ پہلے اُگالداں غالباً دہلی میں ایجاد ہوئے اور وہ بنیہ لکھنؤ میں منتقل ہو آئے۔ اُن کی قطع یہ تھی کہ نیچے گول مینڈا اُسکے اوپر ایک گول ٹوٹو پھرا سکے اور کول نہا نہا۔ یہ اُگالداں تانبے میں اور جھت کے ہر جگہ بننے لگے۔ بیدر میں اُن پر وہاں کا بے نظیر برسی کا کام بنا لکھنؤ میں تانبے پر نقاشی کا کام بنایا گیا۔ پھر مرآد آباد میں بنے اور اُن پر وہاں کی نفیس نقاشی ہوئی۔ لکھنؤ میں پھر سٹی کے اُگالداں اُسی قطع کے بننے لگے۔

مگر اُن میں خرابی یہ تھی کہ اُن کے نیچے کا حصہ ہلکا اور اوپر کا زیادہ پھیلاؤ کی وجہ سے وزنی ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ اکثر بے احتیاطی یا غفلت میں گر جاتے۔ اور فرش خراب ہوتا۔ اس عیب کے دور کرنے کے لیے جے پور۔ حیدرآباد۔ اور اُسکے بعد مرآد آباد میں ایک دوسری قطع کے اُگالداں بننے لگے جو شاید دہلی ہی کے ایجاد ہوں۔ اُنکی قطع کہا روں کی ہڑک یا مدارسی کی ٹوگڈگی کی سی ہوتی ہے۔ اور لکھنؤ میں بھی بہت سے لوگوں کو اس قسم کے اُگالداں اختیار کر لینا پڑے۔ اگرچہ یہاں ابھی تک بُرائی وضع چھوٹی نہیں اور اُسی وضع کے بہت بڑے بڑے اُگالداں اب بھی بنتے ہیں مگر اب بہت سے کمرون میں اس نئی وضع کے بھی موجود ہیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ اُگالداں کی ایجاد دو ترقی میں لکھنؤ کو کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ اگرچہ اُنکا رواج لکھنؤ میں ہندوستان کے تمام شہروں سے زیادہ ہے۔

اب ایک نئی قطع کے بیٹھے اور پھیلے ہوئے انگریزی اُگالداں بھی آتے ہیں جو چینی اور تام چینی کے ہوتے ہیں۔ مگر وہ غالباً چڑ پیتے وقت تھوکنے کے لیے ہیں۔ پان



کی پیک تھوکنے کے لیے بالکل موزون نہیں ہیں۔

خامدان کے بعد امرا اور خوش باش لوگوں کے ہمراہی سامان میں پانی کی لوٹیاں بھی ہے جو خدمتگاروں کے پاس رکھ کر تھیں۔ اعلیٰ العوم یہ تانبے کی اوسط درجے کی سادہ یا نقشی لوٹیاں ہوا کرتی ہیں جن لوگوں کو خدائے استعانت دی ہے اور اسکے ساتھ یہ بھی ہے کہ امارت و دولتندی نے اُن کو پابندی شرع سے آزاد کر دیا ہے وہ چاندی کی لوٹیاں ساتھ رکھتے ہیں۔

لوٹیاں پُرانی ہندوؤں کے عہد کی چیز ہے جو ایک بے ٹوٹی کا گول ظرت ہوتا تھا جس کا منہ پیٹ سے چھوٹا ہوتا۔ اور چونکہ کوئین سے پانی بھرنے کی اکثر ضرورت پیش آیا کرتی اس لیے ہر مسافر کے ساتھ سفر میں لوٹیاں ڈوری ضرور رکھ کر تھیں۔ اور دیہات کے ہندوؤں اور نیز وہاں کے ادنیٰ طبقے کے مسلمانوں میں آج تک اُسی اگلی شان میں اس کا رواج ہے۔ مسلمانوں نے اپنے زمانے میں اُس لوٹیا میں ٹوٹی لگا دی تاکہ پانی کے استعمال میں آسانی ہو۔

میں نہیں جانتا کہ دہلی کے امرا میں بھی یہ رواج تھا۔ اور جن لوگوں کے ساتھ خدمتگاراں رہا کرتے تو اُن کے پاس لوٹیاں بھی ضرور ہوتی جو پانی پینے، گلی کرانے اور دیگر ضرورتوں میں کام آیا کرتی۔ مگر لوٹیا کی موجودہ قطع اور اسکی خوشنالی میں لکھنؤ کو بڑا دخل ہے۔ جس کا حال ہم تانبے کے برتنوں کے سلسلے میں بیان کریں گے۔

گرمیوں میں رنگین کپڑے کا منڈھا ہوا اچھا لہر دار نچکھا بھی خدمتگاروں کے پاس رہتا۔ اور بعد کے زمانے میں چھتری بھی لازم ہو گئی۔ جن کو دھوپ میں ڈکر آقا کے سر پر لگائے رہتا۔

گھروں کی اندرونی ضرورتوں میں ہاتھ دھونے کے لیے سلفی، آفتابہ۔ اور چونکہ مابلوں کا رواج نہ تھا اس لیے مین دانی بڑی ضروری چیزیں تھیں۔ سلفی، آفتابہ ہندوستان کے دولت مند گھرانوں کی پُرانی چیزیں ہیں جو دہلی میں خدائے کب سے مروج تھیں۔ اور اپنی قدیم وضع و شان سے لکھنؤ میں آگئیں۔ یہاں سلفی تو وہی رہی اور گلاب اُس کی جگہ تسلی کا زیادہ رواج ہو گیا ہے مگر یہ ہے کہ وہ سلفی کا بدل نہیں ہو سکتا۔ سلفی ایک گول پیٹ کا ظرت ہے جس کا منہ ذرا چھوٹا کر کے لکڑی میں ایک

اُٹھنے طشت کی وضع میں بہت زیادہ پھیلی ہوتی ہیں۔ اور منہ پر ایک پردے کی جالی رکھ دی جاتی ہے جس میں سے ہاتھ دھوئے نہیں سب پانی گر جاتا ہے۔ اس پردے کو جب چاہیں اُٹھا کر اُسکو خوب اچھی طرح صاف کر سکتے ہیں۔ اس جالی کے اوپر تھوڑی گھاس ڈال دی جاتی ہے کہ پانی کے گرنے میں چھینٹیں نہ اُڑیں۔ اس میں بہت بڑی خوبی اور نفاست یہ ہے کہ میلا پانی جس کی صورت کر یہ ہوتی ہے نظر کے سامنے نہیں رہتا۔ اور جن کے مزاج میں نفاست ہے اُن کو تکلیف ہوتی ہے۔ مگر آفتاب کے بلکہ لکھنؤ میں تو مارچ ہو گیا۔ دراصل آفتاب ہی پرانے زمانے کا لوٹا تھا۔ جس پر لکھنؤ کے مذاق نے تصرف کر کے موجودہ لوٹے کی سڈول شکل پیدا کی۔ پرانا لوٹا جو آفتاب کہلاتا اُس کی شکل یہ تھی کہ تانبے کا ایک مخروطی شکل کا ظرف ہوتا جس میں پیٹ اور گلے کا کچھ امتیاز نہ تھا۔ پندے کے پاس جتنا دور ہوتا وہ اوپر کی طرف تدریجاً گھٹتا چلا جاتا۔ آخر میں وہی گھلا ہو جاتا۔ یہاں تک کہ کنارے موڑ کے منہ بنا دیا جاتا اور ایک جانب اُس میں خمدار ٹوٹی لگا دی جاتی۔ اس شکل کے لوٹے حیدرآباد میں آج بھی مل جاتے ہیں جو اپنی قدامت اور ہمارے لوٹوں کے نقش اولین کا ثبوت دیتے ہیں۔ اُن کی شکل مصر و شام کے گلی ظروف آب یا انگریزوں کے یہاں منہ دھوئے کی بیڑ پر جو چینی کا جگ رہتا ہے اُس کی سی ہوتی۔ اور اسی سے خیال ہوتا ہے کہ مسلمان اس کو عرب و ایران سے اپنے ساتھ لائے ہوں گے۔ چند روز بعد ہندی تمدن کے اثر نے اُس میں پہلا تصرف یہ کیا کہ پیٹ گول بن کر گردن سے جدا اور تانر ہو گیا۔ مگر اصلیت کی قربت کے باعث لمبوٹا بن باقی تھا۔ یعنی عرض اور پھیلاؤ لمبائی کی مناسبت سے نہ تھا۔ اُس وقت تک پیٹ کی گھلائی بھی کرے کی مثل نہیں بلکہ بیضی وی تھی۔ یہی شکل اُس آفتابے کی ہے جس کا ذکر اردو کی اگلی شویوں اور قصے کہانیوں میں ہے۔ لکھنؤ میں یہ ہوا کہ پیٹ بیضی وی سے گروسی ہو گیا۔ اور جتنی لمبائی ہوتی اُسی کی مناسبت سے اُس کا دور اور پھیلاؤ بھی بڑھ گیا۔ گلوں میں ایک موزوں ڈھلاؤ ہو گیا اور ٹوٹی بھی ابتداءً وسیع اور نوک کے پاس تنگ خمدار اور بہت ہی خوشنما ہو گئی۔ یہ لکھنؤ کا موجودہ لوٹا ہے۔ جس سے زیادہ خوشنما اور سڈول لوٹے ہندوستان

کے کسی شہر میں نہیں بنتے۔ اور ہر جگہ کے شوقین فرائیشین کر کر کے لکھنے سے منگوا دیا کرتے ہیں۔ جو تناسب لوگوں میں بیان پیدا ہو گیا ہے چھوٹی لٹیا سے لیکر بڑے سے بڑے لوٹے تک سب میں نظر آتا ہے۔

اسی قسم کا مناسب تصرف تانبے کے تمام برتنوں میں ہوا ہے جس کو ہم آئینہ بیان کریں گے۔ اس لیے کہ اس محل پر اُسکے بتانے کا موقع نہیں ہے۔

تین دانی دراصل تانبے کی ایک بے ٹوٹی کی لٹیا ہوتی ہے جس میں تین بین بھرا رہتا ہے۔ عموماً کھانے کے بعد روہیت چھڑانے کے لیے اُس میں سے بین لیکر ملا جاتا ہے اور پھر پانی سے دھو ڈالا جاتا ہے۔ بعض گرجہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جو بین کی جگہ تین دانی میں مٹیا یا کھلی رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ بین کھانے کی چیز ہے جس کو ہاتھ دھونے میں منافع کرنا اُنکے خیال میں ناجائز بنا دیا جاتا ہے۔ مگر اب اس کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔ اس لیے کہ مٹیا دیوں کے سوا اور کسی موقع پر نہیں بتاتا۔ اور کھلی سے ہاتھ میں اُسکی تیز بو آئے لگتی ہے۔

(۵۳)

معاشرت کے بہت سے سامان ضروری اور آداب نشست و برخاست کو ہم اس سے پیشتر بیان کر چکے ہیں مگر ابھی ہم کو بیان کے شرفا کی باہر کی آمد و رفت کی وضع و شان بتانے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ سندھ و تان کے تمام شہروں کی طرح یہاں بھی انگریزیت اس قدر غالب آگئی ہے کہ ایشیا کے آخری تمدن میں جو وضع پیدا ہوئی تھی بالکل مٹ گئی۔ مگر ہم کو اس موقع پر وہی چیز بیان کرنا ہے جو مٹ چکی ہے یا مٹنے کے قریب ہے۔ لہذا ہم آج سے ساٹھ ستر برس پیشتر سے بھی پہلے زمانے میں نکلے چلتے ہیں۔ اور اُس زمانے کی تصویریں ناظرین کے پیش نظر کرتے ہیں جو اب کہیں نہیں نظر آ سکتیں۔

آج کل کی سی عمدہ موٹروں اور لمبی چوڑی فٹون اور لینڈ و گاڑیوں کے نہ ہونے سے اور نیز حال کے اصول حفظ صحت کے پیش نظر نہ ہونے کے باعث اُن دنوں آج کل کی سی لمبی چوڑی اور وسیع و کشادہ سڑکیں نہ تھیں۔ بلکہ تانگہ رکابہ تھیں جن میں ہاتھی۔ گھوڑے۔ اونٹ۔ ہوا دار۔ بوچے۔ فینین۔ میاں۔

سکھیا لہن - ڈولیان - رتھین - ہلین آدمیوں کی بھٹری میں سے ہٹو چو کرتی ہوئی  
ہر وقت گزرا کرتی تھیں - کیا ہی مرج عام بازار اور کیسی ہی پسندیدہ سیر گاہ  
ہو سب کی حالت بلا استثنا یہی تھی -

ایک اونٹ تو نہیں جو فوجی ضرورتوں - نامہ برقا صدون یا بار برداری کے  
لیے مخصوص تھے - باقی اور تمام سوار یاں شرفا و رؤسا میں حسب حالت و  
حیثیت مروج تھیں - اعلیٰ طبقے کے شاہزادے اور نواب یا اہل عین کے درجے  
کے اور امرا ہوا داروں اور بوجن پر سوار ہوسکے نکلے - ہوا دار - ٹمہ کی وضع  
کی ایک کھلی ڈولی تھی جس کے پیچھے چمڑے کا ٹپ ہوتا - اور لوہے کی کمانوں  
کے ذریعے سے کھولا یا بند کیا جاسکتا - ٹھنڈے اوقات میں جب ٹپ گر دیا جاتا  
تو ہر طرف کی نضا کھلی رہتی - آگے پیچھے اُس میں نفس کے سے ڈنڈے لگے  
ہوتے - چار کہاں اُس کو کا ندھوں پر اٹھائے لیجاتے - اور جو شخص سوار ہوتا  
وہ نہایت وقار و نکست سے بازار کی سیر کرتا - ہر چیز کو دیکھتا بھالتا - اور  
شنا سناؤں سے صاحب سلامت کرتا ہوا جاتا - ہوا دار کی قطع سے معلوم ہوتا  
ہے کہ وہ خاص انگریزوں کی ایجاد کی ہوئی چیز تھی - ہندوستان میں آکر انھوں  
نے اپنے مذاق کے مطابق اور اپنی جدت طرازی سے اُس کو ایجاد کیا - اور اپنی  
نفارست - خوشنمائی - اور صفائی کی بدولت رؤساے ہند کو بہت پسند آیا -  
اب اُس کا رواج بالکل اٹھ گیا - اگرچہ بعض پرانے رؤسا کے یہاں چند ہوا دار  
پہلے بھی پڑے ہوئے ہیں جو رؤسا کی معمولی آمد و رفت میں تو نہیں مگر دولتمند  
ہندوؤں کی براتوں میں وہ کبھی کبھی نظر آ جایا کرتے ہیں -

جوچہ اُس سے زیادہ باوقار اور مشین ساری تھی - اُسکی قطع آج کل کی  
برہم یاد تھا گاڑیوں کی سی ہوتی - جس میں پہیوں کے بجائے پائے ہوتے - اور  
آگے پیچھے نفس کے ایسے دو دو ڈنڈے ہوتے - اور کم از کم آٹھ اور اکثر سولہ سولہ  
کہاں اُس کو اٹھائے لے چلتے - اس لیے کہ وہ کہا دون کے اٹھانے کی تمام  
سوار یوں سے زیادہ بھاری ہوتا - اس سوار ی پر شاید کبھی اور امر بھی سوار  
ہوے ہوں مگر میں نے فقط واجد علی شاہ کو کلکتہ میں اس پر سوار ہوتے دیکھا -

اور اُن کے سوا یہ سواری میں نے کہیں اور کسی کے پاس نہیں دیکھی۔ بادشاہ اپنے باغوں، محلوں، اور کوٹھیوں میں اُسی پر سوار ہونے کے پھر اُکرتے۔ اور گردِ جلوئی خدام کے علاوہ معزز اور کان دولت اور حضور رس مصاحبین یا پیادہ ساتھ چلتے مگر یہ بھی یقیناً انگریزوں کی ایجاد تھا۔ جو اُس عہد کی انگریزی گاڑیوں سے اخذ کر کے کہا روں کے اُٹھانے کے قابل بنا لیا گیا۔

سُکھپال اُن دنوں عورتوں کی نہایت معزز سواری تھی۔ جو خاص ہندوستانی چیز اور ہندی مذاق کے تعلقات کا مکمل نمونہ تھی۔ یہ ایک سرخ گنبد نما ڈولی تھی۔ ایک لمبے چوڑے کھٹولے پر ایک شان دار لال بُرج سا بنادیا جاتا۔ جس میں سونے چاندی کے کھس گئے ہوتے۔ چاروں طرف پردے لٹکے ہوتے۔ اس میں بھی آگے پیچھے دو دو یا ایک ایک ڈنڈے ہوتے اور بہت سے کہا راؤ کو اُٹھا کے لے چلتے۔ یہ سواری عالی مرتبہ بیگمات اور محل شاہی کی خاتونوں کے لیے خاص تھی۔

رہتا اسی وضع کی بیہون دار گاڑی تھی جس میں بلی جوت دیے جاتے۔ بھین دیہات کے تعلقداروں اور معزز زمینداروں کے یہاں اور دیسی ریاستوں میں اب بھی موجود ہیں۔ مگر وزب و زیبک رہوتی جاتی ہیں۔ اور اُن کا رواج اُٹھتا ہوا ہے۔ لکھنؤ میں خاص شاہی محلات کی ضرورت کے لیے اُن دنوں ہزاروں رتھیں تھیں۔ شجاع الدولہ کی بیوی بی بی بیگم صاحبہ نواب آصف الدولہ کے عہد میں جب اپنی بیوی کی زندگی ایک حکمران ملک کی شان سے فیض آباد میں بسر کرتی تھیں تو اکیلی اُن کی سرکار میں آٹھ سو رتھیں تھیں۔ اور قدیم الایام میں حبیب شاہان دہلی اپنی مملکت میں دور دراز کے سفر کیا کرتے تھے تو اُن کے محلات عالیات انھیں رتھوں پر سوار ہونے کے ساتھ جاتے۔

بہل بیہون کی عام گاڑی تھی جس میں ایک کھٹولے کو دو بیہون پر قائم کرتے۔ پھر اُس پر چار ڈنڈے کھڑے کر کے ایک چھتری لگا دیتے۔ اور اُس پر پردے کے لیے غلات ڈال دیا جاتا۔ اُس میں اکثر مرد اور عورتیں سفر کرتیں۔ اُن دنوں متوسط طبقے کے دیہاتوں اور شہریوں دنوں کے لیے سفر کا ذریعہ یہی

سواری تھی۔ بیلین دپاؤن مین اب بھی بکثرت موجود ہیں۔ مگر ان کی ضرورت روز بروز ملتی جاتی ہے اور عنقریب ایک زمانہ ایسا آئے والا ہے کہ یہ سواری عتقا ہو جائے گی۔

ان کے سوا تمام سواریوں کو لوگ خود ہی جانتے ہیں۔ ہمیں ان کی شکل و صورت بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

بہر حال یہ سب سواریاں شہر کے تمام راستوں اور گلی کو چون مین گذرتی نظر آتیں۔ زیادہ تر لوگ ففسون پر سوار ہوتے۔ علما۔ اہلہ۔ امرا۔ اور خوش باش جن کو خدا استطاعت دیتا چار کھار نوکر رکھ لیتے جو خدمتگاری بھی کرتے اور سواری کا بھی کام دیتے۔ جن لوگوں مین ذرا بھی بالکلین ہوتا یا سپہگراہ شان دکھانا چاہتے جو ان دنوں تمام اہل شہر مین عام تھی وہ گھوڑے پر سوار ہو کے نکلتے۔ جو چاندی کے زیور اور کارچوبی ساز و پراق سے دولہن بنا دیے جاتے۔ اعلیٰ درجے کے معززین ہاتھیوں پر بیٹھ کے آمدورفت کرتے۔ جو باوجود اس قدر وقامت کے تمام گلی کو چون مین بلا ٹکٹ گذر جاتے۔ ہاتھیوں پر سادی بانات یا کارچوبی جھولین ہو تیں اور ان پر کھلے ہوئے یا سایہ دار برت نا عاریاں کسی جاتیں۔ زمانہ سواریاں جو سکھیا لون اور ففسون پر ہو تیں وہ بڑے ٹکٹ اور شان سے نکلتیں۔ ففس پر سرخ چٹکے پڑے ہوتے۔ جن پر کبھی گولٹا۔ لچکا بھی ٹانگ دیا جاتا۔ کھار سرخ بانات کے چنے پہنے ہوتے۔ سرور پر سرخ گگردار پگڑیاں ہو تیں جن کی نگرون پر چاندی کی مچھلیاں لگی رہتیں۔ مچھلی ہندوستان مین بہترین شکون مانی گئی ہے۔ رخصت کرتے وقت یا کسی کو کسی اہم کام کے لیے جاتے وقت آج بھی عورتوں کی زبان سے نکل جاتا ہے ”دہی مچھلی“ غالباً اسکو نجوم سے تعلق ہو۔ اور یہ بھی نجومیوں ہی کا ٹکٹ معلوم ہوتا ہے کہ چاندی کی مچھلیاں بنوا کر کھاروں کی پگڑی مین ٹانگ دی جاتیں جو آگے رہتے ہیں تاکہ کہیں جاتے وقت مچھلیاں ہر وقت پیش نظر رہیں۔

زمانہ ففس کے ساتھ ساتھ ایک کھاری چٹکے کا کونا پڑے دوڑتی جاتی۔ ان کھاریوں کی وضع بھی خاص قسم کی تھی۔ سب سے بڑی پہچان یہ تھی کہ لینگے مین

اتنی چوڑی کوٹ ہوتی ہے کہ اُس کا آدمے سے زیادہ حصہ فقط گوٹ کا ہو کر رہتا۔  
ان سوار یون میں سے شہر میں اپنا فقط فٹس باقی رہ گئی ہے۔ یا کبھی کبھی کوئی  
رئیس گھوڑے یا ہاتھی پر دکھائی دے جاتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ باہر نکلنے میں شرفا کی کیا وضع ہوتی تھی۔ لباس کو ہم  
بیان کر چکے ہیں۔ مگر اُن کی تصویر دکھانے کے لیے ہمیں پھر ایک حد تک اُن کی  
وضع قطع بتانے کی ضرورت ہے۔ سواری کی شان کے متعلق میں نے جو کچھ بیان  
کیا اُس میں بجز توپے اور ہوادار کے اور تمام چیزیں وہی ہیں جو ہم کی سے آئیں۔  
لکھنؤ کو اُن سے کوئی خصوصیت نہیں۔ دراصل یہ دہلی ہی کی شان تھی جو اپنی آخری  
جھلک بٹے کر و فر کے ساتھ لکھنؤ میں دکھانے غائب ہو گئی۔

لیکن لباس میں لکھنؤ دہلی سے جدا ہو گیا۔ اب گھر میں گرتا یا قمیص اُتار کے  
بیٹھنا محبوب ہو گیا ہے مگر اُن دنوں بیان گھر کا لباس پہنچے پہنچے تو ایک غرق تھی  
بیان کا دربار شیعہ تھا۔ اور ہر چیز بیان شیعہ ہی کے سانچے میں ڈھلتی تھی۔ فقہ  
الاسیہ کی رو سے راؤن کے کھلے رستے ہیں مضائقہ نہیں۔ تجلات حنفیہ کے کہ  
اُن کے مذہب میں نامت سے لے کر لکھنؤ تک جس قدر حصہ جسم ہے ستر میں ڈال  
ہے اُس کا چھپانا ضروری ہے۔ اور اسی بنا پر دہلی میں علی ایوم عورت کی وضع  
کی ننگی بازو جاتی جس میں لکھنؤ کے نیچے تک جسم ڈھکا رہتا ہے۔ بیان  
کے تمدن میں اُس کی ضرورت نہیں باقی رہی۔ اور بیان کی ننگی فقط ایک پتلی  
سی غرق یا جانگلیا رہ گئی جس میں نامت سے کچھ دان تک تو جسم ڈھکا جاتا ہے  
باقی سب جسم کھلا رہتا ہے۔ لوگوں میں مذہب اور مرد آدمیوں کے نکلنے کا خیال تو  
بڑھا ہوا تھا مگر گھر میں بجز ایک غرق کے جسم پر ایک دھکا بھرا نہ رہتا۔ اور بیات  
اس قدر عام ہو گئی تھی کہ اسی برہنگی کی وضع سے اپنے گھر پر کسی سے ملنے میں بھی  
مضائقہ نہ سمجھا جاتا۔ مگر یہی حضرات جب باہر نکلنے تو شان ہی اور ہوتی۔ قالپ پر  
چڑھی چوڑی شید ٹوپی۔ اُجلا صاف اور براق انگرکھا جو معلوم ہوتا کہ ابھی ابھی صوبہ  
کے گھر سے آیا ہے۔ اور اسی وقت گوٹ اور آستینیں چینی گئی ہیں۔ گلبدن یا تین کھ  
کا عرض کا پانجامہ۔ کاندھے پر مثلت رومال۔ ہاتھ میں دستی رومال اور چھڑی۔

اور پائون مین لکھنؤ کا بنا ہوا سبک بھلی خرد نو کا جوتا۔ باہر نکلنے میں ہر وضع و شریعت کی یہی وضع تھی۔

بہت سے لوگوں کو باہر نکلنے میں اس وضع و لباس کا اس قدر لحاظ تھا کہ کبھی اُن کے کپڑے میلے نہ نظر آتے۔ معلوم ہوتا کہ اسی وقت دھوبی کے یہاں سے آئے ہین۔ حالانکہ مینوں اُنکے دھونے کی فہم نہ آتی۔ اور ہوتا یہ کہ دو گھڑی دن رہے گھر سے نکلے۔ خزانہ خزان ہر چیز سے بچتے اور اپنے سامنے ہاتھ سے بھڑکتے ہوئے چوک کی سیر کی۔ دو گھڑی رات گئے واپس آگئے۔ اور آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ ٹوپی قالب پر رکھ کے ایک کپڑے سے اڑھادی۔ انگرکھے۔ پانچائے۔ اور دھونے کے رومال کو احتیاط سے تہ کر کے دستی رومال میں گھڑی کی طرح باندھ کے کھونٹی پر رکھ دیا۔ اور غرقی باندھ کے اور کوئی پڑانا جوتا یا زیر پائی پہن کر بیٹھ رہے۔ اسی داشت کی برکت تھی کہ قیمتی اور شالی کپڑے چار چار پانچ پانچ پشتون تک اس احتیاط سے رہتے کہ نہ میلے ہوتے۔ نہ پھٹتے۔ نہ کیرا کھاتا۔ ہمیشہ نئے بنے رہتے۔ اور شادی کی تقریبات یا شان و شکوہ کی محفلوں میں ایسا شانہ لباس پہن کر جاتے کہ لوگوں کو جو اُن کی حالت و حیثیت سے واقف ہوتے تعجب ہوتا۔

گو کہ اعلیٰ طبقے کے افراد خصوصاً شاہزادے۔ علماء۔ اور اہل لزوم کے ساتھ سوار یوں پر نکلنے مگر شرفاء کے لیے پیدل پھرنا آج کل کے زمانے کی طرح سیوا نہ تھا۔ ہر طبقے اور درجے کے لوگ یکساں حالت سے پاپلاہ باہر کی سیر کرتے۔ اور پیدل چلنے والے بڑے سے بڑے رئیسوں اور معزز لوگوں کے برابر بیٹھتے اور مضائقہ نہ ہوتا۔

(۵۳)

اب ہم مختصر یہ بھی بتا دینا چاہتے ہیں کہ لکھنؤ کی معاشرت نے اپنی ضرورت و قدر دانی سے کن کن چیزوں کو ترقی دی۔ اور کن کن فنون کو یہاں نشو و نما ہوا۔ اس سلسلے میں بہت سی چیزوں کا ذکر آئے گا۔ مگر ہم پہلے مٹی کے برتنوں سے شروع کرتے ہیں۔



مٹی کے برتن دنیا کی پہلی ایجاد ہیں۔ ہر ملک اور ہر سرزمین سے کھود کے قدیم الایام کے خزف پارے برآمد کیے گئے ہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مٹی کو بھٹی مین بیک کے خزف بنا لینا انسان کو اپنی ترقیوں کے بہت ابتدائی دور میں معلوم ہو گیا تھا۔ اور غالباً دنیا کے عہد حجریت ہی میں مدنی فلزات کے برآمد ہونے سے پہلے انسان کو برتن بنا کے اُن کو بیکانا آ گیا تھا۔ مصر میں عہد فراعنہ کے کئی ظروف اور بابل و تینوا میں غذا اور پانی کے ظروف کے ساتھ نہایت سچے اینٹیں برآمد ہوئی ہیں۔ فراعنہ کے دور میں امرے مصر میں تابوتوں میں لاشوں کو مٹی بنا کے رکھا کرتے وہ مٹی ہی کے ہوتے تھے۔ یہی نہیں۔ اگلی دنیا خزف پاروں اور ٹھیکروں سے بہت دنوں تک کا فکا کام لیتی رہی ہے۔

ہندوستان والوں کو بھی قدیم الایام ہی میں یہ فن آ گیا تھا۔ اور عہد قدیم کے نیکے ہوئے ظروف سے معلوم ہوتا ہے کہ بیان بھی اس فن نے دیگر مقامات سے کم ترقی نہیں کی تھی۔ خصوصاً بت پرستی نے ہندوؤں میں بھی مٹی کی مورتوں کی بنیاد ڈالی جس میں روز بروز ترقی ہوتی رہی۔ اور یہاں کھارون کی ایک ذات پیدا ہوئی۔ جس کا خاندانی اور آبائی پیشہ یہی ہے کہ مٹی کے ظروف اور کھلونے بنائے بیکاتے ہیں۔

دہلی میں اسلامی دور نے عام کھارون کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ کسکروں (کاسکروں) کا ایک نیا گروہ پیدا کر دیا جو مسلمان ہیں اور ظروف کے ساتھ کھلونے بھی بناتے ہیں۔ اور اگرچہ شرع اسلام مورتوں کے بنانے کو مطلقاً ناجائز بتاتی ہے۔ مگر کسکروں کا چونکہ ذریعہ معیشت یہی کام ہے اس لیے وہ ایک حد تک کھلونے بنائے اور بیچنے پر مجبور ہیں۔ مسلمان کسکر عام معاشرت و شائستگی اور نیز اپنے فن میں کھارون سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔

دہلی سے مسلمان امرا ان کسکروں کو بھی اپنے ساتھ لکھنؤ میں لائے اور امریکی شوقین کی بدولت انکی صنعت کو یہاں زیادہ اور نمایاں ترقی ہونے لگی۔ چنانچہ کھار اور کسکر دونوں نے اپنے کام میں مہی ذہانت و طباعی اور جدت طرازیان دکھانا شروع کیا جو ایک مصور تصویرون ہیں اور ایک شاعر اشعار میں دکھایا کرتا ہے۔

حسن اتفاق سے لکھنؤ کی مٹی اس فن کے لیے مناسب ثابت ہوئی جس نے کاریگری کو اظہار کمالات کا موقع دینا شروع کیا۔ اور برتن اور کھلونے دونوں ایسے بننے لگے جیسے کہ کہین نہ بن سکے تھے۔ ظرف میں تو یہ ترقی ہوئی کہ ایسے سبک باریک اور صاف اور اس کے ساتھ خوش قطع برتن یہاں بننے لگے کہ کہین نہیں بن سکتے۔ اور وہے کی مٹی بھی اس کام کے لیے زیادہ مناسب ہے۔ چنانچہ وہاں بھی اس فن کو بڑی ترقی ہو رہی ہے۔ اور وہاں کے کاریگروں کے ظرف نگہ ستون اور لکھنؤ کے ظروف کی وضع میں فرق ہے۔ اور اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ لکھنؤ کے کاریگروں کا کام نقاشت پسند لوگوں کی نظر میں بڑھا ہوا ہے۔

عام چیزوں میں لکھنؤ کے گھڑے۔ بدھتیاں مارے ہندوستان کے گھڑوں اور بدھتیوں سے سبک اور خوشنما ہوتے ہیں۔ گھڑوں کی گولائی نہایت ہی مکمل اور اپنے حدود میں پوری ہوتی ہے۔ بدھتیاں تانبے کے کوٹوں کی قطع سے بہت زیادہ قریب ہوتی ہیں۔ ظروف میں سفائی کے برتن یہاں سے اچھے شاید کہین کم لیں گے۔ مگر چونکہ مٹی کے برتنوں میں کھانے کا رواج بالکل اٹھ گیا ہے۔ اس لیے کھارون کی وجہ اب انکی طرف سے ہٹ گئی، اور روز بروز مٹتی جاتی ہے۔ مگر جن ظروف میں یہاں کے کسکروں نے اپنے کمالات کا اعلیٰ ترین ثبوت دیا وہ آبخورے۔ مرا حیان۔ بھجریان۔ اور صفحے ہیں۔ اور ان کے بعد کھیر کی بانڈیاں۔

آبخورے پانی پینے کے ظروف ہیں۔ اگرچہ شیشے اور تام مٹی کے سبک خوشنما اور نفیس گلاس اور نیز مراد آباد وغیرہ کے گلاس اور کٹورے کثرت سے رواج پا گئے ہیں۔ مگر ہندوستان میں گرمیوں کا ایک ایسا موسم آتا ہے جبکہ بجز مٹی کے آبخوروں کے کسی ظرف میں پانی مزہ نہیں دے سکتا۔ اس لیے کہ پانی ان میں ٹھنڈا رہتا ہے اور خود انکی ٹھنڈک ہاتھ اور ہونٹوں کو خشکی کی ایسی لذت دیتی ہے جو اور کسی چیز سے نہیں حاصل ہو سکتی۔ علاوہ برین مٹی کے کورسے آبخورے ہیں ایک ایسی روح کو تازہ کرنے والی خوشبو ہوتی ہے جس کے شوق نے یہاں مٹی کا عطر ایجاد کر دیا۔ غرض اس ضرورت نے آبخوروں کو باقی رکھا جن میں طرح طرح کی تقابلیں پیدا کی گئیں ایسے نازک۔ ہلکے۔ اور سبک آبخورے

بنے جو کا غذی کہلاتے ہیں۔ اور اس قدر باریک ہوتے ہیں کہ شیشے کے گلاسوں کی نزاکت کو بھی بیان مٹی کے آجروں کی ہستی اور باریکی سے مات کر دیا۔ پھر اُن پر نقش و نگار بنا کے بالوں کی ایک تہ چڑھا دی جاتی ہے کہ پانی کو زیادہ ٹھنڈا رکھے اُنھیں کے مناسب اُسے جوڑ کی تھا لیان ایجاد ہوئیں۔ آخر آجروں کی قطع ایسی خوشنما اور دلکش ہو گئی کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اور زمانے کو ان لینا پڑا کہ انسانی صفت نے جو کمال کھیلنے والے فلزات کے استعمال میں دکھایا ہے وہی مٹی میں بھی دکھائی سکتی ہے

آجروں کے بعد پانی رکھنے اور اُس کے ٹھنڈا کرنے کے ظروف میں سر احیان ہیں۔ صراحی بہت پرانی چیز ہے جس کا رواج ایران و مصر قدیم میں بھی تھا۔ مگر لکھنؤ کی سر احیان مٹی کی خوبی اور کاریگر دن کی لطافت مذاق سے نفیس۔ کا غذی اور بہت ہی سبک ہو گئیں۔ اور پھر اُن کی شکل بھی ایسی خوبصورت ہو گئی کہ ان دونوں باتوں میں کہیں کی سر احیان اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اُنکے دہانے پر ایسی مناسب خمیدگی پیدا ہو گئی کہ لکھنؤ کی سر احیوں کا دہانہ ہی ایسی چیز ہے جو اور کسی جگہ نہیں نظر آ سکتی۔ جھیریاں جی ویسی ہی نازک و سبک ہیں۔ ان کا پیٹ تو وہی سر احیوں کے مثل ہوتا ہے مگر اُسکے اوپر لمبی گردن کے عوض ایک ٹھکر بنا دیا جاتا ہے۔ کام اور نزاکت و لطافت کے اعتبار سے وہ بھی سر احیوں سے کم نہیں ہیں۔

حق۔ ان میں بھی ٹھنڈک کی بے انتہا ضرورت ہوا کرتی ہے تاکہ دھواں ٹھنڈا آئے۔ مٹی کے کا غذی حق یہاں ایسے نفیس اور خوش قطع بننے لگے کہ کسی جگہ نہیں نصیب ہو سکتے۔ پھر نہ تو اسے بوسے کو رسے حقوں سے دھوئیں میں نکلی اور نفاس کے ساتھ کوئی مٹی کی ایسی نفیس خوشبو پیدا ہو جاتی ہے کہ عہد شاہی کے بہت سے عالی مرتبہ ریسوں کو سوا اُنکے کسی حقے میں مزہ نہ آتا تھا۔ عظیم الشان نے اُن میں اور خوشنمائی و نفاست پیدا کر کے عظیم الشان خانی حقے اپنی یادگار چھوڑ دیے جو آج تک مٹی کے کل قسموں کے حقوں سے اچھے بہتک اور مقبول عام ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ لندن کے ملک اشتم الارٹھینس کی نسبت سنا کہ اُنکو مٹی کے سفید پائپ جو بجلی پائپ کہلاتے ہیں اس قدر پسند تھے اور اُنکی شاعرانہ نسبت پسند ہی کو رسے پائپوں کی اس قدر رسیا تھی کہ اسے ایک ٹوکری میں بھرے بوسے کو

اور اچھوٹے پائپ رکھے رہتے۔ وہ ایک پائپ کو لیکر اس میں تبا کو بھرتے دیتے  
اور چند منٹ میں اس کو توڑ کے دوسری ٹوکری میں ڈال دیتے۔ پھر دوبارہ  
ضرورت ہوتی تو دوسرا پائپ لیتے اور چند گش لے کر اسے بھی توڑ کے ڈال دیتے  
یوہین دن بھر بیٹھے کو رسے پائپ بھرا۔ پیا۔ اور توڑا کرتے۔ میرا خیال ہے کہ اگر  
لارڈ ٹینسن کو لکھنو کے عظیم الشان خانی حلقے مل جاتے تو ان مگی پائپوں کو بھول جاتے۔  
اس لیے کہ ان کے دھوئیں میں جو ٹھنڈک۔ نفاست۔ اور خوبی ہوتی ہے اس کا پتہ مگی پائپوں میں  
کو سون نہیں ہے۔

کھیر کی ہانڈیاں۔ پکانے کی ہانڈیاں ہر طبقہ بنتی ہیں مگر لکھنؤ کی ہانڈیاں تانبے کی تیلپون کی جتنی  
سچی نقل ہیں اور کہیں نہ ہوگی۔ خصوصاً گلانی ہانڈیاں جو حصوں میں کھیر وغیرہ تقسیم کرنے کے لیے بنائی جاتی ہیں  
آج کل ان اور مصریوں کی طرح یہ بھی کاغذی اور بہت ہی خوبصورت بنتی ہیں۔ ان میں اب اکثر نازک  
امرا گلاریاں بھی رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ گرمیوں کے موسم میں خاصا دل آویز لگتے ہیں اور ان میں ایسی  
بھی بہت گرم ہو جاتی ہیں۔ مگر ان ہانڈیوں میں وہ اس قدر ٹھنڈی رہتی ہیں اور ان میں ایسی  
سو دھمی خوشبو پیدا ہو جاتی ہے کہ نہایت ہی فرحت بخش ہو جاتی ہیں۔ مگر بتوں سے بھی زیادہ کمال  
کھاروں نے کھلوؤں اور مٹی کی مورقوں میں دکھایا۔ بہت ترش کا فن بہت پرستی کے طفیل میں  
بہت پُرانا ہے۔ مصریوں۔ بالیوں۔ اور ایرانیوں یونانیوں اور رومیوں سب نے اپنے اپنے  
اس فن میں کمال دکھائے جنکے نمونے آج یورپ کے نامور عجائب خانوں میں نظر آسکتے ہیں۔  
خصوصاً اہل یونان پتھر کی موتیں تراشتے اور عہد کا تناسب قائم رکھنے میں ایسا کمال دکھایا کہ آج کل  
یہی باوجود بے اتھا ترقوں کے انکی چاکرستی پر حیران ہے۔ اور ان کی بنائی ہوئی موتیں حال کے بت پرانوں  
اور مصریوں کے لیے بہترین ماڈل یا معیار سمجھی جاتی ہیں۔ مگر مٹی سے کھلوؤں میں تناسب و عفا قائم  
رکھنے اور فطرت کی سچی نقل اتنا نہ میں چو کا رنگی یہاں کے ان پڑھ جاہل کھار دکھا رہے ہیں وہ  
یونان کے کمال سے ذرا بھی کم نہیں ہے۔ وہ انسان کو دیکھ کر اسکی پوری موت اتنی ہی بڑی جتنا کہ  
اس کا جسم ہوتا رہتے ہیں۔ پھر چھوٹی مورقوں میں ہر وضع اور ہر طبقے کے لوگوں کی ایسی مطابق اصل  
نصوبہ میں بناتے ہیں کہ انکے کمال میں شاعرانہ نازکیا لیون کا پتہ چلتا ہے۔ دیوانی میں ہندو کثرت  
سے کھلوئے خریدتے اور تقسیم کرتے ہیں۔ اور اسی ضرورت سے ہر سال اس موسم میں یہاں کے کھاروں  
کو اپنے فن میں نئی نئی ایجادوں و طبعیوں اور نازک خیالیوں کے ظاہر کرنے کا موقع ملتا ہے۔

ان کھارون نے جو موتوں کے طرح طرح کے کر دیا درست تیار کیا ہیں وہ دیکھنے سے تعجب ہے  
 ہیں۔ انگریزی بنیڈ۔ مذہبیوں اور بنیادوں کے طائفے۔ قدیم نوابوں کی محفل۔ امرائے دربار مختلف  
 اہل جہز کے مجمع خاص شان رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ نائیش کے موقع پر بیان کیا گیا کھارے  
 ایک ہندوستانی کا خون بنایا تھا جس میں آبادی کے اندر دکانوں اور مکانوں کے درمیان مختلف  
 البیسے لوگوں کا چلنا پھرنا۔ بچوں اور بیل گاڑیوں کا گزرنا دکھانے کے بعد گردے میدان میں کسانوں  
 کا ہل جوتا اور نالیوں کے ذریعے سے کھیتوں میں پانی چھونچا دکھایا تھا۔ نالیوں میں پانی کا پنا  
 اور اس میں غنئی لہروں کا پڑنا ایک نمودار ہوتا تھا۔ اور یہ چیز نالیوں میں پورے دکھائی گئی تھی کہ بیل  
 بچوں میں کام کر رہے ہیں نہایت دُبلے ہیں اور انکی پسلیاں صاف نظر آرہی ہیں۔ اسی طرح شاہی  
 زمانے کے لکھنؤ کی ایک تصویر بھی میں نے دیکھی جس میں اُس وقت کی آبادی اور بچوں اور بچوں کا  
 نقشہ دکھایا گیا تھا۔ مگر افسوس یہ سب محققین ایک وقتی جوش کے طور پر دو چار روزہ نظر کے غائب  
 ہو جاتی ہیں اور انکی ایسا مقام نہیں کہ جہاں ان تمام صنایعوں کے نمونے محفوظ رکھے جاتے  
 ہوں۔ لندن میں میڈم ٹاڈس انکوائسٹ کے نام سے ایک سی تصویروں کا عجائب خانہ جس میں  
 ہر قسم کی قدیم تصویریں کل مشاہیر زمانہ کی اور نیز وہ جن میں صنائع نے کوئی خاص کمال دکھایا  
 ہے جمع کر دی گئی ہیں بعض ایسی سوئیں ہیں کہ ممکن نہیں ہر جانے والے کو کسی کی صورت پر دھوکا  
 نہ ہو جائے۔ اگر ایسا ان مٹی کی صورتوں کا ایک عجائب خانہ بن جائے اور اس میں  
 کھارون کی تمام کاریگریاں جمع کر دی جائیں تو سیرا خیال کر کہ فن کی ترقی میں بے حد مفید ہونے  
 کے علاوہ وہ نمونہ پیش بھی ہو گا۔ اُس کے واسطے کے لیے ایک کٹھن ضرور کرایا جاسکتا ہے۔ اور سیرا خیال  
 کہ کوئی باہر کا سیاح بغیر اُس کے دیکھے نہ ہلے گا۔ لیکن خرابی یہ ہے کہ خود ہم میں کوئی ذوق اور  
 جوش نہیں ہے۔ اور ہم ہر بات میں گورنمنٹ کے دست مگر رہنا چاہتے ہیں۔ اگر کسی دولت مند  
 امیر لائے کو بیجاے عیاشی کے اس کا شوق ہو جائے تو کس قدر ناموسری و خدمت وطن کا باعث  
 ہو سکتا ہے ؟

عجائب خانوں میں اس قسم کے کھلونے اکثر جمع کر دیے گئے ہیں مگر وہ بہت ہی محدود ہیں  
 اور لکھنؤ میں اس صنعت کا درجہ اتنا ہی نہیں ہے کہ دیگر اچھے بڑے روکا رچیزوں کے نمونے جن کھلونوں  
 بھی رکھے جائیں۔ بیان کھلونوں اور مٹی موتوں کی مستقل نائیش ہونی چاہیے۔

## سیرۃ احمدی

سوانح اقدس حضور سرور عالم  
محمد بنی محمد مصطفیٰ علیہ السلام  
اس کتاب میں حضور کے سوانح پر کے علاوہ  
درج ذیل اور کئی دیگر بھی ہے حضور کے طبی عادات  
و مسائل خصوصی تعلیم اور اسکی فلاسفی نبوت اور ہجرات  
اور انکی حکایتیں کثیر اور طویل۔ غلامی اسلام پر یہ  
بہت شکر ہے، ان عنوانات پر تفصیل علیحدہ  
کتابوں کے تحت کی ہے جو اس کتاب کی خصوصیت ہے۔  
مؤلف

خان احمد حسین خاں صاحب ایڈیٹر  
رسالہ شباب اردو لاہور  
بانی و مدیر، باغ حقون دہلی  
سیہ مبارک علی شاہ کھیلانی ٹوٹی قاسم  
میرٹھ لاہور سے چھپوائی

## سیرۃ النعمان

عظم الامام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی سوانح  
حقتہ اول و دوم  
اس کتاب کے پہلے حصہ میں امام ابو حنیفہ کا نام و نسب  
ولادت و تشریف تعلیم و تربیت، شیوخ و تلامذہ  
و امتداد و بقیہ زندگی اور وراثت کے تحقیقات و حقائق  
عام اختلاف و عادات و مناسبات و زمانہ و مہانت طبعی  
اس قسم کے حالات نہایت تفصیل سے مذکور ہیں  
دوسرے حصہ میں اصولی مسائل پر کلام میں حدیث  
اور فقہ پر مبنی حالات کے تفصیلی بحث ہے  
خاتم میں امام صاحب کے جنازہ شاکر و اولیائے  
دعوت پر غفر حالات ہیں۔  
مؤلف

نعمانی علامہ شبلی نعمانی مرحوم  
وہ تصنیف و تخریج  
سیرۃ مبارک علی شاہ جنتا کبیر ٹوٹی قاسم

## مضامین شری

علامہ رشید کنہوی نے ناول اتنے لکھے  
کہ اردو زبان کے خزانہ کو غنیمت سے بھر  
کر دیا۔ اللہ تعالیٰ انھیں بقیہ عمر میں  
افسوس ہو قدر کرے والی چیز تھی اسکی طرف توجہ  
نہ کی تھی علامہ کی اصل جو ہر روز تصنیف مکتوب تھے  
و نگار کے ذریعہ شائع ہوتے رہے یہ ایسی چیز  
تھی کہ قابل ستائش تھی تھیں کہ کتابی صورت میں  
انکو مرتب و مرتب ہو کر ہیں تو ان کو سراٹھائیں  
دیکھیں مولانا موصوف سے ان کی از سر نو نظر ثانی  
کر کر مندرجہ ذیل عاشقانہ و شاعرانہ جلدیں طبع  
کرائی گئی ہیں۔ شائقین جلد طلب فرمائیں ورنہ  
انتظار طبع اٹھانا پڑے گا جو سخت وقت طلب  
امر ہے۔ قیمت حصہ اول کل دو روپے آٹھ  
آنے (چھ) حصہ دوم کل دو روپے آٹھ آنے  
اعزاز و اختتام سیال قیمت صرف  
ایس علی دلریشیہ لینڈ برادر لاہور

## مضامین شری

مولانا مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شری  
کاشفوی مدظلہ العالی  
کے تمام تاریخی و جغرافی مضامین جن کی تفصیل  
و تحقیق موصوف نے از سر نو نظر ثانی فرمائی ہے  
جنہیں  
سیہ مبارک علی شاہ صاحب لکھنؤ  
مولوی قاسم شریک لاہور نے  
باہتمام  
ایس عبد الرشید اینڈ پراوڑ پرائیڈ  
لاہور دی دروازہ لاہور چھپوایا  
قیمت حصہ اول کل چھ روپے دو آنے  
حصہ دوم ہندوستان میں مشرقی تمدن  
کا آخری سنو لینڈ گزٹ میں کاشف قیمت  
صرف دو روپے چار آنے  
مشہور اکابر کے سوانح شریک لاہور



# تشرکات آزاد

عزیزانِ کلمہ! اہلِ قلبیں! انگلستان کے شہرِ لندن  
 آؤ ملحق ہو جان کے جوہرِ فارس کے فردوسی آؤ  
 ہندوستان کے علامہ برہمچاری کے جواہرِ کمال  
 مولانا مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی  
 کی پیش ہر کتاب قیمت طبع جسم پیر  
 لگا رشتہ ان فارس کی عہدِ ترقیوں کو ان کے کلام کے  
 ساتھ ساتھ مؤرخانِ طرے ہوئے آپ جیات  
 کے نقطوں میں ادایا ہے۔ خدائے ستم  
 رُو کی سے بیکر خان آؤ تو تک کے حالات  
 نگارستان کو سچا ہے۔ نہایت خوشخط کا غلہ  
 اعلیٰ درجہ کا دلچسپی قیمت فیصلہ صرف ۳۰  
 دربارِ کبریٰ شہنشاہ ہند جلال الدین  
 تاریخی افسانہ۔ دھپ حالات۔ رزمِ بزمِ شاد  
 وغم۔ ہندو مسلمانوں کا ملاپ ۲۲ x ۲۹ کی شری  
 قطع ۸۵۰ صفحوں کی ضخامت کا غلہ شایستہ  
 قیمتی لکھا کی چھپائی عمدہ قیمت فیصلہ  
 آپ جیات انگریز اور آؤ زبان کی عمدہ  
 بھرتہ ترقیوں کا حال ہے مشرقی شاعری کی  
 آخری جملہ آؤ آخری بار کا دلچسپ آؤ  
 دستورِ زمانہ ہے حجم ۵۲ صفحوں کی کافی  
 چھپائی کا غلہ ہر قیمت صرف ۳۰  
 سیرِ ایران ہندوستان اور پنجاب سے  
 نکال کر ان لکھنؤ اور ایران تک تحقیق کا دامن  
 بچھا دیا تھا وہاں سے واپس آنے کے بعد اپنے  
 سفر کے حالات مولانا نے خود بیان فرمائے ہیں  
 اس میں مانی سے بیکر پرست تک روشنی  
 ڈالی ہے قیمت فیصلہ دو روپے  
 سخنِ ان فارس کی فارسی زبان کی ایک مجلس  
 کے قابل سے قیوں کے تاریخی مقولہ کے سنے ہوئے  
 شاعر نکالے گئے ہیں ترجمہ پہلوی و فارسی ہندو  
 کے الفاظ کا مقابلہ کر کے تاریخی شاعر نکالے  
 نگارستان فارس کے ساتھ ساتھ اسکا ہونا  
 ہے حجم ۳۲۰ صفحوں کی قیمت صرف ۵

جو ہر فرد امت آج سے پاس پاس پہلے  
 خودوں کی کیا حالت تھی آؤ اب کیا ہے نہایت  
 مشرقی قیمت ایک روپہ آؤ  
 طوفانِ جیات مسلمانوں کو تباہ کرنے  
 والی رسومِ قبیلہ کی اصلاح ایک پیرسوز و بچسپ  
 قصہ کے پیرا ہیں قیمت صرف ۳۰  
 ۵۵۵۔ مریوں کو نہ کہ سے محروم کر دینی مخالفت  
 ایک پیرسوز و محبت انگیز قصہ کے پیرا ہیں ۸  
 تاہم غنی اندلس میں مسلمانوں کے عروج و  
 شہنائی کے قابل و شگبار کا زمانے قیمت ۸  
 لڑکیوں کی انشا کی جوتوں کو خط و کتابت کی  
 آؤ بابتیں سکھانے والی کتاب پیارے زبان  
 میں قیمت یاد آؤ ۱۲  
 عجم افروغی افسانہ کے عہد میں مسلمانوں  
 کا عجمی کارنامے خردندان ایران کا  
 سر قوشانہ مذہبی جوش و خروش کے جذبات  
 لطیف قیمت صرف ایک روپہ چار آنے  
 منازلِ سائرہ مولانا اشرفی ابتدائی  
 درونماک و دھپ سگڑت۔ انگریزوں کے سنے  
 مفید کتاب قیمت صرف ایک روپہ  
 سنجک محض دولت کی طرح سے بے سوچے سمجھے  
 انگریزوں کا انکار کر دینے کے خوفناک  
 نتائج پر درد و پیرسوز داستان قیمت صرف ۱۰  
 گوہرِ مقصود دو چھوٹے چھوٹے  
 سوکن کا جلدیا انکارِ ثانی کے مفید نتائج  
 زدہ لڑکی کی درونماک سرگذشت قیمت ۴  
 در شہوار۔ ماہندان اور ایران و سیستان  
 کی ہولناک جنگوں کا نقشہ عشق و محبت کی  
 چاشنی لے ہوئے قیمت صرف ۱۰  
 جوہرِ عصمت بیویوں کو سلیقہ سکھانے والی  
 پر درد و بچسپ کتاب قیمت صرف ۳۰  
 فسانہ سیمہ (مضمون اولاد پر بے رسم  
 رویداد فتن قیمت صرف چار آنے ۱۰  
 شبِ زندگی حصہ دوم قیمت صرف ۵

ملنے کا پتہ۔ ایس۔ عہد الہی شہید اینڈ برادر س تا جرات کتب لویا ری دروا





**عقیدہ مجسم** ایک کتابت شہادہ بی بی سے کس  
جوہری بنا دیا مجسم ۱۰ صوفی قیمت صرف ۱۵۰  
**حسن و صحت** کتابت شہادہ بی بی سے کس  
کتابت مجسم ۱۰ صوفی قیمت صرف ۱۵۰  
**رفیق عروس** کتابت شہادہ بی بی سے کس  
صاحبہ قیمت صرف ۱۰۰ اس کے  
**نعمت خانہ** کتابت شہادہ بی بی سے کس  
چیتوں کے تیار کرنے کے طریقے قیمت ۱۰  
**کروٹیا** کتابت شہادہ بی بی سے کس  
ہوئے انداز میں - قیمت صرف (۱۰)

**مجموعہ طائف** کتابت شہادہ بی بی سے کس  
کتابت مجسم ۱۰ صوفی قیمت صرف ۱۵۰  
**قومی گیت** کتابت شہادہ بی بی سے کس  
کے قابل مجسم ۱۰ صوفی قیمت صرف ۱۵۰  
**الفاظ** ایک کتابت شہادہ بی بی سے کس  
ادب قات اس کتاب میں یہ بتایا گیا  
اپنی باہمی ملاقاتوں میں کن کن باتوں کا لحاظ رکھنا  
چاہئے اور مختصر مجسم ۱۰ صوفی قیمت صرف ۱۵۰  
**صوفیہ** ایک کتابت شہادہ بی بی سے کس  
پابندی کے ساتھ قیمت صرف دس آئے ۱۰

## تصنیفات فطرت نگار جناب سدرشن صاحب

**بیکناہ مجسم** ایک اعظمیہ درجہ کا مجلسی ناول  
کسی رسالہ زمانہ نے لکھا تھا کہ ایسا ناول آج  
تک ہماری نگاہ سے نہیں گذرا اور میرا اپنی  
نظم ہونے کو ہے قیمت صرف ۱۰  
**سدا بہار کے پھول** ننگار زمانہ نویں  
جناب سدرشن کی ۸ کتابوں کا مجموعہ  
جن میں سے ہر ایک کمرائی بجائے تو کسی مجلس  
ناول سے کم دیکھ نہیں قیمت صرف ۱۲۰  
**قوس فرخ** کتابت شہادہ بی بی سے کس  
گجراتی - مرہٹی اور سندھی زبانوں میں ترجمہ ہو  
چکا ہے - قیمت صرف چودہ آئے ۱۰۰۰ ۱۲  
**عورت کی ہجرت** کتابت شہادہ بی بی سے کس  
ڈراما کی بنا پر لکھا ہوا ایک ڈراما (سبب فطرت  
ننگار سدرشن نے خوبصورتی اور زور کی تدبیریں  
بہا دی ہیں قیمت صرف ایک روپیہ ۱۰  
**ہجرت کا انتقام** کتابت شہادہ بی بی سے کس  
یہ فطرت نگار سدرشن کا تصنیف کردہ بہترین  
ناتک ہے جس کو تجربات اور بنچال اور پونی کو  
نقادان ادب نے جود پسند کیا ہے قیمت ۱۰

**چندر** کتابت شہادہ بی بی سے کس  
کتابوں کا مجموعہ اور زبان میں کتابوں  
کی ایسی کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی ماڈرن  
ریویو لکھتے - بی بیوں لاہور - اردو اور نگ آریا -  
معارف اعظمیہ - نگار آگرہ - ہزار داستان  
لاہور - ہندسے ماترم لاہور نے نہایت پرورد  
ریویو لکھے ہیں - شروع میں دہلی کے جادو و ختم  
خواجہ حسن نظامی کا دیباچہ شامل ہے قیمت  
صرف (دہریہ) دہریہ شہری جلد صرف (۱۰)  
**چٹکیاں** جناب سدرشن کی مزاحیہ  
رومانی اشیاء سے - قدرت کے حیا و عفتوں  
کے دل میں آئے جانے والے ہیکل - سر پر خیا لات  
نئی قسم کی عجیب چیز ہے قیمت صرف ۱۰  
**سج طون** ادیب فطرت نگار سدرشن صاحب  
کی قومی کتابوں کا شاندار مجموعہ  
جس پر نہایت پیش - ہندسے ماترم - زمانہ -  
ہمایوں - ہزار داستان - بی بیوں ماڈرن ریویو  
نے زبردست ریویو لکھے ہیں قیمت ۱۰  
**وے سنگھ** بی بیوں ایک ناٹک ہے مگر بازاری  
اور دلکش ڈراما جبکہ اردو میں شائع نہیں  
ہوا قیمت صرف ایک روپیہ ۱۰  
**من کی موج** فطرت کی لاجواب کتاب ۸



**شعر المجلد اول** - شاعری کی حقیقت فانی  
شعر المجلد دوم - شاعری کا آغاز - قدماء کا  
دور قیمت صرف تین روپے ..... ۳۰

**شعر المجلد سوم** - شعر کے علم و متوسط  
شعر المجلد چہارم - شعر کے متاخرین قیمت  
شعر المجلد پنجم - دور و پے آگے آئے

**شعر المجلد ششم** - قاری شاعری پر پور  
شعر المجلد ہفتم - قیمت صرف .....  
شعر المجلد ہشتم - فلسفیانہ موقیانہ اور  
شعر المجلد نهم - ادبی شاعری پر تبصرہ

قیمت صرف دو روپے .....  
**مفت** - ہندو علی - تاریخی مضامین کا  
مفت - مجموعہ قیمت صرف .....  
مفت - عالمگیر - شمشاد اور نکات تربیت

عالمگیر پر اعتراضات اور ان کے جوابات ۱۲  
مفت - مولانا کی فارسی نثریوں کا مجموعہ -  
مفت - قیمت صرف چار روپے ..... ۳۰

**مفت** - مولانا مرحوم کے خطوط کا  
مفت - بی بی - مجموعہ علمی - فنی - اخلاقی  
ادبی معلومات کا خزائن ہے جلد اول قیمت

صرف ۱۰ جلد دوم قیمت صرف ۱۰  
مفت - کلام شہابی - اردو مہائیت اعلیٰ کتاب  
مفت - قیمت صرف ..... ۱۲

**سوانح مولانا مرحوم** - مولانا مرحوم کے حالات اور  
سوانح مولانا مرحوم ان کے دیوان و مثنوی  
پر ریویو قیمت دو روپے ..... ۱۰

**کلیات بی فارسی** - مجموعہ تصانیف و نثریات  
کلیات بی فارسی - مثنویات و رباعیات  
قیمت صرف دو روپے ..... ۱۰

**تصنیف مولانا سید بیان صاندوی**  
ارض القرآن جلد اول - مقامات کا جغرافیہ  
اور اقوام قرآن میں سے غار - بخودہ ترجمہ - سیاہ -

مفت - بی بی کی تاریخ مہد افشہ مقامات شاعر  
قیمت صرف دو روپے ..... ۱۰

**ارض القرآن جلد دوم** - ایرانی عربوں کی  
کی تہذیب و تمدن - اور مذہب پر افہامی مباحث  
مفت - ۲۵۱ صفحات قیمت صرف ..... ۱۲

**رسائل اہل سنت والجماعت** - فتنہ  
اہل سنت والجماعت کے (مولوی عطاء اللہ کی تحقیق  
مہائیت و مباحث سے کی گئی ہے قیمت ۸

لغات جدیدہ - جدیدہ - جدیدہ - جدیدہ - لغات  
کی دشمنی قیمت صرف ایک روپیہ ..... ۱۰

**سیرۃ عیسیٰ** - حضرت عیسیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات  
سیرۃ عیسیٰ - زندگی قیمت صرف ..... ۱۰

**جہان مالک** - امام مالک کی سوانحی  
اور موطائے مالک پر تبصرہ قیمت ..... ۱۰

**بہار خواہین اسلام** - قیمت ..... ۲۰  
**تصنیف مولانا مولوی علی اسلام ندوی**  
اسوۃ اصحابہ جلد اول - صحابہ کرام کے

عقائد - عبادات - اخلاق اور معاشرت کی تصویر  
تصویر اور قرون اولیٰ کے اسلام کا علمی خاکہ  
ضخامت ۳۵۰ صفحات قیمت صرف ..... ۱۰

**اسوۃ اصحابہ** - حصہ دوم - صحابہ کرام کے  
سیاسی انتظامی اور علمی کارناموں کی تفصیل  
ضخامت ۴۵۰ صفحات قیمت صرف ..... ۱۰

**سیرۃ عمر بن عبد العزیز** - سوانحی اور  
ان کے عہد حکومت کے تمام علمی مذہبی اور  
سیاسی کارناموں اور ان کے مجددانہ اعمال

کی تشریح قیمت صرف ..... (مفت)  
**تصنیف مولانا خاں مرقوم**  
حیات شاعری قیمت صرف ..... ۱۰

**مفت** - مجموعہ نظم حالی - مفت - مسدس حالی قیمت ۸  
مسدس حالی پاکت ایڈیشن قیمت ۱۰

**مفت** - شکوہ ہند قیمت ۲۰ - مثنوی حقوق اولاد ۲  
بیوہ کی مناجات قیمت صرف ۳۰

**مفت** - تحفۃ الاخوان ۲۰ - یادگار غالب ۳۰  
پھوٹ اور ایک کا منظرہ قیمت ۲۰

**مفت** - چپ کی داد قیمت ۲۰ - دیوان حالی قیمت ۱۰  
مقدمہ دیوان حالی قیمت صرف ۱۰

**مفت** - تعصب اور انصاف قیمت صرف ..... ۲۰  
**ریاضیہ عجیبہ** - مع تذکرہ پیام مطبوعہ  
البراکہ - خلیفہ ہارون الرشید عباسی کے

مفصل سوانحی قابل دید کتاب ہے -  
قیمت صرف تین روپے آٹھ آنے ..... ۱۰

## اردو زبان کی تجارتی انسائیکلو پیڈیا

بے روزگاروں کو پرہیز و روکار کرنے اور ملک سے افلاس و تنگدستی کی مصلحت و ذمہ داری اور نئی نسلوں کو تجارتی تعلیم دینے کے لئے نظامیہ ادارہ اشاعت دینی کی مقید عام کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ جس کے پانچ حصے تجارت کی پہلی، تجارت کی دوسری، تجارت کی تیسری، تجارت کی چوتھی، تجارت کی پانچویں کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

پہلی کتاب میں مبادیات تجارت، تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

دوسری کتاب میں تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تیسری کتاب میں تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

چوتھی کتاب میں تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

پانچویں کتاب میں تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

تجارت کی پہلی، تجارت کا بیان ہے۔

مَوْلَانَا مَوْلَايِ مُحَمَّدِ عَبْدِ الْحَكِيمِ صَاحِبِ مَنَاصِقِ شَهْسَوْرَةِ اَمَقْبُولِ عِلْمِ نَصَبِ

[illegible][illegible][illegible][illegible]

ملنے کا پتہ۔ ایس عہد الرشید اینڈ برادران قجراں کی نو ماہرینہ لکھو

نیریتہ کتابیں حکیم چمر سراج الحق مینجی رسالہ دلگداز وادب ڈیڑ رسالہ سہی بخن سچ کٹرہ نمون بیگیاں بکھنو  
سے ملتے ہیں



# فہرست مآثر شاہنشاہ متعلقہ دوکانیں علیہ السلام

## ایند بکرا در زناجران کتب لوہاری دروازہ کاہور

تھا۔ ہم نے اس کی نہایت حرقری سے سمجھ کی اور اس پر حاشیہ بھی تحریر کئے اور دو ہند کے کاغذ پر چھاپی۔  
 تیسرا اول دورہ دہلی (۱۸۵۷ء) میں دوم (۱۸۵۸ء) میں آپ اس کتاب کو شکوہ میں اور ملاحظہ فرمائیں۔ چون چلی محنت اور خرچ کی دادی اس طرح ہی مل سکتی ہے۔  
**مستقبل اسلام** کہ پروتیسر و امری۔ جو  
 دنیا میں اولہ اور سیاسی و مذہبی معلومات کے تقصیر ہو کر ایک حرکت آراء تصنیف مغربی تہذیب اور مشرقی ممالک شائع کی۔ اس کا مسخرہ فخر صاحب دینی علم (علیگ) شوق تیلی چھتری و ہر ام کی گرفتاری نے نہایت مقبول ترجمہ فرمایا اور حاشیہ بھی لکھے۔ یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔ اسلام کی آئینہ حالت مغربی نقطہ نظر سے دیکھنا ہو تو اس کو ملاحظہ فرمائیے آج کل اس کا مطالعہ نہایت فائدہ بخش ہے۔

یہ صرف ایک دو ہیہ پانچ آئے۔۔۔ (۱۸۵۷ء)  
**ذکر فتح اندلس** کتاب تالیف تھی حالات محمد بن عبد الرحمن صاحب پروتیسر و ہر ام کی گرفتاری نے نہایت مقبول ترجمہ فرمایا اور حاشیہ بھی لکھے۔ یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔ اسلام کی آئینہ حالت مغربی نقطہ نظر سے دیکھنا ہو تو اس کو ملاحظہ فرمائیے آج کل اس کا مطالعہ نہایت فائدہ بخش ہے۔

یہ صرف ایک دو ہیہ پانچ آئے۔۔۔ (۱۸۵۷ء)  
**مختصر تاریخ اسلامی** کتاب تالیف تھی حالات محمد بن عبد الرحمن صاحب پروتیسر و ہر ام کی گرفتاری نے نہایت مقبول ترجمہ فرمایا اور حاشیہ بھی لکھے۔ یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔ اسلام کی آئینہ حالت مغربی نقطہ نظر سے دیکھنا ہو تو اس کو ملاحظہ فرمائیے آج کل اس کا مطالعہ نہایت فائدہ بخش ہے۔

**سیرۃ احمدی** یعنی حضور و سرور عالم کی سوانح عمری۔ اس کتاب میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سوانح عمری کے علاوہ زوجہ و اولاد کا تذکرہ بھی ہے حضور کے طبی عادات اور حالات حضور کی تعلیم اور اس کی فلاسفی۔ نبوت اور خیرات اور ان کی فلاسفی نکتہ ازواج طلاق غلام اسلام ہر سبب۔ فضا د ہے ان عنوانات پر تفصیلاً بطورہ علیہ باب قائم کر کے بحث کی ہے۔ جو اسی کتاب کی خصوصیت ہے نہایت دیدہ زیب آرائش اور طبعیات اور زندگی کا اندازین طرح کا نگار و پیرستہ درجہ اول تین روپے (تین) درجہ دوم درجہ سوم دھم رکھی گئی ہے۔ عاشقان حضور کے قابل مطالعہ ہے جلدی طلب فرمائیے تاکہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار نہ کرنا پڑے۔

**مختصر تاریخ اسلامی** کتاب تالیف تھی حالات محمد بن عبد الرحمن صاحب پروتیسر و ہر ام کی گرفتاری نے نہایت مقبول ترجمہ فرمایا اور حاشیہ بھی لکھے۔ یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔ اسلام کی آئینہ حالت مغربی نقطہ نظر سے دیکھنا ہو تو اس کو ملاحظہ فرمائیے آج کل اس کا مطالعہ نہایت فائدہ بخش ہے۔

**سیرۃ النعمان** مختصر علامہ شبلی نعمانی مرحوم کے مکتبہ دار کی تصنیف فرمائی ہے۔ اولہ کر وٹوں حنفی مذہب۔ مذاہن کو امام اعظم اور ان کے تلامذہ و مقلدین شاکر دوں کے حالات اور مسائل سے آگاہ کیا۔ دیکھیں یہ کتاب مختلف مطالعہ چھاپ کر اپنی مدد کر دی تھی۔ کہ دیکھ کر واضح پریشان ہوتا

یہ دیکھ کر تب اور معنوں ہو کر مل جاتیں تو تم کو کھول  
 ہر رگیں چنے ایسی قابل ہستیوں کی خواہش کو پورا  
 کر کے لئے علامہ موصوف کو نکلیت دی تو  
 انہوں نے مہربانی فرمائی اور میری انہاس کو شرف  
 قبولیت بخش کر عالیہ علیہ عنوانوں سے متناہین  
 کو مرتب فرما دیا۔ چنانچہ حصص کر کے اپنے طبع کرنا  
 مشرق کر دیا ہے جن میں سے عاشقانہ و شاعرانہ  
 مضامین کے تین حصہ چھپ کر تیار ہو گئے ہیں۔  
 اور تاریخی و جغرافی مضامین کے دو حصہ ان میں سے  
 ہی چند و ستان میں مشرقی تمدن بصورت حصہ  
 سوم (قیمت ۴۰) عاشقانہ و شاعرانہ مضامین حصہ  
 اول قیمت ۴۰ دور و پے آٹھ آنے (۴۰) ایضاً حصہ  
 دوم قیمت ۴۰ (۴۰) حصہ سوم آغاز و اختتام سال  
 قیمت ۴۰ (۴۰) تاریخی و جغرافی مضامین حصہ اول  
 قیمت ۴۰ (۴۰) حصہ دوم دور و پے آٹھ آنے (۴۰)

**جلد دیگر از ۱۸۸۸ء**  
 یہ باوجود دو  
 ہونے کے علامہ شرمندہ ظلم کے کتب خانہ میں  
 بھی مکمل نہ تھی چنانچہ اسکو طبع کر دیا ہے۔ حقوڑی  
 جلدیں طبع کر گئی ہیں اسلئے جلد طلب فرمائیں  
 قیمت ایک روپیہ چار آنے (۴۰) (۴۰)

**جلد دیگر از ۱۸۸۹ء**  
 اس کو بھی میں نے اس لئے طبع کر دیا ہے کہ یہ  
 سخت نایاب ہو گئی تھی قیمت صرف ۴۰  
 کیا ہے و مشابہہ شعلے ہند  
**بین زاد** اس لئے کلام کا انتخاب لا جواب ہے  
 اور وہ بھی مسلم آستانہ ازاد مرحوم کا کیا ہوا نہایت  
 خوش عطر شعر ترجمہ لکھے ہوئے جلی قلم معلوم ہوتا  
 ہے کہ شگرت سے لکھی ہوئی قلمی کتاب ساسنے  
 رہی ہے۔ ولانا کا نوٹ بھی شامل ہے علامہ شرمندہ  
 لکھنوی نے جو اس کتاب کی نسبت تحریر فرمایا  
 ہے وہ ابتدا میں مشکک کر دیا ہے باوجود ان  
 تمام خوبیوں کے قیمت صرف ۴۰  
**سحرنا کا جاننا** راشد انجیری دہلوی اس  
 کتاب کی مقبولیت اس سے ظاہر ہو سکتی ہے  
 کہ پہلی بار چھپنے ہی اتنی جلد ختم ہوئی کہ چھ ماہ کے  
 اندر اندر دوسری دفع طبع کرانے کی دقت آگئی  
 پوری اب پھر سنوڑی سی جلدیں ہیں جلد طلب  
 فرمائیے۔ یہ کتاب تہذیبیت انہاس کے لئے ایک

سبق آموز اضافہ ہے قیمت ایک روپیہ چار آنے (۴۰)  
**آفتاب مشرق** احمد صدیقی کا اسلام  
 جنگی کارنامے مسلمانوں نے دمشق اور بصرہ وغیرہ  
 شہروں پر قبضہ کر کے اور اسلام کی اشاعت کے  
 لئے جو عظیم الشان قربانیاں کی ہیں ان کا ذکر اور  
 ایسے دردناک پیرائے میں جو مصنف و محقق علامہ اشرف  
 انجیری کا مخصوص اعجاز ہے ایک مسلمان عیاہر  
 اور مسلمان خاتون کی موت اللہ کے مصائب  
 دیکھنے اور سبق حاصل کیجئے۔ ایک کتبہ کا اسلام  
 پر شیدا ہو کر مسلمان ہونا۔ تہذیب کا جانا۔ اور  
 فضیل کے کنگوروں پر سے گرانے سے پرہیز  
 اسلام سے ہمنامی نہ کرنا۔ اس کتاب میں مزاج  
 ہے۔ جوش اسلامی حقیقت اسلامی۔ عدل اسلامی  
 کا بخوبی کتب کو اس کتاب کے مطالعہ سے ملے گا۔  
 دو بارہ چھپی ہے اور قریب الاختتام۔ چھپاتی۔  
 لکھنوی سرورق نہایت دیدہ زیب قیمت ۴۰

**رہنما قانون الہامی دو کتب خانہ**  
 دیکھا کہ لئے نہ تھی کتب طبع ہو رہی تھیں لیکن  
 منشی صاحبان جن کو کم دینے سوڑی نہیں کر تے  
 پڑتی ان کے لئے ایک کتاب کی نہ ہو کتب خانہ  
 کی بات ہے۔ یہ کتاب منشی صاحبان کے لئے مخصوص  
 اور رعائیں نویسوں۔ ٹائٹل۔ سما ہو کاروں وغیرہ  
 وغیرہ کے لئے عموماً مفید ہے اس کتاب میں  
 قانون مروجہ ہند کو نہایت آسان عام فہم زبان  
 میں بیان کیا ہے ناظرین مشکوایں اور قانونی  
 انجماؤں سے خلصی حاصل کریں قیمت ۴۰

**نصیحا مسر طفرہ صبا بی**  
 منشی غفر سانی کا نہایت دلچسپ  
 نئی چھتری (۴۰) پسندیدہ ناول قیمت ۴۰ (۴۰)  
**بہار کی گرفتاری** منشی چھتری کے ہیرو بہرام  
 کے حیرت انگیز کارنامے  
 حصہ دوم قیمت ایک روپیہ چار آنے (۴۰) (۴۰)  
**چوروں کا کلاب** دل ہلانے اور چوری کے  
 خطرات سے بچنے اور نقصان کھانیکا نا و خزانہ  
 لکھنوی ایسٹریٹ پولیس کے لئے ہر زبان میں  
 پڑھنے کے لئے بہت مفید صرف آٹھ آنے (۴۰)  
**مستقبل اسلام** ترجمہ فیست صرف (۴۰)



# نہایت خیر و بخت نال پر ممدنی اخلاقی ناول راتہ کہ بیان

**نظریہ یکم** یہ اپنے رنگ کا بے نظیر ناول ہے اور ایک زندگی کی بیوقوفانہ دکھائی گئی ہے۔ شوہر کی جدائی اور بے انتہائی سے بیوی مر جاتی ہے آخر میں زندگی کے مظالم سے تنگ آکر ملوث ہر جنون ہو جاتا ہے۔ اور بیوی کی قبر کی تلاش میں قبرستان جاتا ہے۔ وہاں ایک نقاب پوش عورت کو پاتا ہے۔ جو دراصل اس کی بیوی ہے مر جانی کے بعد اسے بیوی کیونکر زندہ مل گئی؟ یہ راز صرف کتاب پڑھنے پر معلوم ہوگا۔ انداز تحریر دلکش و مصنف کا فوٹو بھی درج ہے قیمت .... ع

**حسرت** یہ ناول اسم یا سٹے ہے جس میں عالم کی نیرنگیاں اور فلک ستار کی جفا آرائیاں دکھائی گئی ہیں۔ یہ درد و غم کا فسانہ جوٹ کھائے ہوئے دلوں کے لئے مرقعِ عبرت ہے جہاں فانی کی لذتیں اس قابل نہیں کہ کوئی مجھ دار انسان ان سے دل نہ لگائے۔ یہ دنیا کی تیز کمی بھی اس نے کسی کے ساتھ وفا نہ کی شاذ و نادر ہی کسی کی امید بر آئی ہوگی صدر نامہ لادانی امیدوں سمیت اپنی قبروں میں جا سوتے۔ ان میں سے ایک مظہر بھی تھا کہ کامیابی کی جھلک دکھائی لیکن وہ میرا یہ سے زیادہ پائدار نہ تھی۔ اپنی بیوی پچھلے آرا کے ساتھ چند دن ہی بسر نہ کر سکا۔ بد قسمتی نے بیوی بچوں گھر بار سے چھڑایا غربت کے مصائب تھے۔ زمانہ کے تشدید خزاں دیکھے۔ گھر بٹا تو بیوی دوسرے کی ہو چکی تھی و ناگ فسانہ شروع سے آخر تک دلکش ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ دلہ و زور اور درد انگیز بھی قیمت ع

**سوز** عورت کی کیا دی اور مکاری کی داستان۔ عورت کی بیوقوفی و دوستوں کی غمگینی۔ خود غرضی اور خود کامی کے نتائج رنج و اندوہ کا فسانہ۔ درد و غم کی کہانی۔ زمانہ کی نا مسا عدت۔ دنیا کے تشدید و خزا۔ دوستوں پر بھروسہ کا انجام۔ بے وفائی اور بے مہربانی کی داستان عورت کی کمزورت۔ ظالم کا ظلم اور اس کا کینہ کڑا ضبط و تحمل کی کامیابی بہت ہی دلچسپ و دلکش انداز میں دکھائی گئی ہے۔ اس کو پڑھ کر انسان حیرت ہو جاتا ہے۔ مصنف کا فوٹو ساتھ ہے قابل دید قیمت صرف ایک روپیہ .... ع

**احسان** محبت آہ مجبت! کیا ہے یہ ایک اہمیت ایک آفت صوفی اور فلسفی ہے جو کچھ کہیں انہیں اختیار ہے۔ یہاں تو جو کدہری ہے وہی کہتا ہوں ہجرت کے نام میں ہر شے اور گیا۔ محبت ایک کو نہیں دونوں کو لے ڈالتی ہے اس کی ابتداء اور انتہا دونوں تباہ کن۔ اس میں سولے ٹھوس اور نامرادی کے رکھائی کیا ہے نول کی گھڑیاں پیسہ بھی ہوں تو کس شام میں ہیں ان کا زمانہ پشیمک ہرق سے زیادہ نہیں پھر وہی بیوقوف ہے اور رنج و غم اور اس سے اگر کچھ حاصل ہوتا ہے تو صرف آہ اور یہیں پر نزل ختم ہو جاتی ہے اس آہ سے آشنا ہونا چاہئے ہونا تو اسے پڑھو اور سبق حاصل کرو۔ اور دنیاوی چیزوں کی محبت میں اپنی اپنی تباہ نہ کرو قیمت صرف .... ع

**اپنی روزگار** زمانہ سازوں اور فتنہ و فتنوں کی خطیاں بوائے کی خطرناک نتائج ہوں کو زور پڑتا ہے کہ بڑا انجام ہر کس و نا کس پر ہوا پورے پورے بھرے کے عرصہ کے لئے کا دردناک نتیجہ۔ دلالہ عورتوں کی کارستانیاں، دولت کا لالچ چور بدعاشوں کی سازشیں اور ان کے مضرت سار ایک سربیب عورت کا شہر پر اور فتنہ جو لوگوں کی سازش سے نجات پاتا۔ اور ان بدعاشوں کا اپنی ستر کو پہنچنا۔ جتنا ایک دوسرا فتنہ ہی آگیا ہے جس میں ایک مندر کے پوجاری کے عصمت شکن چھکڑے اور ایک لڑکی کی عزت مانی کا ذکر ہے جس نے ناول کو اور بھی زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے قیمت صرف .... ع

**شمع** ایک انگریزی ناول کا قابل دید ترجمہ ہے۔ مترجم نے کوشش کر کے فتنہ کو انیشیائی مذاق کے موافق بنا دیا ہے اصل کتاب انگلستان کے ایک مشہور ناولسٹ کی تصنیف ہے۔ اصل کتاب کی خوبی کی دلیل اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ پنجاب پبلکس ایک کمیٹی کی کمرٹ میں شامل ہے جس کا یہی یہ کتاب ہے۔ اسی پایہ کا یہ ترجمہ بھی ہے پڑھنے سے ترجمہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ اور پیکل تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ واقعی قابل دید کتاب ہے۔ قیمت صرف بارہ آنے .... ع

میں نے کا ہتہ۔ انیس عید الر مشید ایند برادر دس نا جران کذب لوباری دروازہ۔ لاہور

**گلیہ** ایک غریب کا اتفاقاً لاشری میں لیتا پاتا اور لقمہ ہو جاتا۔ پھر دولت کے نشہ میں آکر اعزاز و قربا سے نفرت کرنا۔ اولاً۔ اپنی لڑکی کی نسبت اپنے پیچھے سے کر کے اس سے بھر جانا۔ لڑکی کا دوسری جگہ شادی پر لڑائی نہ ہونا اور خوشی پر تیار نہ ہونا۔ پولیس انسپکٹر حامد کا لڑکی کی مدد کرنا اور مختلف خطرات سے بچانا۔ ایک اور عورت کا اپنے شوہر کو نہر ویکر میں کمرنا۔ اور بد معاشوں کا ساتھ دینا۔ پولیس انسپکٹر کی عیادت نہ چاہیں۔ پولیس اور قزاقوں کی ٹھیکر چوروں کی چالیا زیاں اور پولیس کی سخت عملی پولیس کی کامیابی بد معاشوں کی شکست لڑکی کی کامیابی۔ مراغہ سانی کا بہت ہی عجیب ناول ہے قیمت صرف بارہ آنے۔ ۱۲

**گنتی آسرا** بڑی صحت کا انجام۔ بد چلی خانہ خراب کی کثرت۔ ایک پیش کی تباہی۔ یورپین تہذیب کے تباہ کن کرشمے ایک مظلوم عورت کی کامیابی۔ بے وفا بد معاش اور بد چلن شوہر کی بدکرداریوں کا انجام۔ شروع سے آخر تک سوز و گداز اور درد اندہ سے معمور ہے۔ بہت ہی دلکش اور دلربا سنان ہے قیمت ۱۲

**مکافات عمل** ایک فنی خیر اور بد کرداروں کے عشق کے چوچکے وصال و فراق کی داستان۔ راز و نیاز کی باتیں اور محبت کی کرشمہ سازیاں قیمت صرف ایک روپیہ چار آنے۔ (دیکھ)

**پارہ ڈول** ایک دلگداز سنانہ۔ غم و کوشش تقدیر کے کرشمے۔ جذباتی اور ناہرادی کی داستان۔ حسن و عشق کا معاملہ بہت ہی دلکش اور حکیم دور و سنان ہے قیمت ۱۲

**درو** ایک لاجواب ڈی ٹیکٹو ناول جس کے متعلق نوٹوں کا تیاں ہے کہ شخ مشنوں کے جوہر یہ سب سے بہتر ناول ہے۔ اس کو پڑھ کر انسان بہت حق دروین جاتا ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ چار آنے۔ (دیکھ)

**واہ** مراغہ سانی کے ناولوں میں سب سے بہتر ناول ہے انسپکٹر محمود وصال بہتر و سنان کے شرکاک ہو کر کے کارنامے جو پنجاب میں ٹیکس صاحب ہمارے اور پٹی انسپکٹر جنرل پولیس کے ایما سے لکھا گیا ہے اور ابھی

کے نام پر معنون ہے قیمت صرف ۱۰۰۰۰

**سرخ حرف** بعض کا خیال ہے کہ یہ وگداز ہے۔ بہترین تصنیف میں سے ہے اور یہ بالکل سچ ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک دیوانہ مقام بنو ہر نے عبرت خیز انتقام کس طرح لیا۔ قابل دید قیمت صرف ۱۲

**وہ عورتیں کر کے دکھایا** ایک عجیب غریب ناول قیمت صرف ۱۲

**پری بالو** قابل دید عجیب و غریب ناول پری بالو قیمت دس آنے۔ ۱۰

**ساوھو کی کثرت** ففیری کے لکھا۔ میں عیادت۔ قزاقی ظلم و ستم کا نظارہ قابل دید قیمت ۱۲

**اسرارہ شمس** آٹائیل و طباعت وغیرہ نہایت دلربا قیمت صرف نو آنے۔ ۹

**آپ بیتی** ایک لڑکے کا باپ فوت ہو جانا ہے۔ ماں و سرانجام کر لیتی ہے بچے کو ان مواقع پر جو خوش اور تکلیفیں آتھیں پڑتی ہیں۔ پڑھ کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ آخر میں خداوند تعالیٰ اپنا فضل کرتا ہے اور کامیاب اور لائق گزیر جوائیٹ بن جاتا ہے۔ نہایت مزیدار لکھا ہے قیمت صرف ۱۲

**نازنین مجہدین** ایک عورت کا آبگ ہزار سال تک زندہ رہنا اور پھر غسل آتشین سے ہی زندگی کا ختم ہونا نہایت رفت خیر۔ اور حیران کرنے والا بیان ہے۔ پڑھیں بچو اور حیران ہوں۔ وحتیا نہ زندگی اور وحتیوں کے رسم و رواج بھی اس سے معلوم ہو جائینگے یہ نہایت ہی دلچسپ اور قابل دید کتاب ہے قیمت صرف چھ آنے۔ ۶

**ایلیس و جمیلہ** شیطان کے انسانوں کی دیکھ اور قابل عبرت ناول ہے قیمت ۱۰

فان احمد رشید اینڈ برادرین تاجران کتب بودای و درازہ۔ لاہور

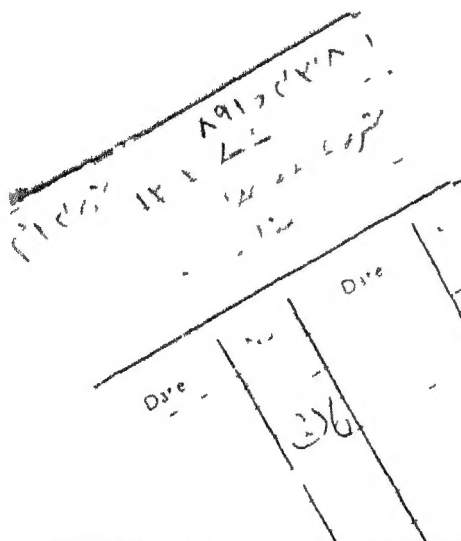








CALL No. { ۸۹۱۵۰۷۷۸  
 ACC. No. ۱۲۲۷۷  
 AUTHOR  
 TITLE



# MAULANA AZAD LIBRARY ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

## RULES -

- 1 The book must be returned on the date stamped above.
2. A fine of Re. 1/- per volume per day shall be charged for text-books and 10 P. per vol. per day for general books kept over-due.

